

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ط

مطالب الفرقان

قرآن مجید کی تفسیر — خود — قرآن مجید سے

جلد پنجم

سورۃ الانعام ۶ (مکمل) — اور سورۃ الاعراف ۷ (آیت ۱۵۸) تک

مع انڈکس

پرویز

شائع کردہ

طلوع اسلام پبلسٹ، بی، گلبرگ ۲، لاہور

جُمْلہ حقُّوتے محفوظ

نام کتاب	مطالب الفرقان (جلد پنجم)
مصنف	علامہ پرویز
پبلشر	طلوع اسلام ٹرسٹ (ر؟نڈ)
	25- بی، گلبرگ 2- لاہور 54660
	فون: 879246
طالع	دوست ایسوسی ایٹس
	الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
پریس	ایچ۔ والی پرنٹرز، لاہور
ایڈیشن	اول نومبر 1982ء
	دوم اکتوبر 1994ء

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی شائع کردہ
کُتب کی جُمْلہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بِاسْمِهِ تَعَالٰی

آئینہ مطالب

(مطالب الفرقان — جلد پنجم)

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷	۴-۹ ۴ وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ لَّخَبَّرْتَهُمْ... مَا يَلِدُونَ	۳	آئینہ مطالب
۸	قریش کی معجزات طلبی اور اس سے انکار	۲۸	پیش گفتار
۸	رسول کا فریضہ وحی کے مطابق نظام قائم کرنا تھا		پہلا باب
۸	اور یہ فریضہ انسان ہی سرانجام دے سکتا تھا، فرشتہ نہیں		(سورة الانعام)
۹	۴-۱۱ ۴ وَلَقَدْ اسْتَهْزِئُوا بِالْمُكَذِّبِينَ		آیت ۶ تا ۶۴
۹	استہزاء اور اس کا انجام	۳	۴-۱ ۴ الْحَمْدُ لِلَّهِ..... يَعْدِلُونَ
۱۰	۴-۱۲ ۴ قُلْ لِمَنْ..... يُؤْمِنُونَ	۴	نور و ظلمت خدا کی تخلیق ہیں
۱۰	”کتاب علی نفسہ الرحمۃ“	۴	”خدا ایسا کرتا ہے“ کا مفہوم
۱۰	کا مفہوم	۴	۴-۲ ۴ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ... تَتَرَوْنَ
۱۱	خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔	۵	افراد اور اقوام کی موت اور حیات
۱۱	سنت اللہ اور کلمت اللہ	۵	۴-۳ ۴ وَهُوَ اللَّهُ..... مَا تَكْسِبُونَ
۱۱	خدا نے خود اپنے آپ پر پابندی عائد کر رکھی ہے	۵	ارض و سماء میں الہ
۱۲	خدا اور انسان کے صاحب اختیار مرنے میں فرق	۶	۴-۴ ۴ وَمَا تَأْتِيهِمْ..... قَرْنًا الْآخِرِينَ
		۶	اقوام سابقہ کے مآل کی مثال

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸	۴ ۲۵-۲۸ وَ مِنْهُمْ مَنْ... لَكَذِبُونَ	۱۳	۴ ۱۳-۱۴ وَلَهُ مَا سَكَنَ... مِنَ الْمُشْرِكِينَ
۱۹	مجلس نبوی میں منافقانہ شرکت	۱۳	نظام اسلامی کی خصوصیت
۲۰	یہ التجائیں کہ ہمیں ایک بار دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم بڑے نیک بن جائیں۔ ایسا ہو نہیں سکے گا۔	۱۳	یہ تمام افراد کی ضروریات پوری کریگا۔ ان سے اپنے لئے کچھ نہیں لے گا۔
۲۱	۴ ۲۹-۳۲ وَقَالُوا... تَبَايَأُ الْمُرْسَلِينَ	۱۳	۴ ۱۵-۱۸ قُلْ إِنِّي أَخَافُ... الْحَكِيمِ الْخَبِيرِ
۲۱	حیاتِ اخروی سے انکار	۱۳	اگر رسول بھی (بفرض محال) خدا کی معصیت کرے، تو مزا سے بچ نہیں سکتا۔
۲۱	قرآن اور اخروی زندگی پر ایمان لازم و ملزوم ہیں	۱۳	شفاعت کے خلاف ایک اور دلیل
۲۱	ظہور نتائج کے بعد تاسف و ندامت (توبہ) کچھ کام نہیں دیں گے	۱۵	قہر اور قہار کا مفہوم
۲۱	”دنیاوی زندگی لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں“ کا مفہوم	۱۵	خدا کے قہر اور انسانوں کے قہر میں فرق
۲۱	اسے رسول! یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے قوائینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں	۱۵	۴ ۱۹ قُلْ أَمَّا شَيْءٌ... تَمَا تَشْرِكُونَ
۲۲	اس لئے تمہیں اس سے ملول خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا کچھ ہر رسول کے ساتھ ہونا چلا آیا ہے، اور	۱۵	قرآن قیامت تک ضابطہ ہدایت ہے ختم نبوت کی محکم دلیل۔
۲۳	آخر الامر وہ رسول کا میاب ہوئے یہ خدا کا اہل قانون سے ہے۔	۱۵	یہود اور نصاریٰ کی طرف سے مخالفت کے اسباب
۲۳	کلمات اللہ اور سنت اللہ کے غیر متبدل ہونے کے حوالے	۱۵	۴ ۲۰-۲۱ الَّذِينَ اتَّبَعْتَهُمْ... الْمُتَّبِعُونَ
۲۳		۱۵	ان کا شرک کس قسم کا تھا؟
۲۳		۱۸	۴ ۲۲-۲۳ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ... كَانُوا يَفْتَرُونَ
۲۳		۱۸	یوم مکافات عمل انکا شرک سے انکار۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۶	{ قُلْ أَسْرَعُ بِتَكْمُ کَانُوا يَعْمَلُونَ -	۲۳	{ ۴/۳۵ وَإِنْ كَانَ كَبُرَ... مِنَ الْجَاهِلِينَ ۱۔ سے رسول! تم خواہ مخواہ ان کے غم میں گھلے جا رہے ہو۔ یہ معجزات دکھانے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اور یہ سماری مشیت نہیں کہ ہم انسانوں کے اختیار و ارادہ کو سلب کر کے انہیں ایمان لانے پر مجبور کر دیں۔
۲۸	{ ۴/۳۴ فَلَمَّا تَسَوَّا... هُمْ مُبْلِسُونَ ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت کی فراوانی، تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ جائز ذرائع سے فراوانی رزق باعث شادابی۔	۲۴	{ ۴/۳۶ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ..... إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ایمان تو وہ لائیں گے جو عقل و فکر سے کام لیں گے۔
۲۹	{ ۴/۳۵ فَقُطِعَ..... سَرِّ الْعَالَمِينَ اس طرح ظالمین کی جڑ کاٹ جاتی ہے۔ اور مظلوم شکر کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ نظام سرمایہ داری کے دلائل کی تردید قارون کی ذہنیت۔	۲۵	{ ۴/۳۷ وَقَالُوا لَوْ لَا..... لَا يَعْلَمُونَ پھر معجزات کا مطالبہ۔ ۲۵ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ..... يُحْشَرُونَ تخلیقی اعتبار سے، دیگر جاندار بھی انسانوں جیسی ایک نوع ہیں۔ نظریہ ارتقاء کا بنیادی اصول
۳۰	{ ۴/۳۶ قُلْ أَسْرَعُ بِتَكْمُ... يَصْدُقُونَ - حصول رزق کی صلاحیتیں خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اگر وہ انہیں سلب کر لے، تو کوئی بھی انہیں واپس نہیں دلا سکتا۔	۲۶	{ ۴/۳۹ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا..... مُسْتَقِيمٌ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے، گمراہ رہتے ہیں منافقین کا ایمان۔ خدا کے ساتھ سودے بازی!

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴	جماعت صحابہ کی اہمیت	۳۱	۶/۴۷ قُلْ أَسْرَأُ بِكُمْ... الظَّالِمُونَ
۳۵	۶/۵۳ وَكَذَلِكَ فَتَنَّا... بِالشُّكْرِينَ	۳۱	ایسی قومیں تباہ ہوتی ہیں۔
۳۵	۶/۵۴ وَإِذَا جَاءَكَ... عَقُورٌ سَرَّ حِيمٌ	۳۱	۶/۴۸-۴۹ وَمَا تُرْسِلُ... يَفْسُقُونَ
۳۵	۶/۵۵ وَكَذَلِكَ نَفْصِلُ... الْمُجْرِمِينَ	۳۲	خوہوں کی زندگی اور موت سے متعلق
۳۵	۶/۵۶ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۲	خدا کی طرف سے واضح راہنمائی
۳۵	۶/۵۷ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۲	۶/۵۰ قُلْ لَا أَقُولُ... تَتَفَكَّرُونَ
۳۵	۶/۵۸ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۲	رسول کا اعلان کہ میرے پاس خزانے
۳۵	۶/۵۹ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۲	نہیں، نہ میں غریب کا علم جانتا ہوں،
۳۵	۶/۶۰ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۲	نہ میں فرشتہ ہوں۔ میں صرف وحی
۳۵	۶/۶۱ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۲	کا اتباع کرتا ہوں اور اس کی طرف
۳۵	۶/۶۲ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۲	تمہیں دعوت دیتا ہوں۔
۳۵	۶/۶۳ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	۶/۵۱ وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ... يَتَّقُونَ
۳۵	۶/۶۴ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	تنبذیر سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے
۳۵	۶/۶۵ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	۶/۶۳ ہیں جو غلط اقدامات کے نتائج
۳۵	۶/۶۶ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	سے خائف ہوں۔
۳۵	۶/۶۷ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	رسولوں کی دعوت پر سب سے پہلے
۳۵	۶/۶۸ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	غریب لوگ لبیک کہتے۔ امراء کا طبقہ
۳۵	۶/۶۹ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	مطالبہ کرتا کہ انہیں جماعت سے نکال دو
۳۵	۶/۷۰ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۳	رسول اس مطالبہ کو پھٹکار کر دیتا
۳۵	۶/۷۱ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۴	۶/۷۲ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ... الظَّالِمِينَ
۳۵	۶/۷۳ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۴	رسول اللہ سے ارشاد کہ ان غریبوں اور کمزوروں
۳۵	۶/۷۴ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۴	کو دفعہ کار نہ دینا۔ ان کا اخلاص بہت بڑی متاع
۳۵	۶/۷۵ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ	۳۴	۶/۷۵ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ... مِنَ الْمُتَعَدِّينَ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۵	قُلْ هُوَ الْقَادِرُ..... يَفْقَهُونَ	۳۸	قُلْ لَّوْ أَنَا..... كِتَابٌ مُبِينٌ
۴۵	عذاب (تباہی) کی وجوہات -	۳۸-۵۹	کون سے امور غیب سے
۴۶	کبھی اربابِ اقتدار بگڑ جاتے ہیں، تو ساری قوم بگڑ جاتی ہے	۳۹	متعلق ہیں، اور کون سے ایسے جن کا علم انسان کو بھی ہو سکتا ہے
۴۶	کبھی نیچے کا طبقہ تنگ آ کر قانون شکنی پر اتر آتا ہے، کبھی قوم پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے	۴۰	وَهُوَ الَّذِي..... كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ
۴۶	وَكَذَّبَ بِهٖ..... بَوَكِيلٍ -	۴۱	نہند اور موت میں فرق -
۴۷	رسول کا فریضہ صحیح راستہ دکھانا ہے - اُس پر زبردستی چلانا نہیں	۴۱	نفس کے معنی شعور -
۴۷	لِكُلِّ نَبِيٍّ..... سَوْفَ تَعْلَمُونَ	۴۱	موت کی صورت میں انسانی شعور کی فعالیت معطل ہو جاتی ہے - وہ معدوم نہیں ہوتا -
۴۷	ہر عمل کا نتیجہ اُس کے وقت پر جا کر نمودار ہوتا ہے -	۴۲	جیاتِ اخروی میں اُس کی قوتِ فعالیت پھر کار فرما ہو جاتی ہے
۴۸	وَإِذَا سَأَلَ آيَاتٍ..... كَانُوا يَكْفُرُونَ	۴۲	وَهُوَ الْقَاهِرُ..... أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ
۴۸	قرآن کریم کو سنجیدگی سے نہ لینے والوں کی محفل سے اٹھ آؤ	۴۲	اعمال نامہ کی تفصیل -
۴۹	اُن تک قرآن پہنچاتے رہو تاکہ کوئی شخص اس لئے ہلاک نہ ہو جائے کہ سچائی اُس تک پہنچی نہیں تھی -	۴۳	موت سے صرف جسم انسانی مرتا ہے نفس انسانی نہیں مرتا -
۵۰	قُلْ اٰنذِعُوْا..... اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ	۴۳	قُلْ مَنْ يَّجْعَلْكُمْ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ
۴۱-۷۲		۴۳-۴۴	مصیبت کے وقت خدا یاد آتا ہے خوشحالی میں اُسے فراموش کر دیا جاتا ہے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۵	سائنٹفک طریق استدلال ہی { مؤثر ہو سکتا ہے	۵۰	خدا کی دعوت کے سوا ہر دعوت { گمراہی ہے ہدایت صرف خدا کی دی ہوئی ہدایت ہے۔
۵۵	لَا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ كِي { حقیقت کثرت تشریح	۵۱	کتاب اللہ کی اطاعت ہی اسلام { ہے۔ یہی اقامت الصلوٰۃ کا مفہوم ہے۔
۵۶	کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے { اور تغیر پذیر کو مقام الوہیت حاصل نہیں ہو سکتا۔	۵۲	وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ { هُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ { کائنات میں جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے خدا کی حکم اسکیموں کے مطابق ہوتا ہے۔
۵۷	فنا اور بقا کے معانی۔	۵۲	نفع صور کا اجمالی مفہوم۔
۵۷	فنا اور ہلاکت میں فرق۔	۵۳	وَإِذْ قَالَ مِنْ { الْمُؤَقِنِينَ { حضرت ابراہیم کی داستان جلیلہ { پہلے اپنے والد کو تنبیہ نبی کی بشریت۔
۵۷	نفس انسانی نشوونما پاکر تغیرات { سے ماوراء ہو جاتا ہے۔	۵۳	خفائق کائنات کا مشاہدہ
۵۸	ہمارے مفسرین کی غلط نگہی۔	۵۴	فَلَمَّا جَنَّ مِنَّا { تُشْرِكُونَ۔
۵۸	حقیقت نبوت۔	۵۴	شارہ پرستی کے خلاف جہاد { اور دلائل محکم۔
۵۹	حضرت ابراہیم کا انداز بڑا محققانہ { اور دلنشین تھا		
۵۹	إِنِّي وَجَّهْتُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ { توحید خالص کا مفہوم۔		
۶۰	وَحَاجَّةُ قَوْمِهِ { تَعْلَمُونَ۔		
	شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔		
	توحید سے ہر قسم کا خوف مٹ جاتا ہے		
	اس لئے کہ خدا اور حق حکومت صرف		
	خدا کو حاصل ہے۔		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۷	ایک اعلانِ عظیم۔	۶۱	الَّذِينَ آمَنُوا..... مُهْتَدُونَ
۶۸	{	۶۱	شُرکِ ظلمِ عظیم ہے۔
۶۸	مفہوم اور بحث	۶۲	{
۶۸	اس کا غلط ترجمہ اور غیر قرآنی مفہوم	۶۲	مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک
۶۸	اس مفہوم کی تردید قرآنِ کریم کی رو سے	۶۲	کے مشرک!
۶۸	نسل پرستی کے خلاف	۶۲	{
۶۹	مَوَدَّةٌ فِي الْقُرْبَىٰ کا مفہوم۔	۶۲	وَتِلْكَ حُجَّتُنَا..... حَكِيمٌ
۷۱	غلط مفہوم کی بنیاد و ضعیف روایات	۶۲	عَلِيمٌ
۷۱	ان کی تاریخ اور تفصیل	۶۲	{
۷۳	{	۶۲	سببی بحقیقت دلائل و عبرت سے
۷۳	ایرانیوں، عباسیوں، سیدوں کی	۶۲	{
۷۳	فضیلت کی روایات	۶۲	مدارج بلند ہو جاتے ہیں
۷۳	دروہیں آل کا اضافہ	۶۲	{
۷۴	{	۶۲	وَوَهَبْنَا لَهُ..... يَعْلَمُونَ
۷۴	وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ.....	۶۲	{
۷۴	يَلْعَبُونَ	۶۲	ذریتِ ابراہیمی اور انبیاء ماسبق۔
۷۴	{	۶۲	{
۷۴	خدا کا صحیح تصور وہی ہے جس کا	۶۲	ان میں سے ہر ایک نبی نہیں تھا۔
۷۴	تعارف خود اس نے بدریغ وحی کر لیا ہے	۶۲	{
۷۸	{	۶۲	أُولَٰئِكَ الَّذِينَ..... يَكْفُرِينَ
۷۸	وَهَذَا كِتَابٌ..... يُحَافِظُونَ	۶۲	{
۷۸	کتاب اللہ مبارک ہے۔	۶۲	انہیں کتاب و حکم و نبوت عطا
۷۸	برکت کے معنی	۶۲	{
۷۸	استحکام اور نشوونما کا امتزاج	۶۲	ہوئی تھی۔
۷۸	غیر متبدل اصول اور زمانے کے	۶۲	{
۷۸	تفاضل کا ساتھ دینے والی جزئیات	۶۲	اُمتوں کو یہ کچھ کیسے حاصل ہوتا ہے؟
		۶۵	تمام انبیاء اُمتِ واحدہ کے افراد تھے۔
		۶۵	{
		۶۵	أُولَٰئِكَ الَّذِينَ..... لِلْعَالَمِينَ
		۶۵	{
		۶۵	دین شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے
		۶۵	{
		۶۵	اس کے نافذ کرنے کے طریقے
		۶۵	{
		۶۵	بدلتے رہے ہیں۔ یہ شریعت ہوتی
		۶۵	{
		۶۵	ہے جس میں تغیر ہوتا رہتا ہے
		۶۵	{
		۶۵	میں تم سے رسالت کا کوئی اجر نہیں ملتا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۸۶	علوم سائنس کی اہمیت -	۷۸	خدا اور آخرت پر ایمان
"	{ وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ... يَفْقَهُونَ -	۷۹	تبلیغ کا دائرہ بند ترجیح و بیع ہو گا کیا -
"	تخلیق انسانی نفس واحد سے -	"	{ وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ تَسْتَكْبِرُونَ -
۸۶-۸۷	مستقر اور مستودع کا مفہوم	"	سنگین ترین جرم -
۸۸	{ وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ يَوْمَئِذٍ يُؤْمِنُونَ	۸۰	۱۔ مذہبی پیشوائیت - تھیا کرپسی حامل -
۸۸	{ جناس اور پھلوں کی شکل میں سامان نشوونما -	"	۲۔ ختم نبوت کے بعد وحی کے مدعی -
"	{ کائناتی حقائق میں مومنین کے لئے آیات -	"	خواہ اس کا نام کشف و الہام رکھ لیا جائے -
۸۹	{ وَجْعَلُوا يَصِفُونَ	۸۰	۳۔ قرآن کی مثل (مثلاً معہ - روایت کا عقیدہ -
"	تو ہم پرستیاں -	"	ایغو کے متعلق ضمنی اشارہ -
"	{ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ عَلَيْهِ	۸۱	{ وَ لَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادٰی تَزْعُمُونَ
"	خدا کی اولاد کے عقیدہ کا ابطال -	۸۲	{ فَرَادٰی کا معنی خیز اور حقیقت کشف مفہوم
۸۹	{ اُس کی بیوی ہی نہیں تو اُس کے یاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے	۸۴	{ اِنَّ اللّٰهَ فَخْلَقُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ
۹۰	{ ایک عظیم دلیل اس حقیقت کی کہ کائنات میں خدا بھی خلاف فطرت کوئی کام نہیں کرتا -	۸۵	موت و حیات نو کے متعلق مثالیں -
۹۰	{ ذَرِكُمْ اللّٰه الْخَبِيرُ	"	سورج اور چاند دونوں حساب و شمار کے لئے ہیں
		"	ستاروں سے راہ نمائی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۰	خدا کا ادراک کوئی آنکھ نہیں کر سکتی۔	۹۰	یہ عقیدہ کہ اولیاء اللہ، خدا کے
۹۱	شریک محفل ہوتے ہیں، قرآن کے خلاف ہے۔	۹۱	قَدْ جَاءَكُمْ..... بِحَفِیْظٍ۔
۹۱	قرآن بصائر کا مجموعہ ہے، اور	۹۱	علم و بصیرت کی رو سے سمجھ میں
۹۲	آ سکتا ہے	۹۲	قانون مکافات عمل، ہر عمل کا
۹۲	نتیجہ اپنے لئے۔	۹۲	وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ..... يَعْلَمُونَ
۹۲	نصریف آیات سے قرآن فہمی۔	۹۲	درس کے معنی۔
۹۳	قرآنی مفہام کی وضاحت خود	۹۳	خدا نے کر دی ہے۔
۹۴	اتَّبِعْ مَا أَوْحَى.....	۹۴	عَنِ الْمُنْشِرِ كَيْفَ
۹۴	رسول اللہ کو اتباع قرآنی کا حکم۔	۹۴	وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ..... بِوَكِيلٍ
۹۵	خدا انسانوں کو مجبوراً صحیح راہ پر	۹۵	چلا نا نہیں چاہتا۔
۹۶	وَلَا تَسْبُوا الَّذِينَ..... يَعْمَلُونَ۔	۹۶	لوگوں کے مہبودان باطل کو برا
۹۶	بھلا مت کہو۔ دلائل و براہین	۹۶	سے اُن کی غلط فہمی کی وضاحت کرو
۹۶	وَاقْسَمُوا يَا اللَّهُ..... يَجْهَلُونَ۔	۹۶	معجزات طلبی اور اُس سے انکار۔
۹۸	ایک دفعہ نہ کہدیا، تو پھر کسی صورت	۹۸	میں ہاں نہیں کہتے (ضد پراٹے ہنا)
۹۹	وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا..... مُقْتَرِفُونَ۔	۹۹	انبیاء کی دعوت کے دشمن۔
۹۹	شیاطین الانس والجن۔	۹۹	یہ ملمع سازی کی باتیں کرتے
۱۰۰	رہتے ہیں، یعنی افسانوں پر مبنی و غلط۔	۱۰۰	منقصد۔ جھٹلا کر اپنے پیچھے لگانا۔
۱۰۱	أَفَغَيْرَ اللَّهِ..... مِنَ الْمُنْتَرِينَ۔	۱۰۱	رسول اللہ کا اعلان کہ حکومت
۱۰۱	صرف کتاب اللہ کی جائز ہے	۱۰۱	یہ کتاب مفصل یعنی نکھار کر بات کرنیوالی ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۱۸	اہل تصوف کی غلط فہمی — شریعت کے ظاہر احکام کی پابندی ضروری ہے	۱۱۶	وَتَمَّتْ كَلِمَتُكَ السَّيِّئِينَ الْعَالِيِينَ
۱۱۹	ظاہر الاِثم اور باطنہ کے معنی	۱۱۸	خدا کی کتاب مکمل اور غیر متبدل ہے۔
۱۲۰	یہ آیت پہلے آچکی ہے۔	۱۱۹	وَ اِنْ تُطِيعُوا بِالْمُهْتَدِينَ
۱۲۱	اَوْ مَنْ كَانَ يَعْمَلُونَ۔	۱۲۰	اکثریت کی تائید حق کا معیار نہیں ہو سکتی۔
۱۲۲	موت اور حیات کا قرآنی تصور۔	۱۲۱	مغربی جمہوریت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی
۱۲۳	پیغامِ انبی ہی کے لئے منفعت بخش	۱۲۲	نظامِ جمہوریت کی تاریخ۔
۱۲۴	ہو گا جو زندہ ہوں۔	۱۲۳	نظامِ جمہوریت خود اہل مغرب کی
۱۲۵	وَ كَذَلِكَ جَعَلْنَا يَمْكُرُونَ	۱۲۴	نگاہوں میں
۱۲۶	نظامِ ربوبیت کی مخالفت	۱۲۵	دنیا کس طرح قرآن کی طرف آرہی ہے
۱۲۷	اکابر مجربین کی طرف سے	۱۲۶	فَكُلُوا مِنْهَا مُؤْمِنِينَ
۱۲۸	اُن کا مطالبہ کہ اُن کی طرف	۱۲۷	ذبح کے وقت اللہ کا نام
۱۲۹	وحیِ براہِ راست ہونی چاہیئے	۱۲۸	لینا ضروری ہے
۱۳۰	فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ كَانُوا يَعْمَلُونَ	۱۲۹	جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے
۱۳۱	اسلام کے لئے شرح صدر، کفر اور منافقت کے لئے تعصب	۱۳۰	وہ حلال نہیں۔
۱۳۲	اور تنگ نظری۔	۱۳۱	وَمَا لَكُمْ بِالْمُعْتَدِينَ
۱۳۳	اس سے جس پیدا ہو جاتا	۱۳۲	حلال چیزوں میں سے وہ کھاؤ
۱۳۴	ہے۔ شکوک و اضطراب	۱۳۳	جو تمہیں پسند (طیب) ہوں
		۱۳۴	وَذَرُوا ظَاهِرًا يَقْتَرِفُونَ۔
		۱۳۵	ممنوع کے ظاہر اور باطن دونوں
		۱۳۶	سے اجتناب لازم ہے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۰	کر سکتیں جو عقل و بصیرت سے کام لیں۔	۱۲۳	{ وَيَوْمَ يَكْشُرُهُمْ... غَفِلُونَ
۱۳۱	{ وَهُوَ الَّذِي... الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ	۱۲۵	جن و انس کا اجتماع۔
۱۳۲	{ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق غیر قرآنی ہے حقوق انسانوں پر ایک دوسرے کے ہیں۔	۱۲۶	{ اَلَا مَا شَاءَ اللّٰهُ کا مفہوم۔ تباہی کی دو شرائط: ہدایت کا پہنچ جانا اور سمجھنے کی صلاحیت
۱۳۲	{ حقلہ کا مفہوم — اسلام کا معاشی نظام	۱۲۷	{ وَ اِنَّكَ لَدَرَجَاتٍ... يَّعْمَلُونَ
۱۳۳	{ حرام و حلال کی انسانوں کی مرتب کردہ فہرستیں۔	۱۲۷	درجات مطابق اعمال۔
۱۳۴	{ قُلْ لَا اَشْهَدُ... غَفُوْرًا رَّحِيْمًا	۱۲۸	{ وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ... بِمُعْجِزَيْنِ
۱۳۴	{ خدا کی حرام کردہ (چار) اشیاء کی فہرست	۱۲۸	تاقون استبدال و استخلاف قومی۔
۱۳۵	{ وَ عَلَى الَّذِينَ... قَوْمِ الْمُجْرِمِينَ	۱۲۹	{ قُلْ يٰ قَوْمِ... الظَّالِمُونَ۔ دعاوی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا ثبوت ان کے محسوس نتائج ہوتے ہیں۔
۱۳۵	{ یہودیوں پر، ان کے جرائم کی سزا کے طو پر کچھ چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں	۱۲۹	{ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ... كَانُوا مُهْتَدِيْنَ
۱۳۶	{ ہماری فقہ نے امت پر اتنی چیزوں کو حرام کیوں قرار دے دیا؟	۱۲۹	توہم پرستیاں۔ پیروں اور پرستوں کی کارستانیوں سب "خدا کے نام پر" خود ہماری حالت۔ مردوں سے متعلق رسومات: نذر و نیاز۔ عرس توہم پرست قومیں ان قوموں کا مقابلہ نہیں
۱۳۶	{ سَيَقُولُ الَّذِينَ... اَجْمَعِينَ۔		
۱۳۶	"اگر خدا کو منادور نہ ہوتا تو ہم شرک کیوں کرتے"		
۱۳۶	عقیدہ تقدیر کی تردید۔		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۳	قرآن ہی صراطِ مستقیم ہے۔	۱۳۷	۶۔ قُلْ هَلُمَّ يَعْدِلُونَ۔
۱۴۴	اسی کا اتباع، اتباعِ سنتِ رسول اللہ ہے	۱۳۸	سند صرف خدا کی کتاب ہے، فقہاء نہیں۔
۱۴۵	۴۔ ثُمَّ آتَيْنَا لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ	۱۴۰	۶۔ قُلْ تَعَالَوْا تَعْقِلُونَ۔
۱۴۶	کتابِ موسیٰ کے بعد یہ آخری کتاب (قرآن مجید)	۱۴۱	چند اہم احکام یکجا۔
۱۴۷	۶۔ اَنْ تَقُولُوا كَانُوا يَصْدِفُونَ	۱۴۲	۱۔ شرک مت کرو۔ ۲۔ وائزین کے ساتھ حسن سلوک
۱۴۸	اہل عرب کی طرف کتاب تاکہ تمام حجت ہو جائے	۱۴۳	۳۔ قتلِ اولاد کے خلاف۔ ۴۔ بے حیائی کے خلاف۔ ۵۔ قتلِ نفس
۱۴۹	بہم قرآن مجید کی عملی تفسیر کرتے ہیں۔	۱۴۴	جنسی خواہش کی بے باکی کی روک تھام
۱۵۰	۶۔ هَلْ يَنْظُرُونَ اِنَّا مُنْتَظِرُونَ	۱۴۵	دل کے ارادے سے ہو سکتی ہے
۱۵۱	تباہی سامنے آنے پر ایمان، اور ایمان بلا عمل خیر کے مقصد اور بے معنی نہیں ہے	۱۴۶	ہر انسانی جان کیساں واجب الاحترام ہے
۱۵۲	۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّ قَوْا يَفْعَلُونَ	۱۴۷	لیکن ہماری فقہ کا فیصلہ۔ عورت کی دیت مرد سے نصف
۱۵۳	دین میں فرقے پیدا کرنے والوں سے رسول اللہ کا کوئی واسطہ نہیں	۱۴۸	۶۔ وَلَا تَقْرَبُوا تَذَكَّرُونَ
۱۵۴	۶۔ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ لَا يُظْلَمُونَ	۱۴۹	دیگر احکام
۱۵۵	حسنِ عمل کی جزا دس دس گنا ہے۔	۱۵۰	۱۔ یتیموں کے مال کی حفاظت
۱۵۶	جرم کی سزا اتنی ہی زیادہ نہیں۔	۱۵۱	۲۔ ناپ تول پورا۔ ۳۔ عدل کی تاکید۔ ۴۔ ایفائے عہد
		۱۵۲	خدا و سمیت سے زیادہ مکاتبت نہیں ٹھہرتا۔
		۱۵۳	۶۔ وَاِنَّ هَذِهِ صِرَاطِي لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۴۹	فقہ کا شرعناک فیصلہ سزا بالمثل کے متعلق	۱۴۹	قُلْ إِنِّیْ هَدِیْتُ... الْمَشْرِکِیْنَ
۱۵۰	حَنِیْفًا کا مفہوم	۱۵۰	قُلْ إِنِّیْ صَلَّاتِیْ.....
۱۵۱	سب کچھ خدا کے لئے ہونا اور کرنا۔	۱۵۱	قُلْ أَغَیْرَ اللَّهِ.....
۱۵۲	اسلام اسے کہتے ہیں۔	۱۵۲	وَهُوَ الَّذِیْ.....
۱۵۳	حضور سب سے پہلے مسلم تھے۔	۱۵۳	خَلَّیْفَتِیْ فِی الْأَرْضِ۔
۱۵۴	تُسَلِّکَ کے معنی۔	۱۵۴	اختیارات سے ذمہ داریوں کی
۱۵۵	قُلْ أَغَیْرَ اللَّهِ.....	۱۵۵	پرکھ مطلوب ہوتی ہے۔
۱۵۶	رب صرف خدا ہے۔	۱۵۶	دوسرا باب
۱۵۷	قانونِ مکافاتِ عمل۔	۱۵۷	سورة الاعراف
۱۵۸	رب، اور حاکم کا باہمی تعلق	۱۵۸	آیت ۱ تا ۵۸
۱۵۹	وَهُوَ الَّذِیْ.....	۱۵۹	
۱۶۰	خَلَّیْفَتِیْ فِی الْأَرْضِ۔	۱۶۰	
۱۶۱	اختیارات سے ذمہ داریوں کی	۱۶۱	
۱۶۲	پرکھ مطلوب ہوتی ہے۔	۱۶۲	
۱۶۳	دوسرا باب	۱۶۳	
۱۶۴	سورة الاعراف	۱۶۴	
۱۶۵	آیت ۱ تا ۵۸	۱۶۵	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۶۸	کفار اپنے اچھے کاموں کا بدلہ {	۱۶۲	اقوام سابقہ پر تباہیاں -
"	اسی دنیا میں لے جیتے ہیں {	۱۶۳	تباہی کا عبرت آموز نقشہ -
"	باغی کے تمام اچھے کام {	۱۶۴	فَلَنَسْأَلَنَّ اَلْعُرْسِلَيْنِ
"	ضائع ہو جاتے ہیں - {	"	تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا کرنا -
۱۶۹	ہمارے اعمال بھی رائیگاں جاتے ہیں -	"	اُن تک پیغام پہنچ چکا ہو - اور
"	خُسران سے مراد انسانی ذات کا نقصان ہے	"	اُن میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو
"	وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ {	"	ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری {
"	تَشْكُرُونَ - {	"	جماعتِ مومنین پر عائد ہوتی ہے {
۱۷۰	نوع انسان کا تمکن فی الارض	"	فَلَنَقْصُصَنَّ {
"	زمین تمام انسانوں کے لئے ذریعہ {	۱۶۴	بَايَاتِنَا يَظْلِمُونَ
"	معاش ہے - {	۱۶۵	اعمال کے ذرہ ذرہ کا وزن ہوگا -
"	آیات کا مفہوم - (تشریح) {	"	پلڑوں کا بھاری اور ہلکا ہونا -
۱۷۱	ان آیات کی جلد دوم میں گزر چکی ہے {	"	سلسلہ ارتقاء میں ہی اصول کار فرما ہے
۱۷۲	متاع کا مفہوم -	"	سوال، معصوم ہونے کا نہیں تعمیری {
۱۷۵	اس کے اندر قرآن کا پورا معاشی {	۱۶۶	پلڑے کے بھاری ہونے کا ہے {
۱۷۵	نظام آجنا ہے - {	"	مومنین سے کبھی لغزشیں ہو جاتی ہیں -
"	قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ {	"	انتحانوں میں (PASS-MARKS) {
"	تَخْرَجُونَ {	۱۶۷	کا اصول -
۱۷۶	اسی میں مرنے اور جینے کا مفہوم -	"	لازمی مضمون میں فعل ہو جائیو اے کے {
"	يَلْبَنِي اَدَمَ {	"	باقی پرچے دیکھے ہی نہیں جاتے {
۱۷۶	لَا يُؤْمِنُونَ {	"	توحید اور ایمان بالآخرت لازمی {
۱۷۶	زیب و زینت کی چیزیں حرام نہیں -	۱۷۸	مضامین ہیں -

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۸۰	مذہب پرستوں کی اصلاح ناممکن {	۱۷۷	لیکن اُن کا استعمال حدودِ خداوندی {
۱۸۱	نہیں تو سخت مشکل ضرور ہوتی ہے {	۱۷۷	کے اندر رہنے ہوئے کرنا ہوگا {
۱۸۱	يٰۤاَيُّهَا اٰدَمَ..... الْمُسْرِفِيْنَ {	۱۷۷	ایسی جذبات تحت الشعور {
۱۸۱	زیب و زینت خدا کی راہ میں {	۱۷۷	میں پنہاں رہتے ہیں {
۱۸۱	حائل نہیں ہوتی۔ {	۱۷۸	وَ اِذَا قَعَلُوْا..... تَعْلَمُوْنَ - {
۱۸۲	اطاعتِ خداوندی زندگی میں {	۱۷۸	غلط کام دو چار نسلوں تک متواتر {
۱۸۲	حسن پیدا کر دیتی ہے۔ {	۱۷۸	چلے آئیں، تو ان کی کٹک باقی نہیں {
۱۸۳	قُلْ مَنْ حَرَّمَ..... {	۱۷۸	رہتی۔ وہ اسلاف کا مسلک بن {
۱۸۳	لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ {	۱۷۸	جاتے ہیں۔ {
۱۸۳	زیب و زینت کی چیزوں کو کون {	۱۷۸	نقدِ براور تقلید و ونوں خلافتِ قرآن ہیں {
۱۸۳	حرام قرار دے سکتا ہے ؟ {	۱۷۸	قُلْ اَمَرَ بِیْ..... تَعُوْذُوْنَ - {
۱۸۳	آرٹ اور اسلام۔ {	۱۷۹	ان سے بچنے کا طریق — {
۱۸۳	اس زندگی میں بھی جمالیات اور {	۱۷۹	احکامِ خداوندی کی اطاعت۔ {
۱۸۳	آخری زندگی میں بھی {	۱۷۹	مسجد کے معنی اطاعت کرنا۔ {
۱۸۳	حرام و حلال کی فقہی فہرستیں {	۱۷۹	پلٹ کر وہیں چلو جہاں سے {
۱۸۴	خدا کے چیلنج کا جواب {	۱۷۹	غلط راستہ اختیار کیا تھا {
۱۸۸	قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ..... لَا {	۱۷۹	پھر وہی نتائج پیدا ہو جائیں گے۔ {
۱۸۸	تَعْلَمُوْنَ - {	۱۷۹	فَرِيقًا هٰدٰی..... {
۱۸۸	خدا کی حرام کردہ اشیاء کی فہرست۔ {	۱۷۹	مُهْتَدُوْنَ {
۱۸۸	فواحش کا مفہوم۔ {	۱۸۰	دُنیا میں دو ہی گروہ ہیں۔ {
۱۸۹	وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ..... {	۱۸۰	یہی ”دوقومی نظریہ“ ہے {
۱۸۹	يَسْتَقْدِرُ مُوْن - {	۱۸۰	کھلے ہوئے ملحد اور فریب خوردہ مذہب {
			پرست

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۹۵	تکذیب - زبان سے اقرار اور عمل سے تردید۔	۱۹۰	قوم کی اہل کا مفہوم۔
۱۹۵	زمین اور آسمان کی برکات کے دروازوں کا کھل جانا۔ یعنی دنیاوی خوشحائیاں اور ہدایت خداوندی کا حصول۔	۱۹۱	بہائیوں کی غلط فہمی۔
۱۹۶	وَالَّذِينَ آمَنُوا... تَعْمَلُونَ	۱۹۱	قرآن کسی خاص مدت کے لئے نہیں دیا گیا یہ ابدی ضابطہ خداوندی ہے۔
۱۹۷	لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔	۱۹۱	اس کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔
۱۹۷	اہل جنت کے دلوں سے غل کا دور ہو جانا۔	۱۹۱	بِئْسَ نَجِیُّ الْاَدَمِ... خَلِدُونَ
۱۹۷	اُن میں کوئی بات ایسی نہ ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپا کر رکھا جائے۔	۱۹۱	بنی آدم کے ہاں محفوظ وحی کا رہنا ضروری ہے۔
۱۹۷	جنت، اعمال انسانی کے عوض۔	۱۹۱	فَمَنْ اَظْلَمُ... کَانُوا کُفْرًا
۱۹۷	انتزاع غل۔ ایک عمیق نفسیاتی عمل جس سے نحت الشعور میں پڑی ہوئی گریہیں کھل جاتی ہیں۔	۱۹۲	مفتری علی اللہ اور مکذبین دونوں مجرم۔
۱۹۹	وَنَادَى... کُفْرًا	۱۹۲	جہنم میں باز پرس
۱۹۹	اہل جنت اور اہل جہنم میں مکالمہ۔	۱۹۳	قَالَ ادْخُلُوا... کُنْتُمْ تَكْسِبُونَ
۲۰۰	دونوں کے درمیان پردہ۔	۱۹۳	جہنم میں قوموں کا مکالمہ
۲۰۱	نقاب پوش انسانی درندے۔	۱۹۴	سب کو دُکھنا عذاب
۲۰۱	مذہبی پیشوا، صراطِ مستقیم میں بیچ و خم ڈالنے والے!!	۱۹۴	إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا... الظَّالِمِينَ
۲۰۱		۱۹۵	استکبار۔ اعلائیہ سرکشی اختیار کرنا۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰۸	پیرس کے ڈاکٹر (MAURICE BUCCAILE) کی بصیرت افروز تحقیق	۲۰۱	الْعُوجُ اور الْعُوجُ میں فرق ﴿ وَمَا بَيْنَهُمَا حِجَابٌ يَطْمَعُونَ ﴾
۲۰۸	مصنف کا حقیقت کشا تعارف	۲۰۲	اہل اعراف کا مفہوم -
۲۰۸	ذوق تحقیق کیا کچھ کرتا ہے !	۲۰۲	اُمّتِ محمدیہ کے رفیع المنزل افراد -
۲۰۸	قدیم عربی زبان کی تحصیل - یہ تحقیق	۲۰۳	﴿ وَإِذَا صُرِفَتْ يَجْحَدُونَ ﴾
۲۰۹	کہ قرآن غیر محرف صحیفہ ہے -	۲۰۳-۲۰۴	اہل اعراف اور دیگر افراد کے مکالمات
۲۰۹	تبویب القرآن -	۲۰۴	اپنے دین سے مذاق کرنے والے -
۲۱۰	قرآن مجید کے مروجہ ترجموں کی کیفیت	۲۰۴	دنیاوی زندگی کی کشش کے فریب خورد
۲۱۰	قرآن، لاریب، خدا کی کتاب ہے -	۲۰۵	﴿ وَلَقَدْ جَعَلْنَاهُمْ يَفْتَرُونَ ﴾
۲۱۲	﴿ ادْعُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ الْمُجْتَدِينَ ﴾	۲۰۵	ان تک ہدایت پہنچ چکی تھی -
۲۱۳	تضرع کا مفہوم -	۲۰۵	موت کے بعد دنیا میں واپس
۲۱۳	﴿ وَلَا تَفْسِدُوا مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴾	۲۰۵	نہیں آیا جاسکے گا
۲۱۳	معاشرہ میں فساد انگیزی، ناہمواریاں	۲۰۵	سفارش (شفاعت) کسی کی نہیں چلیگی
۲۱۳	پیدا کرنے کی مخالفت -	۲۰۵	﴿ إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾
۲۱۳	﴿ وَهُوَ الَّذِي تَذَكَّرُونَ ﴾	۲۰۶	خارجی کائنات میں قانون کی کارفرمائی -
۲۱۴	وحی کی رہنمائی اور انسانی محنت،	۲۰۶	سائنس کے انکشافات کس طرح
۲۱۴	دونوں کے یکجا ہونے سے ثمرباری	۲۰۶	﴿ قرآنی آیات کی تائید کرتے ہیں -
۲۱۴	ہوتی ہے -		
۲۱۴	﴿ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَشْكُرُونَ ﴾		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۹۵	تکذیب - زبان سے اقرار اور عمل سے تردید۔	۱۹۰	قوم کی اجل کا مفہوم۔
۱۹۵	زمین اور آسمان کی برکات کے دروازوں کا کھل جانا۔ یعنی دنیاوی خوشحالیاں اور ہدایت خداوندی کا حصول۔	۱۹۰	بہائیوں کی غلط نگہی۔
۱۹۴	وَالَّذِينَ آمَنُوا... تَعْمَلُونَ	۱۹۱	قرآن کسی خاص مدت کے لئے نہیں دیا گیا یہ ابدی ضابطہ خداوندی ہے۔
۱۹۴	لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔	۱۹۱	اس کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔
۱۹۴	اہل جنت کے دلوں سے غل کا دور ہو جانا۔	۱۹۱	بَنِي آدَمَ... خَلِدُونَ
۱۹۴	اُن میں کوئی بات ایسی نہ ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپا کر رکھا جائے۔	۱۹۱	بنی آدم کے ہاں محفوظ وحی کا رہنا ضروری ہے۔
۱۹۴	جنت، اعمال انسانی کے عوض۔	۱۹۱	فَمَنْ أَظْلَمُ... كَانُوا كَافِرِينَ۔
۱۹۴	انتراع غل۔ ایک عمیق نفسیاتی عمل جس سے تحت الشعور میں پٹری ہوئی گرہیں کھل جاتی ہیں۔	۱۹۲	مفتری علی اللہ اور مکذبین دونوں مجرم۔
۱۹۹	وَنَادَى... كُفْرًا۔	۱۹۲	جہنم میں باز پرس
۱۹۹	اہل جنت اور اہل جہنم میں مکالمہ۔	۱۹۳	قَالَ ادْخُلُوا... كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ
۲۰۰	دونوں کے درمیان پردہ۔	۱۹۳	جہنم میں قوموں کا مکالمہ
۲۰۱	نقاب پوش انسانی درندے۔	۱۹۳	سب کو دگنا عذاب
۲۰۱	مذہبی پیشوا، صراط مستقیم میں بیچ و خم ڈالنے والے!!	۱۹۴	إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا... الظَّالِمِينَ۔
۲۰۱		۱۹۵	استکبار۔ علانیہ سرکشی اختیار کرنا۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۴۳	خفیہ سازشیں -	۲۵۸	تمکّن اور عقل و بصیرت دونوں حاصل تھے
۲۴۵	وَقَالُوا يُضْلِجُ..... الْمُرْسَلِينَ	۲۵۹	آیات ۴۰-۴۱ کا بقایا حصہ
۲۴۶	ناقصہ حضرت صالحؑ -	۲۶۱ وَقَطَعْنَا..... مُؤْمِنِينَ
۲۴۷	خداوندی نظام معیشت کا بنیائی مکتبہ -	۲۶۲	تباہی اور بربادی -
۲۴۸	هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ..... أَلِيمٌ	۲۶۳	سعد و نحس کا مفہوم -
۲۴۹	اللہ کی اونٹنی - اللہ کی زمین -	۲۶۴	قوم ثمود - حضرت صالحؑ
۲۵۰	تم پابندیاں لگانے والے کون ہوتے ہو؟	۲۶۵	وَادْكُرُوا..... مُفْسِدِينَ
۲۵۱	معادہ کرنے کے بعد خلاف ورزی -	۲۶۶	قوم ثمود کا تعارف -
۲۵۲	فَاخَذَتْهُمْ..... جَثِيبِينَ	۲۶۷	وَإِلَى ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا
۲۵۳	لرزہ انگیز عذاب -	۲۶۸	بعثت حضرت صالحؑ -
۲۵۴	اصحاب الرّس -	۲۶۹	ارباب اقتدار کے سرگروہ فساد
۲۵۵	فَتَوَلَّى عَنْهُمْ..... النَّاصِحِينَ	۲۷۰	کی جڑ ہوتے ہیں -
۲۵۶	حضرت صالحؑ جماعت مومنین کو لیکر	۲۷۱	اُن کی اصلاح ہو جائے تو
۲۵۷	کسی محفوظ مقام کی طرف نکل گئے تھے	۲۷۲	قوم کی اصلاح ہو جاتی ہے
۲۵۸	کوئی رسول اجر رسالت نہیں مانگتا تھا۔	۲۷۳	پیغام اولیٰں - صرف اللہ کی حکومت
۲۵۹	ناقصہ اللہ (اللہ کی اونٹنی) کیوں کہا گیا	۲۷۴	قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ...
۲۶۰	اسی طرح کشتی نوحؑ اور کعبہ وغیرہ کو	۲۷۵	كُفِرُوا -
۲۶۱	آیات اللہ کہا گیا ہے	۲۷۶	ارباب قوت کی طرف سے مخالفت
۲۶۲	آیات اللہ کی حفاظت نہ کرنے سے	۲۷۷	وہی اعتراض کہ ایک انسان کس طرح
۲۶۳	تباہی آتی ہے -	۲۷۸	رسول ہو سکتا ہے -
۲۶۴	قوم حضرت لوطؑ	۲۷۹	اسلاف پرستی -
۲۶۵	قوم لوطؑ کا تعارف -		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱۱	وَإِلَىٰ مَدْيَنَ.....	۲۹۱	وَلُوطًا إِذْ قَالَ.....
۳۱۲	الْمُفْسِدِينَ.....	۲۹۲	مُسْرِفُونَ
۳۱۴-۳۱۵	قَالَ الْمَلَأُ.....	۲۹۳	أَنْ كَا جُرْم - اغلام جیسی شرمناک فحاشی
۳۱۵	خَيْرُ الْفَاحِشِينَ	۲۹۴	علم بصیرت کے باوجود جہالت -
۳۱۵	مُسْتَكْبِرِينَ کی طرف سے مخالفت	۲۹۴	دہزنی بھی -
۳۱۶	وَقَالَ الْمَلَأُ..... الْخٰسِرُونَ	۲۹۵	وَمَا كَانَ..... يَتَطَهَّرُونَ
۳۱۷	مذہب اور سیاست -	۲۹۶	تندیر اور مخالفت -
۳۲۰	صلوٰۃ کا مفہوم -	۲۹۷	ظہور نتائج کا وقت -
۳۲۱	اسلاف پرستی -	۲۹۸	خدا کے فرستادہ -
۳۲۱	سرداران قوم کی طرف سے دھمکیاں -	۲۹۸	وَ اَمْطَرُ عَلَيْهِمْ..... الْمَجْرِمِينَ
۳۲۲	جواب: تم اپنی جگہ کام کرو۔ مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔	۲۹۹	عذاب کی نوعیت -
۳۲۳	نقیحہ خود بتا دے گا کہ کون سنی پر ہے	۳۰۰	حضرت لوطؑ کی بیوی اُن کے اہل میں سے نہیں تھی -
۳۲۳	اعتراض: تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو، پھر رسول کس طرح!	۳۰۱	حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں
۳۲۴	فَاَخَذَتْهُمُ.....	۳۰۲	دوسری طرف فرعون کی بیوی
۳۲۴	هُمُ الْخٰسِرِينَ	۳۰۳	تورات کی رو سے حضرت لوطؑ کا
۳۲۴	ظہور نتائج کا وقت -	۳۰۴	(معاذ اللہ) کردار (بیٹیوں کے ساتھ ہمبستر)
۳۲۵	فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ..... كٰفِرِينَ	۳۰۵	قوم کی عورتیں نبیؑ کی بیٹیاں -
۳۲۵	حضرت شعیبؑ وہاں سے ہجرت کر گئے تھے -	۳۰۶	حضرت ابراہیمؑ کے مہمان کون تھے؟
۳۲۵	ہجرت کر گئے تھے -	۳۰۷	قوم مدین - حضرت شعیبؑ
۳۲۵	وَمَا اَرْسَلْنَا..... لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ	۳۰۸	قوم مدین کا تعارف -

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳۱	دل مانتا ہے لیکن جھوٹی عورت کا خیال اسے تسلیم نہیں کرنے دیتا {	۳۲۵	یہ کشمکش مسلسل چلی آرہی ہے۔
۱۰۲	وَمَا وَجَدْنَا..... لَفْسِقَيْنِ۔	۳۲۶	وَلَقَدْ بَدَّلْنَا..... لَا يَشْعُرُونَ {
		۳۲۷	وہ پھر ویسی دوش اختیار کر لیتے ہیں۔
		۳۲۷	یہ کچھ محض اتفاقیہ نہیں ہوتا۔
		۳۲۸	نقدیر اور سیکورازم کے غلط نظریات
		۳۲۸	وَلَوْ أَنَّ..... يَكْسِبُونَ {
		۳۲۸	اگر وہ قوم قوانین خداوندی پر ایمان
		۳۲۸	لے آئے، تو اس پر زمین اور آسمان کی
		۳۲۸	برکات کے دروازے کھل جاتے ہیں
		۳۲۸	دین اور دنیا کا ارتباط۔
		۳۲۹	عشق اور زیر کی کامیروزہ۔
		۳۲۹	أَفَأَمِنَ..... الْخَاسِرُونَ {
		۳۲۹	لیکن قومیں ایسا نہیں کرتیں {
		۳۲۹	اور تباہ ہو جاتی ہیں۔
		۳۳۰	تباہی اُس وقت آتی ہے جب قوم {
		۳۳۰	عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دے {
		۳۳۰	أَوَلَمْ يَهْدِ..... يَسْمَعُونَ {
		۳۳۰	اُن کے جانشینوں کے لئے بھی یہی قانون ہے
		۳۳۰	تِلْكَ الْقُرَى..... قُلُوبِ {
		۳۳۰	الْكَافِرِينَ۔
		۳۳۰	اقوام سابقہ کی داستانیں اسی {
		۳۳۰	مقصد کے لئے دہرائی جاتی ہیں {
		۳۳۱	حضرت موسیٰؑ کی مدین کی زندگی۔
		۳۳۱	تنبلی گاہ طور۔
		۳۳۱	دادی مقدس طویٰ کا مجازی مفہوم
		۳۳۱	وحی و عقل کے تجرباتی طریق میں فرق۔
		۳۳۱	وحی سے منزلیں سمٹ جاتی ہیں۔
		۳۳۱	ایک عظیم انقلاب برپا کرنے کا فریضہ۔
		۳۳۱	عصا اور بد بیضا۔
		۳۳۱	اس مہم کے سر کرنے کے لئے {
		۳۳۱	حضرت موسیٰؑ کی استدعا {
		۳۳۱	زبان کی گرہ کشائی۔
		۳۳۱	تبیین و ذکر کا انقلابی مفہوم۔
		۳۳۱	ان منازل کا ذکر جن سے گزر کر {
		۳۳۱	حضرت موسیٰؑ مقام نبوت تک پہنچے {
		۳۳۱	اس طرح خدا نے انہیں اپنے ایک {
		۳۳۱	کام کے لئے تیار کیا۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴۴	فرعون بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کرتا تھا؟	۳۴۴	حضورؐ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔
۳۴۵	{ فریح انباء۔ استیحاء نساء۔ پارٹیوں میں تقسیم	۳۴۵	فرعون کی طرف جاؤ تو رویہ نرم رکھنا۔
۳۴۶	خدا بنی اسرائیل کو نوازنا چاہتا تھا۔	۳۴۶	مزید بیانات۔
۳۴۷	{ یعنی انہیں مملکت اور اقتدار عطا کرنا چاہتا تھا۔	۳۴۷	خدا کے ساتھ ہونے کا مفہوم۔
۳۴۸	خدا کی نوازش اور احسان کا مفہوم۔	۳۴۸	{ ایلانی گورنر (ہرمزان) اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ
۳۴۹	{ قَالَ اِنْ كُنْتُ لَلْظُلَمِیْنَ۔	۳۴۸	گزشتہ واقعات کا اعادہ۔
۳۵۰	فرعون کا مطالبہ۔	۳۵۵	دربار فرعون میں۔
۳۵۱	عصا۔ اڑوٹھا اور ید بیضا کا مفہوم۔	۳۵۶	{ وَقَالَ مُوسٰی بَنِي اِسْرَآءِیْلَ
۳۵۲	{ قَالَ الْمَلَاُ سَلِحُوْا عَلَیْہِ	۳۵۶	{ ایک ہی مطالبہ۔ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔
۳۵۳	فرعون کا پروگرام۔ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مناظرہ۔	۳۵۷	فرعون کا استفسار۔ تمہارا رب کون ہے؟
۳۵۴	وہی اسلاف پرستی۔	۳۵۷	اس کا جواب۔ نہایت مختصر اور جامع۔
۳۵۵	قوم فرعون کو خدشہ تھا کہ موسیٰؑ انہیں مملکت سے نکال باہر کرے گا۔	۳۵۸	سوال :- ہمارے اسلاف کس حالت میں ہیں؟
۳۵۶	اعتراض :- تم تو ہماری ہی طرح کے انسان ہو، اور تمہاری قوم ہماری محکوم ہے!	۳۵۸	پیغمبرانہ جواب۔
۳۵۷	{ محکوموں کی کوئی بات قابل اعتنا نہیں ہوتی۔	۳۵۹	ہمارا اور اسلاف کا تعلق۔
۳۵۸		۳۶۱	جواب کی مزید وضاحت۔
۳۵۹		۳۶۲	فرعون کا دعویٰ ربوبیت۔
۳۶۰		۳۶۳	اُس کا ابطال۔
۳۶۱		۳۶۳	استبداد کی دھمکی۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۹۰	حق کی فتح -	۳۷۴	حضرت موسیٰؑ پر احسانات کی یاد دہانی
۳۹۱	قَالُوا آآمَنَّا..... وَهُمْ يُؤَن		جواب: ان احسانات کا بدلہ یہ چاہتے ہو کہ
۳۹۱	ساحرین کا ایمان لانا -	۳۷۵	بنی اسرائیل کو اپنی غلامی کی زنجیروں
۳۹۱	قَالَ فِرْعَوْنُ.....		میں جکڑے رکھو -
۳۹۱	اَجْمَعِينَ	۳۷۵	دھمکی -
۳۹۱	فرعون کی شعلہ باری -	۳۷۶	عصا اور ید بیضا کی مزید تشریح -
۳۹۲	انتہائی سزا کی دھمکی -	۳۷۷	ساحرین کا مفہوم -
۳۹۳	ساحرین کے کرکٹر کی پختگی -	۳۸۱	فرعون تمسخر ہوا آیا -
۳۹۴	آیات ۱۲۶-۱۲۵ کا حوالہ -	۳۸۱	اپنی قوم میں اپنے اقتدار کا پراپیگنڈا -
	پانچواں باب	۳۸۲	یہ ملک اور اس کے ذرائع پیداوار
	آیات ۱۲۷ تا ۱۵۸		سب میری ملکیت ہیں -
۳۹۷	وَقَالَ الْمَلَأُ..... قَاهِرُونَ	۳۸۵	وَجَاءَ السَّحَرَةُ.....
۳۹۷	بنی اسرائیل کے خلاف تدابیر -		المُقَرَّبِينَ
۳۹۸	اور تشدد -	۳۸۵	مذہبی پیشواؤں کا مطالبہ کہ اگر ہم
۳۹۸	قَالَ مُوسَى.....		جیت گئے تو ہمیں کیا انعام ملے گا؟
۳۹۸	كَيْفَ تَعْبَأُونَ		انعام بھی ملے گا اور بادشاہ کا
۳۹۸	حضرت موسیٰؑ کی اپنی قوم کو تلقین -		تقرب بھی حاصل ہوگا -
۳۹۸	وراثت ارض کا قانون -	۳۸۹	تورات میں ہان کا ذکر اور حقیقت -
۳۹۹	وَأَوْسَرْنَا..... بَنِي إِسْرَائِيلَ		قَالَ أَلْقُوا.....
۳۹۹	بنی اسرائیل کو ملکیت کا وارث بنا دیا گیا -		مَا يَأْفِكُونَ
		۳۹۰	مقابلہ -
			فَوَقَعَ الْحَقُّ..... سَلْجِدِیْنِ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۰۶	وَ اَكْتُبْ لَنَا..... يَوْمَ مَمْنُونِ - ۱۵۶	۳۹۹	۱۳۰ وَلَقَدْ اخَذْنَا..... يَذْكُرُونَ
۴۰۷	حضرت موسیٰ کی خدا سے درخواست -	۴۰۰	قوم فرعون پر ہلکی ہلکی عقوبات -
۴۰۸	دنیا اور آخرت کی حسنات -	۴۰۱	فَاِذَا جَاءَ تَهُمْ..... قَوْمٌ مُّجْبِرِينَ - ۱۳۱-۱۳۲
۴۰۸	رحمت خداوندی کی وسعت بے پایاں -	۴۰۲	اُن کی طرف سے ردِ عمل -
۴۰۸	اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ..... اَلْمُفْلِحُونَ - ۱۵۷	۴۰۳	وَلَمَّا وَقَعَ..... غُفْلِينَ - ۱۳۳-۱۳۴
۴۰۸	یہ حسنات اور رحمت، اتباع محمد الرسول اللہ سے حاصل ہونگی {	۴۰۴	فرعون کی غرقابی -
۴۰۸	بعثت نبی اکرمؐ کا مقصود و مُنتہی {	۴۰۵	وَجَاوِزْنَا..... عَلَى الْعُلَمِیْنَ - ۱۳۵-۱۳۶
۴۰۸	نوع انسانی کی آزادی -	۴۰۶	بنی اسرائیل کا عبورِ دریا -
۴۱۰	کتب سابقہ میں حضورؐ کی آمد کی پیشگوئیاں	۴۰۷	اور غلامی کی نفسیات کے مظاہرے
۴۱۳	قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ..... تَهْتَدُونَ - ۱۵۸	۴۰۸	وَ اتَّخَذَ قَوْمٌ..... اَرْحَامَ الرَّحْمٰنِ
۴۱۳	تمام نوع انسان کی طرف رسول -	۴۰۹	گوسالہ پرستی -
۴۱۳	ہدایت مشروط ہے اتباع نبی اکرمؐ کے ساتھ {	۴۱۰	تفرقہ شرک سے بھی بدتر -
۴۱۳	خدا کا آخری رسولؐ -	۴۱۱	وَلَمَّا سَقَطَ..... خَسِرِينَ - ۱۴۹
۴۱۳	وَوَعَدْنَا..... اَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ - ۱۴۲-۱۴۳	۴۱۲	قوم کی ندامت -
۴۱۳	حضرت موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی {	۴۱۳	اِنَّ الَّذِیْنَ..... تَرْجِحُوْهُ
۴۱۳	کی آرزو -	۴۱۴	گوسالہ پرستی کا نتیجہ -
۴۱۳	اس کا جواب — یہ ناممکن ہے -	۴۱۵	وَ اَخْنَسَ مُوسٰی..... خَبِرُ الْغَفِرِیْنَ - ۱۵۵
۴۱۵	انسانی ذات بھی محسوس اور مرئی نہیں {	۴۱۶	قوم کی طرف سے خدا کو بے نقاب {
۴۱۵	چہ جائیکہ خدا کی ذات	۴۱۷	دیکھنے کا مطالبہ اور جواب

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۱۸	الواح حضرت موسیٰ	۴۱۶	خدا اور انسان کا باہمی تعلق۔
۴۱۸	سَاَصْرِفُ كَانُوا	۴۱۷	نبی کی بشری حیثیت۔
۴۱۸	يَعْمَلُونَ	۴۱۷	قَالَ يَمُوسَى الشَّكْرَيْنِ
۴۱۹	اس آیت کا عام اور صحیح مفہوم۔	۴۱۸	اصطفاء اور اجنباء۔
۴۲۰	استکبار (اقتدار) بغیر الحق حرم ہے	۴۱۸	وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْاَلْوَا ح {
۴۲۱	انڈکس۔	۴۱۸ دَا سَا الْفِسْقَيْنِ

منزل و مقصود قرآن دیگر است رسم و آئین مسلمان دیگر است
بندہ مومن ز قرآن بر نخورد در ایام او، نہ مے دیدم نہ درد
خود طلسم قیصر و کسری شکست خود سر تخت ملوکیت نشست
تا نہال سلطنت قوت گرفت دین او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد و گر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد و گر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش گفتار

مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں تیسری نومبر ۱۹۷۹ء میں، اور چوتھی نومبر ۱۹۸۱ء میں۔ اب اس کی پانچویں جلد پیش خدمت ہے۔ اس میں سورۃ الانعام (مکمل) اور سورۃ الاعراف کی (۱ تا ۱۵۸) آیات آگئی ہیں۔ ان کے مضامین اور موضوعات کا اندازہ فہرست سے لگ سکے گا۔ تصریفات آیات کی رو سے جو تفسیر مرتب ہوگی اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، اکثر و بیشتر وہ مضامین سامنے آئیں گے جن کی تشریح سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔ ان موضوعات کی مکرر تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی ان کا حوالہ دینا کافی ہوتا ہے۔ زیر نظر جلد میں اس قسم کے موضوعات بکثرت سامنے آئیں گے، بالخصوص داستان بنی اسرائیل اور کوائف حضرت موسیٰ کے ضمن میں۔ ان مقامات پر تشریحات کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ حوالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

فکر قرآنی کے سلسلہ میں پرویز صاحب کا مسلک حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۱) کا ہے۔ یعنی ہر طرف سے کٹ کر قرآن خالص کی فکر و تعلیم پیش کرنا۔ انہوں نے یہ آواز قریب پچاس سال پہلے بلند کی تھی اور قریب پالیس سال سے مسلسل پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ شروع شروع میں اس کی مخالفت ہوئی لیکن جوں جوں قرآنی حقائق زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں، اس مخالفت کے بادل بھی چھٹتے جا رہے ہیں اور نگہ امید دیکھ رہی ہے کہ آخر لامرہ بھی انداز فکر غالب آئے گا۔ جس وقت امت نے یہ مسلک اپنا لیا، دین کے دروازے اس پر دوا ہو جائیں گے۔ پرویز صاحب کی فکری کاوش اس باب میں بڑی حد تک مدد و معاون ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر و راز کرے اور انہیں توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل کر سکیں۔

اس جلد کی کامیوں کی تصبیح بڑی دیدہ ریزی سے کی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر پڑے تو براہ کرم اس سے ہمیں مطلع فرمادیا جائے۔ اس فکر کی نشر و اشاعت میں ہم احباب کے ہر قسم کے تعاون کے محتاج ہیں۔

آیات کا حوالہ اس جلد میں بھی حسب سابق ہے۔ یعنی متن کتاب میں اوپر سورۃ کا نمبر۔ اندکس میں الغۃ حوالہ دیوں۔ پہلے آیت کا نمبر۔ چھٹی سورۃ کی سترھویں آیت۔ والاسلام۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مطالب الفرقان

جلد پنجم



آغاز سورة الانعام (سورة ٦)

تیشہ برائیمی

- ۱۔ سنت اللہ اور کلمات اللہ
- ۲۔ انسان کے صاحب اختیار اور خدا کے صاحب اختیار ہونے میں فرق
- ۳۔ نظام اسلامی کی بنیادی خصوصیت — ربوبیت
- ۴۔ ختم نبوت کی محکم دلیل
- ۵۔ معجزات طلبی اور اس کا انکار
- ۶۔ نظام سرمایہ داری کا استیصال
- ۷۔ بیند اور موت میں فرق — نفس غیر شعوریہ
- ۸۔ اعمال نامہ جو گردن میں معلق رہتا ہے
- ۹۔ حضرت ابراہیم کی داستانِ جلیلہ
- ۱۰۔ مؤدۃ فی القربیٰ کا صحیح مفہوم
- ۱۱۔ خدا کے ہاں ”خدا ہی“ جانے کا مفہوم
- ۱۲۔ خدا کا ادراک آنکھوں سے نہیں ہو سکتا
- ۱۳۔ اہل تصوف کا پیدا کردہ الجھاؤ۔
- ۱۴۔ اقوام کی موت و حیات کا قرآنی مفہوم
- ۱۵۔ حرام و حلال کی بابت خدا کا فیصلہ
- ۱۶۔ ذبیحہ پر خدا کا نام لینا۔
- ۱۷۔ ”اگر خدا چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے“ — اس عقیدہ کی تردید

پہلا باب

سُورَةُ الْاِنْعَامِ — (۶)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۴
۱
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهٖمْ یُعَذِّبُهُمْ

کائنات کا گوشہ گوشہ اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر ہے (۱) اس میں ظلمت اور نور تاریکی اور
اجالے کی نمود بھی اُسی کے قانون کے مطابق ہوتی ہے (یہ نہیں کہ جیسا کہ مجوسیوں کا عقیدہ ہے، تاریکی
کا خدا، اہرمین ہے اور روشنی کا خدا، مزدواں ہے)۔ یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے جو توحید کا انکار کر کے
خدا کے ساتھ اوروں کو بھی برابر کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

قرآن مجید (سورہ فاتحہ) کا پہلا لفظ حمد ہے جس کا مفہوم مطالب الفرقان جلد اول (ص ۱) میں بتایا گیا ہے۔
اس میں کہا گیا ہے کہ کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذباتِ تحسین بے ساختہ
بیدار ہوں ان کے والہانہ اظہار کو عربوں کے ہاں حمد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے شرط اول یہ ہے کہ جس
شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہو وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہیئے۔ وہاں (سورہ فاتحہ میں) خدا
کی ربوبیتِ عالمینی کو وجہ حمد قرار دیا گیا تھا۔ یہاں تخلیقِ ارض و سموات کو سامنے لایا گیا ہے۔ ارض و سما (کائنات)
خدا کا کس قدر عظیم تخلیقی شاہکار ہے اس کے متعلق اندکس میں ارض و سموات - تخلیق - علماء - کائنات وغیرہ کے عنوانات
نیز جلد چہارم میں آیات ۹-۱۸۹ کے تحت دیکھئے۔

ظلمت اور نور تاریکی اور روشنی کے متعلق مطالب جلد اول ص ۲۶ اور جلد سوم ص ۴۵۲ میں تفصیل سے لکھا
جا چکا ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ ایک تاریکی اور روشنی "خارجی کائنات کی ہے۔ اور دوسری انسانی دنیا کی۔ انسانی

دنیا میں باطل تصورات اور نظریاتِ حیات کو تاریکی سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اُن سے زندگی کی صحیح راہیں روشن نہیں ہوتیں اور وحی کے عطا کردہ نظریات کو نور کم کر پکارا گیا ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ جَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ (خدا نے تاریکی اور روشنی کو بنایا۔ جہاں تک خارجی کائنات میں تاریکی اور روشنی کا تعلق ہے، اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ خدا کے متعین کردہ طبعی قوانین (تکوین شمس و قمر اور گردش یل و نہار) کے مطابق رونما ہوتی ہیں۔ لہذا جَعَلَ (اُس نے بنایا) سے مراد ہے اُس کے قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہونے والے تغیرات۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے خدا کی نازل کردہ (وحی) نور ہے۔ جو شخص اس نور سے استفادہ نہیں کرتا وہ تاریکی میں رہتا ہے، اسی طرح جیسے سورج اپنی روشنی کو عام کرتا ہے، لیکن جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے اُس پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی نور اور ظلمت خدا کے قانون کی رو سے رونما ہوتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ خارجی کائنات ہو یا انسانی دنیا، جو کچھ خدا کے قانون کی رو سے واقع ہوا اُسے خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ خواہ وہ (انسانی دنیا میں) کسی کے ہاتھوں سرانجام پائے تفصیل اس نکتہ کی مطالب جلد اول (ص ۱۸۴) میں ملے گی۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی دنیا سے متعلق امور میں جب (قرآن مجید میں) یہ کہا جائے کہ خدا نے ایسا کیا تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ خدا کے قانون کی رو سے ایسا ہوا، خواہ اس کا کرنے والا کوئی ہو۔

نور و ظلمت کے مذکورہ بالا مفہوم سے جو سیوں (پارسیوں) کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی کہ ہر من (تاریکی یعنی شیطان) اور یزدان (روشنی یعنی خدا) دو مستقل بالذات قوتیں آپس میں نبرد آزما ہیں۔ نیز خیر و شر کا مسئلہ بھی حل ہو گیا جس نے دانشورانِ عالم کو خواہ مخواہ پریشان کر رکھا ہے (دیکھئے انڈکس میں ”خیر و شر“) تخلیقِ ارض و سموات (خارجی کائنات) کی طرح انسانی تخلیق بھی خدا کا شاہکار ہے۔ اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّىٰ عِنْدَهُ ۖ ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ ۝

تاریکی اور روشنی تو پھر بھی کروں کی گردش کا نتیجہ ہے۔ خدا تو وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی اور پھر تمہاری طبعی زندگی کے لئے، ایک میعاد ٹھہرا دی۔ (افراد کی موت و حیات کے علاوہ، اقوام کی موت و حیات کے لئے بھی ایک میعاد ہوتی ہے۔ یہ میعاد قانُونِ خداوندی کے مطابق متعین

ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم اس باب میں خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کر رہے ہو۔

قانون موت و حیات | تخلیق انسان کے متعلق مطالب الفرقان۔ جلد دوم کے ابتدائی باب میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ موت و حیات سے متعلق بحث کے لئے اندکس دیکھیے اور اس سوال کے جواب کے لئے کہ ”کیا موت کا وقت مقرر ہے یا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟“ جلد چہارم۔ صفحات ۲۵۲-۲۵۳ ملاحظہ کیجئے

(طبعی دنیا میں) خواہ وہ خارجی کائنات ہو، خواہ خود انسان کی طبعی زندگی (قوانین خداوندی کے تذکرہ کے بعد اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ انسان کی ”انسانی زندگی“ میں بھی اُسی کے قوانین کا فرما ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ جو قوم ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرے گی اُس کی زندگی کی راہیں روشن ہوں گی۔ جو ان سے انکھیں بند کرے گی، اُس پر تاریکی چھا جائیگی۔

۶/۳ وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُونَ ۝

لہذا تم یہ نہ سمجھ لو کہ خدا کا قانون، خارجی کائنات تک ہی محدود ہے۔ انسانوں کی زندگی اُس کے دائرہ اثر و نفوذ سے باہر ہے (۶/۳۱-۶/۲۹)۔ کائنات میں بھی اُسی کا قانون نافذ العمل ہے اور تمہاری تمدنی اور معاشی زندگی میں بھی اُسی کا قانون۔ (۶/۲۱-۶/۲۲ ، ۶/۲۳)۔ وہ تمہاری اُن باتوں سے بھی واقف ہے جو ابھر کر سامنے آتی ہیں اور اُن سے بھی جو چھپی رہتی ہیں۔ (وہ تمہاری مضمحل اور مشہور، دونوں صلاحیتوں کو جانتا ہے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے باخبر ہے۔

ارض و سما میں اللہ | اللہ تعالیٰ کے اللہ الارض اور اللہ السماء ہونے کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول (صفحہ ۲) میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ آیت زیر نظر کے آخری الفاظ سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کوئی سانظام حیات اختیار کر لے، اُس کے نتائج (اُس کی اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ) قوانین خداوندی کے مطابق

۱۔ افراد کی مدت حیات خدا کے طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے (۶/۳۴ ، ۶/۵۶)۔ اور انہی کے مطابق عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے (۶/۳۵)۔ اسی طرح قوموں کی موت و حیات کے لئے بھی قانون مقرر ہے۔ (مدت پہلے سے مقرر نہیں۔ قانون مقرر ہے) جس کے مطابق وہ قوم اپنی زندگی کی مدت خود مقرر کرتی ہے (۶/۱۵ ، ۶/۱۳ ، ۶/۱۴)۔ جب اس قانون کے مطابق کسی قوم کی زندگی کے دن ختم ہو جاتے ہیں تو اُسے اس سے مفر نہیں ہو سکتا۔ (۶/۳۴)

برآمد ہوں گے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر قوانین خداوندی سے اعراض برتنا انسان کی غلط نگہی اور گمراہی ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝

لیکن اس کے باوجود، لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ (خدا کے کائناتی قوانین، یعنی قوانین فطرت کے تو اس درجہ قائل ہیں کہ ان پر علوم سائنس کی اتنی عظیم عمارت قائم کر رکھی ہے لیکن) جب اُسی خدا کی طرف سے، (ان کی تمدنی اور معاشی زندگی سے متعلق) کوئی قانون سامنے آتا ہے تو اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مجید اپنے انداز کے مطابق سب سے پہلے اپنی اولیں مخاطب قوم کو، اُن کی غلط روی کے انجام سے متنبہ کرتا ہے اور اپنے دعویٰ کی شہادت میں اقوام گزشتہ کے انجام کو سامنے لاتا ہے۔ ارشاد ہے:-

فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ أَلَمْ يَرَوْا كَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مِمَّا نَحْنُ لَكُمْ وَآمِرٌ سَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَاهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝

یہی کیفیت ان مخاطبین کی ہے۔ جب خدا کا وہ ضابطہ قوانین جو ٹھوس حقائق اپنے اندر رکھتا ہے، اُن کی طرف آیا تو انہوں نے اُسے جھٹلایا اور جس انقلاب کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اُس کی ہنسی اُڑانے لگے۔ لیکن کیا اس سے انقلاب رُک جائے گا؟ وہ تو آکر رہے گا!

یہ اپنی قوت اور دولت کے نشے میں مدست ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نظام زندگی جس سے انہیں اس قدر خوش حالی اور فراوانی حاصل ہے انہیں کبھی تباہی کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ لیکن کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اُن سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں جنہیں اس قدر ثروت اور سطوت حاصل تھی۔ جو انہیں بھی حاصل نہیں۔ ان پر رزق کی فراوانیوں کی بارش ہوتی تھی، اور معاشی خوش حالیوں کی نہریں بہتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے غلط نظام زندگی کی وجہ سے (جس میں عالمگیر انسانیت کی فلاح و ہیود کے بجائے، محدود مفاد پرستی کو پیش نظر رکھا گیا تھا) تباہ اور برباد ہو گئیں۔ اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

قوموں کے عروج و زوال اُن کے استبدال و استخلاف اور موت و حیات سے متعلق قوانین کے لئے اندکس

دیکھئے۔ یہاں اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے دولت (معیشت) کی فراوانی کو بھی قوموں کی تباہی کا موجب بتایا ہے جب اسے تحریبی امور کے لئے صرف کیا جائے (۲۸/۵)۔ قرآن مجید کی اولیں مخاطب قوم (قریش) کو بھی اسی قسم کی معاش کی فراوانی حاصل تھی (۱۴۹/۱) جس کے نشے میں مست ہو کر وہ عقل و بصیرت پر مبنی کسی بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے چنانچہ جب انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا تو مطالبہ کرتے کہ رسول اللہ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں۔ کہا کہ یہ بھی ان کی کٹ جھٹی ہے یہ صحیح روش زندگی سے اس لئے انکار نہیں کرتے کہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس لئے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں بات ان کی سمجھ میں تو آتی ہے لیکن چونکہ اس سے ان کے مفادات پر زور پڑتی ہے اس لئے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مخالفت تو اس لئے کرتے ہیں لیکن بائیں اور بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر کوئی لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل ہو تو ہم پھر اس پر ایمان لائیں گے۔ (۱۶۰/۹) فرمایا

﴿۶۰﴾ وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ كِتَابٍ فِي قِرطاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝

ہم نے، اپنے نظام کے حق اور ان کے نظام کے باطل ہونے کے ثبوت میں خارجی کائنات، انسانی تخلیق اور تاریخی شواہد سے ایسے واضح دلائل پیش کر دیئے ہیں کہ ان کے بعد کسی صاحب عقل و بصیرت کو اس سے مجال انکار نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم دلائل و براہین کو نہیں جانتے۔ ہمیں کوئی معجزہ دکھاؤ، نب، ہم مانیں گے۔ لیکن یہ بھی ان کی محض کٹ جھٹی ہے۔ اگر ہم ایسا کرتے کہ تم پر کوئی لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل کر دیتے جسے یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ لیتے کہ وہ سچ مچ کی کتاب ہے تو جنہوں نے نہیں مانا وہ اس پر بھی کہہ دیتے کہ یہ کھلا ہوا فریب ہے۔

معجزات طلبی اور اس سے انکار | معجزات طلبی اور اس سے انکار کے متعلق، مطالب الفرقان جلد اول (ص ۳۰۵) اور جلد سوم (ص ۲۳) پر بحث ہو چکی ہے۔

پھر فرمایا:

﴿۶۱﴾ وَقَالُوا الْوَلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّفُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِ مِمَّا يَلْبَسُونَ ۝

یہ کہتے ہیں کہ اس رسول پر کوئی ایسا فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوتا (جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں)۔ ان سے

کہو کہ فرشتے اُس وقت آیا کرتے ہیں جب قوموں کی تباہی کا وقت آجاتا ہے۔ اُس وقت ان کے معاملہ کا دو ٹوک فیصلہ ہو جایا کرتا ہے اور کسی کو اس کی مہلت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی روش میں تبدیلی کر کے اُس تباہی سے بچ جائے۔

باقی رہا ان کی طرف پیغام رسانی کا معاملہ 'سو' اس مقصد کے لئے اگر ہم (بفرض محال) کوئی ایسا فرشتہ بھی بھیجتے جو انہیں نظر آسکتا تو وہ بھی اُن کے سامنے انسانی شکل ہی میں آتا۔ اُس صورت میں یہ پھر انہی شہادت میں مبتلا رہتے جن میں اب ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا :-
 وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ۚ قُلْ لَوْ كُنَّا فِي الْأَرْضِ مِنْ مَلَائِكَةٍ يُمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ۚ (۹۵-۹۶)

(ہم جانتے ہیں کہ جب تو ان سے کہے گا کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ میں خدا کا پیغام تم تک پہنچا دوں، تو یہ تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ ذہن انسانی کے طفلانہ پن نے اسے ہمیشہ مغالطہ میں رکھا ہے کہ خدا کے رسول کو، انسانوں سے الگ کوئی عجوبہ سی مخلوق ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ) جب کبھی لوگوں کے پاس ہماری راہنمائی آتی تو ان کے اس راہ نمائی کے قبول کرنے کے راستے میں ہمیشہ یہ بات حائل رہی کہ ہدایت لانے والا دوسرے انسانوں جیسا انسان کیوں ہے۔ (فرشتہ کیوں نہیں!)

ان سے کہو کہ انسانوں کو رسول بنا کر اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ وہ انہیں انسان بتاتے ہیں، اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور سکونت پذیر ہوتے تو ہم ان کے لئے آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے (۹۶)

اس میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ رسول کا فریضہ یہی نہیں ہوتا کہ وہ منزل من اللہ، وحی کو لوگوں تک پہنچا دے۔ اُس کا فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ اس وحی کے مطابق نظام معاشرہ قائم کر کے دکھا دے۔ رسول کا یہی کارنامہ **رسول کا فریضہ** | دوسروں کے لئے اسوہ (نمونہ) کا کام دینا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رسول کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ

اسی صورت میں بن سکتی تھی جب رسول بھی انہی جیسا انسان ہوتا۔ یعنی وہ سمجھ دیتے کہ جب ایک انسان اس قسم کا نظام قائم کر سکتا ہے تو دوسرے انسان کیوں نہیں ایسا کر سکتے۔ اگر زمین پر بسنے والے انسانوں کی طرف کوئی فرشتہ (فوق البشر ہستی) رسول بن کر آتا اور یہ کچھ کر کے دکھاتا تو اُس کا یہ کارنامہ انسانوں کے لئے نمونہ کا کام دے ہی نہ سکتا۔

وہ کہہ دیتے (اور ایسا کہنے میں حق بجانب ہوتے) کہ وہ تو فرشتہ تھا جس نے ایسا کر دکھایا ہم تو فرشتے نہیں۔ ہم سے ایسا کچھ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تھی وہ حکمت جس کے مطابق انسانوں کی طرف ایک انسان ہی رسول بنا کر بھیجا جاتا تھا۔

لیکن ہم نے اس حکمت خداوندی کو ختم کر کے رکھ دیا جب یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے معجزہ تھا۔ اور اس کے بعد اس خود فریبی میں مبتلا ہو کر بیٹھ گئے کہ رسول اللہؐ نے تو ایسا کچھ معجزات کی رو سے کر دکھایا تھا۔ ہم ایسا اس طرح کر سکتے ہیں، ہمیں تو خدا کی طرف سے معجزات نہیں ملتے؟

انسان اپنی بے عملی کے جواز کے لئے کس کس قسم کے بہانے تراش لیتا ہے؟ قرآن نے اس قسم کی بہانہ تراشیں اور کٹ جھتیوں کو استہزاء سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا:۔۔۔

وَلَقَدْ اسْتَهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَخَافَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس اہم معاملہ کو سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لیتے ہی نہیں۔ یونہی ہنسی مذاق سمجھتے ہیں۔ یہ کچھ (اسے رسول!) تمہارے ساتھ ہی نہیں ہو رہا۔ تم سے پہلے بھی جس قدر رسول آئے اُن کا اسی طرح مذاق اڑایا گیا۔ جب انہوں نے اقتدار پرستوں اور مفاوطلوں سے کہا کہ تمہارا غلط نظام زندگی تمہیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے تو انہوں نے اُن کی ہنسی اڑائی۔ لیکن ان ہنسی اڑانے والوں کو اُس تباہی نے آگھیرا جس کی وہ ہنسی اڑا کرتے تھے۔

اس کے جواب میں آنا کہہ دینا کافی سمجھا کہ

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝

ان سے کہو کہ جاؤ! زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا کیا حشر ہوا جنہوں نے قانون خداوندی کو جھٹلایا تھا؟

اس کے بعد کہا کہ تم ان تاریخی شواہد سے ہٹ کر خود نظام کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ وہاں کس کا قانون اور اقتدار کا فرما ہے۔ اس کے جواب میں یہ لوگ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ اقتدار کسی انسان کا نہیں۔ خدا کا ہے (اس نقطہ کی وضاحت اپنے مقام پر کی جائے گی۔ سر دست آپ یہ حوالے دیکھ لیجئے (۲۳/۸۵)، (۲۹/۶۱-۶۳)، (۳۱/۶۵)، (۲۳/۹)، (۲۳/۸۲) لیکن آئینہ زیر نظر میں جس حقیقت پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے اس اقتدار کا مقصد اور سلسلہ کائنات کے اس نظم و نسق کے ساتھ کار فرما رہنے کا مقصود و منتہی کیا ہے؟ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ اس کے لئے آپ پہلے آیت اور

اُس کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے۔ فرمایا:

قُلْ لِّمَن مَّا فِي السَّلَاطِ وَالْأَرْضِ ط قُلْ لِلّٰهِ كُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ ط
لِيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ط الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ
فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

ان سے کہو کہ ان تاریخی شواہد کے ساتھ، نظامِ کائنات پر بھی غور کرو اور دیکھو کہ اس میں اقتدار اور قانون کس کا کارفرما ہے، اور یہ کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے یوں سرگرم عمل ہے؟ ان سے کہو کہ جیسا کہ تمہیں خود اس کا اعتراف ہے، (۲۹/۶۱)۔ یہ تمام سلسلہ، خدا کے پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اور چل اس لئے رہا ہے کہ ہر شے کو اُس کی نشوونما کا سامان ملتا رہے۔ اس لئے کہ جس لئے اُسے پیدا کیا ہے اُس نے سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا بھی اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ خارجی کائنات میں تو یہ نظام بلا روک ٹوک جاری رہتا ہے، لیکن انسان اپنی دنیا میں اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن اس کی مزاحمت کیسے روارکھی جاسکتی ہے؟ لہذا سوچو کہ اگر تم اس نظامِ ربوبیت کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاؤ تو تمہیں کھڑا رہنے دیا جائے گا؟ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور ضرور ہونا پڑے گا۔

ان حقائق کی موجودگی میں، ایسی عظیم صداقت سے انکار وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے آپ کو تباہ کر چکے ہوں۔

کہا کہ یہ کارخانہ کائنات اس حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ ہر شے کو اس کی نشوونما کا سامان ملتا رہے (رحمت کے یہی معنی ہیں۔ دیکھیے انڈکس) ایک بیج منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے لیکن خدا کا قانون وہاں بھی اس لئے کارفرما ہوتا ہے کہ اس بیج میں نشوونما پانے کی مضمحل صلاحیتیں برومند ہو کر کونسل کی شکل میں ابھرائی جائیں۔ پھر وہ پودا آہستہ آہستہ

کُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ | اپنی انتہائی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ استقرارِ حمل کے بعد عورت کا جسمانی نظام اس قدر نظم و ضبط کے ساتھ (خود بخود) مصروفِ عمل

رہتا ہے کہ جنین کو رحم کے اندر سامانِ نشوونما ملتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی پیدائش کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ

ہیں اس کی رحمت کے کرشمے! لیکن اس پہلے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ انتہائی غور و فکر کے منقاضی ہیں۔ فرمایا:

کُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ ط

لے دیگر حوالے اوپر لکھے جا چکے ہیں۔

سامان نشوونما کا مینا کرنا خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔

آپ انڈکس میں ”عالم امر“ اور ”خلق“ کے عنوان دیکھئے۔ اس میں حقیقت سامنے آجائے گی کہ عالم امر میں خدا کا تخلیقی پروگرام جس طرح طے پاتا ہے وہ (ہمارے علم و تصور کی رو سے) کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ لیکن عالم خلق کے لئے خدا نے کچھ قوانین مرتب کر رکھے ہیں جن میں خود خدا بھی کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ ان میں اکثریت تو ان کی ہے۔ جنہیں ”قوانین فطرت“ کہا جاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی انسانی زندگی — (طبعی زندگی نہیں۔ ان کی انسانی زندگی) کیلئے قوانین، وحی کے ذریعے دیئے گئے ہیں۔ ان قوانین یا احکام کے لئے لفظ کُتِبَ (یا کُتِبَ) آیا ہے۔ یعنی ایسا کرنا تم پر لازم قرار دیا گیا ہے۔ (مثلاً) کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۹)۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) وغیرہ۔ اور یہی لفظ خدا نے خود اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے جہاں فرمایا کُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ (۶/۱۲، ۶/۵۴) ”خدا نے اللہ رحمۃ کو اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔“

خارجی کائنات اور انسانوں پر خدا کا اقتدار تھا۔ اس لئے ان کے متعلق کہا کہ ”خدا نے ان پر ایسا کرنا لازم قرار دے رکھا ہے“ لیکن خدا کے اوپر تو کسی کا اقتدار نہیں تھا جو اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرتا۔ اُس نے کہا کہ ہم نے اپنے اوپر خود آپ پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اس کے لئے کہیں ”کُتِبَ“ کا لفظ آیا۔ کہیں کہا کہ حَقًّا عَلَيْنَا (۱۱/۳۱، ۱۱/۳۲)۔ کہیں اُسے اپنا ”وعدہ“ کہہ کر پکارا، اور اس وعدہ کے متعلق کہا کہ وَعْدًا لِّمَنۡ حَقَّ (۱۱/۳۲)۔ ”خدا کے وعدے پکے اور سچے ہیں“ ان کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوتی۔ (نیز ۱۱/۳۱ و دیگر متعدد مقامات)

خدا کے وعدے | ایک جگہ تو یہاں تک بھی کہ دیا کہ كَانَ عَلَىٰ سَرِّكَ وَعْدًا مَّسْئُورًا (۲۴/۲۵)

”یہ خدا کا ایسا وعدہ ہے کہ اگر کبھی تمہیں (بفرض محال) ایسا خیال گزرے کہ وہ پورا نہیں ہو رہا تو یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

الفاظ کچھ بھی کیوں نہ استعمال ہوئے ہوں۔ مفہوم سب کا یہ ہے کہ یہ ایسے قوانین ہیں جن کی خود خدا نے بھی اپنے اوپر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اس کو دیگر مقامات میں ”سنت اللہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے جو غیر متبدل ہے (مطالب القرآن جلد دوم۔ ص ۱۵۳ نیز عنوان تقدیر و مکافات عمل وغیرہ)۔ ”حکمت اللہ“ کو (LAW IN THEORY) اور ”سنت اللہ“ کو (LAW IN PRACTICE) سمجھئے۔ دونوں غیر متبدل ہیں۔

ان مقامات پر بعض سطح بین ذہنیتیں اعتراض کیا کرتی ہیں کہ خدا پر کسی قسم کی پابندی ہونے سے تودہ قادر مطلق نہیں رہتا۔ لیکن یہ اُن کی سوچ کی کمی ہے۔ آپ کو آپ کا آقا (جس کے ہاں آپ ملازم ہیں) کہتا ہے کہ تمہاری

ڈیوٹی یہ ہے کہ صبح پانچ بجے اٹھو۔ فلاں جگہ (جو یہاں سے نین میل کے فاصلے پر ہے) جاؤ وہاں یہ کام کرو اور پھر واپس آکر ناشتہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ایسا آپ کو مجبوراً کرنا پڑتا ہے۔ یہ ملازمت کی پابندی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنی صحت کی خاطر خود فیصلہ کرتے ہیں کہ آپ صبح پانچ بجے اٹھ کر سیر کے لئے جایا کریں گے اور نین میل کی سیر کے بعد آکر ناشتہ کریں گے تو یہ آپ پر جبر نہیں۔ اس سے آپ کا اختیار سلب نہیں ہو جاتا۔ اپنے اختیار سے اپنے آپ پر پابندی عائد کی ہے۔ یہی مثال خدا کی اپنے آپ پر پابندیاں عائد کر لینے کی ہے۔ اس سے اُس کے قادر مطلق ہونے پر کوئی حرج نہیں آتا۔ نہ کوئی اثر پڑتا ہے۔

اور یہی صورت خود انسان کی ہے۔ خدا نے اُس کے لئے ایک قانون مقرر کیا اور اس کے بعد کہا کہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس پر عمل کرو یا نہ کرو۔ اب اگر کوئی شخص اس پر عمل کرتا ہے تو اس پابندی سے اُس کا اختیار سلب نہیں ہو جاتا۔ اُس نے خود اپنے اختیار سے یہ پابندی قبول کی ہے۔ یہ پابندی تو بلکہ اُس کے صاحب اختیار ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ اپنے اختیار سے جس قدر قانون خداوندی کا پابند ہوتا جائے گا اُسی قدر صاحب اختیار منظور ہوگا۔
می شود از جبر پیدا اختیار۔

خدا اور انسان کے صاحب اختیار ہونے میں فرق
لیکن خدا اور بندے میں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ انسان کے لئے جب خدا نے

کَتَبَ عَلَيْكُمْ۔ ”کہا تو اُسے اس کا اختیار دے دیا کہ چاہے اس پابندی کے مطابق عمل کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ لیکن خدا نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا۔ اس نے کہا کہ ہم نے اپنے لئے جو پابندی تجویز کی ہے ہم اُس کی خلاف ورزی کبھی نہیں کریں گے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو انسان صاحب اختیار رہتا ہے اور خدا ”مجبور“

خدا کا اس قسم کا تصور آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ اور اسی قسم کا وہ چاہتا ہے کہ انسانی دنیا میں نظام قائم ہو جس میں ہر فرد اپنے اختیار و ارادہ سے قانون کی پابندیاں قبول کرے اور ان کی خلاف ورزی کبھی نہ کرے۔ اس قسم کا نظام اُس حسن و خوبی سے چلے گا جس حسن و خوبی سے نظام کائنات کا فرما ہے۔ وہاں نہ کوئی شے قانون کی پابندی سے سرتابی اختیار کرتی ہے (کہ انہیں اس کا اختیار ہی حاصل نہیں) اور نہ ہی اس نظام کا چلانے والا (خدا) اپنے اوپر عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ کس قدر قابل اعتماد ہے وہ نظام! اور اگر انسانی دنیا میں بھی اس قسم کا نظام قائم ہو جائے تو کس قدر امن و سکون کی مظہر اور برومند یوں اور شادابیوں کی پیکر ہوگی وہ زندگی! اقوام خداوندی کی

ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الْبَيْلِ وَالنَّهَارِ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝
 قُلْ أَغَيَّرَ اللَّهُ أَخْذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعَمُ
 وَلَا يُطْعَمُ ۖ قُلْ إِنِّي أَمَرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُونَنَّ
 مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

رات کی تاریکیاں ہوں یا دن کا اجالا، خدا کے لئے یکساں ہے۔ اس لئے نہ تم اُس سے بھاگ کر کہیں جا سکتے ہو، نہ اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکتے ہو۔ وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

ان سے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسے خدا کو چھوڑ کر جس نے اس عظیم سلسلہ کائنات کو پیدا کیا اور پھر ہر شے کی نشوونما کا ذمہ لیا، کوئی اور رفیق و کارساز تجویز کروں؟ اُس خدا کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو سامانِ زیست عطا کرتا ہے لیکن خود سامانِ زیست کا محتاج نہیں۔ اس لئے اُس کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے بلامزد و معاوضہ ملتا ہے۔ وہ کسی کی محنت اور مشقت کے حاصل میں سے اپنے لئے کچھ نہیں لینا چاہتا۔

یہی ہے وہ خدا جس کے متعلق مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اُس کے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کروں اور اس کی مامیت میں کسی اور کو شریک نہ کروں (۶/۱۶)

اسلامی نظام کی خصوصیت | اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہوئی کہ **هُوَ يُطْعَمُ وَلَا يُطْعَمُ**۔ وہ سب کو حسب ضرورت دے گا۔ کسی سے اپنے لئے کچھ نہیں لے گا۔

اس میں کسی قسم کی سلب و نہب نہیں ہوگی۔ **فَلَا يَخْفُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا (۲۱/۱۱)**۔ اس میں نہ کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی ہوگی نہ سلب و نہب۔ اس میں سربراہ مملکت سب سے پہلے اعلان کرے گا کہ **أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ**۔ میں سب سے پہلے ان قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں (۶/۱۶)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سابقہ میں آیت (۲۱/۱۱) کی تشریح اور انڈکس میں ”حکومت“ کا عنوان۔

یہاں کہا گیا ہے کہ رسول بھی ان قوانین خداوندی کی اطاعت کرتا تھا۔ دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ وہ مومنین کی طرح اپنی وحی پر ایمان بھی لاتا تھا (مطالب جلد سوم ص ۴۸۹)۔ وہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا اور ساتھ ہی کہتا تھا کہ

قُلْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ ابْنِ يُؤْيُوسَ عَظِيمٍ ۝
 عَنْهُ يُؤْمَذُ فَقَدْ سَرَّحَهُ طَوْذَالُكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝ وَإِنْ يَمْسُكْ

اللَّهُ بِضُرِّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُنْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ ۖ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ۝

رسول بھی قوانین سے مستثنیٰ نہیں | ان سے کہو کہیں کس طرح خدا کے قوانین سے سرکشی اختیار کرتا ہوں

جب کہ مجھے معلوم ہے کہ ظہورِ ناسخ کے وقت اُن کی خلاف ورزی

کی پاداش ایسی سخت ہوگی جس سے مجھے ڈرنا چاہئے۔ یعنی اُس کے قانونِ مکافات میں کسی کی رعایت نہیں ہو سکتی اُس کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو مجھے بھی اس کی سزا مل جائے گی۔

۱۵، ۳۹

جو شخص، اُس دن، اس عقوبت سے محفوظ رہا تو سمجھ لو کہ اُس پر خدا کا بڑا ہی فضل ہوا۔ یہ اُس کی بڑی کامیابی و کامرانی ہوگی، جو اُسے اُس کے اعمالِ حسنہ کے نتیجہ میں ملے گی۔

یاد رکھو! انسان کو جو نقصان، قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے پہنچتا ہے اُس کے ازالہ کی، اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ انسان اُسی کے قوانین کا اتباع کرے۔ یہی صورت نفع پہنچنے کی ہے۔ اس لئے کہ نفع اور نقصان کے پیمانے اُس کے قوانین کی رو سے متعین ہوتے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس کے قوانین کی زد سے کوئی شخص باہر نہیں جاسکتا۔ وہ سب پر غالب ہیں لیکن اس کا یہ غلبہ، استبداد اور دھاندلی کا نہیں۔ وہ ہر بات سے باخبر ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

شفاعت کے خلاف | شفاعت کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے اندکس)۔

یہاں ایک اور زاویہ سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ سوچئے کہ جو (بزرگ و برتر) بہتی اپنے متعلق کہے کہ اگر (بفرض محال) میں بھی معصیت کا مرتکب ہوں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا، کیا وہ یہ کرے گا کہ دوسرے معصیت کاروں کی سفارش کرے؟ انہیں اُن کے جرائم کی سزا سے بچائے؟

آیت (۱۱) میں خدا کے لئے ”قاہر“ کا لفظ آیا ہے۔ دیگر مقامات پر اُسے ”قہار“ بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے

قاہر اور قہار کا مفہوم | ہاں قہر اور قہار وغیرہ الفاظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں کئے جاتے۔ ان سے مراد جابر اور مستبد حکمران ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف یہ مفہوم منسوب کرنا صحیح

نہیں ہوگا۔ عربی لغت میں قہر کا لفظ گرفت۔ غلبہ اور اقتدار کے لئے آتا ہے۔ اس لئے خدا کے غلبہ (قہر) سے مراد اس کے قانونِ مکافاتِ کمال کی گرفت ہے جس سے نہ کوئی چھوٹ سکتا ہے نہ باہر رہ سکتا ہے۔ یہ مفہوم

اس سورہ میں ذرا آگے چل کر ان انصاف پس واضح کر دیا کہ **هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً** (۶/۶) ”وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور اس کے لئے اُس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ انسان کا ہر عمل محفوظ رہے تاکہ اُسے اس کا نتیجہ محبتنا پڑے“ خدا کے قانون مکافات کا یہی غلبہ ہے جس کی رو سے ظالموں کی جڑ کاٹ جاتی ہے اور مظلوم اس پُرسکد کا کلمہ پڑھتے ہیں (۶/۶)۔ خدا نے ابھی بھی کہا تھا کہ ”اُس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دے رکھا ہے“ اگر قہر کے عام معنی لئے جائیں تو پھر رحمت کے ساتھ قہر کیسے آسکے گا؟ لیکن ادنیٰ تدبیر سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے اپنی گرفت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی کلائی کا توڑ دینا، مظلوموں کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ اس بنا پر قبائل نے بندہ مومن کے متعلق کہا ہے کہ

قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پر شفیق (ضرب کلیم ۱۲۹)

انسانوں کا قہر | لیکن جب یہی قہر (غلبہ و تسلط) ایک انسان کا دوسرے انسانوں پر ہو تو یہ وہ فرعویت ہے۔ جس کی بزمیت کے لئے ضرب کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرعون کے جرائم کے سر قہرست ہی جرم تھا جس کی رو سے وہ کہتا تھا کہ **إِنَّا قَوْمٌ قَهَرُونَ** (۱۲/۶)۔ ”ان (بنی اسرائیل) پر ہمارا غلبہ اور تسلط ہے“ چونکہ جابر اور قہار انسان کسی دوسرے انسان پر اسی صورت میں تسلط جاتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ وہ تنہا ہے اس کا یلہ و مددگار کوئی نہیں۔ اس لئے حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے جماعت مومنین سے کہا گیا کہ **فَإِنَّمَا إِلَهُ الْكَافِرِينَ** (۹۳/۹) ”جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اُسے کچلنے کی کوشش نہ کرنا“ اسی پنج سے عرب اُس گوشت کو جسنے بھونسنے کے لئے آگ پر رکھا جائے **”لَحْمٌ مَقْمُورٌ“** کہتے تھے۔ اس سے انسانوں پر انسانوں کے قہر کی کیفیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ کسی کمزور و ناتوان کو اپنے قہر کی آگ پر رکھ کر اُسے اپنے کھانے کے قابل بنالینا اللہ ہر ایک کو اس سے اپنے حفظ و امان میں رکھے

قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً ۚ قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَأُوحِيَ إِلِيَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ لَا تُذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ ۖ إِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ إِلَهَةً أُخْرَىٰ ۚ قُلْ لَا أَشْهَدُ ۚ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ وَإِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝

چھو کہ ان حقائق کی صداقت کے لئے (جنہیں میں بیان کرتا ہوں) کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے؟ میرے اور تمہارے درمیان خود خدا کی شہادت موجود ہے۔ اُسی کا فیصلہ سب سے بہتر ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ شہادت

اور فیصلہ اس قرآن میں موجود ہے جو بذریعہ وحی دیا گیا ہے تاکہ میں اُس کے ذریعے تمہیں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد میں پہنچے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں۔ (۶۲-۶۱)

کیا تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور بھی ہے جس کے قوانین کی اطاعت کی جائے؟ ان سے کہو کہ اگر تمہارا یہی دعویٰ ہے تو میں اس کی صداقت کی شہادت نہیں دے سکتا۔ میرا دعویٰ تو یہی ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی اور ایسی ہستی نہیں جس کے قانون کی اطاعت کی جائے۔ جنہیں تم اقتدا میں خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ان سے بیزار ہوں۔

اللہ تعالیٰ اور ملائکہ وغیرہ کی شہادت کے متعلق (۶۳) میں گفتگو ہو چکی ہے۔ وہاں دیکھ لیجئے۔ اس آیت میں ایک امکانہ قابل غور ہے حضورؐ کی لسان مبارک سے کہا یہ کیا ہے کہ میری طرف قرآن وحی کیا گیا ہے (لَا نُنْذِرُكُمْ بِهِ) وَمَنْ يُلْغَمْ تَاكِمِ اس کے ذریعے تمہیں بھی متنبہ کروں اور انہیں بھی جن تک یہ بعد ازاں پہنچے۔ قرآن کریم تمام اقوام عالم کیلئے قیامت تک کیلئے ضابطہ راہنمائی ہے حضورؐ نے اپنے مخاطبین کو تو اس سے بذاتِ خود آگاہ کر دیا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ تبلیغ رسالت ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے حضورؐ ختم نبوتؐ کی ایک اور دلیل

کی اُمت کی وساطت سے جاری رہنا تھا۔ قرآن کی یہ تبلیغ (لَا نُنْذِرُكُمْ بِهِ) میں قابل غور ہے) قیامت تک جاری رہے گی۔ اسے حضورؐ ہی کی جانب سے سمجھا جائے گا۔ سورۃ الجمعہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے (۶۴) نبوتؐ حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گئی اور رسالت یعنی قرآن کریم کی تعلیم کا دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ امت کی وساطت سے ادا ہوتا رہے گا۔ اس لئے حضورؐ کے بعد کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت نہیں رہی، بالخصوص اس لئے کہ قرآن کریم مکمل بھی ہے۔ غیر متبدل بھی اور محفوظ بھی۔ ایسی کتاب کی موجودگی میں کوئی رسول آئے گا کا ہے کے لئے؟

جیسا کہ معلوم ہے رسول اللہؐ کی دعوت کی مخالفت ایک توقیرش کی طرف سے ہوتی تھی جو کسی آسمانی مذہب کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ دوسرا گروہ اہل کتاب کا تھا جن میں یہودی اور عیسائی شامل تھے۔ یہودی اس مخالفت میں زیادہ متشدد تھے۔ یہ دونوں (یہودی اور عیسائی) ایک آنے والے کے منتظر تھے جس کی علامات اور خصوصیات ان کی کتابوں میں مذکور تھیں، اور اگر تعسب کی عینک اتار کر دیکھا جاتا تو حضورؐ ان خصوصیات کے مصداق نظر آجاتے۔

یہود اور نصاریٰ کی طرف سے مخالفت

لیکن یہ لوگ سب کچھ جانتے بوجھتے اس دعوت کی مخالفت کرتے۔ یہودی اس لئے مخالفت کرتے کہ یہ مدعی نبوتؐ شاخ اسرائیل (حضرت اسحاقؑ کی اولاد) سے متعلق ہونے کی بجائے فریت اسمعیلی سے کیوں ہے؟ اور عیسائی کہتے کہ وہ آنے والا آسمان سے زندہ اترنے والا مسیح ہوگا۔ قرآن کریم نے کہا کہ صداقت کے اس انکار سے لوگ کسی اور کا نہیں خود اپنی

ذات کا نقصان کر رہے ہیں۔

۶۰ ۶۰ الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمُ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

جن لوگوں کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی، وہ اس حقیقت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں کہ یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یوں پہچانتے ہیں جیسے ماں باپ اپنی اولاد کو پہچانتے ہوں۔ اس لئے ان کا انکار حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ یہ اپنے آپ کو تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ (اور خطرات سے حفاظت تو وہی چاہتے جسے زندہ رہنے کی آرزو ہو۔ ۳۶)

اپنی ذات کے نقصان کی وضاحت کے لئے سابقہ جملہ میں آیت (۵۰) دیکھیے۔ وہ کہتے تھے کہ حضورؐ کا دعویٰ نبوت (معاذ اللہ) افتراء ہے۔ فرمایا:

۶۱ ۶۱ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝

ذرا سوچو کہ اُس سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اپنی طرف سے بات بنائے اور اُسے خدا کی طرف منسوب کر دے۔ اسی طرح اُس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا کون ہے جو خدا کے سچے قوانین کو جھٹلائے۔ یہ دونوں ظالم ہیں۔ وہ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ سچ کو جھوٹ قرار دیتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم نے (متعدد مقامات پر) ان مخالفین کو مشرک کہہ کر پکارا ہے۔ قریش تو بتوں کی پرستش کرتے تھے اس لئے وہ عام مفہوم کے اعتبار سے ہی مشرک تھے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کو الوہیت میں شریک تصور کرتے تھے۔ ان کا شرک بھی کھلا ہوا تھا۔ یہودی

مقرر تھے کہ انہیں مشرک کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ کہا کہ تم احکامِ خداوندی کے بجائے اپنے مذہبی پیشواؤں کے احکام کی اطاعت کرتے ہو۔ یہی تمہارا شرک ہے (دیکھیے مطالب الفرقان جلد دوم ص ۱۹۵)

یاد رکھیے جب بھی انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو خدا کی احکام کا درجہ دے دیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا، خواہ وہ مذہبی مقتداؤں کے احکام ہوں اور خواہ حکمرانوں کے احکام۔ ہم خود صدیوں سے اسی عملی شرک میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ہاں اطاعت کتاب اللہ کی نہیں، انسانوں کے وضع کردہ احکام کی ہوتی ہے۔ اسی قسم کے شرک کے متعلق یہ کہا :-

وَلَكُمْ تَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ لَقَوْلٌ لِّلَّذِينَ أَشْرَكُوا آيِنَ شُرَكَاءُكُمْ
الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ
رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ أَنْظِرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ
هَٰذَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

۶
۶۲-۶۴

جس دن یہ سب مغلوب و محکوم ہو کر تمہارے سامنے آئیں گے (ایاحیاتِ اخروی میں ان کے اعمال کے نتائج ان کے
سامنے آئیں گے) تو اس وقت ان لوگوں سے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک ٹھہراتے ہیں، پوچھا جائے گا کہ
بتاؤ! وہ کہاں ہیں جن کے متعلق تمہارا دعویٰ تھا کہ وہ خدا کی اختیارات میں شریک ہیں (۱۶)

شُرک سے انکار | اُس وقت اُن کے پاس کوئی بات کہنے کے لئے نہیں ہوگی، بجز اس کے کہ وہ خدا کی قسمیں
کھا کھا کر یقین دلائیں گے کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا کرتے تھے۔

اُس وقت کہا جائے گا کہ دیکھو! یہ لوگ کس طرح خود اپنے خلاف جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ
جس قدر افترا پروازیاں کیا کرتے تھے، وہ سب بے کار ثابت ہو چکی ہوں گی۔

یہ لوگ حضور کی مجالس میں آکر بیٹھتے لیکن بالکل منافقانہ انداز سے۔ اس لئے کہ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ
وَفِي أَذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا كَلَّآيَةً لَا يُؤْمِنُوا بِهَا طَحْتِي إِذَا جَاءُوكَ
يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سَاطِرُ الْأُولَىٰ ۝

۶
۶۵

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو عرض دکھاوے کی خاطر تیری طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں ورنہ خدا اور تعصب کی بنا پر ان کے
دلوں پر ایسے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ان میں بات سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ اور تکبر و نخوت کی وجہ سے اُن کے
کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ چکے ہیں کہ کوئی آواز ان کے دماغ تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ ان کی یہ حالت ہو چکی ہے کہ اگر ان کے
سامنے (دو، چار، دس نہیں) وہ تمام دلائل بھی آجائیں جن سے صداقت پہچانی جاسکتی ہے، تو یہ پھر بھی اُس پر ایمان نہ
لائیں۔ یہی وجہ ہے، کہ یہ بات بات پر تجھ سے الجھتے اور جھگڑتے رہتے ہیں۔ قرآن سے انکار کرتے ہیں اور کہتے
ہیں کہ اس میں، اس کے سوا کچھ ہی کیا ہے کہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں یہ دہراتا رہتا ہے۔

اس قسم کی آیات کی تشریح اس سے پہلے بھی کی جا چکی ہے (دیکھئے مطالب الفرقان۔ جلد اول ص ۱۶) پھر
اتنا ہی نہیں کہ یہ خود ہی قرآنی تعلیم سے اپنے آپ کو محروم رکھتے تھے۔ یہ دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے

تھے۔ یہ حمد اور مخالفت کی انتہا ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْوَنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝

اس طرح یہ لوگ، خود بھی قرآن کی راہ نمائی سے بے نصیب رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے رہتے ہیں

لیکن اتنا نہیں سمجھتے کہ اس سے ہم کسی اور کا نقصان نہیں کرتے، خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

اس کے لئے یہ لوگ ٹیکنیک کیا اختیار کرتے تھے اُس کی بابت مطالب الفرقان جلد اول ص ۱۷۳ دیکھئے

فرمایا کہ ان کی مخالفت کی شدت کا تو یہ عالم ہے لیکن بزدلی کی یہ کیفیت کہ عذاب کے سامنے آتے ہی یہ گھٹنوں کے بل جھک جائیں گے اور منتیں سماعتیں کرنے لگ جائیں گے۔ منافق ہوتا ہی بزدل ہے۔ فرمایا:

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وَقَفُوا عَلَى النَّاسِ فَقَالُوا يَلَيْتُنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ
بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ بَلْ بَدَأَ اللَّهُ مَا كَانُوا
يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ رَدُّوا عَاذُوا الْمَآئِئَةَ عَنْهُ وَإِنَّهُمْ
لَكَاذِبُونَ ۝

اس وقت تو یہ یوں بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ (لیکن اے مخاطب!) اگر تو اُس منظر کو دیکھ سکتا جب یہ تنہا ہی اور بربادی کے بہنم کے سامنے کھڑے ہوں گے اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی، تو یہ کس حسرت و یاس سے کہیں گے کہ اگر ہمیں ایک موقعہ اور دے دیا جائے، تو ہم قوائینِ خداوندی کی کبھی تکذیب نہ کریں اور اُن پر ضرور ایمان لے آئیں۔

یہ کچھ وہ اس لئے نہیں کہیں گے کہ وہ واقعی اپنی حالت بدلنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ جو کچھ وہ دوسروں سے چھپا کر کیا کرتے تھے (اور یوں مجرم ہونے کے باوجود، لوگوں کی نگاہوں میں بڑے معتبر بنے رہتے تھے) وہ بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا اور انہیں اپنے جرائم کے چھپانے کے لئے کوئی پردہ نہیں مل سکے گا۔ ورنہ اُن کی کیفیت یہ ہے کہ اگر انہیں اور موقعہ بھی دے دیا جائے تو پھر وہی کچھ کرنے لگ جائیں جن سے انہیں روکا گیا تھا۔ (ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ جب آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے اور اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو گڑگڑا، گڑگڑا کر معافیاں مانگتا ہے اور وعدے کرتا ہے کہ اگر ایک دفعہ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل ہو جائے تو آئندہ کبھی ایسا

نہیں کروں گا۔ لیکن، اس کے بعد پھر وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے۔
لہذا، یہ لوگ ایسا کہنے میں بھی سچے نہیں ہوں گے کہ اگر انہیں ایک موقع اور مل جائے تو وہ کبھی ایسا
نہیں کریں گے۔

دُنیا میں واپسی نہیں ہوگی | اس نکتہ کے متعلق کہ مرنے کے بعد اس دنیا میں دوبارہ نہیں آیا جاسکے گا،
مطالب الفرقان جلد سوم، صفحہ ۳۵-۳۳ دیکھیے۔ نیز جلد اول ص ۴۴۔

یہ تو وہ تھے جو مرنے کے بعد کی زندگی کے بہرہ نوع قائل تھے۔ لیکن دوسرا گروہ اُن کا تھا جو سرے سے
اس کا قائل ہی نہ تھا۔

وَقَالُوا إِن هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝
إِذْ وَقَفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ط قَالَ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ ط قَالُوا بَلَىٰ وَ
رَبِّنَا ط قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ قَدْ
خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ ط حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ ثَهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً قَالُوا يَحْسِرْتُنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا ۖ وَهُمْ يَحْمِلُونَ
أُوزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ط أَلَا سَاءَ مَا يَزِدُّونَ ۝

۶
۳۱-۳۹

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس لئے اگر
ہم یہاں ایسا انتظام کریں کہ کسی کی گرفت میں نہ آسکیں۔ یا گرفت میں آنے کے بعد، جھوٹ سچ بول کر مڑا
پانے سے بچ جائیں، تو پھر اپنے آپ کو جائز اور ناجائز کی پابندیوں میں کیوں جکڑے رکھیں۔ (یاد رکھئے۔

حیاتِ آخرت کے منکر | قرآن پر وہی ایمان لائے گا جو حیاتِ اُخروی پر ایمان رکھتا ہو: ۶/۳۱-۳۹

۲۴-۲۵ (۲۴)۔ یہی وجہ ہے کہ از نکابِ جرم سے انسان اِی صورت

میں لچک سکتا ہے، جب اسے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل، اور زندگی کے تسلسل (حیاتِ اُخروی) پر محکم
یقین ہو (۲۵)۔

اگر تم اس وقت کا تصور کر سکو، جب یہ ظہورِ نتائج کے وقت اپنے نشوونما دینے والے کے سامنے کھڑے
ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ بتاؤ! زندگی کے تسلسل اور حیاتِ اُخروی کا عقیدہ، حقیقت ثابتہ تھا
یا نہیں؟ تو انہیں یہ کہنے کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ ہاں! ہمارا نشوونما دینے والا اس پر شاہد ہے کہ

یہ فی الواقعہ ایک ٹھوس حقیقت تھی اُس وقت اُن سے کہا جائے گا، کہ اب اس اعترافِ حقیقت سے کیا فائدہ؟
اب تم اپنے اعمال کی مزا بھگتو جس سے تم یوں انکار کیا کرتے تھے۔ غلط روش کے نتائج، اس زندگی
میں بھی سامنے آسکتے ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ غلط نظام کی قومی اور اجتماعی تباہیاں یہیں
سامنے آجاتی ہیں۔

جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات سے انکار کرتے ہیں، وہ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ جب وہ تباہ کن انقلاب
یک لخت اُن کے سامنے آئے گا، تو وہ بصد حسرت و یاس کہیں گے کہ ہم سے بڑی تفسیر ہوئی۔ لیکن اُس
وقت ایسا کہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ اپنے غلط اعمال کے بوجھ کے نیچے دبے ہونگے۔ اور
کس قدر بُرا ہے وہ بوجھ جس سے انسان کی انسانیت یوں کچلی جائے!

وہ دنیاوی زندگی ہی کو اصل حیات سمجھتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ ط وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ
لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ط أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

یہ سب اس لئے کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ انسان کی طبعی زندگی ہی بس حقیقی زندگی ہے۔ اور اس کے تقاضوں کا
پورا کرنا ہی مقصود حیات ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ طبعی زندگی کے تقاضوں کی اہمیت کے باوجود، جب
کبھی ایسا ہو کہ ان تقاضوں میں اور انسان کی ذات کے تقاضوں میں تصادم واقع ہو جائے، تو اس وقت طبعی
زندگی کے تقاضا کو کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ اور انسانی زندگی کے تقاضا کو اس پر قربان
دنیاوی زندگی لہو و لعب نہیں کر دینا چاہیئے۔ جو لوگ تباہی سے بچنا چاہتے ہیں، اُن کے نزدیک ایسے
وقت میں، انسانی زندگی کا تقاضا، طبعی تقاضا کے مقابلہ میں کہیں زیادہ قیمتی

ہوتا ہے۔ لہذا وہ اقدارِ خداوندی کی پابندی کرتے ہیں، خواہ اس سے انہیں مادی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔
کیا ان کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آئی کہ زندگی مومن حیوانی سطح کی زندگی نہیں، اس سے بلند، انسانی سطح کی
زندگی بھی ہے اور انسانی زندگی، بہر نوع، حیوانی زندگی سے بلند ہوتی ہے۔

دنیاوی زندگی کے لہو و لعب ہونے کا مطلب، اور دنیاوی اور اخروی زندگی میں تقابل کے لئے اندکس دیکھے۔



اس کے بعد پھر حضور کو تسلی دی گئی کہ ان لوگوں کے طرزِ عمل سے آپ افسردہ خاطر نہ ہوں۔ اس کے لئے

جس کتہ کی وضاحت کی گئی ہے وہ بڑا اہم ہے اور اس کی وضاحت بڑی دلنشین ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ جو تمہاری مخالفت کرتے ہیں، تو یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے جو تمہیں اس پر ملال ہو۔ یہ قوانین خداوندی کو جھٹلاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ قوانین تمہارے یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے | نہیں، خدا کے ہیں (تم تو صرف انہیں ان تک پہنچانے والے ہو)، اس لئے یہ ان قوانین کو جھٹلاتے ہیں تو اس میں تمہارے لئے برا ماننے کی کون سی بات ہے؟ یہ موضوع اس سے پہلے بھی متعدد مقامات میں آچکا ہے (انڈکس دیکھئے)، نیز آیت (۵) کی تشریح جو سابقہ صفحات میں سامنے آچکی ہے۔ فرمایا:

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزَنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَئِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝

(اے رسول!) ہم اس حقیقت سے ناخبر ہیں کہ یہ لوگ، اس نظام کے متعلق جو باتیں کرتے ہیں، وہ تمہارے لئے سخت ملال اور افسردگی کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تجھے تو جھوٹا نہیں سمجھتے (جو یہ بات اس طرح تم پر گراں گزرے) یہ تو قانون خداوندی کو جھٹلاتے ہیں (حالانکہ ان کا دل اسے صحیح تسلیم کرتا ہے) (۲۴)۔ اس لئے ان کی باتوں سے دل برداشتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ (اگر تم کسی سے کہو کہ سنکھیا ہلک ہوتا ہے اور وہ کہے کہ نہیں یہ جھوٹ ہے۔ سنکھیا عمدہ حیات ہے۔ تو اس سے اُس کی جہالت پر افسوس تو ہو سکتا ہے، ضیق اور ملال نہیں ہونا چاہیے)

اور پھر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا کچھ ہر رسول کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے:

وَلَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا ۖ وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَنَّهُمْ نَصَرُنَا ۖ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَّبَائِ الْمُرْسَلِينَ ۝

پھر، یہ بات کوئی نئی بھی نہیں۔ تم سے پہلے بھی جو رسول آئے، اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ اُن کی پیش کردہ تعلیم کی بھی اسی طرح تکذیب ہوتی رہی لیکن انہوں نے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت استقلال اور استقامت سے اپنے پرگرام پر عمل پیرا رہے۔ اور جس قدر تکالیف مخالفین کی طرف سے پہنچتی رہیں، انہیں ہمت اور حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا، یہاں تک کہ بالآخر (ہمارے قانون کے مطابق) ہماری طرف سے نصرت آپہنچی۔

پہنچتی کیوں نہ؟ خدا کا قانون اٹل ہے۔ اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت اُن انبیاء کے احوال و کوائف سے واضح ہو جاتی ہے جن کے تذکرے (اس قرآن میں) تم تک پہنچ چکے ہیں۔

اقبال کے الفاظ میں سے

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریت پنجرہ فگن نئے

وہی فطرت اسد اللہی، وہی مرجی وہی غنتری

خدا کا اٹل قانون یہ جو کہا گیا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ — قوانینِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی — تو اس کا اعادہ متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ اور یہی دین کی اصل ہے۔

سابقہ صفحات پر آیت (۶/۱۴) کے تحت بھی اس سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں، حسب ذیل حوالے بھی دیکھئے: (۶/۱۱۴)؛ (۶/۱۴۳)؛ (۶/۱۴۴)؛ (۶/۱۴۵)؛ (۶/۱۴۶)؛ (۶/۱۴۷)؛ (۶/۱۴۸)؛ (۶/۱۴۹)۔ اور سنت اللہ کے غیر متبدل ہونے کے سلسلہ میں (۶/۱۴۷)؛ (۶/۱۴۸)؛ (۶/۱۴۹)۔ نیز مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۵۳۔ اور اس کے تحت درج کردہ حوالے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو رک جو لوگ عقل و فکر سے کام لے کر قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں، وہ کسی طرح بھی اس دعوت کو قبول نہیں کریں گے) ایک اور انداز سے سمجھایا گیا۔ فرمایا:

وَإِنْ كَانَ كِبَرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلْمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَى فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝

ان لوگوں کی طرف سے اس قدر مخالفت کے باوجود تم اس غم سے بے حال ہو رہے ہو کہ یہ صحیح راستے کی طرف کیوں نہیں آتے؟ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں؟ لیکن تم لاکھ غم کھاؤ اور ہزار افسوس کرو، یہ پھر بھی صحیح راستے پر نہیں آنے کے۔ اگر تم ایسا کر سکو تو زمین میں کوئی سُرنگ لگا کر (پاتاں تک جا پہنچو)۔ یا آسمان میں سیڑھی لگا کر عالم بالا تک پہنچ جاؤ۔ اور وہاں سے کوئی ایسا معجزہ لے آؤ جس سے اُن کی تسلی ہو جائے تو یہ اس پر بھی ایمان نہیں لائیں گے (۶/۱۴۷)۔ (تمہاری یہ آرزو کہ لوگ صحیح راستے پر آجائیں، تمہارے خلوص اور انسانیت کے ساتھ تمہاری گہری ہمدردی کی دلیل ہے)، لیکن انہیں زبردستی صحیح راستے پر لانے کا سوال نہیں۔ اگر انسان کا اختیار دار ارادہ سلب کر کے، سب کو ایک طریق پر چلانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے ایسا کرنا

معجزات میں کیا مشکل تھا؟ (۶/۱۴۷)۔ لیکن اُس کی مشیت یہ ہے نہیں۔ وہ انسان کا اختیار

نہیں چھیننا چاہتا۔ یہ ہے اس کی وجہ۔ سو تم اُن لوگوں میں سے نہ ہو جانا جو حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ اللہ نے تمام انسانوں کو نیک ہی کیوں نہ بنادیا !

اس موضوع کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد اول صفحہ ۳۱۲ - ۳۰۹ پر ہو چکی ہے، جہاں زیر نظر آیت بھی درج ہے۔ اس کے بعد کہا:

إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْعَوْنَ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝

ہم نے ہدایت اور گمراہی کے لئے قانون یہ مقرر کر دیا ہے کہ جو شخص عقل و بصیرت سے کام نہیں لے گا، اس پر حقیقت مشتبہ رہے گی (پہ)۔ اس کے برعکس، جو بات کو دل کے کانوں سے سنے گا، وہ اس پر لبیک کہے گا۔ باقی رہے وہ جو بے حس ہیں، تو وہ آہستہ آہستہ بیدار ہوں گے، اور رفتہ رفتہ دین خداوندی کی طرف آئیں گے۔ [اس کے لئے تمہیں بڑی استقامت سے کام لینا ہوگا (پہ)]۔ لیکن جو لوگ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ختم کر چکے ہوں، اور خدا اور تعصب کی بنا پر سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوں، وہ تباہ ہو جائیں گے (پہ)۔

یہ موضوع بھی اس سے پہلے آچکا ہے۔ حوالہ کے لئے انڈکس میں ”عقل و فکر“ کا عنوان دیکھیے۔ مندرجہ بالا مفہوم میں آیت (پہ) کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی تشریح کے لئے مطالب الفرقان جلد سوم (صفحات ۴۶۱ - ۴۵۸) دیکھیے، اور آیت (پہ) کی تفسیر کے لئے جلد اول (صفحات ۱۵۸ - الآخر)

اس کے بعد ان لوگوں کے اس اعتراض کو پھر دہرایا گیا کہ رسول معجزات کیوں نہیں دکھاتا؟
وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنْزِلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

ان (کٹ مچتی کرنے والوں) کا اعتراض یہ ہے کہ خدا اپنے رسول پر کوئی نشانی (حسی معجزہ) کیوں نہیں نازل کرتا ان سے کہو کہ حسی معجزات کا رد و ناکردنا خدا کے لئے ناممکن نہیں، لیکن انہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ خدا چاہتا ہے کہ تم اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر غلط اور صحیح میں امتیاز کرو۔ وہ تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر کے تم سے حقیقت منوانا نہیں چاہتا۔

معجزات کے متعلق انڈکس دیکھیے، اور اس نکتہ کی وضاحت کے لئے کہ خدا کا قادر مطلق ہونے کے باوجود

اپنے قوانین کے خلاف نہ کرنا، آیت (۶/۳۷) کے تحت سابقہ صفحات دیکھیے۔

معجزات طلبی | معجزات دکھا کر کسی کو اپنی دعوت (اسلام) کا قائل کر لینا، اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لینے کے مترادف ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے اگلی آیت میں دو قسم کی مخلوق کا ذکر کیا گیا۔ انسان کے سوا کائنات کی جملہ مخلوق کو اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے جو ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ اور دوسرے، انسان جسے صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ قوانین دونوں کے لئے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ایک نوع ان کی اطاعت پر مجبور ہے۔ دوسری نوع کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کی اطاعت کرے، اور چاہے ان سے انحراف برت لے۔ نتائج بہر حال ان کی روش کے مطابق مرتب ہوں گے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا ظَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثًا
لَكُمْ مِمَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ شَمَّ إِلَى رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝

یہ طریق کار (کہ سب کو مجبوراً ایک ہی راستے پر چلایا جائے) خارجی کائنات میں اختیار کیا گیا ہے۔ تم دیکھو کہ جس قدر زمین پر چلنے والے ذی حیات ہیں، یا فضاے آسمانی میں اڑنے والے پرندے، طبیعی تخلیق کے اعتبار سے، وہ بھی تمہارے ہی جیسی انواع ہیں۔ ان کے لئے ہم نے کتاب فطرت میں تمام قوانین مکمل طور پر رکھے ہیں (یہی صورت انسانی راہنمائی کے لئے قرآن مجید کی ہے) اور وہ سب کے سب، بلا چون و چرا اپنے پروردگار کی طرف سے دی ہوئی راہنمائی کے گرد جمع رہتے ہیں۔ اُس سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹتے۔

(۲۴)۔ یہ اس لئے کہ انہیں اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ مجبور پیدا کیا گیا ہے۔

اس آیت میں ایک ایسا عظیم دقیق نکتہ ہے جسے سائنسدان ہی (APPRECIATE) کر سکتے ہیں۔ کہا کہ کرؤاض پر پھیلے ہوئے ذی حیات تمہاری ہی قسم کی انواع ہیں۔ مطالب الفرقان (جلد اول) میں بیان کردہ نظریہ ارتقاء پر غور کیجئے۔ اس کی رو سے سائنس کا انکشاف یہ ہے کہ زندگی کی ابتداء ایک جرثومہ جیات سے ہوئی۔ پھر وہ ارتقائی منازل طے کرتی اور آگے بڑھتی ہوئی پکیر انسانی تک پہنچی۔ اس سلسلہ میں جس قدر ذی حیات انواع وجود میں آئیں، وہ شکل و سیئت میں الگ الگ ہیں، لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے

نظریہ ارتقاء | کی مثل ہیں۔ آیہ زیر نظر میں ”أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ“ کے الفاظ آئے ہیں۔ احمہ کا لفظ جمع ہے امت کی اور امت کا مادہ احم ہے جس کے لغوی معنی ”ماں“ ہیں اور مجازی معنی اصل اور بنیاد۔ نظریہ ارتقاء کے مشکشف، ڈارون نے اپنی جس کتاب میں اس نظریہ کی وضاحت کی ہے اس کا نام ہے (ORIGIN OF SPECIES)

”اصل انواع“ آپ غور کیجئے کہ یہ الفاظ کس طرح ”أَمْثَلُكُمْ“ کی تشریح کرتے ہیں، یعنی اپنی اصل اور منج کے اعتبار سے یہ تمام انواع تمہاری ہی مثل ہیں۔

اس کے بعد بتایا کہ ان انواع کے لئے قوانین فطرت متعین کئے گئے ہیں جو صحیفہ کائنات میں بکھرے پڑے ہیں، اور انسانوں کے لئے یہ قوانین بذریعہ وحی عطا کئے جو (اب) قرآن کریم کی دقتیں میں محفوظ ہیں۔

اول الذکر اس مرکز پر جمع ہونے کے لئے مجبور ہیں :

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمُّوا وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ ۚ مَن يَشَاءِ
اللَّهُ يُضْلِلْهُ ۖ وَمَن يَشَأْ يُجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

(لیکن انسان کی حالت اُن سے مختلف ہے۔ اسے عقل و فکر دے کر، صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو عقل و فکر سے کام لے کر، خدا کی راہنمائی اختیار کر لیتے ہیں۔ باقی) عقل کے دیئے گئے کر کے اُسکے قوانین کو جھٹلاتے رہتے ہیں، اور یوں بہرے اور گونگے بن کر، جہالت اور تعصب کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

انسانوں کے لئے یہی خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ سو جو شخص اس قانون کے مطابق، غلط راستہ اختیار کر لے، وہ غلط راستے پر رہتا ہے۔ اور جو صحیح راستہ اختیار کرنا چاہے، اُس کے سامنے زندگی کی سیدھی اور توازن بدوش راہ آجاتی ہے۔

اس کے بعد تین آیتوں میں انسان کی اس مضطربانہ اور عاجلانہ ذہنیت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جب یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو خدا کو پکار پکار کر یاد کرنے لگتا ہے، اور

جب وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو پھر اسے فراموش کر دیتا ہے۔ انسان کی اس قسم کی ”خدا پرستی“ کے متعلق کہیں کہا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۚ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ ۚ قَلِيلٌ ۚ (۲۳)۔ ”ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کی ہدایت اس طرح اختیار کرتے ہیں گویا کنارے پر بیٹھے ہیں۔ اگر خدا پرستی سے مفاد حاصل ہوتے ہیں، تو خدا پرست ہیں۔ اگر کوئی مصیبت آجاتی ہے، تو منہ پھیر کر دوسری طرف چل دیتے ہیں“ ایسی روش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ (۲۴)۔ ”دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ، اور یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں“ اور کہیں کہا کہ هٰذَا بَيْنَ بَيْنٍ ذَٰلِكَ قَاطِعٌ ۚ اِلٰی

هُوَ لَآءٍ وَلَا إِلَىٰ هُوَ لَآءٍ (۳۳) نہ کیسو ہو کر اس طرف، نہ کیسو ہو کر اُس طرف۔ مکھی کی طرح بھنبھناتے اور منڈلاتے ہوئے، یاد رکھئے! دین بھی کیسوئی کا نام ہے اور کفر بھی کیسوئی کا۔ یہ بین بین کی روش منافقین کی ہوتی ہے جن کا ٹھکانہ جہنم کا سب سے نچلا درجہ بنایا گیا ہے۔ حتی پرستی کے ساتھ سودا بازی کرنا، منافقت ہے۔ اس مضمون کو اگلی تین آیتوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

قُلْ أَمَرَ أَتَكُفُّونَ ۖ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ وَتَتَسَوَّنَ مَآثِرُكُمْ ۚ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَآخَذْنَا مِنْهُمُ بِالْبَاسِ ۚ إِنَّهُمْ وَالضَّالِّينَ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ۚ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَٰكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ خدا کے علاوہ اور قوتیں بھی اختیار و اقتدار رکھتی ہیں، تو جس وقت کوئی طبعی آفت (آندھی، سیلاب، وبا وغیرہ) آتی ہے، یا کوئی تباہ کن انقلاب برپا ہونے لگتا ہے، تو تم ان قوتوں کو اپنی مدد کے لئے کیوں نہیں پکارتے؟ (بے ساختہ) خدا ہی کو کیوں پکارتے ہو؟ اُس وقت تم ان تمام قوتوں کو بھول جاتے ہو۔ پھر وہ مصیبت بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق رفع ہوتی ہے۔ (لیکن اس کے بعد تم، قانون خداوندی کو پس پشت ڈال کر پھر غیر خدائی قوتوں کے پیچھے چلنے لگ جاتے ہو)۔ (اے رسول!) یہ کچھ تمہارے ساتھ ہی مخصوص نہیں، شروع سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ تم سے پہلے بھی ہم، دیگر اقوام کی طرف، اپنے پیغامبر بھیجتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عام مصیبتوں اور تکالیف میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ابتدائی تنذیر ہوتی ہے تاکہ لوگ محتاط ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر کے، قانون خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔

لیکن اس تنذیر سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے، ان کے دل اور زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات اُن کے کاروبار کو اُن کی نگاہوں میں بڑا خوش نما بنا کر دکھاتے، دوران سے کہتے کہ

جس کام میں اس قدر جلد اور آسانی سے مفاد حاصل ہو رہے ہوں، انہیں چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگلی آیت میں تاریخ انسانیت کے ایک اہم گوشے کو سامنے لا کر بتایا گیا ہے کہ قوموں کی تباہی کے بنیادی اسباب کیا ہوتے ہیں۔ سورۃ النحل میں کہا گیا ہے کہ جب کوئی قوم انعاماتِ خداوندی (زندگی کی مرفہ الحالی اور رزق کی فراوانی) سے کفر برتنی ہے، اور نظامِ خداوندی کے بجائے اپنا خود ساختہ نظام قائم کر لیتی ہے تو فَإِذَا أَقْبَسَ اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ (۱۱۲) اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ یعنی قوموں کی تباہی کا ایک سبب، رزق کی تنگی، معاشی بد حالی، مفلسی، غریبی، محتاجی، اپنی روٹی کے لئے بھی گداگری ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف کہا کہ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا (۲۸)۔ ”کتنی قومیں ایسی تھیں جو دولت و ثروت کی فراوانی کی وجہ سے تباہ ہو گئیں“۔

قوموں میں بعض زرائم اور جرائمِ مفلسی اور بد حالی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض جرائم، دولت کی فراوانی کے نشہ کی وجہ سے۔ اول الذکر معائب کو اگر فالج سے تعبیر کیا جائے تو ثانی الذکر کو سرسام قرار دیا جائے گا۔ تباہی بہر حال دونوں قسم کے معائب سے واقعہ ہوتی ہے۔ قرآن کریم ایسا متوازن اقتصادی نظام عطا کرتا ہے جس میں نہ کوئی شخص مفلسی اور محتاجی کا فالج زدہ ہوتا ہے، اور نہ ہی کوئی دولت کی فراوانی کے سرسام میں مبتلا۔ قوموں کی اس قسم کی تباہی کے متعلق کہا:

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ طَحَّتْ إِذَا
فَرِحُوا بِمَا آوَتْوُا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ۝

انہیں یہ مفاد عاجلہ حاصل اس لئے ہونے کہ ہمارا قانون مکافاتِ عمل، عمل اور اسکے نتیجہ کے ظہور میں، ہدایت کا وقفہ رکھتا ہے، اس لئے انسان کی غلط روش سے یہ نہیں ہوتا کہ وہ فوراً تباہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ لوگ خدا کے قانون کو پس پشت ڈال دیتے، لیکن اس کے باوجود، اُن پر سامانِ زیست کے دروازے کھلے رہتے (۲۸)۔ وہ اسی طرح، قوت اور دولت کے نشہ میں بہست ہوتے چلے جاتے، اور اس کے ساتھ ہی، اُن کی غلط روش کے تباہ کن اثرات بھی آہستہ آہستہ جمع ہوتے رہتے، تا آنکہ اُن کے ظہور کا وقت آ جاتا، تو وہ قوم، اپنی توقعات کے یکسر خلاف، گرفت میں آ جاتی۔ اور ان پر ایسی تباہی آتی کہ اُن کی باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔ رزق کے دروازوں کا ایک طرح کھلنا، قوانینِ خداوندی کی اتباع سے ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ زمین و آسمان کی

برکات سے متنع ہونا ہوتا ہے۔ وَكُوَانُ أَهْلِ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقُوا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ - (۶/۹۶)۔ اور دوسری طرف یہی دروازے، قوانینِ خداوندی کو فراموش کرنے سے کھلتے جاؤ ذرائع سے فراوانی رزق | ہیں، جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ رزق وہی ہوتا ہے۔ اس کا مضر نتائج بدل دیتا ہے۔ رزق فروع انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے ہو تو نتیجہ تعمیر و تحسین۔ ذاتی یا گروہی ملکیت کے لئے ہو، تو نتیجہ تباہی اور بربادی۔ کس نوعیت کی تباہی اور بربادی؟ اس کے لئے آپ نے شاید آیت کے آخری الفاظ پر غور نہیں فرمایا۔ فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ۔ ایسی تباہی جس سے وہ زندگی کی باز آفرینی کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں! اپنے مستقبل کی طرف سے مایوسی، شدید ترین عذاب ہوتا ہے اگر پودا اوپر سے خشک ہو گیا ہے لیکن اس کی جڑ ثابت ہے تو اس کی بار دیگر سرسبزی و شادابی کی امید ہو سکتی ہے۔ لیکن جس پودے کی جڑ کاٹ جائے، اُس کی حیات نو کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ہے۔ ایسی ہی قومیں زندگی کی باز آفرینی کی طرف سے مایوس ہوتی ہیں۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۶/۴۵)

اس طرح اس قوم کی جڑ کاٹ جاتی جو دوسروں کے حقوق کو غصب کر کے انسانیت پر ظلم اور زیادتی کرتی تھی۔ جب ان کی تباہی سے نظامِ ربوبیت کی راہ میں حائل ہونے والے موانع دور ہو جاتے، تو وہ نظام، دنیا کے لئے درجہ ہزار حمد و ستائش بن جاتا۔ اس طرح یہ تخریبی مرحلہ تعمیری منزل کا پیش خیمہ بن جاتا۔ یہی ہمارا قانون ہے یہاں ہر تعمیر سے پہلے تخریب ہوتی ہے۔ حق کے نظام کے متمکن ہونے کے لئے، باطل کے نظام کی شکست و ریخت ضروری ہے۔ جب تک ظالم کی جڑ نہ کاٹے، مظلوم کی کھیتی ہری نہیں ہوتی (ظالم کی تباہی پر مظلوم بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین)۔ کس قدر مرزا و احمد سے خدا کا عالمگیر نظام ربوبیت؟

آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے کس مقام پر الحمد للہ رب العالمین کہا ہے؟ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے قرآن کریم (سورہ فاتحہ) کا آغاز ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے، نظامِ خداوندی کا مقصود و منتہی، ربوبیتِ عالمی ہے جو درجہِ حمدیت ہے۔ جو عناصر اس ربوبیت کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، اُن کا راستہ سے ہٹا دینا عالمگیر انسانیت کے لئے جشنِ مسرت منانے کی تقریب ہوگی۔ ظالم کی جڑ کاٹ جانے پر ہر مظلوم کی زبان پر بے ساختہ آئے گا کہ الحمد للہ رب العالمین

اور ان میں سے ہر ایک پکاراٹھے گا

مرگ تو اہل جہاں را زندگی ست

باش تا مہنی کہ انجام تو چیست؟

عالمگیر ربوبیت کا راستہ روکنے والے، سرمایہ داروں سے جب کہا جائے کہ تم اس قدر مال و دولت کے واحد مالک کس طرح بن بیٹھے ہو، تو وہ (قارون کے الفاظ میں) جواب میں کہتے ہیں: اِنَّمَا اُوْتِيتُهُ عَلٰی

نظام سرمایہ داری کی تر وید

یہ میری ذاتی صلاحیتوں کا حاصل کردہ ہے۔ اس میں کسی اور کو دخل دینے کا کیا حق حاصل ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ذہنیت کسی ایک قارون تک محدود نہیں۔ دنیا کے ہر سرمایہ دار کی یہی ذہنیت ہوتی ہے۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (۳۹)۔ اور یہی ذہنیت ساری خرابیوں کی جڑ اور فسادِ آدمیت کی بنیاد ہے۔ حصول

علم کا ذریعہ سماعت و بصارت (حواس) ہیں۔ انہی سے اکتسابِ رزق کی صلاحیت ترتیب پاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے یہ پوچھو کہ یہ ذرائع حصولِ علم تمہاری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہیں یا تم نے کسی سے خریدے ہیں؟ یہ تو

خدا کے عطا کردہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نُّعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (۱۴)۔ یہ سب نعماء خداوندی ہیں جو انسان کو بلا مزہ و معاوضہ عطا ہوتی ہیں، لہذا اس کی رُو سے حاصل کردہ مال و دولت کا انسان واحد

مالک، نہیں ہو سکتا۔ یہ اسباب و ذرائع خدا کے عطا کردہ ہیں اور انسان کی صرف محنت ہے۔ لہذا اس کے ماحصل میں سے وہ صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ [لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی] (۵۳)

باقی سب خدا کا ہے جسے اُس کے حکم کے مطابق ضرورت مندوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ (تفصیل ان امور کی قرآن کے معاشی نظام کے تحت ملے گی جسے اندکس میں دیکھ لیجئے)۔ یہاں اس مکتبہ کی وضاحت اس انداز سے کی:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَعْيَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوبِكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِ اللّٰهِ يٰۤاَيُّهَا رَبِّهِ اُنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصُدُّوْنَ ۝

ان تاریخی شواہد کو سامنے لانے کے بعد، ان سے پوچھو کہ تم عوام کے حقوق کو یہ سمجھ کر غصب کرنے ہو کہ تم عقل و فکر میں اُن سے بڑھ کر ہو، اس لئے تمہیں حق پہنچتا ہے کہ تم، فکر و ذہن سے اُن کا سب کچھ چین جھپٹ لو۔ لیکن یہ بتاؤ کہ عقل و فکر کی تمام صلاحیتیں دی ہوئی کس کی ہیں؟ یہ نہ تو تمہاری خود پیدا کردہ ہیں، نہ تم نے انہیں کہیں سے خریدے۔ یہ تمہیں خالقِ قدرت کی طرف سے ملی ہیں، اگر وہ سمع و بصر و قلب کی ان صلاحیتوں کو سلب کرے، تو کیا کوئی اور قوت ایسی ہے جو ان صلاحیتوں کو تمہیں پس

دیدے؟ ہم کس طرح مختلف دلائل و براہین کو پھیر پھیر کر ان کے سامنے لاتے ہیں، لیکن، یہ اس کے باوجود، حق و صداقت سے منہ موڑے رکھتے ہیں۔

اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے وہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ قوموں کی تباہی ہوتا ہے۔

﴿قُلْ أَرَأَيْتُكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الظَّالِمُونَ ۝﴾

ان سے پوچھو کہ اگر وہ تباہ کن انقلاب تم پر اچانک آجائے۔ یا اُس کی علامات قبل از وقت ابھر کر تمہارے سامنے آجائیں، تو اس سے تمہاری ہلاکت ہوگی یا کسی اور قوم کی؟ ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ جو قوم دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتی ہے، وہ ہلاک ہو کر رہتی ہے، اور چونکہ تم ایسا ہی کرتے ہو، اس لئے تمہارے سوا اور کون سی قوم ہلاک ہوگی؟ اس انقلاب میں تمہاری ہی تباہی اور بربادی ہوگی۔



اس حقیقت کو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا۔ تو یہ نہیں کر اسے بتایا نہ گیا ہو کہ زندگی کی کامرانیوں اور خوشگوار یوں کی راہ کون سی ہے، اور تباہیوں اور بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ کونسا ہے اس مقصد کے لئے اُس نے بشتِ انبیاء کرام کا سلسلہ جاری کیا تھا:

﴿وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ ۚ فَمَنْ أَهْتَفَ فَلَآ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يُمَسِّحُهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝﴾

ہمارا قانون جو پیغمبروں کی وساطت سے بھیجا جاتا ہے، ہر دو نظام ہائے زندگی کے نتائج کو کھلے طور پر بیان کر دیتا ہے۔ صحیح نظام کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں۔ غلط نظام کا تال، تباہی اور بربادی۔

اس کے بعد، جو قوم صحیح روش زندگی اختیار کر لیتی ہے، اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، جو قوم ہمارے قوانین کو جھٹلا کر غلط روش زندگی پر مہر رہنمی ہے، اُس پر تباہی اور بربادی کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ بے راہ روی کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

اس نکتہ کو پھر سمجھ لیجئے کہ حضراتِ مرسلین من اللہ کا فریضہ، رسالت (پہنچاوت) خداوندی کو انسانوں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ خدا نے نوح انسانی تک جو آخری پیغام پہنچانا تھا، وہ قرآن کریم میں مکمل کر دیا گیا۔ اسے غیر متبدل قرار

دیا گیا، اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اس لئے نبی اکرمؐ کے بعد کسی نامور من اللہ کے آنے کی ضرورت نہ رہی۔ اسے ختم نبوتؐ کہا جاتا ہے۔

واضح راہ نمائی قرآن کریم نے ایمان و اعمال صالح اور دوسری طرف تکذیب رسالات خداوندی کے حواقب کو ایسی محسوس شکل میں واضح کر دیا ہے کہ ان کی روشنی میں کوئی قوم اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھ سکتی کہ وہ ایمان و اعمال صالح کی پابند ہے یا تکذیب و کفر کی حامل۔ ایمان و اعمال صالح کا نتیجہ خوف اور حزن سے مامونیت اور تکذیب و فسق کا نتیجہ تباہی اور بربادی۔ سو ہر قوم اپنی حالت سے اندازہ کر سکتی ہے کہ وہ مومن ہے یا فاسق۔

انبیاء کرامؑ کا فریضہ یہ تھا کہ وہ غلط اور صحیح راستے میں امتیاز کر کے دکھائیں، لیکن محسوسات کے خوگر انسان مطالبہ کرتے تھے کہ وہ انہیں کوئی معجزہ دکھائیں۔ یہ منشاء خداوندی کے خلاف تھا کہ انسان کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اسے مجبوراً ایک خاص راستہ پر چلایا جائے۔ اس لئے اس مطالبہ کو مسترد کیا جاتا رہا۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد اول صفحہ ۳۰۹ اور جلد سوم صفحہ ۲۳ پر گزر چکی ہے۔ (نیز سابقہ صفحات میں) یہاں بھی اسی کو دہرایا گیا ہے۔ فرمایا:

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَ

الْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ۝

(ان سے کہہ دو کہ میں بھی، انبیاء سابقہؑ کی طرح، تمہیں یہی بتانے کے لئے آیا ہوں کہ کونسی روش کا نتیجہ کیا ہوگا)۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں، یا یہ کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ یا میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تمہارا ہی جیسا ایک انسان ہوں، اور جو کچھ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے، اُس کا اتباع کرتا ہوں۔ اور اس کی روشنی میں، اپنی آنکھوں سے دیکھ کر راستہ چلتا ہوں۔ اُس کے برعکس، تم نہ وحی کا اتباع کرتے ہو، نہ عقل و فکر سے کام لیتے ہو۔ بس اپنے اسلاف کے راستے پر آنکھیں بند کئے چلے جا رہے ہو۔

مجھے بتاؤ کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا، دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے؟

بہینا اور اندھا برابر نہیں ہو سکتے یہاں دو لفظوں میں بات نکھار کر بیان کر دی۔ یعنی عقل و فکر سے کام لینے والا بہینا، اور توہم پرستی اور جہالت پر اصرار کرنے والا اندھا۔ پوچھا کہ بتاؤ کہ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ سو جب یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے، تو تم کیوں جہالت

اصرار کرتے ہوئے

آیت ۴۸ میں کہا گیا تھا کہ انبیاء کا فریضہ تبشیر و تذہیب رہے۔ کہا گیا کہ انبیاء کرامؑ کو بے شک اپنا یہ فریضہ ادا کرتے رہنا چاہیئے، لیکن ان کی اس تبلیغ و تذہیب سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو اس حقیقت پر یقین رکھیں کہ غلط کاموں کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

[۶/۵۱] وَأَنْذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ كَيْسَ كَاسٍ مِنْ دُونِهِ وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۖ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝

اے رسول! تو، اس قرآن کی رو سے، ان لوگوں کو زندگی کے پُرخطر راستوں سے آگاہ کرتا رہ جو خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی تو نہ ان کا کوئی رفیق و مددگار ہو سکتا ہے، نہ سفارشی، جو انہیں اُس کے بناء کن نتائج سے بچا سکے۔

انہیں اس طرح سمجھانے سے مقصد یہ ہے کہ شاید یہ زندگی کے خطرات سے اپنی حفاظت کر لیں۔

حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ان کی دعوت کو سب سے پہلے وہ لوگ قبول کرتے تھے جو معاشرہ میں ضعیف و ناتوان، محتاج و محروم، مستبد قوتوں کے وبائے ہوئے اور کچلے ہوئے تھے۔ یہ اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا مقصد ان انسانوں کو، پستیوں سے اٹھا کر شرفِ انسانیّت اور احترامِ آدمیت کی بندوبست پر ہے جانا ہوتا تھا۔ ان کے برعکس، دو لہندہ اور مستبد طبقہ اُس کی مخالفت کرتا تھا۔ کیونکہ اس نظام کی کامیابی میں انہیں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ اس دعوت کی مخالفت تو اس

غریبوں کی جماعت

بناء پر کرتے، لیکن اعتراض یہ کرتے تھے کہ ہم یہ کیسے برداشت کر لیں کہ یہ غریب اور مفلس انسان، جنہیں ہم اس معاشرہ میں ذیل ترین افراد سمجھتے ہیں، ہمارے ہمدوش ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مطالبہ کرتے کہ ان لوگوں کو اس جماعت سے نکال دیا جائے، تو ہم پھر اس دعوت کو سننے کے لئے تیار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کے اس مہنی پر تہور اور رحمتِ مطالبہ کو کسی صورت میں بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا جاسکتا تھا! رسولؐ کی طرف سے دو ٹوک الفاظ میں اسے مسترد کر دیا جاتا اس سے ان کی مخالفت اور بھی بڑھ جاتی، اور اس مخالفت کا اولین ہدف، یہی کمزور اور ناتوان افراد بنتے۔ وحی اور رسالت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستانِ عبرت آموز ہے۔ سلسلہ وحی کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوا تھا، اور قرآن کریم نے ان کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلے میں اسی کشمکش کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے آیات (۱۱/۲۴-۲۵) (۱۱/۲۶-۲۷) حضرت نوحؑ کا جواب تھا: وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا ۖ (۱۱/۲۶)۔ ”میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار

ایک ہی آیت کے بعد اس کی وضاحت ان بلیغ الفاظ میں کر دی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۶۰)

اے رسول! تیرے لئے خدا اور یہ جماعتِ مومنین، جو تیرا اتباع کرتی ہے، کافی ہے۔

یعنی ایک خدا کافی نہیں۔ خدا اور یہ جماعتِ مومنین، دونوں مل کر تیرے لئے کافی ہوں گے۔ غور فرمائیے کہ صحابہ کبار کی عظمت کے سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا تھا اور اُس آیتِ جلیلہ کی تو ابتداء ہی ان الفاظ سے کی گئی تھی کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ (۲۹) جس میں دینِ خداوندی کی نہایت جامع اور دلکش تصویر بڑے حسین اور دلآویز انداز میں کھینچی گئی ہے۔

دوسری طرف ان صحابہؓ کے ایمان اور ان کے مقام کی کیا کیفیت اور نوعیت تھی، اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اول - صفحہ ۲۲۵ پر گزرب چکی ہے۔

ان کے برعکس ان رعوت و کبر کے پکیروں کی ذہنیت آشکارا کرنے کے لئے کہا گیا کہ:

وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا أَهَؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ
مَنْ بَلَّغْنَا آلِيسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ۝

یہ بڑے لوگ، ان چھوٹے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو! یہ ہیں وہ جنہیں ہم میں سے انعاماتِ خداوندی کے لئے چُن لیا گیا ہے۔ ذرا ان کی حالت تو دیکھو؟ تم نے دیکھا کہ ان باتوں سے، ان لوگوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح نکھر کر سامنے آگئی اور صاف معلوم ہو گیا کہ وہ کون سا جذبہ ہے جو انہیں حق و صداقت کی طرف آنے سے روک رہا ہے؟ تم ان سے کہہ دو کہ اس نظام میں عزت اور ذلت کے معیار بالکل مختلف ہیں۔ یہاں، جو جس قدر، قوانینِ خداوندی کا پاسدار اور قدر شناس ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ واجبِ التکریم سمجھا جاتا ہے۔ (۲۹)

دوسری طرف اس جماعت کے متعلق کہا:

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءً بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

لہذا، جب تمہاری جماعت کے لوگ تمہارے پاس آئیں تو ان سے کہو کہ وہ بالکل نہ گھبرائیں، ان کے لئے ہر طرح کا

آمن اور سلامتی ہے۔ یہ نظام، ان بڑے لوگوں کی خاطر تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے کہ تمہاری پوری پوری نشوونما ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر تم میں سے کسی سے کوئی بھول چوک بھی ہو جائے، اور اس کے بعد وہ اپنے کئے پہ نادم ہو، اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لے، تو اسے بھی اس نظام کی حفاظت اور محنت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ (نظام عدل میں، عفو و اصلاح کی گنجائش رکھ دینا بھی خدا کی رحمت ہے۔ اس طرح ”عدل“ ”رحم“ اور ایک دوسرے سے متضاد نہیں رہتے۔ قانون کے مطابق ”عفو“ بھی ”عدل“ کا ایک گوشہ بن جاتا ہے)

اس آیت میں پھر کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَۃَ آیا ہے جس کی تشریح سابقہ صفحات، آیت (۶۴) کے تابع گزر چکی ہے تو یہ کئے متعلق انڈکس دیکھیے نیز اسی جلد میں آیت (۱۹-۱۲) کی تفسیر۔ ان تصریحات کے بعد فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نَفِصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ عَلٰی حِلِّ الْمَجْرِمِیْنَ ۝ [۵۵]

بم اس طرح اپنے قوانین کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ (سہو و خطا سے لغزش کرنے والوں اور دیدہ و دانستہ مجرم کرنے والوں کی راہیں ایک دوسرے سے، متمیز ہو جائیں۔

قیام عدل کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ قانون نہایت واضح طور پر ہر ایک کے سامنے آجائے۔ یہ افراد کا فریضہ نہیں کہ وہ معلوم کرتے پھر اس کے قانون کیا ہے اور اس کا مفہوم و مطلب کیا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کی اس طرح نشر و اشاعت کرے کہ وہ ہر ایک کے علم میں آجائے۔ اور پھر ایسا انتظام کرے کہ متنازعہ فیہ امور کے سلسلہ میں متعلقہ فریق معلوم کر سکیں کہ اس باب میں قانون کیا ہے۔

قانون غیر مبہم ہونا چاہیے | اور اس کا منشاء اور مفہوم کیا ہے تاکہ ہر فریق سمجھ لے کہ اس کا دعویٰ قانون کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر حکومت کی طرف سے ایسی مشینری متعین کر دی جائے تو مقدمات کے تصفیہ کے سلسلہ میں وہ تمام الجھنیں دور ہو جائیں جن کی وجہ سے آجکل لوگوں کو اس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس طرح مجرمین کا راستہ واضح طور پر الگ اور متمیز ہو جائے۔ یہ بڑی امن کی راہ ہے۔ آجکل حالت یہ ہے کہ معاشرہ میں فریب کار اور جرائم پیشہ لوگ دوسروں کے ساتھ اس طرح گھلے ملے رہتے ہیں کہ تعریف لوگ انہیں پہچان ہی نہیں سکتے اور اس طرح ان کے دامن فریب میں آجاتے ہیں۔ اگر ایسی صورت ہو کہ

مجرم متمیز ہوں گے

جرائم پیشہ لوگ آسانی سے پہچانے جاسکیں تو شریف انسان بڑے امن میں رہیں۔
قرآن کریم نے مثالی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ اس میں مجرمین
شریف لوگوں سے الگ ہوں گے۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ۔ (۳۶)۔ ایسے نمایاں طور پر
الگ اور متمیز کہ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسُيُئِهِمْ (۵۵)۔ ”مجرم اپنی بدشائنیوں سے پہچانے جائیں گے۔“
اس طرح کوئی شخص دھوکا نہیں کھا سکے گا کہ جس سے وہ معاملہ کر رہا ہے وہ شریف ہے یا بد معاش۔ یوں ان کی راہیں
الگ الگ نظر آجائیں گی۔

پچھلے سے بات یوں چلی آرہی تھی کہ قوم کے بڑے بڑے سردار مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان مفلسوں اور
ناداروں کو جنہیں وہ معاشرہ میں ذیل سمجھتے تھے، اپنی جماعت سے الگ کر دیں تو پھر ہم آپ کے ساتھ شامل
ہو سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ مطالبہ سراسر ان کے پست جذبات پر مبنی تھا۔ یعنی ان کی انانیت اور تکبر کے جذبات
اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ جنہیں وہ ذیل سمجھتے ہیں وہ ان کے ہمدوش کھڑے ہو جائیں۔ ان سے کہا گیا کہ
دین کا نظام قوانین پر مبنی ہے نہ کہ جذبات پرستی پر۔ قانون کا تقاضا مساواتِ انسانیہ ہے۔ اس لئے دین کا مدعی
قانون کو چھوڑ کر کسی کے جذبات کا اتباع نہیں کر سکتا۔ فرمایا:

قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ قُلْ لَا أَتَّبِعُ
أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۝

لہذا، (ان بڑے بڑے لوگوں سے) کہہ دو کہ تم خدا کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو، مجھے ان کی اطاعت سے روک
دیا گیا ہے۔ میں تمہاری خاطر ایسا نہیں کر سکتا۔ تمہارا مطالبہ جذبات پر مبنی ہے اور میری دعوت قانونِ خداوندی پر۔
لہذا میں اس قانون کو چھوڑ کر تمہارے جذبات کا اتباع نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا کروں تو میں بھی تمہاری طرح راہِ گم کردہ
ہو جاؤں گا۔ سیدھے راستے پر نہیں رہوں گا۔

قانونِ دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے اور جذبات میں علم و بصیرت اور دلیل و برہان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔
جذبات پرست لوگ دھاندلی سے قانون کی تکذیب کرتے ہیں، اس لئے ان دونوں گروہوں میں مفاہمت کی
صورت پیدا نہیں ہو سکتی:

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ
بِهِ إِن الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ يَقْضِي الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۝

میں اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک واضح راستے پر ہوں، اور تم اُسے جھٹلاتے ہو۔ (اس لئے مجھ میں اور تم میں مفاہمت کس طرح ہو سکتی ہے؟ تمہارا راستہ اور میرا اور) باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ جس تباہی اور بربادی سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو، وہ جلدی کیوں نہیں آتی، تو عمل اور اس کا نتیجہ برآمد ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جیسے درخت کے پھل لانے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے)۔ یہ میرے بس کی بات نہیں کہیں اُس مدت میں تخفیف کر کے، تباہی کو تمہارے سامنے جلدی سے آؤں۔ (ان باتوں کا فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ اپنے قانون کو ٹھیک ٹھیک طور پر بتا دیتا ہے اور پھر اُسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اُس سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی اور نہیں۔

اے بدخالفین کے اس اعتراض کو پھر سامنے لایا گیا جو وہ اکثر کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ جس تباہی سے رسولؐ انہیں متنبہ کرتا ہے، وہ آتی کیوں نہیں اس میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

قُلْ لَّوْ أَنِّي عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقَضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يُعْلِمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبُرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٌ فِي ظُلُمَاتٍ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝

ان سے کہو کہ جس تباہی کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو، اگر اُس کا جلد سے آنا میرے اختیار میں ہوتا، تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ لیکن (یہ چیز میرے بس کی نہیں)۔ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے کہ زیادتی کرنے والوں کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت کون سا ہے۔

اعمال کے اُن دیکھے نتائج، اور انسانی نگاہوں سے مستور حقائق و حوادث کو سامنے لے آئے والا قانون اُسی کا ہے۔ غیب کا علم اُس کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ کائنات کی خشکی اور نرمی (بحر و بر) میں کیا ہو رہا ہے۔ کس درخت سے کوئی پتہ کب جھڑے گا۔ زمین کی تاریکیوں میں دبا ہوا دانہ کب پھوٹے گا۔ کوئی تازہ یا خشک میوہ کب کھانے کے قابل ہوگا۔ یہ سب کچھ اُس کے کائناتی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور یہ قانونِ فطرت کی کھلی ہوئی کتاب میں درج ہے۔ (جو لوگ اس کتاب کو پڑھ لیں، انہیں ان امور کا علم حاصل ہو سکتا ہے اس علم سے خواہ ان کائنات کے تالے کھل سکتے ہیں۔

یہاں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ یعنی غیب کے متعلق کہا کہ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ۔ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو

نہیں۔ علم غیب کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول ۹۵-۹۰ پر بحث ہو چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ (خدا) جانتا ہے جو بحر و بر میں ہے۔ وغیرہ۔ ان امور کے متعلق صرف اتنا ہی کہا کہ خدا کو ان کا علم ہے علم غیب۔ اور قوانین فطرت

لہذا، یہ امور، غیب میں سے نہیں۔ یہ سب صحیفہ کائنات میں مذکور ہیں اور قوانین فطرت کے مطابق رد و نما ہوتے رہتے ہیں۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کو عطا کر دی گئی ہے۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کر لیں گے، انہیں ان امور کا علم ہو جائے گا۔ (قوانین فطرت کے متعلق انڈس میں ”فطرت“ کا عنوان دیکھئے)۔

اسی قسم کی ایک اور آیت بھی ہے، جس پر غور نہ کرنے سے الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِمَا يَأْتِي أَرْضُ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (۳۱)

یہ ظہور نتائج کی گھڑی، کب آئے گی، اس کا علم خدا ہی کر سکتا ہے، اگرچہ اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔ جس طرح بارش برستی تو ایک وقت پر جا کر ہے، لیکن وہ بنی شروع ہو گئی ہوتی ہے ایک مدت پہلے سے۔ یا جس طرح بچہ پیدا تو ہوتا ہے ایک وقت خاص پر جا کر، لیکن وہ رحم مادر میں بہت پہلے سے مختلف مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ خدا کو ان تمام مراحل کا علم ہوتا ہے۔

ان امور، یعنی بارش یا جنین کے مختلف مراحل میں سے گزرنے کا علم تو تم بھی حاصل کر سکتے ہو، لیکن خدا وہ کچھ بھی جانتا ہے جو تم نہیں جان سکتے۔ (مثلاً) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا۔ اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ خدا سب کچھ جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے (اس لئے خدا کو اس بات کا علم ہے کہ ظہور نتائج کی گھڑی کب آئے گی۔ تمہیں اس کا یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ضرور آکر رہے گی)

اس میں پہلے ہے: إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ۔ ”علم الساعت خدا کے ہاں ہی ہے۔“ انسانوں کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہے: وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ بارش اور جنین کے متعلق صرف اتنا ہی کہا ہے کہ خدا کو ان امور کا علم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان کا علم صرف

خدا کو ہوتا ہے، انسانوں کو نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد پھر دو امور کے متعلق کہا کہ انسان کو ان کا علم نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ کہ وہ کل کیا کرے گا، اور اُس کی موت کہاں واقع ہوگی۔ اس قسم کی آیات میں یہ فرق کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ کون سے امور ہیں جن کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ ان کا علم صرف اُسی کو ہوتا ہے، اور کون سے امور ایسے ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ خدا کو ان کا علم ہوتا ہے۔ ان (ثانی الذکر) امور کا علم انسان بھی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ علم غیب نہیں۔ علم غیب وہی ہے جسے خدا نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ وہ علم کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ (اگر خدا بذریعہ وحی عطا نہ کرے تو) رسولوں کو بھی نہیں۔

جس طرح کائنات میں سلسلہ علت و معلول جاری ہے، یعنی ہر عمل کا نتیجہ قانونِ فطرت کی رو سے مرتب ہوتا ہے۔ اس طرح انسانی دنیا میں قانونِ مکافات کا عمل کار فرما ہے جس کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اگلی آیت میں ان ہر دو قوانین کی مثال ایک ہی مقام پر دے دی گئی ہے

فرمایا:-

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

(خارجی کائنات میں بہار و خزاں کی گردشوں کی طرح، خود تمہاری زندگی میں بھی یل و نہار کی گردشیں جاری رہتی ہیں)۔ وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو۔ اس کے بعد وہ تمہیں رات کو سلا دیتا ہے، اور پھر تم دن میں اُٹھ بیٹھتے ہو (۳۹)۔ اس طرح وقت گزرتا جاتا ہے تاکہ تمہارے اعمال کے نتائج کے ظہور کی مدت پوری ہو جائے۔ اور اس دوران میں تمہارا ہر قدم اُسی سمت کو اُٹھ رہا ہوتا ہے (اگرچہ تم اپنے ذہن میں سمجھ رہے ہوتے ہو کہ وہ بات آئی گئی ہوگی)۔ حتیٰ کہ وہ وقت آ جاتا ہے جب تمہارے اعمال کے نتائج محسوس شکل میں تمہارے سامنے اکھڑے ہوتے ہیں۔

”هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم بِاللَّيْلِ“ کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اللہ وہ ہے جو تمہیں رات کو وفات دے دیتا ہے (یعنی مار دیتا ہے)۔ (اور پھر دن کو زندہ کر دیتا ہے)۔ ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ ”خدا وہ ہے جو تمہیں رات کو سلا دیتا ہے اور پھر تم دن میں اُٹھ بیٹھتے ہو“ یہ مفہوم قرآنِ کریم کے ایک اور مقام سے لیا گیا ہے جس میں ایک ایسی عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جس کا صحیح مفہوم دورِ حاضر کے علم النفس

(سائیکالوجی) کی روشنی میں سمجھ میں آ سکتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے، اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاِنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَازِلِهَا ۚ ”اللہ نفوس کو وفات دیتا ہے اُن کی موت کے وقت، اور جو لوگ مرتے نہیں اُن کی نیند کی حالت میں“

نیند اور موت میں فرق

ہم نے یہاں يَتَوَفَّى کا ترجمہ ”وفات دے دیتا ہے“ کیا ہے اور نفوس کا لفظ بلا مفہوم رہنے دیا ہے۔ آیت کے اتنے حصے میں کہا گیا ہے کہ حالت موت اور حالت نیند میں نفس انسانی پر وفات طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے: فَيُدْخِلُ اِلَيْهِ قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاٰخِرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط جن پر موت وارد ہو جاتی ہے، اُن کے نفس کو روک لیتا ہے اور جن پر موت طاری نہیں ہوتی۔ یعنی وہ صرف نیند کی حالت میں ہوتے ہیں، اُن کے نفس کو واپس بھیج دیتا ہے ایک معینہ مدت کے لئے: ”اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ“ (۳۹)۔ ”جس حقیقت کو یہاں بیان کیا گیا ہے، اس میں ارباب فکر و تدبیر کے لئے مقصود و منتہی تک پہنچنے کے لئے نشانیاں ہیں“

کہا یہ گیا ہے کہ حالت نیند اور موت کے عالم میں نفس انسانی کو روک لیا جاتا ہے۔ اسے وفات دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جسے نیند اور موت کی حالت میں متوفی کر دیا جاتا ہے۔ موت کی صورت میں اسے روک لیا جاتا ہے، اور نیند کی صورت میں اسے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

موت کی حالت میں کیا ہوتا ہے ہم نہیں جانتے۔ لیکن نیند کی حالت میں کیا ہوتا ہے، یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے۔ ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں بھاگنے والے اور سونے والے میں کوئی فرق نہیں ہوتا، بجز ایک بات کے۔ دونوں زندہ ہوتے ہیں۔ دونوں کے جوارح (دل، جگر، پھیپھڑے، تنفس وغیرہ) اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں جب طرح بیداری کی حالت میں۔ لیکن ان میں ایک فرق ہوتا ہے۔ یعنی بیداری میں انسان کا شعور کام کر رہا ہوتا ہے۔ نیند کی حالت میں

نفس کے معنی شعور

شعور کام نہیں کر رہا ہوتا۔ لیکن وہ معدوم نہیں ہوتا، صرف معطل ہوتا ہے کیونکہ کہا گیا ہے کہ جاگنے پر اسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ لہذا، اس آیت میں نفس سے مراد انسانی شعور ہے اور وفات دینے کے معانی عارضی طور پر معطل کر دینے کے۔

کہا یہ گیا ہے کہ جو کچھ نیند کی حالت میں ہوتا ہے، وہی کچھ موت کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی دونوں حالتوں میں انسانی شعور معطل ہوتا ہے۔ موت کی حالت میں اسے واپس نہیں بھیجا جاتا، وہیں روک لیا جاتا ہے یعنی

موت کی حالت میں بھی شعور (نفسِ انسانی) معدوم نہیں ہو جاتا۔ وہ موجود ہوتا ہے، صرف اُس کی کار فرمائی، عارضی طور پر، معطل ہو جاتی رہے۔ دوبارہ زندگی کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ معطل شدہ شعور پھر کام کرنے لگ جائے گا۔

حیاتِ آخرت | لہذا، حیاتِ آخرت میں انسان کا موجودہ شعور، اپنی تمام صلاحیتوں، یعنی خیالات، احساسات اور حافظہ کو بدستور لئے ہوئے کار فرما ہوگا۔ اس زندگی میں اس کی کار فرمائی

کا ذریعہ (MEDIUM) طبعی جسم ہوتا ہے۔ حیاتِ آخرت میں یہ ذریعہ کس قسم کا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس کا ذریعہ فعالیت کچھ بھی ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شعور تو وہی ہوگا اور وہی اس کی کار فرمائیاں۔

اس مقام پر اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید تفصیل وہاں آئے گی جہاں حیاتِ آخرت پر بحث کی جائے گی۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہم نے آیت (۶۱) میں یَتَوَفَّكُمُ کا ترجمہ سو جانا کیوں کیا ہے۔



بات ہو رہی تھی قانونِ مکافاتِ عمل کی۔ اس تسلسل میں فرمایا:

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۖ حَتَّىٰ
إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمْ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ۝
ثُمَّ رُدُّوْا إِلَىٰ آلِهِم مَّا لَهُمُ الْحَقُّ ۖ أَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ
الْحَسِبْنَ ۝

۶
۶۱-۶۲

اُس کا قانونِ مکافات تمام انسانوں پر غالب ہے۔ اُس نے ایسی قوتیں مقرر کر رکھی ہیں جو تم پر نگران رہتی ہیں (تاکہ تمہارا کوئی عمل بے نتیجہ نہ رہے)۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ظہورِ نتائج، انسان کی اس زندگی میں ہو جائے۔ زندگی کا سلسلہ اس سے آگے بھی چلتا ہے۔ چنانچہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے کارندے (قانونِ فطرت کے مطابق) اُس کی دنیاوی زندگی کی بدلت کو پورا کر دیتے ہیں۔

اور اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی نہیں کرتے (۱۱-۱۳ ذ ۱۴-۱۵ ذ ۱۶-۱۷ ذ ۱۸-۱۹ ذ ۲۰ ذ ۲۱ ذ ۲۲ ذ ۲۳ ذ ۲۴ ذ ۲۵ ذ ۲۶ ذ ۲۷ ذ ۲۸ ذ ۲۹ ذ ۳۰ ذ ۳۱ ذ ۳۲ ذ ۳۳ ذ ۳۴ ذ ۳۵ ذ ۳۶ ذ ۳۷ ذ ۳۸ ذ ۳۹ ذ ۴۰ ذ ۴۱ ذ ۴۲ ذ ۴۳ ذ ۴۴ ذ ۴۵ ذ ۴۶ ذ ۴۷ ذ ۴۸ ذ ۴۹ ذ ۵۰ ذ ۵۱ ذ ۵۲ ذ ۵۳ ذ ۵۴ ذ ۵۵ ذ ۵۶ ذ ۵۷ ذ ۵۸ ذ ۵۹ ذ ۶۰ ذ ۶۱ ذ ۶۲ ذ ۶۳ ذ ۶۴ ذ ۶۵ ذ ۶۶ ذ ۶۷ ذ ۶۸ ذ ۶۹ ذ ۷۰ ذ ۷۱ ذ ۷۲ ذ ۷۳ ذ ۷۴ ذ ۷۵ ذ ۷۶ ذ ۷۷ ذ ۷۸ ذ ۷۹ ذ ۸۰ ذ ۸۱ ذ ۸۲ ذ ۸۳ ذ ۸۴ ذ ۸۵ ذ ۸۶ ذ ۸۷ ذ ۸۸ ذ ۸۹ ذ ۹۰ ذ ۹۱ ذ ۹۲ ذ ۹۳ ذ ۹۴ ذ ۹۵ ذ ۹۶ ذ ۹۷ ذ ۹۸ ذ ۹۹ ذ ۱۰۰ ذ)

اس کے بعد زندگی اگلے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور وہاں نتائج، ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔

یہ نتائج خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں کسی اور کا قانون نہیں چل سکتا۔ فیصلہ اُسی کا ہے۔

اُس کا قانونِ مکافات، نتائج مرتب کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرتا۔ یہ ساتھ کے ساتھ ہونا رہتا ہے (یہ

الگ بات ہے کہ ان کا مجموعی اثر ایک وقت کے بعد جا کر نمودار ہو۔)

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے محفوظ کیا جاتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ وہ انسان کے اعمال ہیں جو نتیجہ خیزی کے لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں، جس طرح بیج، زمین میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ علم النفس اس پر شاہد ہے کہ انسان کے ہر عمل، حتیٰ کہ اس کے خیالات اور ارادوں تک کا اثر اس کی ذات (نفس) پر مرتب ہوتا رہتا ہے۔ یہ ذات، ان تمام اثرات و نقوش کو ساتھ لے کر مرنے کے بعد آگے جاتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے ”اعمال نامہ“ کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو مختلف انداز سے سمجھایا ہے، یہاں حَفْظُہٗ کہا ہے محفوظ کر لینے والے۔ سورة الرعد میں کہا ہے:

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَہٗ ۚ مِّنْ أَمْرِ اللّٰہِ ۚ (۱۳)

”انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعین ہیں جو اس کے ہر عمل کا پیچھا کر کے اُسے اس کے نتیجہ تک پہنچاتی۔

یوں انسان کا ہر عمل محفوظ ہو کر نتیجہ خیز ہوتا ہے۔“

سورة الانفا میں ہے:

وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۝ کَرَامًا کَاتِبِیْنَ ۝ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (۱۲-۱۱)

”اُس نے تم پر محافظ مقرر کر رکھے ہیں۔ نہایت معزز اور امین۔ جو کچھ تم کرتے ہو انہیں اس

سب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے دیکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ (اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے)۔“

سورة اسریٰ میں اس دیکارڈ (اعمال نامہ) کو بڑی مبلغ مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ فرمایا: وَ کُلُّ اِنْسَانٍ

الْزَمٰنُہٗ طَیْرٌ کَافٍ فِیْ عُقْبَہٗ ط ”ہر انسان کا اعمال نامہ مرتب ہو کر اُس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے، جس کے

نتائج تبدیل کرنے پر اسے کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ (لفظ طائر میں یہ مفہوم مضمون ہے)۔ جب تک ظہورِ نتائج کا وقت

نہیں آتا، وہ دستاویز پیٹے رہتی ہے: وَ نُخْرِجُ لَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ کِتٰبًا یَلْقَہٗ مَنشُورًا ۝ (۱۴)

”جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جاتا ہے تو وہی لپٹی ہوئی دستاویز ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔ یعنی

اس وقت جو باتیں انسان کے نفس غیر شعوری کے ترخانے میں مستور ہوتی ہیں۔ اس وقت نفس شعوریہ کے سامنے

آ جائیں گی۔ اُسے اُس وقت کہا جائے گا: اِقْرَأْ کِتٰبَکَ ط ”تو اپنا اعمال نامہ خود پڑھ“ کَفٰی بِنَفْسِکَ

الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا ۝ (۱۵) تمہارا حساب کرنے کے لئے کہیں باہر سے محاسب بلائے کی ضرورت

نہیں۔ تو خود ہی اسے پڑھ لے اور خود ہی حساب کر کے بتا دے کہ تیرا مقام کونسا ہے!“

اس طرح سمجھایا گیا کہ ”اعمال نامہ“ کہیں خارج میں نہیں دکھا رہتا۔ انسان کے اعمال اُس کی ذات پر اپنے

اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور انہی نقوش کی حامل انسانی ذات اس کا اعمال نامہ ہوتا ہے۔ موت سے انسانی جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اُس کی ذات جو اُس کے اعمال کی حامل ہوتی ہے، محفوظ رہتی ہے۔ سورہ ق میں ہے کہ یہ منکرینِ حیاتِ آخرت کہتے ہیں کہ یہ تو عجیب سی بات نظر آتی ہے کہ عَرَاذًا امْتَنَّا وَكُنَّا ثَرَايَا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ (۵)۔ جب ہم مر جائیں گے اور گل سرخ مر مٹی ہو جائیں گے تو پھر زندہ ہونگے؟ یہ تو بڑی بعید از عقل بات ہے! فرمایا: قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ سُجَّ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ (۶)۔ ان سے کہو کہ انسان کی جس چیز کو زمین کم کر دیتی ہے، اُس کا ہمیں علم ہے۔ موت اس کے طبعی جسم کو منتشر کرتی ہے۔ اسکی ذات پر اسے کچھ تصرف حاصل نہیں ہوتا۔ اور چونکہ انسانی اعمال کا تعلق اُس کی ذات سے ہے نہ کہ اُس کے جسم سے، اس لئے اس ذات کے محفوظ رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اعمال سب محفوظ رہتے ہیں۔

وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳)۔ اور یہ کتاب سچی سچی بات کہہ دیتی ہے۔ یہ ہے جسے (۶) میں حَفَظَةٌ کہا گیا ہے۔

اوپر کہا ہے اَلَا لَهُ الْحُكْمُ۔ قانون صرف خدا کا کار فرما رہتا ہے۔ کائنات میں حکم صرف اس کا چلتا ہے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ جب کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو پھر خدا یاد آتا ہے۔ جب وہ مصیبت رفع ہو جاتی ہے تو پھر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے:

قُلْ مَنْ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ لَّيِّنُ أَمْرُنَا مِنْ هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝
قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيْكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ مُشْرِكُونَ ۝

ان سے پوچھو کہ بحر و بر میں، جب کہیں بھی کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا کس قانون کے مطابق مل سکتا ہے؟ تم اس وقت، اپنی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں، کبھی گڑگڑا کر، اور کبھی چپکے چپکے دل میں اُسے مدد کے لئے پکارتے ہو، اور کہتے ہو کہ اگر خدا اس مصیبت سے ہمیں نجات دلا دے تو ہم ہمیشہ اُس کے شکر گزار رہیں گے۔

ان سے کہو کہ ان مصیبتوں سے، بلکہ تمام مصیبتوں سے، چھٹکارا، خدا کے قانون کے مطابق ہی ملتا ہے لیکن اس کے باوجود، تمہاری یہ حالت ہے کہ تم (اپنی زندگی کے معاملات میں) قوانینِ خداوندی کے ساتھ، اور قوانین بھی شامل کر لیتے ہو۔ اور یوں ایک غلط نظام قائم کر کے اپنے لئے تباہی مول لے لیتے ہو۔

قانونِ خداوندی کا اتباع ہر حال میں کرنا چاہیئے۔ اگر اُس زمانے میں جب حالات سازگار ہوں، قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے تو مصیبت آئے ہی نہیں۔ صحت کی حالت میں احتیاط برتی جائے۔ احتیاط برتنے کے معنی یہ ہیں کہ جو باتیں مُمکنِ صحت ہیں انہیں اختیار کیا جائے اور جو مضرِ صحت ہیں، اُن سے پرہیز کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو پھر بیماری آتی ہی نہیں۔ لیکن ہماری حالت

قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہر حال میں

یہ ہوتی ہے کہ صحت کے زمانے میں احتیاط نہیں برتتے، اور جب اس بد پرہیزی کی وجہ سے صحت خراب ہو جاتی ہے، مرض کا حملہ ہو جاتا ہے، تو پھر ڈاکٹروں، حکیموں کی طرف بھاگتے دوڑتے ہیں اور وہ جس قسم کے پرہیز بتاتے ہیں، اُن پر عمل کرنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ تہیہ چند دنوں تک رہتا ہے۔ پھر انہی بد پرہیزیوں پر اُتر آتے ہیں اور پھر بیمار پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر تم حالتِ صحت میں پرہیز کرو تو بیمار کیوں پڑو۔ ایک ہندی دوہا ہے

دکھ میں تو ہر کو بھجیں، سکھ میں بھجے نہ کو جو سکھ میں ہر کو بھجیں، تو دکھ کا بھگو ہو

افراد سے آگے بڑھیں تو یہی حالت اقوام کی ہوتی ہے۔ وہ خوش حالی اور سرفرازی کے زمانے میں ہر قسم کی بد عنوانیوں پر اُتر آتی ہیں، اور جب ان بد عنوانیوں کے نتیجے میں تباہی آتی ہے تو اس وقت اصلاحِ احوال کا خیال آتا ہے۔ اگر خوش حالی کے زمانے میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے تو تباہی آئے ہی کیوں!

قوانینِ خداوندی کی دوسرے غلط نظام کے نتیجے میں جو تباہیاں آتی ہیں، اس کی کمی ایک شکلیں ہوتی ہیں:

۶
۶۵

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِّنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْدَسَكُمْ شَيْعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ط أَنْظَرُ كَيْفَ نَصَرَفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝

نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقے میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں، اور اُن کی وجہ سے معاشرۂ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقے میں لاقانونیت کی وبا پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ (۱۶/۵۷)۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں، اور خانہ جنگی پر اُتر آتے ہیں (۶/۱۳۱)۔ اور یوں تباہ ہو جاتے ہیں۔

دیکھو! ہم کس طرح اپنے قوانین کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ، اچھی طرح بات سمجھ سکیں۔

مذہبی عذاب کی مختلف شکلیں

قرآن کریم نے یہاں انسانی زندگی کے اجتماعی نظام کے بڑے عینی حقائق بیان کئے ہیں۔ کبھی (اور اکثر) ایسا ہوتا

ہے کہ عوام تو ٹھیک ہوتے ہیں لیکن قوم کا اوپر کا طبقہ (ارباب اقتدار اور اعیان دولت و ثروت) بگڑ جاتے ہیں اور ان کے بگڑنے سے سارا نظام تھس تھس ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس قوم پر تنہا ہی آجاتی ہے۔ سورہ نمل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا اللہ! اس قوم کی اصلاح کس طرح ہوگی؟ وہ تو ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے۔ اس کے ایک ایک فرد کی اصلاح (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہے۔ ارشاد خداوندی ہوا کہ ساری کی ساری قوم بگڑی ہوئی نہیں، نہ ہی ان کے ایک ایک فرد کی اصلاح کی ضرورت ہے: **وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ** (۲۴)۔ مملکت کے مرکزی مقام (دار السلطنت) میں نواب ارباب اقتدار ہیں جو بگڑے ہوئے ہیں۔ انہی کے

اکابرین کی تقلید | تنبیہ میں ساری قوم بگڑ رہی ہے۔ اگر ان نوکی اصلاح کر دی جائے تو ساری قوم کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ عوام، اکابرین قوم کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اگر وہ بدعنوان ہوں، تو ساری قوم میں بدعنوانی پھیل جاتی ہے۔ وہ صحیح راستے پر چلیں، تو قوم، ان کے اتباع میں صحیح راستے پر چلتی رہتی ہے۔ لہذا، قوموں میں تنہا ہی کی ایک شکل (یا ایک وجہ) یہ ہوتی ہے کہ اُس کا طبقہ بالا بگڑ جاتا ہے، تو ساری قوم بگڑ جاتی ہے۔ اور یوں مملکت میں بد نظمی پھیل جاتی ہے۔

دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ ارباب اقتدار کا ظلم اور استبداد اس قدر حد سے بڑھ جاتا ہے کہ وہ قوم کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے، اور اس کے رد عمل کے طور پر عوام لاقانونیت پر اتر آتے ہیں اور اس طرح معاشرہ کا نظم و نسق تباہ ہو جاتا ہے۔ اور ملک میں فوضویت (انارکی) پھیل جاتی ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر عوام کو اپنے پیچھے لگا کر الگ الگ پارٹیاں بنالیتے ہیں، اور وہ پارٹیاں آپس میں ٹکرا کر ملک کو تباہ کر دیتی ہیں۔

اجتماعی تنہا ہی کی ان شکلوں کی وضاحت کے بعد کہا کہ ہم ان امور کو اس لئے بار بار سامنے لاتے ہیں۔ **لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ**۔ تاکہ لوگ غور و فکر سے کام لیں، اور جن اسباب و وجوہ سے معاشرہ پر تنہا ہی آتی ہے اور ان کی اصلاح کریں۔ قرآنی نظام میں ان میں سے کوئی صورت بھی پیدا نہیں ہوتی، اس کے بعد کہا:

۶۴ وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۖ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝

لیکن تیری یہ قوم اس پر بھی نہیں سمجھتی، اور ایسی ٹھوس حقیقت کو برابر جھٹلائے چلی جا رہی ہے۔ تم ان سے کہہ دو کہ (میرا کام تمہیں نیک و بد سمجھانا ہے)۔ میں تم پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا کہ تمہیں زبردستی صبح راستے پر چلاؤں۔

رَسُولُ انْ پَر دَارُ وُغَہِ نَہِیْنِ | قرآن کریم نے متعدد مقامات پر نبی اکرمؐ سے کہا ہے کہ آپ کا کام ان لوگوں کو صبح راستہ دکھا دینا ہے۔ زبردستی اس راستہ پر چلانا نہیں۔ اگر انسانوں کو زبردستی راستہ پر چلانا مقصود ہوتا تو انہیں پیلا ہی اس طرح کیا جاتا کہ یہ (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مجبوراً قوانین خداوندی کی اطاعت کئے چلے جاتے۔ لیکن خدا نے انہیں اختیار و ارادہ کی صلاحیت اس دی ہے کہ یہ خود اپنے فیصلے سے اپنے لئے راستہ اختیار کریں۔

باقی رہا ان کا یہ اعتراض کہ اگر ان کی غلط روش کا نتیجہ تباہی ہے، تو وہ تباہی ان پر آتی کیوں نہیں۔ فرمایا:

لِكُلِّ نَبِیٍّ مُّسْتَقَرٌّ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

تم جو کچھ کر رہے ہو اس کا نتیجہ اپنے وقت پر نمودار ہو جائے گا۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ہر واقعہ کے نتیجہ خیز ہونے کا ایک مقام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بات آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے، اور لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ تا آنکہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر بھڑک جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔

ہے۔ (۱۸۳-۱۸۲)

یہ کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے، متعدد مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ انڈکس میں ”مہلت“ کا عنوان دیکھئے۔ یہاں ہر واقعہ یا حادثہ کے لئے ”مستقر“ کا لفظ لا کر قرآن کریم نے ایک عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ مستقر کے معنی ہونے ہیں کسی متحرک شے کا چلتے چلتے کسی نقطہ پر آ کر رک جانا۔ کہا یہ گیا ہے کہ عمل، اپنے نتیجہ خیزی کے مقام کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ اس مقام پر آ کر رک جاتا ہے جہاں اس کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ ہم اس حادثہ کو صرف اُس وقت دیکھتے ہیں جب وہ محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے، حالانکہ وہ بہت پہلے سے مرتب ہونا شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے: **وَالَّذِیْنَ كَذَّبُواْ بِآیَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ** ○ (۱۸۲)۔ جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت کو جھٹلاتے ہیں ہم انہیں اس طرح بندرت (STEP BY STEP) تباہی کی طرف لے جاتے ہیں کہ انہیں اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا۔ نتیجہ خیزی کا

یہ عمل بڑا غیر محسوس ہوتا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت (۲۱-۱۱) میں اس عمل کو بڑے دلنشین انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مفہوم القرآن میں ان آیات کے معنی دیکھئے۔

احتیاطی تدابیر کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک اہم اصول کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بعض (بلکہ اکثر) امراض متعدی (CONTAGIOUS) ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے مریضوں سے دور رہا جائے۔ فرمایا:

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

قرآن کریم کو سنجیدگی سے نہ لینے والے | جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہمارے قوانین (قرآن) کو سنجیدگی سے نہیں سنتے بلکہ اُس کے

متعلق لغو اور بے کار باتیں کرتے ہیں، تو اُن سے کنارہ کش ہو جاؤ تا آنکہ وہ اس موضوع کو چھوڑ کر کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ اور اگر تم اپنے خیالات میں مہمک، یا گفتگو میں جذب ہونے کی وجہ سے اس بات کو بھول جاؤ تو جس وقت بھی یہ یاد آئے ان لوگوں سے اُٹھ جاؤ۔ یہ لوگ، قرآن جیسی بلند پایہ کتاب کے متعلق اس قسم کا رویہ اختیار کر کے بڑی زیادتی کرتے ہیں۔

ان امور کی تشریح آیات (۱۱-۵) میں آچکی ہے۔ (نیز دیکھئے ۶۸)۔ اس کے بعد ہے:

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَٰكِنْ ذِكْرًا لِّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝

جو لوگ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، اُن پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ یہ لوگ قرآن کے متعلق اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ ہم نے انہیں (ایسے لوگوں سے الگ ہو جانے کی) تاکید اس لئے کی ہے کہ ان کے لئے ایسی باتوں سے بچنا ضروری ہے۔

اگلی آیت میں اس تاکید کی مزید وضاحت کی گئی ہے جو (۶۸-۶) میں سامنے لائی گئی تھی:

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ وَذَكِّرْ بِهِ ۚ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ

وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۚ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلُّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا ۚ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ أُبْسِنُوا بِمَا كَسَبُوا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ
أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝

جن لوگوں کی یہ حالت ہو کہ وہ نظام خداوندی تو ایک طرف) خود اُس آئین اور ضابطہ کو بھی کچھ اہمیت نہ دیں
جیسے انہوں نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے اور انسانی زندگی کو محض تماشا سمجھیں، اور اس دھوکے میں رہیں کہ

ان تک قرآن پہنچاتے رہو | مقصد حیات عیش و عشرت ہے، اور بس۔ تم ایسے لوگوں کے
پیچھے اپنی جان مت کھپاؤ۔ انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دو۔ البتہ

قرآنی تعلیم اُن کے سامنے پیش کرتے رہو۔ اس لئے کہ کسی شخص کو، اُس کے غلط اعمال کی وجہ سے، قرآن سے محروم
نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے، ان غلط اعمال کے نتائج سے، قانون خداوندی کے سوا کوئی
نہیں بچا سکتا۔ اس کے لئے نہ اُس کا کوئی رفیق اور نہ مددگار ہو سکتا ہے، نہ سفارشی۔ نہ ہی وہ کچھ بدلہ (کفارہ)
دے کہ ان کے نتائج سے بچ سکتا ہے۔ اُن لوگوں کو، اُن کے اعمال کے حوالے کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے
کیا ہے اُس کی سزا اُبھگتیں۔ (۵۲ ذ ۶۴)۔ وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ
چیزیں بھی، جو عام حالات میں انسان کی پرورش کا موجب بنتی ہیں، ان کے لئے تلخا بہ حیات، اور سوبانِ رُوح
بن جاتی ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے صحیح راستے پر چلنے سے انکار کر دیا تھا اور حق و صداقت سے سرکشی برتی تھی
(جس کا دل مضطرب اور پریشان ہو، اُسے خوشگوار چیزیں بھی زہر لگتی ہیں)۔

قرآن کریم کی کثرت وہ نگہی اور شفقت اور نرمگساری ملاحظہ فرمائیے۔ اس قسم کے غلط کار لوگوں سے الگ
ہو جانے کی تاکید کے ساتھ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اُن سے الگ نہ ہو جاؤ، لیکن اُن تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہو۔
تاکہ وہ اس وجہ سے زندگی کی سعادتوں اور خوشگوار یوں سے محروم نہ رہ جائیں کہ اُن تک خدا کا پیغام نہیں پہنچا
تھا۔ تمہارا فریضہ پیغامات خداوندی کی تبلیغ ہے۔ تم اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔ اس قسم کے غلط
لوگوں کو تو بلکہ اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ ڈاکٹر کا متعدد امراض کے مریضوں سے اپنی حفاظتی تدابیر اختیار
کرنا اور اس طرح اُن سے ذرا ہٹ کر رہنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان کا علاج چھوڑ
دے۔ اسے اُن کا علاج بدستور جاری رکھنا چاہیے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کی حامل (کتاب اللہ کی وارث) قوم کی ذمہ داریاں کس قدر شدید ہیں۔ بے راہرو

اقوام سے الگ رہنے کی توانا کب سے (یعنی یہ کہ ان کی روش اختیار نہ کی جائے)۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ ان تک قرآن کا پیغام پہنچاتے رہیں۔

لیکن جو قوم خود ہی قرآن کو چھوڑ بیٹھی ہو، وہ دوسری اقوام تک اس کا پیغام کیا پہنچائے گی؟

﴿

قرآن مجید کی اصطلاحات بڑی غور طلب ہوتی ہیں۔ پانیِ مُدِ حیات ہے اسی پر زندہ شے کا سہارا ہے حیوانات تو ایک طرف، نباتات کی روئیدگی، نشوونما اور ثمر باری کا بنیادی انحصار اسی پر ہے۔ لیکن کسی پودے پر لکھوتا ہوا پانی ڈالو، وہ اُسی وقت مڑھ جاسے گا۔ اور پھر زندگی سے محروم ہو جائے گا۔ پانی وہی تھا۔ لیکن اُس کی کیفیت میں فرق آ جانے سے وہ مدِ حیات ہونے کے بجائے ہلاک ہو گیا۔ اسی طرح توحشت پانی بھی۔

غلط نظامِ زندگی میں زندگی کی ضروریات کی چیزیں وہی ہوتی ہیں، لیکن وہ انسانی ذات کے لئے مدِ حیات ہونے کے بجائے ہلاکت آفرین بن جاتی ہیں۔ دودھ مدِ صحت ہے، لیکن وہی دودھ اگر چرا کر پیا جائے تو (طبعی طور پر تو اس کی تاثیر میں کچھ فرق نہیں ہوتا لیکن) انسانی ذات کے لئے وہ ہلاکت کا موجب ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں قانونِ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں جو الفاظ آئے ہیں، ان کی تشریح جلد دوم (صفحہ ۲۲۸-۲۲۹) میں دیکھئے۔ (یعنی آیت ۲۱ کے تحت)۔

جن لوگوں سے قطعِ علائق کر لینے کے لئے کہا گیا ہے، وہ ضرور پوچھیں گے کہ ہم میں کیا برائی ہے جو تم ہم سے اس طرح الگ ہو رہے ہو؟ اور تم سے اظہارِ محبت کرتے ہوئے کہیں گے کہ صحیح راستہ وہی ہے جس پر ہم کامزن ہیں۔ کہا کہ ان سے کہو کہ:

قُلْ اَسْتَدْعُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَ
نُرَدُّ عَلَىٰ اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِیْنُ
فِی الْاَرْضِ حَیْرَانٍ ۚ اَلَمْ یَكُنْ یَدْعُوْنَهُ اِلٰی الْهُدٰی اَلْتِنٰٓا
قُلْ اِنَّ هُدٰی اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰی ۖ وَاْمُرْنَا لِنُسَلِّمَ لِرَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَاَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۖ وَهُوَ الَّذِیْ اِلَیْهِ
تُحْشَرُوْنَ ۝

نشوونما کا سامان بھی ساتھ ہی فراہم کر دیا۔ اس حقیقت کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَیَوْمَ یَقُولُ کُنْ فِیْکُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْکُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ عَلَمُ الْغِیْبِ وَ الشَّهَادَةُ وَهُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝

یہ اس خدا کا قانون ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو ایک حقیقت کے طور پر تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اس کی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ جو بھی وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے، اس کے وقوع پذیر ہونے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔

اس کی ہر بات معنی بر حقیقت ہوتی ہے (۲۳-۱۳)۔ یہ بھی شاعری نہیں ہوتی (۲۹)۔ اس لئے کائنات میں ہر جگہ اُسی کا اقتدار اعلیٰ کام کر رہا ہے۔ وہ ہر شے کی موجودہ حالت کو جانتا ہے، اور اس کے امکانات اور مضمر صلاحیتوں سے بھی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت کیا ہو رہا ہے، اور اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ جس انقلاب کی اس وقت خبر دی جا رہی ہے، وہ آکر رہے گا۔ حق اور باطل کی قوتوں کا ٹکراؤ ہو گا۔ اور یہ ٹکراؤ یونہی اتفاقیہ رونما نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ خدا نے خیر کی محکم اسکیم کے مطابق ہو گا۔ وہی اسکیم جس کے مطابق حق و باطل کا ٹکراؤ ہونا چلا آ رہا ہے اور جس میں حق، فاتح و منصور ہو کر سامنے آجائے (۲۱-۸)۔

(۲۲-۲۴) و (۲۳-۲۴)

تخلیق کائنات: اس کے معنی برحق ہونے اور کُن فیکون، غیب و شہود وغیرہ کے سلسلہ میں تفصیلی بحث پہلے آچکی ہے۔ انڈکس میں دیکھئے۔ وَلَهُ الْمُلْکُ کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول میں صالِحِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ { (۱) صفحہ ۲۸ } دیکھئے۔ نیز عنوانات۔ آخرت، اُخروی زندگی اور قیامت۔

نفخ صور | نفخ صور کی تشریح کا اصل مقام، اُخروی زندگی اور اس کے متعلقات ہیں جن کا ذکر اپنے اپنے مقامات پر آئے گا۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ (۱) اس سے مراد میدان جنگ میں فوجوں کا تصادم بھی ہے۔ اور (۱) مَرْدِ اقوام (پکیان آب و گل) میں جیات تازہ کی نمود بھی۔ صور، صورت کی جمع بھی ہے۔ اور صورت کے معنی (FORM) یا پیکر ہیں۔ یعنی ان انسانوں میں جو ”مٹی کے مادہ“ بن چکے ہوں، زندگی کی حرارتیں اور توانائیاں بھونک کر انہیں زندہ اقوام کی صفت میں لا کھڑا کرنا۔ مقصد اس سے حق و باطل کے تصادم اور کشمکش ہے۔

حق و باطل کی کشمکش کا ذکر آیا تو قرآن کریم نے ذہن کا رخ داستانِ حضرت ابراہیمؑ کی طرف منتقل کر دیا، جن کی زندگی اس کشمکش کی مسلسل داستان تھی۔ اس داستان کے بیشتر گوشے سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں اُنکے اس واقعہ کا ذکر ہے جہاں اُنہوں نے اجرامِ فلکی کی الوہیت کے عقیدہ کی علیٰ وجہ البصیرت تردید کی تھی۔ پہلے ان کی اس تنبیہ کا ذکر جو اُنہوں نے خود اپنے والد کو کی تھی :

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ إِزْرَأْ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً إِنِّي أَخَافُكَ وَأَقْوَمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۶/۷۵)

حق و باطل کی یہی کشمکش تھی جس سے ابراہیمؑ دوچار ہوا۔ اس کی ابتداء خود اس کے اپنے گھر سے ہوئی، جب اُس نے اپنے باپ، آد سے کہا کہ یہ کیا ہے کہ تم نے اپنے ہاتھ کی تراشیدہ موزیوں اور غیر خدائی قوتوں کو اپنا آلہ بارگاہ ہے، میرے نزدیک تو تم اور تمہاری قوم کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

اس کے بعد اجرامِ فلکی کی الوہیت کی تردید ہے۔ لیکن اس سے پہلے دو لفظوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خود اس نتیجے پر کیسے پہنچے تھے۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں وضاحت سے بتایا گیا ہے، نبیؐ کو جو علم بذریعہ وحی دیا جاتا تھا، وہ اُس کی اپنی فکر، تجربات یا مشاہدات کا نتیجہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے براہِ راست خدا کی طرف سے عطا ہوتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب وہ ان پیغامات اور حقائق کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا تھا، تو وہ ان کی مخالفت کرتے تھے۔ اُنہیں ان کی صداقت کا قائل کرانے کے لئے ضروری تھا کہ اُن سے دلائل و براہین کی رُو سے بحث کی جائے۔ اُن دلائل کو چھوڑ کر جنہیں خود وحی نے بیان کیا ہوتا تھا، باقی دلائل و براہین نبیؐ کی اپنی فکر، تجربات و مشاہدات کی رُو سے حاصل کر وہ ہوتے تھے۔ یہ مراحل نبیؐ کی بشریت کے دائرے میں ہوتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کو یہ حقیقت تو بذریعہ وحی معلوم ہو گئی تھی کہ نہ تو انسانوں کے خود تراشیدہ بت خدا ہو سکتے ہیں اور نہ ہی مظاہرِ فطرت کو درجۃ الوہیت حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن بت پرستی کے خلاف اُنہوں نے اپنے والد کو جو دلائل دیئے تھے ظاہر ہے کہ اُن کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اُن کی قوم بت پرست کے علاوہ ستارہ پرست بھی تھی۔ اُن کی اس باطل (بلکہ توہم) پرستی کی مخالفت کے سلسلہ میں بھی ضروری تھا کہ اُنہیں دلائل و براہین کی رُو سے اس کا قائل کیا جاتا۔ اس کے لئے اُنہوں نے اجرامِ فلکی کی نقل و حرکت کا بغائرِ مشاہدہ اور معائنہ کیا، اور اس سے وہ اس قائل ہو گئے کہ حتم و یقین کے ساتھ

نبیؐ کی بشریت

ان مخالفین سے بات کر سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ
وَلِيَكُونَ مِنَ ٱلْمُؤَقِّنِينَ ۝

اس مقصد کے لئے ہم نے ابراہیمؑ کو کائناتی نظام کا مشاہدہ کرایا تھا جس سے اُسے یہ یقین حاصل ہو گیا کہ ساری کائنات میں فقط خداؑ واحد کا قانون جاری و ساری ہے۔ اس لئے نہ تو کائنات کی کوئی شے اپنے اندر خدا بننے کی قوت رکھتی ہے، اور نہ ہی یہاں ایک سے زیادہ ہستیوں کا اقتدار چل سکتا ہے۔

اس یقین تک پہنچنے کا یہ طریق وہی ہے جسے سورہ آل عمران کی آیات (۹۰-۹۳) میں بیان کیا گیا ہے یعنی مسلسل غور و فکر کے بعد اس حقیقت کا علیٰ وجہ البصیرت مشاہدہ کر لینا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۖ (۹۳)۔ ”اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کا رگڑ کائنات کو باطل نہیں پیدا کیا، بلکہ بالحق پیدا کیا ہے۔“

ان محکم دلائل سے آراستہ ہونے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے قوم کی ستارہ پرستی کے خلاف مہم شروع کی۔ اگلی تین چار آیات میں اسی مہم کی تفصیل دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ جو کچھ اگلی آیات میں کہا گیا ہے، وہ کسی ایک واقعہ کا تذکرہ نہیں۔ وہ اس مسلسل مہم کی داستان ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ ٱلَّيْلُ رَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ
قَالَ لَا أُحِبُّ ٱلْأَفْلِينَ ۝ فَلَمَّا رَا ٱلْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هٰذَا رَبِّي ۖ
فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي ۖ لَأَكُونَنَّ مِنَ ٱلْقَوْمِ الضَّٰلِّينَ ۝
فَلَمَّا رَا ٱلشَّمْسُ بَازِعَةً قَالَ هٰذَا رَبِّي ۖ هٰذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ
قَالَ يَقَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَشْرِكُونَ ۝

ستارہ پرستی کے خلاف دلائل | اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مشاہداتی دلائل سے اپنی قوم کے باطل عقائد کا ابطال کرتا تھا۔ (مثلاً) جب رات کے وقت ستارہ نمودار

ہوتا، (جس کی وہ قوم پرستش کرتی تھی) تو ابراہیمؑ اُن سے کہتا کہ اچھا! تم کہتے ہو کہ یہ میرا پروردگار ہے (اس کے سامنے جھکنا چاہیے) اُس کے بعد جب وہ ستارہ ڈوب جاتا تو وہ اُن سے کہتا کہ، کیوں! یہی ہے جسے تم پروردگار ٹھہراتے ہو، بھلا ایسی چیز بھی پروردگار ہو سکتی ہے جو ابھی سامنے چمکتی ہو اور ابھی غروب ہو جائے

اسی طرح جب چمکتا ہوا چاند نکلتا (اور اس کی پرستش کی جاتی) تو وہ اپنی قوم سے کہتا کہ تم کہتے ہو، یہ میرا پروردگار ہے؟ اُس کے بعد جب وہ بھی غروب ہو جاتا تو وہ اُن سے کہتا کہ تم مجھ سے کہتے تھے کہ میں اسے پروردگار تسلیم کر لوں؟ اگر میرے نشوونما دینے والے نے میری راہنمائی حقیقت کی طرف نہ کی ہوتی، تو میں بھی تمہاری طرح گمراہ ہو جاتا۔ اور اس قسم کے غماص کو خدا ماننے لگ جاتا جنہیں اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں۔

جب سورج اپنی تابناکیوں کے ساتھ طلوع ہوتا، اور وہ قوم اس کی پرستش کرتی تو وہ اُن سے کہتا کہ تم کہتے ہو کہ یہ بہت بڑا ہے، اس لئے اسے پروردگار تسلیم کر لو؟ جب وہ بھی غروب ہو جاتا، تو وہ اُن سے کہتا کہ یہ دیکھو، تمہارے پروردگار کا کیا حشر ہوا!

ان کائناتی دلائل کے بعد وہ اُن سے کہتا کہ تم جن قوتوں کو خدائی اختیارات و اقتدارات میں شریک سمجھتے ہو (وہ خواہ اجرام سماوی ہوں یا دیوی دیوتا۔ خواہ تمہارے مذہبی پیشوا ہوں یا خود تمہارا بادشاہ) میں اُن کے خدا ہونے کے تصور تک سے بیزاد ہوں۔ (۳۶/۸۹)

آپ نے غور فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (نظری بحث کے بجائے) مشاہداتی دلائل سے کس طرح اُن کی توہم پرستی کا ابطال کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس حتم و یقین کے ساتھ، اور جس مدلل انداز سے، ایک سائنسدان قرآنی حقائق کا اثبات کر سکتا ہے، نظری علوم کے، حاملین ایسا نہیں کر سکتے۔ نظری علوم کے حامل سمجھا سکتے ہیں: "سائنسدان دکھا سکتا ہے" اور سمجھانے اور دکھانے میں جو فرق ہے، ظاہر ہے۔ قرآن کریم اسی لئے مشاہداتِ فطرت پر

سائنسک طریق استدلال

بار بار زور دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہی طریق اختیار کیا تھا، اور اسی بنا پر اُن کے دلائل قاطع ثابت ہوئے تھے۔ (۴/۸۴)۔ اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے (انی بُرئِیْ مِمَّا تُشْرِكُوْنَ کہا ہے (۴/۸۴) سورۃ الصافات میں (انی سَقِیْمٌ کہا ہے۔ (۳۶/۸۹)۔

بدیہی طور پر یہاں واقعہ تو حضرت ابراہیمؑ کا بیان کیا گیا ہے، لیکن اس میں ایک ایسی حقیقت واضح کی گئی ہے جو اب دی گئی ہے اور غیر متبدل بھی۔ یہاں کہا یہ گیا ہے:

آفل کا مفہوم لَا أُحِبُّ الْاَفْلٰیْنِ۔ چاند، سورج، ستاروں کی جہت سے تو اس کا ترجمہ "ڈوب جانے والے" کیا جائے گا۔ لیکن افل کے درحقیقت معنی ہوتے ہیں

وہ جو ایک حال پر ندر ہے، جس میں ہر آن تغیر ہوتا رہے۔ زمانہ نزولِ قرآن میں تو لوگوں کو چند ایک چیزوں

ہی میں تغیر نظر آتا تھا۔ لیکن اب سائنٹیفک (SCIENTIFIC) تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر (CHANGE) واقعہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو حتیٰ کہ پتھر کی چٹان میں بھی ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ کائنات مادہ سے تشکیل پذیر ہوئی ہے۔ اور مادہ کی تحلیل کی جائے تو وہ آخر الامر توانائی محض (PURE ENERGY) رہ جاتا ہے، جو مسلسل حرکت ہے، اور تغیرات کی آماجگاہ۔

لہذا، یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تغیر پذیر شے خدا نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دیگر، مخلوق میں سے کسی کو بھی مقام الوہیت حاصل نہیں ہو سکتا۔ اَللّٰہ (خدا) وہی ہو سکتا ہے جو تغیر پذیر (افل) نہ ہو۔ سورۃ الرحمن میں ہے: کُلُّ شَیْءٍ عَلَیْہَا فَاَن ۙ وَ یَبْقَی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَلِ وَ الْاِکْرَامِ ۝ (۵۵-۶۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”کائنات کی ہر شے فنا ہو جائے گی اور باقی صرف خدا کی ذات رہ جائیگی“ اس میں شبہ نہیں کہ کائنات جو مخلوق ہے، خدا کی طرح ابدی نہیں۔ ابدیت

صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن یہاں اشیائے کائنات کو فَاَن کہا گیا ہے اور ذات خداوندی کے لئے بقا کا لفظ آیا ہے۔ فنا، بقا کی ضد ہے۔ بقا کے معنی ہوتے ہیں اپنی حالت پر برقرار رہنا۔ اس لئے فنا کے معنی ہوں گے تغیر پذیر ہونا۔ بنا بریں آیات (۵۵-۶۴) کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے، اور تغیرات سے ماوراء صرف ذات خداوندی۔ سورۃ القصص میں ہے: کُلُّ شَیْءٍ

ہَالِکٌ اِلَّا وَجْہُہٗ ط (۲۸)۔ یہاں ہَالِک کے معنی بھی فَاَن کے ہیں، لیکن ایک نہایت لطیف فرق کے ساتھ سائنسدانوں کی تحقیق یہ ہے کہ جس چیز کو ہم تغیر (CHANGE) کہتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ چیز تو ویسے کی ویسی رہتی ہے، اس میں ایک تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ تغیر (CHANGE) سے وہ شے وہی نہیں رہتی۔ وہ معدوم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی شے متشکل ہوتی ہے۔

لیکن یہ تبدیلی ایسی سُرعَت اور لطافت واقع ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس چیز میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس تحقیق کی رُو سے (کہ وہ شے معدوم ہو جاتی ہے) آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے فَاَن کے ساتھ ہَالِک کا لفظ لاکر کیسی عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ کائنات کی ہر شے میں اس ”عدم و وجود“ کا (PROCESS) جاری ہے۔ اس سے ماوراء صرف خدا کی ذات ہے۔

ہلاکت میں تغیر کے ساتھ، قوت میں کمی آجانے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اور سائنس کے انکشافات اس کی بھی تصدیق کر رہے ہیں کہ اشیائے کائنات (بالخصوص اجرام فلکی) کی قوت اور حرارت میں ہر آن کمی واقعہ

حقیقت نبوت

صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے، حقیقت نبوت سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ نبوت انسانی ملک نہیں، جسے تجارب و مشاہدات سے حاصل کیا جائے۔ وہ خدا کی موبہبت عظمیٰ ہے جس کا نزول قلب نبویٰ پر ہوتا ہے۔ لہذا حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ (معاذ اللہ) کو اکب پرستی کے شرک کے بعد توحید کی طرف آئے تھے۔ اتنی بڑی جسارت ہے جس کے تصور سے روح کا پتہ ہے۔ خود قرآن کریم نے جس انداز و ترتیب سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے، وہ اس پر شاہد ہے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے (معاذ اللہ) اقرب کو اکب پرستی کا بیان نہیں، بلکہ قوم کے سامنے حقیقت سے پردہ اٹھانے کا ایک موثر انداز ہے جس میں نظری دلائل کے بجائے عینی مشاہدہ کے طریقہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ واقعہ کی ابتداء بت پرستی کے خلاف حضرت ابراہیمؑ کے اعتراض سے ہوتی ہے۔ (دیکھئے (۶/۲۶))۔ اس کے بعد کَذٰلِكَ نَرٰی اٰبْرٰهٖمَ مَلْحُوٓتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶/۷۶) سے ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ ملکوتِ ارض و سماوات (نظامِ ارضی و سماوی) کے متعلق مقامِ علم و یقین تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد اصل

انذارِ براہیمی

واقعہ فلما سے شروع ہوتا ہے جو دونوں آیتوں کے باہمی تعلق کی ایک محکم کڑی ہے یعنی پہلے نظامِ ارضی و سماوی کے راز ہائے سرستہ حضرت ابراہیمؑ پر منکشف کئے گئے اور اس کے بعد (فلما) یہ واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی آخری آیت (۶/۷۶) میں ارشاد ہے کہ جب سورج بھی ڈوب گیا، تو کہا: قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَبْرٰهٖمَ کُوْنٌ۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ قوم سے مخاطب اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ حضراتِ ابراہیمؑ یہ باتیں اپنی قوم کو سمجھا رہے ہیں، سورج، چاند اور ستاروں کے حالات پر غور کر کے (معاذ اللہ) اپنے شرک سے تائب نہیں ہو رہے۔ اس سے بھی آگے بڑھتے، آیت ۷۷ میں ارشاد ہے: وَحَآجِبْہٗ قَوْمَہٗ۔ آپ کی قوم نے آپ سے جھگڑا شروع کر دیا۔ یہ مکڑا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ سارا معاملہ قوم کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اور پھر

آخری آیت (۶/۷۷) نے تو اس معاملہ کو بالکل شک و شبہ سے بلند کر کے رکھ دیا ہے، جہاں فرمایا کہ وَتِلْکَ حُجَّتُنَا اَتٰیْنٰہَا اِبْرٰهٖمَ عَلٰی قَوْمِہٖ۔ یہ وہ دلیل محکم (حجت) و برہان قاطع تھی جو ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی۔ اب اس کے بعد معلوم نہیں کونسی چیز مبہم رہ جاتی ہے جو ذہن کو حضرت ابراہیمؑ کی (معاذ اللہ) ستارہ پرستی کی طرف منتقل کر دے؟ بجز اس کے کہ اسرائیلیات کے تتبع میں ہمارے مفسرین نے ایسا لکھ دیا ہے!

حضرت ابراہیمؑ نے مظاہر فطرت کی الوہیت کے ابطال کے بعد فرمایا:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

میں اپنی تمام توجہات کامرکز صرف اُس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو اس تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی ہے (اور جس کا قانون یہاں اس طرح نافذ العمل ہے کہ اُس سے دستاروں کو مفر ہے، نہ چاند اور سورج کو مجالِ سربانی)۔ اس لئے میں اُس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔ یہ میرا دو ٹوک فیصلہ ہے۔

توحیدِ خالص | اپنی تمام توجہات، خواہشات، آرزوؤں، تمناؤں، مقاصدِ حیات کو یکسو ہو کر اس مقصد کے لئے وقف کر دینا، جسے خدا نے متعین فرمایا ہے، یہ ہے خدا پر ایمان لانا اور شرک سے مجتنب ہونا۔ اور یہ کچھ اتباعِ قوانینِ خداوندی کی رو ہی سے ممکن ہے۔ ان قوانین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ یہ تغیر آشنا نہیں (۶/۱۱۶)۔ قوانینِ خداوندی کے سوا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو یہ خصوصیت ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل سمجھنا (جیسا کہ فقہی قوانین کو سمجھا جاتا ہے) شرک ہے۔

لیکن اس قدر واضح اور قاطع دلائل کے باوجود وہ قوم حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ جھگرتی رہی:

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۖ قَالَ أَتُجَاجُونِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدِينَا ۖ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۖ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۖ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ۝

وہ قوم اسی طرح، ابراہیمؑ سے روو کد کرتی اور چاہتی کہ اُسے، اس کے مسلک سے ہٹا دے۔ وہ اُن سے کہتا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں روو کد کرتے ہو اور چاہتے ہو کہ میں اُس کا راستہ چھوڑ دوں، (لیکن میں تمہاری بات کیسے مان سکتا ہوں) جب کہ خدا نے مجھے سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ (تم مجھ سے کہتے ہو کہ تمہارے معبود بڑی قوتوں کے مالک ہیں اس لئے مجھے اُن سے ڈرنا چاہئے۔ لیکن میں اُن کی

خوف، شرک میں ہوتا ہے | حقیقت سے باخبر ہوں، اس لئے) اُن سے قطعاً نہیں ڈرتا۔ یہ مجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ نقصان صرف قانونِ خداوندی کے مطابق

پہنچتا ہے اور اس کی نگاہوں سے کوئی شے پوشیدہ نہیں رہ سکتی (اس لئے مجھے صرف اس کی احتیاط کرنی چاہئے کہ اُس کے قانون کی خلاف ورزی نہ ہو)۔ حیرت ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی

تم حقیقت کو نہیں مانتے؟ اس کے بعد کہا:

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُكُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنْتَ كُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ
مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ
إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

۶
۸۲

توحید، خوف کی قاطع ہے | بھلا میں ان مٹی کی مورتیوں (معبودانِ باطل) سے کیوں ڈروں جنہیں کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ ڈرنا تو تمہیں چاہئے جو اللہ جیسی مختارِ کل ہستی کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔ حالانکہ اللہ نے تم سے کہیں نہیں کہا کہ یہ واقعی میرے اختیار میں شریک ہیں۔

اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے تو بتاؤ کہ تم میں اور مجھ میں، کون امن و اطمینان کا زیادہ حقدار ہے (اور کسے لرزاں و ترساں رہنا چاہئے) تمہیں یا مجھے؟ (خوف، شرک کا لازمی نتیجہ ہے (۲۲)، توحید سے انسان کے دل میں اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا)۔

شرک کا مفہوم کیا ہے، اور شرک سے خوف کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ یا خوف کا نتیجہ شرک ہوتا ہے، اس سے سابقہ جلدوں میں واضح کیا جا چکا ہے۔ (انڈکس میں شرک اور خوف کے عنوانات دیکھئے)۔ لہذا کسی تغیر پذیر اور فنا آشنا شے کو اپنے سے برتر سمجھ کر اس سے ڈرنا اور اس ڈر کی وجہ سے اس کے سامنے جھکنا شرک اور ظلمِ عظیم ہے۔ سورۃ النقص کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ط (۲۸)۔ پوری آیت یوں ہے: وَلَا تَكْفُؤُنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ اور دیکھنا اتم مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی وَلَا تَدْعُ مَعَ إِلَهِكَ إِلَهًا آخَرَ۔ خدا کے ساتھ دوسروں کی بھی آلہ (صاحبِ اقتدار) تسلیم نہ کر لینا۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ۔ یا دیکھو! صاحبِ اقتدار صرف خدا کی ذات ہے۔ اس لئے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ط اس کے سوا کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔

حکومت صرف خدا کی ہے | اس سے سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کو آلہ ماننے، اور اس کے سوا کسی اور کو آلہ تسلیم نہ کرنے کا عملی مفہوم کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ لَہُ الْحُكْمُ۔ یعنی حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اگر انسانوں کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے، تو یہ شرک ہے اور اس سے انسان کا قلب، خوف کا نشیمن بن جاتا ہے۔ وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۹)۔ زندگی کے تمام

معاملات کے تصفیہ کے لئے اُس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یعنی اس کا حل اس کی کتاب کی رو سے تلاش اور اختیار کرنا چاہیئے۔ کہ غیر متغیر صرف اُسی کے احکام و قوانین ہیں۔ امن و اطمینان اُنہی کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان غیر متغیر قوانین کی اطاعت کریں، نہ کہ انسانوں کی محکومیت اختیار کرنے والوں کو جنہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اُن کا آقا اس وقت کیا کر رہا ہے اور کل کو کیا کہہ رہا ہے گا! انسانوں کی حکمرانی میں کوئی آئین اور قوانین غیر متبدل نہیں ہوتے، نہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے تابع رہنے والے انسانوں کو کبھی امن و اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ امن نصیب ہوتا ہے اُن لوگوں کو :

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿۸۳﴾

ان حضرات کی روشنی میں، اس میں شک کی گنجائش کہاں ہے کہ امن و اطمینان انہی کے لئے ہے جو قانون خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور عملاً اُس کی خلاف ورزی نہ کریں۔ ہر شے کو اُسکے صحیح مقام پر رکھیں، اور شرک سے محتجب رہیں (۳۱)۔ (کیونکہ امن اور بے خوفی کے لئے ایمان اور اعمال صالح بنیادی شرط ہے۔ ۲/۲۶) یہی وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ پر گامزن ہوں گے۔

یہاں کہا گیا ہے کہ امن اور ہدایت اُن کے حصے میں آتے ہیں جو اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث نہ ہونے دیں۔ قرآن کریم میں شرک کو ظلم، بلکہ ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ (۱۱۳) ظلم کے معنی ہوتے ہیں جس شے کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اُسے وہاں پر نہ رکھنا۔ شرک میں مظاہر فطرت یا انسانوں کو اُن کے مقام عبادت سے اُوپر لے جا کر الوہیت کا درجہ دے دیا جاتا ہے، اور خدا کو اُس کے بلند و بالا مقام احدیت سے نیچے اتار کر مخلوق کے ہمہوش کر دیا جاتا ہے۔ یہ ظلم ہے، بلکہ ”ظلم عظیم“۔ یہاں یہ آیت جس سیاق و سباق میں آئی ہے، وہ واضح ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں کسی آفل کو خدا کا درجہ نہیں دے سکتا۔ اور آفل کے معنی ہم نے دیکھ لئے ہیں۔ یعنی تغیر پذیر۔ اس ایک لفظ نے، خدا کے سوا، ہر شے کی الوہیت کو باطل قرار دے دیا، کیونکہ کائنات میں تغیر سے ماوراء صرف خدا کی ذات ہے۔ خدا نے کائنات اللہ اور سنت اللہ کو غیر متبدل کہا ہے۔ (۱۱۴ ذ ۳۳)، یعنی قوانین و اقتدار خداوندی ہی غیر متبدل اور تغیرنا آشنا ہیں۔ انہی کی محکومیت اختیار کرنے سے انسان کو حقیقی امن نصیب ہو سکتا ہے، اور یہی راہ اسے اُس کی منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔ اگر ہم ان اقدار و قوانین کے بجائے انسانوں کے

عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

(ابراہیمؑ اپنے مشن میں کامیاب ہوا۔ ازاں بعد) ہم نے اُسے اسحاقؑ جیسا بیٹا اور یعقوبؑ جیسا پوتا عطا کیا۔ ان سب کو ہم نے زندگی کی سیدھی راہ دکھا دی تھی۔ وہی راہ جو اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی۔ اور پھر ابراہیمؑ کی نسل میں داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ ایوبؑ۔ یوسفؑ۔ موسیٰؑ اور ہارونؑ کو دکھائی تھی۔ (اور وہ اس راہ پر چل کر کامیاب و کامران ہوئے تھے) یوں ہم ان لوگوں کی محنت کو بار آور کیا کرتے ہیں جو حُسنِ کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں۔ انہی میں ذکر کیا۔ یحییٰؑ۔ عیسیٰؑ اور ایساؑ کا شمار ہے۔ یہ سب صالحین میں سے تھے۔

نیز اسمعیلؑ۔ الیسعؑ۔ یونسؑ اور لوطؑ، اسی زمرہ میں شامل تھے۔ ان سب کو، زندگی کی خوشگوار یوں ہیں اقوامِ عالم پر فضیلت حاصل تھی۔

یہاں تک ان حضرات کا نام لیا گیا جو متعین طور پر زمرہٴ انبیاء میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ :

وَمِنَ الْآبَاءِ لَهُمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

اور ان کے آباء و اجداد، اور ان کی نسل، اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے کتنوں کو برگزیدہ کیا۔ اور زندگی کی اُسی ترازو بدوش، سیدھی راہ پر چلایا۔

مذکورہ انبیاء کرامؑ کے آباء و اجداد، نسل یا بھائی بندوں میں سے ہر ایک کو نبوت نہیں ملی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض انبیاء بھی ہوں۔ لیکن قرآن کریم نے ایسا بالتصریح نہیں کہا۔ اُن کے اقتبا (برگزیدگی) کا ہی ذکر کیا ہے۔ اور برگزیدہ ہر نیک عمل انسان ہو سکتا ہے۔ سورہ حج میں جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے : هُوَ اجْتَبَاكُمْ۔ (۲۲)۔ ”خدا نے تمہیں برگزیدگی عطا کی ہے“ یہ تمام خدا کے متعین کردہ راستے پر چلتے تھے۔

ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

یہ خدا کی طرف عطا شدہ وہ رہنمائی ہے جس سے ہر وہ شخص جو صیغِ راستہ پر چلنا چاہے، صیغِ راستے کا پتہ نشان پالیتا ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ، اس راستے کے ساتھ دوسرے راستوں کو بھی ملا لیں، تو ان کی محنت رائیگاں ہو جائے گی (اُس مسافر کی طرح جو کبھی ایک راہ پر چلے، کبھی دوسرے پر۔ یوں، وہ بھر چلنے سے وہ تھک

تو ضرور جائے گا، لیکن منزل مقصود تک کبھی نہیں پہنچ پائے گا۔ منزل تک وہی پہنچے گا جو ٹھیک اُس راستے پر چلتا جائے جو اُس کی منزل کی طرف جاتا ہے۔

یہ وہ ہیں :-

۹. ۶ ۹ **أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ وَالْحُكْمُ وَالنَّبُوءَةُ ۚ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۝**

یہ (جن کا اوپر ذکر کیا گیا) وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب (ضابطہ قوانین)، حکومت (لوگوں میں کتاب خداوندی

کتاب و حکم و نبوت کے مطابق فیصلے کرنے کے اختیارات) اور نبوت (خدا کی طرف سے وحی پانے کا امتیاز خصوصی) عطا کئے تھے (۳۵ ذ ۳۸)۔

اگرچہ (اصلی) کتاب جہاں انبیاء کے اتباع کے مدعی ہیں، اس ضابطہ خداوندی پر چلنے سے انکار کرتے ہیں جو اب

قرآن میں دیا گیا ہے، تو اس سے یہ ضابطہ لاچار اثر ہو کر نہیں رہ گیا) اسے ہم نے ان لوگوں کے سپرد کر دیا ہے

جو اس کی صداقت سے انکار نہیں کرتے۔ (۳۵ ذ ۳۸)

اوپر جن کا ذکر آیا ہے، ان میں انبیاء اور غیر انبیاء سب شامل ہیں۔ ان میں سے نبوت صرف انبیاء کرام کو عطا ہوئی تھی، اور نبوت سے مراد وحی کے ذریعے ملنے والی کتاب تھی جو ہر نبی کو ملی تھی (۲۱ ذ ۲۲)۔ اس کتاب کو نبی اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا۔ اسے دوسروں تک بھی پہنچاتا تھا، اور جو اُس کی صداقت پر ایمان لے آتے تھے، وہ اُس کی اُمت میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس اعتبار سے کتاب میں انبیاء اور غیر انبیاء دونوں شامل ہوتے تھے۔ انبیاء بلا واسطہ اور اُس کی اُمت بالواسطہ۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دوسری جگہ کہا ہے :

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ (۴۵ ذ ۴۶)۔ اور اُمتِ مسلمہ (اُمتِ محمدیہ)

لے لے جن کا ذکر اوپر آیا ہے اُن میں انبیاء اور غیر انبیاء سب شامل ہیں (انبیاء کے آباء۔ نسل اور بھائی بندوں میں غیر

انبیاء بھی شامل ہیں)۔ لہذا، ان میں انبیاء کرام پر وحی کے ذریعے کتاب نازل کی (۲۱ ذ ۲۲)۔ انبیاء کی وساطت سے

کتاب اُن کے متبعین کو ملی۔ اور اسے نافذ کرنے کی عملی قوت بھی۔ اس طرح کتاب و حکومت میں نبی اور غیر نبی دونوں

شامل ہو جاتے ہیں۔ اور نبوت صرف انبیاء کا خاصہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ کے بعد نبوت ختم ہو گئی اور کتاب و

حکومت، حضور کی اُمت میں آگے چلی۔

کو وارث کتاب قرار دیا ہے (۳۵/۳۵)

کتاب، ضابطہ قوانین کو کہتے ہیں، اور قوانین بے مقصد ہوتے ہیں جب تک اُن کے ساتھ قوت نافذ نہ ہو۔ اسے حکومت کہا جاتا ہے۔ اس لئے انبیاء اور اُن کی اُمت کو کتاب کے ساتھ حکومت بھی عطا ہوئی تھی۔ سو بات یوں ہوئی کہ

(i) نبوت نہ ہو تو خدا کی کتاب نہیں مل سکتی۔

(ii) کتاب نہ ہو تو ہدایت نہیں مل سکتی۔

(iii) کتاب کے ساتھ حکومت نہ ہو تو کتاب کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ وہ محض وعظ بن کر رہ جاتی ہے۔

(iv) کتاب، بلا حکومت ہو تو وہ مذہب ہوتا ہے، اور کتاب کے ساتھ حکومت ہو تو دین متکمل ہوتا ہے، اور

دین کا تمکمل ہی منشائے خداوندی ہے۔ (۲۴/۵۵)۔

لیکن اس حکومت سے مفصل لوگوں کو اپنا محکوم یا غلام بنانا نہیں۔ انہیں خدا کا عہد بنانا مقصود ہوتا ہے اس کی وضاحت آیت (۳۰/۳۰) میں کی جا چکی ہے، وہاں بھی کتاب اور حکومت اور نبوت تینوں کا ذکر ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام انبیاء کو امت واحدہ (ایک ہی برادری کے افراد) قرار دیا ہے: اِنَّ هَذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَاَنَا سَرَبُكُمْ فَاَعْبُدُوْنِ (۲۱/۹۱)۔ یہ تمام انبیاء ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ کیونکہ یہ سب عدل کے فرستادہ تھے۔ انہیں دین بھی ایک ہی دیا گیا تھا

(۲۲/۱۳) اس لئے ان کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰی اللّٰهُ فِیْہِذِہُمْ اَقْتَدِہٖ قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِۗۤ اَجْرًاۚ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٰی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

یہ (انبیاء) وہ ہیں جنہیں اللہ نے زندگی کی صحیح راہ دکھا دی تھی۔ پس (اے رسول!) تم بھی اسی راستے پر چلو جس پر اللہ نے انہیں چلایا تھا۔ (اور لوگوں کو اسی راہ کی طرف دعوت دیتے جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ) میں اس راہنمائی کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ یہ تو تمام نوریہ انسان کے لئے ضابطہ حیات ہے (میری ذاتی ملکیت نہیں کہ تم سے اس کی قیمت وصول کروں)۔

بیساکر پہلے بتایا جا چکا ہے، ایک چیز ہوتی ہے زندگی کے لئے اصول و اقدار۔ انہیں دین کہا جاتا ہے اور دوسری چیز ہوتی ہے ان اصولوں کو نافذ کرنے کے طور طریقے۔ اسے اصطلاح میں شریعت (یا جزئیات)

کہا جاتا ہے۔ الدین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ لیکن اس پر چلنے کے طور طریقے (شریعتیں) ہر رسول کے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے مختلف تھیں۔ ان (احکام شریعت) میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں، اور بعض ان میں سے منسوخ بھی کر دی جاتی تھیں۔ (دیکھئے اندکس میں عنوان ناسخ و منسوخ)۔ لہذا، شریعت ہر نبی اور اس کی اُمت کی مختلف ہوتی تھی۔ آیہ زیر نظر (۶۱) میں جو کہا گیا ہے کہ تم اس ہدایت پر چلو جو ان **عَدِّین کا اتباع** تمام انبیاء کو دے دی گئی تھی، تو اس سے مراد الدین ہے جو حضور نبی اکرمؐ کو انبیاء سابقہ کی طرح) بذریعہ وحی عطا ہوا تھا۔ اس سے مراد ان (انبیاء سابقہ) کی شریعتوں کا اقتدا نہیں، اس لئے کہ اول تو وہ شریعتیں اپنی غیر مُحرَف شکل میں کہیں موجود نہیں تھیں۔ اور اگر موجود ہوتیں بھی، تو وہ وقتی اور ہنگامی تھیں۔ ابدی طور پر واجب الاتباع نہیں تھیں۔

اس آیت میں چار لفظوں میں ایک عظیم حقیقت کا بیان کیا گیا ہے۔ یعنی رسول اعلان کرتا ہے لَا اسْتَلْکُمْ عَلَیْکُمْ اَجْرًا ط میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اور تمہارے لئے جو کچھ کرتا ہوں، اس کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔

اجر رسالت رسول ایک ناصح مشفق کی طرح اپنی قوم کی طرف آتا تھا۔ اُس کی نصیحت اس قوم کے بھلے کے لئے ہوتی تھی۔ ناصح کی ایک خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ جو کچھ وہ کہے، وہ حق اور صداقت پر مبنی ہو اور وہ اسے دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرے تاکہ وہ قوم کی عقل و فکر کو اپیل کرے۔ اور دوسری خصوصیت یہ کہ اس نصیحت فرمائی میں اُس کا اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ وہ خالصتاً ان لوگوں کی ہی خواہی پر مبنی ہو۔ یہ خصوصیت بڑی گراں بہا ہوتی ہے، اور نصیحت کے مؤثر ہونے کے لئے بڑا قوی ذریعہ۔ اگر مخاطبین کو یقین ہو جائے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد مضمر نہیں، تو ان کا (کم از کم) ہوشمند طبقہ ان سے کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ مضمر نہیں، اس لئے تم اس کی بات تو سن لو۔ یہ جو دن رات اپنی جان کھپاتا ہے۔ اتنی تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ اتنی مشقتیں اٹھاتا ہے، اور اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں، تو سوچنے کی بات ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ لہذا، بے غرض نصیحت اور بے اجر چارہ گرمی کا بڑا گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے چنانچہ اسی قسم کا تھا وہ فرد ہوشمند جس نے بستی کے تخریب کاروں سے کہا تھا کہ تم ان مُرسلین کا اتباع کرو۔ تم دیکھتے نہیں کہ وہ تم سے اس ہی خواہی کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے (۳۶)۔ یہ وجہ ہے کہ ہر رسولؐ اپنے پیغام کو پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ اعلان کرتا تھا کہ لَیْقَوْم لَا اسْتَلْکُمْ عَلَیْکُمْ اَجْرًا ط (۱۱)۔ "اے مری قوم! میں

اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔

حضور نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر کہ میں تم سے کوئی اجر رسالت نہیں مانگتا، اس کی وضاحت کر دی کہ اَلَا مَن شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهِ سَبِيلًا (۲۵) ”میرا مقصد فقط اتنا ہے کہ تم میں سے جو چاہے، خدا کی طرف جانے والا راستہ اختیار کر لے، اور یہی میرا اجر رسالت ہے۔ مَا سَأَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ“ (۳۴) ”اور یہ اجر خود تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ اِنْ اَجْرِيْ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ“ ”میرا اجر، میرے خدا کے ہاں سے، مجھے ملے گا۔

یہ آیات اس قدر واضح ہیں کہ ان کا مفہوم سمجھنے کے لئے کسی تشریح اور تفسیر کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک آیت، بلکہ اس کے چند الفاظ ایسے ہیں جن کے اختلافی مفہوم سے اُمت منتقل طور پر دو پارہ ہو گئی ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کے مفہوم کی طرف آؤں، یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ، جیسا کہ میں شروع سے لکھنا چلا آ رہا ہوں، میرا تعلق کسی مذہبی فرقہ سے نہیں۔ میں فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہوں۔

میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں | میں صرف مسلمان ہوں اور قرآن کریم کا طالب علم۔ اس طلب علم قرآنی کے سلسلے میں بھی میرا یہ ایمان ہے کہ کسی خاص عقیدہ، نظریہ

یا تصور کو پہلے سے ذہن میں جاگزیں کر کے قرآن کے سمجھنے کی کوشش کرنا بھی شرک ہے۔ قرآن کی طرف خالی الذہن ہو کر آنا چاہیئے اور اس طرح اس کی بارگاہ سے جو تعلیم ملے اس کی صداقت پر ایمان رکھنا چاہیئے۔ اس صراحت کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ آیت نہ یہ نظر کے اختلافی مفہوم پر بحث کرتے ہوئے بھی مجھے نہ کسی فرقہ کی رعایت مقصود ہے، نہ کسی کی مخالفت مطلوب۔ میں صرف اسی نتیجہ کو پیش کروں گا جس تک میں، اپنی بصیرت قرآنی کی رُو سے، پہنچا ہوں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے ہر رسولؐ نے اس کا اعلان کیا، اور حضور نبی اکرمؐ نے تاکید فرمایا کہ ”میں تم سے تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا۔“

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۲/۴۳ میں ہے :

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (۶۲)۔

مودۃ فی القربی

ایک گروہ اس کا ترجمہ کرتا ہے: ”میں تم سے اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو“ شیعہ حضرات ”رشتے داروں“ سے مراد لیتے ہیں ”آل محمد“۔ یعنی حضرت فاطمہؑ کے بطن سے حضرت علیؑ کی اولاد (اور آگے تک اُن کا سلسلہ)۔ انہیں عرف عام میں سیّد (سادات) کہا جاتا ہے۔ اس مفہوم کی رُو سے، سیّدوں کی محبت، قیامت تک کے لئے، مسلمانوں پر فرض قرار پائی۔ جس مسلمان کے دل میں کسی سیّد کے خلاف ذرا سا (نفرت اور عناد) تو ایک طرف) بیزارى اور تکدر کا جذبہ پیدا ہو گیا، وہ معصیتِ رسولؐ کا مرتکب ہو گیا! یہ تو ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا کہ یہ ترجمہ یا مفہوم، خود عربی زبان کی رُو سے، بھی کس طرح ناقابل قبول ہے، اور یہ بھی کہ یہ کیسے وجود میں آیا۔ یہاں صرف یہ دیکھئے کہ اس مفہوم کی رُو سے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کی ساری عمارت کس طرح منہدم ہو جاتی ہے قرآن کریم، تکریمِ انسانیت کا پیغام ہے کہ آیا اور اُس نے تمام نوعِ انسان کو، ایک عالمگیر برادری کی شکل میں، متشکل کرنا، اپنا نصب العین قرار دیا۔ اس کے لئے اُس نے نسلی امتیاز و تفریق کے تصور کی جڑ کاٹ دی۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تمام انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱۶)۔ اور ان کے مدارج ان کے اعمال کی رُو سے متعین ہوتے ہیں — وَلِكُلِّ دَرَجَتٍ مِّمَّا عَمِلُوا (۱۷)۔ اس معیار کی رُو سے سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جس کے اعمال سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۱۸)۔ اس میں کسی کا بیٹا، باپ یا بھائی یا اور رشتہ دار ہونا کچھ فرق نہیں پیدا کرتا۔ قرآن کریم نے اس کی پہلی مثال سب سے پہلے پیغمبر کی زندگی سے پیش کی ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے خدا سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے کو غرقابی سے بچایا جائے کیونکہ وہ اس کے اہل میں سے ہے تو جواب ملا کہ اِنَّكَ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ (۱۹)۔ اے نوحؑ! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ اِنَّكَ عَلٰی غَیْبٍ صَاحِق (۲۰)۔ اُس کے اعمال صالح نہیں، اور اس کے بعدیتنبیہ کی کہ فَلَا تَسْتَنْسِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ (۲۱) جس بات کا تجھے علم نہ ہو، اُس کی ہم سے طلب نہ کیا کرو۔ اِنِّیْۤ اَعْطٰکَ نَسْلَ پُرستى کے خلاف اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجٰہِلِیْنَ (۲۲)۔ تمہیں یہ نصیحت اس لئے کی جاتی ہے تاکہ تم جاہلوں جیسی باتیں نہ کرو۔ آپؐ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ نبیؐ کا بیٹا ہونا بھی اسے کسی رعایت کا مستحق قرار نہیں دے سکتا۔

اور آگے بڑھئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے مختلف مراحل میں سے گزرنے کے بعد اپنے آپ کو انسانیت کے بلند ترین مقام کا اہل ثابت کر دیا تو ارشاد باری تعالیٰ ہوا: اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (ہم تمہیں نوح انسان کی امامت کا مستحق قرار دے دیا)۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ بارالہ! تیرا یہ وعدہ میرے ہی ساتھ ہے یا میری اولاد میں بھی یہ اس طرح منتقل ہوتا رہے گا۔ فرمایا: لَا یُنَالُ عَهْدِیْ الظَّالِمِیْنَ۔ (میری اولاد میں سے جو تیرے نقش قدم پر چلتا رہے گا اُس کے ساتھ تو ہمارا یہ وعدہ برقرار رہے گا، لیکن جو اس سے انحراف کرے گا اور سرکشی برتے گا، اُس کے ساتھ ہمارا یہ وعدہ نہیں۔ اسے محض تمہاری اولاد میں سے ہونا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ (جو میرا پیروں سے جو میرا اتباع کرے گا، جو اس روش سے انحراف برتے، وہ میرا ہے ہی نہیں۔

انبیاء اکرام کا رشتہ دار ہونا تو ایک طرف، نبی کریمؐ نے خود اپنے متعلق فرمایا: اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ عَصِیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۶/۱۵)۔ اگر میں بھی خدا کی معصیت کا مرتکب ہوں تو ڈرتا ہوں کہ اُس کے عذاب سے بچ نہیں سکوں گا۔

ان تصریحات (اور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم، قانون مکافاتِ عمل) کی روشنی میں کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ یہ فرمائیں گے کہ (اور وہ بھی ارشادِ خداوندی کی رو سے کیونکہ آیت میں قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ..... ہے۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ.....) میں تم سے اپنی رسالت کا یہ اجر مانگتا ہوں کہ تم میری آل (سیّدوں) سے محبت کرو خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اس قسم کی نسل پرستی کی تعلیم کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا! حضورؐ نے جو اُمت متشکل فرمائی، اس میں مختلف نسلوں، قوموں، قبیلوں، خاندانوں کے افراد شامل تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب (صحابہؓ) کو مستحق شرف و اعتبار قرار دیا تھا۔ ان میں حضورؐ کے رشتہ دار بھی تھے۔ انہیں کسی خصوصی مرتبہ کا حقدار نہیں ٹھہرایا تھا۔ ان کے برعکس ابولہب حضورؐ کا حقیقی چچا تھا، اسے خدا نے (نام لے کر) جہنم کا ایندھن قرار دیا تھا۔ اور حضورؐ کی رشتہ داری اس کے کسی کام نہیں آسکتی! آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ کا آغاز اس طرح فرمایا تھا کہ

یاد رکھو! جاہلیت کے تمام دستور و آئین میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ میں نے انہیں مسل و الاسبے اس کے بعد

فرمایا:

ایہا الناس! لا اِن ربکم واحد۔ و ان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی

وَلَا تَجْعَلْ عَلَىٰ عَرَبٍ - وَلَا لَأَحْمَرَ عَلَىٰ اسْوَدَ وَلَا لَأَسْوَدَ عَلَىٰ أَحْمَرَ - إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ -

”اے نوع انسانی! سن رکھو کہ تمہارا سب کا رب ایک ہے۔ تم تمام ایک ہی اصل کی شاخیں ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر

سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے سبب“

آپ نے اپنی وفات سے پہلے جو آخری خطبہ ارشاد فرمایا، اس کے آخری الفاظ تھے:-

۱۔ یہ پیغمبر کی بیٹی فاطمہؑ! اور اے پیغمبر کی بیوی صفیہؑ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

آپ سوچئے کہ جو پیغمبر (اپنی بیٹی) حضرت فاطمہؑ سے یہ کہے، کیا وہ یہ کہے گا کہ اس (فاطمہؑ) کی اولاد سے محبت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو؟ خدا نے تمام مومنوں کو بھائی بھائی کہا ہے (۲۹)۔ رَحِمَاءُ

بَيْنَهُمْ (۲۸) ان کی خصوصیت بتائی ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار۔ اس میں آل محمدؐ کی کوئی تخصیص و تفریق نہیں کی۔ اس لئے حضورؐ خصوصیت سے، اپنی اولاد (آل) کے متعلق یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ان سے محبت کرنا تم سب کا فریضہ ہے۔

آیت کے معانی | اب آئیے آیت کے الفاظ کے معانی کی طرف۔ الفاظ ہیں ”الْمُودَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ“ (۲۲)۔ قُرْبَىٰ کے معنی قرابت یا رشتہ داری کے ہیں۔ ”رشتہ دار کے نہیں۔

رشتہ داروں کے لئے قرآن مجید میں ذَوِ الْقُرْبَىٰ آیا ہے (۲۱)۔ یعنی ”رشتہ داری والے“۔ اگر میرے رشتہ دار کہنا ہوتا تو لَوْ لَا قُرْبَاؤِي کہا جاتا۔

صلہ رحمی، یا رشتہ داری کے تعلقات کی پاسداری (زمانہ جاہلیت میں بھی) عربوں کی نمایاں خصوصیت تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جب حضورؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا، تو اس کی مخالفت میں، قریش، اور قریش میں سے بھی بنی ہاشم، یعنی آپ کے قبیلہ اور خاندان کے افراد (قریب ترین رشتہ دار) سب سے آگے تھے۔ یعنی انہوں نے اس مخالفت میں اپنی قومی خصوصیت کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ سورہ توبہ میں ہے:

كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلَّا وَّلَا ذِمَّةً ط ... (۹)

”ان لوگوں سے ایسا عہد کیسے توقع کی جاسکتی ہے، جن کی حالت یہ ہے کہ اگر ان کا تم پر زور چلے تو یہ،

عہد و پیمان تو ایک طرف رہا، رشتہ داری کے تعلقات اور معاشرتی روالہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیں۔

اس سے آگے ہے: لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا وَّلَا ذِمَّةً ط (۹)۔ ”ان کی حالت یہ ہے کہ ان میں

سے جو شخص اسلام لے آتا ہے، یہ اس سے رشتہ داری کے عام تعلقات کی بھی پاسداری نہیں کرتے اور اسے

ایسی ایسی اذیتیں پہنچاتے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

یہ تھا اسلام کی ابتدائی دعوت کے دوران نبی اکرمؐ اور جماعتِ مؤمنین کے خلاف اُن کے رشتہ داروں کی مخالفت کی شدت کا عالم۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، حضورؐ نے اُن سے کہا تھا کہ میں تم سے اپنی رسالت کا تو کوئی اجر نہیں مانگتا لیکن تم میری اور جماعتِ مؤمنین کی مخالفت اور اذیت رسانی میں اس حد تک تو نہ بڑھ جاؤ کہ اپنی قومی خصوصیت کے خلاف رشتہ داری کے عام (معاشرتی) تعلقات کو بھی بالائے طاق رکھ دو۔

یہ مفہوم ہمارا ہی اخذ کردہ نہیں۔ متقدمین میں بھی یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے: صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی گئی تو حضرت سعید بن جبیرؓ نے کہا اس سے مراد قرابتِ آلِ محمدؐ سے ہے۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: تم نے عجلت سے کام لیا۔ سنو! قریش کے جس قدر قبیلے تھے، سب کے ساتھ حضورؐ کی رشتہ داری تھی۔ تو مطلب یہ ہے کہ تم اس رشتہ داری کا لحاظ رکھو جو مجھ میں اور تم میں ہے۔ حضرت مجاہدؓ، حضرت عکرمہؓ، حضرت قتادہؓ، حضرت سدیؓ، حضرت ابوالکلامؓ حضرت عبدالرحمنؓ وغیرہ بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی۔ پچیسواں پارہ صفحہ ۱۲)

بعض لوگوں کا خیال ایک اور طرف گیا ہے۔ عربوں کی خانہ جنگی مشہور تھی۔ ایک ایک جنگ سالہا سال تک جاری رہتی تھی۔ اس سے ان کا معاشرہ تباہ ہو رہا تھا۔ اسلام کی تعلیم خوریزی اور مفسدہ پردازی کے سخت خلاف تھی۔ یہی حضورؐ کی دعوت تھی۔ لیکن وہ لوگ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ میں تمہیں جو دعوت دیتا ہوں اس سے مقصد یہ ہے کہ تم باہمی خانہ جنگی سے رک جاؤ۔ اس میں تمہارا بھلا ہے۔ میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ چاہتا یہ ہوں کہ تم باہمی رشتوں ناطوں ہی کا خیال کرو اور اس جنگ و قتال کے سلسلہ کو ختم کرو۔ اگر تم نے ایسا کر دیا تو مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ اس کی تائید سورۃ الباقیٰ کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ یعنی: قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ (۲۴۴)۔ ”میں تم سے جو اجر رسالت مانگتا ہوں، وہ خود تمہارے بھلے کے لئے ہے“ مخالفین کو بات سمجھانے کا یہ جزو اول نشین انداز ہے۔

۱۔ واضح رہے کہ یہ اسلام کے ابتدائی دور کی بات ہے۔ بعد میں ان لوگوں سے تعلقات منقطع کرنے کے احکام نازل ہو گئے تھے۔

غلط مفہوم کیسے لیا گیا | اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ قرآن کریم کی ایسی واضح تعلیم اور خود اس آیت کے صاف الفاظ کی موجودگی میں وہ مفہوم کس طرح وجود میں آگیا جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے؟

یعنی یہ کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میرا جو رسالت یہ ہے کہ تم میری آل سے محبت کرو۔ یہ مفہوم پیدا کر دہ ہے ان روایات کا جو سیاسی محرکات اور مصالح کی رو سے وضع کی گئی تھیں۔ یہ داستان سیاست بڑی دراز ہے جو ان صفحات میں سمجھنا نہیں سکتی۔ اسے آپ میری کتاب ”شاہکار رسالت“ میں دیکھ سکتے ہیں۔ ملخصاً یوں سمجھئے کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ میں شروع سے مخالفت چلی آرہی تھی۔ جب حکومت بنی امیہ کے ہاں آگئی تو بنی ہاشم کا جذبہ مخالفت مشتعل ہو گیا۔ چنانچہ بنی عباسؓ ان کے خلاف سازشی تدابیر شروع کر دیں۔ ان کا مرکز ایران تھا، اور ابو مسلم خراسانی اس سازش کی دعوت کا سب سے بڑا نقیب۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ بنی عباس کے نام میں عوام کے لئے کوئی کشش نہیں کشش اسی نام میں ہو سکتی ہے جس کی نسبت رسول اللہؐ سے ہو۔ چنانچہ انہوں نے طے یہ کیا کہ کسی کا نام لئے بغیر کہا یہ جائے کہ ”امامت اہل بیت“ کا حق ہے۔ اس مسلسل پراپیگنڈا کا نتیجہ تھا کہ ۳۲ھ میں بنو امیہ کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ اور اقتدار بنو عباس کے ہاتھ میں آ گیا۔ زمام اقتدار تو ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن سب سے زیادہ اثر ایرانیوں کا تھا۔ ان کے علاوہ وہاں ”اہل بیت“ (یعنی سادات) بھی تھے۔ انہیں شرکایت تھی کہ سلطنت حاصل تو ان کے نام سے کی گئی ہے، لیکن اس پر قبضہ بنو عباس نے جمایا ہے۔ چنانچہ ان میں باہمی حقیقتش شروع ہو گئی۔ ان تینوں گروہوں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ روایات کی دوسری ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وضعی روایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

(ضمناً) شیعہ حضرات کی روایات کی چار کتابیں تو ان کی اپنی ہیں، اور سنی حضرات کی روایات کے چھ معتبر ترین مجموعے (صحاح ستہ) ان کے اپنے۔ ان سب کے جامعین ایرانی ہیں۔ مندرجہ بالا تینوں گروہوں حتیٰ میں جو روایات وضع ہوئیں، وہ ان مجموعوں میں موجود ہیں۔

۱۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد دشادیاں کیں۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ ان کے ہاں اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے جو اولاد حضرت فاطمہؓ کے بطن سے ہوئی انہیں سید کہا جاتا ہے۔ اور جو اولاد دوسری بیویوں کے بطن سے ہوئی انہیں علوی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

وضعی روایات | سورۃ الجمعہ میں رسول اللہ کی تبلیغ رسالت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ تبلیغ اُن
مخاطبین تک ہی محدود نہیں — وَأَخْرَيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ط
(۶۲) اس کا سلسلہ اُن لوگوں تک بھی پہنچے گا جو ہنوز ان (مخاطبین) کے ساتھ ملے نہیں۔ جامع ترمذی میں
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ

کسی نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہؐ خاموش رہے۔ پھر اپنا ہاتھ (حضرت سلمانؓ فارسی) کے اوپر
رکھا اور فرمایا: قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا پر بھی معلق ہوگا، تو اس کی قوم میں
ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پالیں گے۔

سورہ محمد میں ہے:

وَأِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا يَحْكُمُوا بِأَمْرِكُمْ (۶۴)۔ ”اگر تم
دین سے پھر جاؤ گے تو خدا تمہاری جگہ ایک اور قوم کو لے آئے گا۔ جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔“

جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی روایت ہے کہ
لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا؟ آپؐ نے (حضرت سلمانؓ فارسی) کے
مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

”اس کی قوم کو۔ اس کی قوم کو۔“

اس قسم کی روایات سے اہل فارس کی برتری کی سند نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے مہیا کرنا مقصود تھا کیونکہ وہی
خلافت عباسیہ میں جملہ مناصب حکومت پر قابض تھے۔

اب آئیے عباسیہ کی طرف۔ تفسیر جامع البیان میں آیت إِلَّا الْمَوْدَةِ فِي الْمَقْرِبَةِ کی تفسیر میں
کہا گیا ہے:

آنحضرتؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص
کے دل میں ایمان اُس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تم (یعنی حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد)
کو اللہ اور رسولؐ کے لئے محبوب نہ رکھے۔ (نیز تفسیر ابن کثیر۔ اردو ترجمہ۔ پچیسواں پارہ صفحہ ۱۳)

اس سے آلِ عباسؓ کی محبت مسلمانوں کے لئے ایمان کی شرط قرار پاگئی۔

جہاں تک سادات کا تعلق ہے، ان کے حق میں تو ایران میں تحریک کے زمانے ہی سے پراپیگنڈا

شروع ہو گیا تھا، اس لئے ان کی فضیلت، علو مرتبہ اور مناقب و محامد سے روایات کے مجموعے بھرے پڑے ہیں۔ شیعہ حضرات کے، روایات کے، چار مجموعے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور اور مستند الکافی کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں اہل بیت (یا سادات) کے حق میں کس قسم کی روایات ہیں، اس کا اندازہ صرف ایک روایت سے لگا لیجئے:

امام جعفر صادق (علیہ السلام) نے فرمایا..... ”ہم وہ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے فرض قرار دی ہے۔ لوگوں کو بدول ہماری معرفت کے چارہ نہیں، اور ہم سے جاہل رہنا قابل قبول نہیں ہوگا۔ جس نے ہم کو پہچانا، وہ مومن ہے۔ اور جس نے انکار کیا، وہ کافر ہے۔ اور جس نے ہم کو نہ پہچانا، لیکن انکار نہ کیا، وہ گمراہ ہے جب تک اس ہدایت کی طرف نہ لوٹے جس کو اللہ نے ہماری اطاعت واجبہ کی صورت میں فرض کیا ہے..... فرمایا امام محمد باقر (علیہ السلام) نے۔ ہماری محبت ایمان ہے۔ اور ہمارا بغض کفر..... یہی اللہ اور اس کے ملائکہ کا دین ہے۔“

(اشافی۔ ترجمہ الکافی۔ جلد اول ص ۱۶-۲۱۵)

ان نصیحتات کی روشنی میں بآسانی سمجھ میں آجائے گا کہ آیت ”مودۃ فی القربی“ کا یہ مفہوم کیسے لیا گیا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم سے کچھ اجر رسالت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ تم میری آل سے محبت کرو چنانچہ جامع ترمذی میں حضرت سعید بن جبیر کی یہ روایت درج ہے:

اس آیت میں قرابی کے معنی آل محمدؐ کے ہیں۔ یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔

صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں ہے کہ

جب یہ آیت نازل ہوئی — یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(۳۳/۵۶) — اے مومنو! نبیؐ پر درود بھیجو اور سلام۔ تو حضرت بشیر بن سعدؓ نے نبی (صلعم) سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپؐ پر درود بھیجیں؟ آپؐ نے در تک سکوت کیا، پھر فرمایا کہ کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ..... (ایضاً ص ۲۵)

درود کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۱۱۳) پر بتایا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا اضافہ

کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا۔ صَلُّوا عَلَيْهِ۔ رسولؐ پر درود بھیجو (۳۳/۵۶) اور روایت نے اس

حکم خداوندی میں ”وَ اِلَہ“ کا اضافہ کر کے اس کی تکمیل کر دی! اور یہ درود شیعہ حضرات کا ہی نہیں، سنی حضرات اسے ہر نماز میں بھی پڑھتے ہیں اور لاکھوں بار اس کا ورد بھی کرتے ہیں۔ لہذا، ہر سنی، اپنی نمازوں میں سیدوں پر درود بھیجتا ہے، خواہ اُن کا کردار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اور آگے بڑھیے۔ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا:

وَ اِنِّیْ قَدْ تَرٰکْتُ فِیْکُمْ مَا لَمْ تَضْلُوْا بَعْدَہٗ، اِنْ اَعْتَصَمْتُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ
میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوط پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے؟
کتاب اللہ۔ (صحاح۔ بحوالہ شبلی۔ سیرت النبیؐ۔ جلد دوم صفحہ ۱۵۶)

لیکن ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا:-

میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوط تھامے رہے تو بہکوکے نہیں۔ ایک دوسری سے زیادہ عظمت والی ہے۔ کتاب اللہ جو خدا کی طرف سے ایک لٹکانی ہوئی رستی ہے جو آسمان سے زمین تک آتی ہے۔ اور دوسری چیز میری عزت، میری اہل بیت سے، اور یہ دونوں جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پر آئیں۔ (ابن کثیر۔ پچیسواں پارہ صفحہ ۱۴)

آپؐ غور کیجئے کہ اس روایت کی رو سے، کتاب اللہ اور عزت (اولاد) رسول اللہؐ دونوں ہم پایہ ہو گئے اس طرح کہ ایک دوسرے سے زیادہ عظمت والی ہے۔ اور حضورؐ نے امت سے فرمایا کہ اگر یہ دونوں کو تھامے رکھیں گے تو گمراہ نہ ہوں گے۔ اس سے آپؐ اندازہ لگا لیجئے کہ آل محمدؐ کا مرتبہ کیا ہے۔ اور یہ دونوں روایتیں سنیوں کے احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ ان کے جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں ان کے (نیچتین پاک کے) خصوصیت سے نام لئے جاتے ہیں۔ اور ان پر درود بھیجا جاتا ہے۔ سنیوں ہی کی ایک اور روایت ہے:-

(حضرت) ابوذرؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے کعبہ کے دروازے کو کھڑکیہ بیان کیا کہ میں نے نبیؐ کو یہ فرماتے سنا ہے آگاہ ہو کہ میرے اہل بیت تمہارے لئے نوح کی کشتی کے مانند ہیں۔ جو شخص کشتی میں سوار ہوا۔ اُس نے نجات پائی اور جو کشتی میں سوار ہونے سے پیچھے رہ گیا، وہ ہلاک ہو گیا۔

(مشکوٰۃ۔ اردو ترجمہ، جلد دوم۔ صفحہ ۴۴۳)

یعنی، ایمان، ہدایت، نجات سب رسول اللہؐ کی آل (عزت۔ اہل بیت) کی محبت اور ان کے ساتھ وابستگی سے مشروط ہیں، اور یہ ہے وہ اجر رسالت جس کا مطالبہ حضورؐ نے فرمایا تھا۔

لے ان امور کی تفصیل کے لئے ہماری دیگر تصانیف۔ لغات القرآن، شاہکار رسالت، معراج انسانیّت اور ادراہ طلوع اسلام کی طرے سے شائع کردہ مقام حدیث دیکھیے۔

یہ ہے روایات کی رو سے ”مودۃ فی القربی“ کی آیت کی تفسیر قرآن کریم کی رو سے اس کا مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

❖

مذکورہ صدر مباحث، آیت ۶ کے ضمن میں تھے۔ اب آگے بڑھیے۔ فرمایا:

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ ۚ قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا ۖ وَعِلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوا ۖ أَنْتُمْ وَلَآ آبَاؤُكُمْ ۚ قُلِ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ ۝

جب یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رسول تو عام انسانوں جیسا ایک انسان ہے۔ خدا اس کی طرف اپنی وحی کیسے بھیج سکتا ہے، تو (اس سے نظر آتا ہے کہ) یہ لوگ خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگا سکے۔ (انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ خدا کی ہر بات نرالی اور اچھی کی ہونی چاہیے)۔ (۲۲/۵ ذ ۳۹/۶ ذ ۶۴/۶)۔

ان سے پوچھو کہ اگر تمہاری دعویٰ صحیح ہے کہ جس کتاب کو کسی بشر (انسان) کی طرف نازل کیا جائے، وہ من جانب اللہ نہیں ہو سکتی، تو وہ کتاب کس کی طرف سے آئی تھی جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی؟ (موسیٰ بھی تو عام انسانوں جیسا انسان ہی تھا)۔ اُس کتاب میں بھی حقائق کی روشنی اور انسانوں کے لئے صحیح راہنمائی تھی۔ تم نے اس کتاب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب تم اُس میں تھوڑے سے حصے کو (اپنی مصلحتوں کے مطابق) ظاہر کرتے ہو، اور باقی کتاب کو چھپا کر رکھتے ہو۔ حالانکہ اُس کتاب میں، اُن امور کا علم دیا گیا تھا جنہیں نہ تم جانتے تھے، نہ تمہارے آباء و اجداد۔

ان سے کہو کہ اُس کتاب کو بھی اللہ ہی نے نازل کیا تھا (اور ایک انسان ہی کی طرف نازل کیا تھا۔ اگر یہ لوگ اسکے باوجود اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو ان کے پیچھے جان کھپانے کی ضرورت نہیں)۔ انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی لغویات سے کھینچ رہیں۔

(نیز آیات ۲۲/۵ ذ ۳۹/۶) دیکھیے

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۖ بڑا غور طلب ہے۔ ایک مغربی مفکر (غالباً لاک) نے کہا ہے

کہ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنے لئے کس قسم کا معبود اختیار کر رکھا ہے، تو میں اس قوم کے تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ سب کے متعلق بتا دوں گا۔

یہ حقیقت ہے کہ خدا کے تصور کا قوموں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ آپ دنیا کی کسی مذہب پرست قوم کو لیجئے۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں ایک معبود کو مانتی ہوگی۔ لہذا یہاں تک ان قوموں میں اشتراک ہوگا۔ یعنی کسی معبود کو ماننا۔ لیکن جب آپ ان کے معبود کے تصور (یا تفصیل) میں جائیں گے، تو کسی قوم کا معبود دوسری قوم کے معبود سے نہیں ملے گا۔ ہر ایک کا ”خدا“ الگ الگ ہوگا۔ خدا کوئی محسوس شے تو ہے نہیں کہ اسے سامنے لاکر دکھا دیا جائے۔ محسوس ہونا تو ایک طرف، وہ تو ”برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم“ ہے۔ لہذا اس کے متعلق ذہنوں میں تصور ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ خدا کا وہی تصور صحیح ہو سکتا ہے جو ان صفات کی رو سے قائم کیا جائے جو اس نے خود وحی کے ذریعہ بتائی ہیں، اور وہ اپنی اصلی شکل میں صرف قرآن کے اندر ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن صرف اس ایمان باللہ کو صحیح تسلیم کرتا ہے جو قرآنی صفات کے مطابق لایا جائے۔ دوسرے مذاہب کو تو چھوڑیئے، خود ہماری اپنی (مسلمانوں کی) حالت یہ ہے کہ ہم نے بھی اپنے اپنے ذہن (یا عقیدہ) کا الگ الگ خدا تجویز کر رکھا ہے۔ ”قرآنی خدا“ پر ایمان کہیں نظر نہیں آتا۔ اور اس لئے ہماری یہ حالت بھی ہے: خدا پر ایمان درست ہو جائے تو دیکھئے ہماری حالت کس طرح سنور جاتی ہے۔ اسلام کے صدر اول میں جو عظیم انقلاب برپا ہوا تھا، وہ بنیادی طور پر اللہ کے صحیح تصور کی بدولت نکلا۔ اس کے بعد یہ تصور بحث و نظر کا موضوع بن گیا اور ہم دن بدن گرتے چلے گئے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں سے

زندہ قوت تھی جہاں میں ہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضوسے اگر ظلمت کو دار نہ ہو
خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا منہام (ضرب کلیم)
زیر نظر آیت میں اس نے مذہب پرست طبقہ کی اس غلط نگہی کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کی رو سے وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا ہر کام ”عجوبہ“ ہونا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ یہ خدا کا غلط تصور ہے۔ انسانی دنیا میں اس کے کام مبنی بر حکمت ہوتے ہیں۔ جو علم بصیرت کی رو سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس کی طرف سے نازل کردہ تعلیم (کتاب) کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ اسی خصوصیت کی حامل کتب سابقہ تھیں۔ اس کی مشہود یہ کتاب (قرآن مجید) ہے۔

۶
۹۳

وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ
أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ يُؤْمِنُونَ بِهِ
وَهُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝

اسی طرح خدا نے اس کتاب کو ایک انسان پر نازل کیا ہے۔ یہ بڑی بابرکت کتاب ہے، اور اس تعلیم کو سچ کر
دکھانے والی جو اس سے پہلے دی گئی تھی۔ (اسے رسولؐ) تم اس کے ذریعے (پہلے) اس مرکزی مقام (مکہ)
اور اس کے گرد و پیش کے باشندوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو۔ اس پر
وہی لوگ ایمان لائیں گے جو زندگی کو اسی دنیا کی زندگی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے بعد کی زندگی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔
اور انہیں یقین ہے کہ موجودہ غلط نظام کی جگہ ایک صحیح نظام آکر رہے گا۔ اس مقصد کے لئے یہ لوگ خدا کے
مقرر کردہ نظامِ صلوٰۃ کی حفاظت کرتے ہیں۔

یہاں کتاب اللہ کو ”مبارک“ کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں (لفظِ ثواب کی طرح) برکت کا مفہوم بھی محض
برکت کے معنی | ذہنی سا ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کا مفہوم بڑا اہم ہے اور جب اس لفظ کو قرآن
کے لئے استعمال کیا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بَرَکَۃ کے معنی

اس ثبات کے ہیں جس کے ساتھ ٹو بھی ہو۔ یعنی ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ بڑھ بھی
رہی ہو۔ درخت اس کی نمایاں مثال ہے۔ وہ اپنے مقام پر مستحکم نہ ہو تو اس کا وجود باقی نہیں رہتا، اور اگر اس میں
نشو و نما نہ ہو تو بھی وہ بہتے مقصد رہ جاتا ہے اور اسے اکھیر ناپڑتا ہے۔ ثبات اور نشو و نما کا امتزاج ہے جس
درخت شجر طیب بنتا ہے۔ قرآن مجید میں جو اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ پر مستحکم اور غیر متبدل ہیں
لیکن ان کی روشنی میں ایسی جزئیات وضع کی جاسکتی ہیں جو زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینا
استحکام اور نشو و نما (ثبات اور تغیر) کے اس امتزاج سے یہ کتاب عظیم مبارک قرار پاتی ہے۔ اس سے
وہ معاشرہ یا نظام قائم ہوتا ہے جسے اُس نے الصلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے صلوٰۃ)

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرآن پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں، جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں (آخرت
خدا اور آخرت پر ایمان | کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے) ایمان بالقرآن کی بنیاد خدا کے قانون
مکافاتِ عمل پر ایمان ہے۔ قرآن میں اس قانون کی تفصیل دی گئی ہے

اس لئے ایمان بالقرآن اور ایمان بالآخرت لازم و ملزوم ہیں۔ ہمارا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ آخرت پر۔

یعنی ان الفاظ پر ایمان ہے، ان کے مقصود و مطلوب پر نہیں۔ اس لئے ہماری صلوٰۃ بھی رسمی نماز بن کر رہ گئی ہے۔ رسول اللہ کی رسالت تمام نوع انسان کے لئے تھی۔ لیکن اس مُنتہی تک بند رنج پہنچ جانا مقصود تھا۔ اس کا آغاز حضورؐ نے اپنے عشیرہ و اقربا سے کیا۔ — وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (۲۶) اس کے بعد اس کا دائرہ اصل مکہ اور اس کے گرد و نواح تک وسیع کیا گیا۔ (دیکھو نظر آیت)۔ اس کے بعد پوری کی پوری قوم کو مخاطب کیا گیا۔ اور یہ سلسلہ قوم کے دائرہ سے بھی آگے چلا گیا۔ ختم نبوت کے بعد یہ سلسلہ اُمت محمدیہ کی وساطت سے آگے بڑھنا تھا۔ یہ سلسلہ ایک وقت تک جاری رہا۔ اور اس کے بعد اس کے بعد ہم آگے جن کا خود اپنا ہی قرآن پر ایمان نہیں۔ لیکن قرآن کا پیغام نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے، نہ کسی خاص خطہ ملک تک محصور۔ یہ تمام نوع انسان کے لئے ضابطہ زندگی ہے، اور (قرآن کے دعویٰ کے مطابق) اسے دنیا کے تمام ضوابط پر غالب آکر رہنا ہے، سو ایسا ہو کر رہے گا۔ اس کے بعد کہا کہ وحی صرف انبیاء کرام کو عطا ہوتی ہے۔ غیر از نبی اگر اس کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کاذب اور فریب کار ہے:

۶
۹۴ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوٓا۟ أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ۝

ان سے کہو کہ اس سے بڑھ کر سنگین مجرم کون ہو سکتا ہے، جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں منسوب کر دے خدا کی طرف، یعنی اپنی طرف سے وضع کردہ عقائد و احکام کو شریعت خداوندی کہہ کر پیش کرے، یا اس کا مدعی ہو کہ اُس کی طرف خدا کی وحی آتی ہے (خواہ اُس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے)، حالانکہ وحی صرف انبیاء کی طرف آتی ہے، اور سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی یہ رسولؐ ہے۔ لہذا اس رسولؐ کی موجودگی میں یا اس کے بعد، یہ دعویٰ کہ مجھے خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے، کذب و افتراء ہے۔ اور پھر اس سے بڑھ کر مجرم کون ہے جو یہ کہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، میں بھی اس جیسا دے سکتا ہوں (ہاں)۔ یاد رکھو: وحی کی مثل کوئی شے

نہیں ہو سکتی، نہ ہی کسی انسان کا حکم، وحی کا درجہ رکھ سکتا ہے۔

یہ لوگ، اس وقت تو یوں بڑھ چڑھ کر بائیں کر رہے ہیں، لیکن (اے مخاطب) کاش تو اُس منظر کو دیکھ سکتا۔ جب حق و باطل کے تصادم کے وقت، یہ لوگ میدان جنگ میں دم توڑ رہے ہونگے۔ اور ہماری کائناتی قوتیں (ملائکہ) ان پر مسلط ہو رہی ہوں گی کہ اُس ایغو کو باہر نکالو، جو تمہارے غرور کا باعث تھا۔ اب وہ وقت آچکا ہے جب تمہیں (شکست کی) رسوا کن سزا ملے گی۔ کیونکہ تم خدا کے خلاف ناحق افترا کیا کرتے اور غرور نفس کی بنا پر، اُس کے قوانین سے سرکشی برتا کرتے تھے۔

اس میں تین گروہوں، یاد عادی کا ذکر ہے۔ ایک وہ مذہبی پیشوا جو خود قوانین وضع کریں اور انہیں شریعت خداوندی کہہ کر عام کریں۔ (انڈکس میں دیکھئے شریعت سازی)۔ آپ آجکل عام طور پر اس قسم کے تقصیر کر رہے ہیں | الفاظ نہیں گے کہ اسلام یہ کتا ہے۔ اسلام کی رو سے یہ جائز ہے، وہ ناجائز ہے۔ اسلام کا فیصلہ یہ نہیں۔ اسلام کا حکم یہ ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ کوئی خدائی سند (قرآنی حکم)

پیش نہیں کریں گے۔ اگر آپ اسے کویدیں گے تو نظر آئے گا کہ اس سے مراد باب شریعت کے فتویٰ۔ فقہ کے مسائل۔ بزرگوں کے اقوال یا وضعی روایات ہوں گی۔ کسی انسان کی کسی بات کو خدا کی بات کہنا افتراء علی اللہ ہے۔ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے۔ انسانوں کے فیصلوں کو خدا کی شریعت کہنا فکرا فذکرا ہے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو ختم نبوت کے بعد وحی کے مدعی ہوتے ہیں۔ (ختم نبوت کی بحث سابقہ جلدوں میں آچکی ہے، انڈکس دیکھئے)۔ لہذا نبی کریم کے بعد وحی کا مدعی، مکذب اور مفتری علی اللہ ہے (انڈکس میں وحی کا عنوان دیکھئے)۔ وحی براہ راست علم حاصل ہونے کا نام ہے، اور وحی کا سلسلہ ختم ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ حضور کے بعد، خدا سے براہ راست علم، کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہذا، کشف، الہام کو خدا کی طرف سے براہ راست حاصل شدہ علم کہنا بھی افتراء ہے۔ (انڈکس میں الہام اور کشف دیکھئے)۔

قرآن کریم بے مثل و بے نظیر کتاب ہے۔ اُس نے تمام نوری انسان کو چیلنج دیا کہ وہ اس کی مثل بنا کر دکھائیں اس سلسلہ کی ایک شاخ تو بعض فلاسفوں کا یہ (باطل) نظریہ ہے کہ جنہیں انبیاءؑ کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت

نابغہ شخصیتیں (GENIUS) ہوتی تھیں جو اپنے غیر شعوری محسوسات اور خیالات کو منزل من اللہ وحی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ چیز کسی خام شخصیت تک محدود نہیں۔ نابغہ اب بھی پیدا ہو سکتے ہیں (اور ہوتے ہیں)۔ ہم نے وحی کی بحث کے سلسلہ میں اس قسم کے نظریات کا ابطال کیا ہے۔ وحی بے مثل و بے نظیر ہوتی تھی جو غیر از انبیاء کسی انسان کو نہیں ملتی تھی، اور اب اس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔

قرآن کی مثل لیکن قرآن کی مثل کا ایک عقیدہ خود ہماری وضعی روایات کا پیدا کردہ ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ اسے منسوب کیا جاتا ہے حضور نبی اکرم کی طرف، (مثلاً) اس قسم کی روایت

مقدم بن معرکیرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ مجھے قرآن اور اس کی مثل اس کے ساتھ (مثلہ معہ) دیا گیا ہے۔ خبردار ہو کہ ایک پیٹ بھرا شخص اپنے چھپر کھٹ پر پڑا ہوا کہے گا کہ بس، اس قرآن کو لازم جانو۔ جو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ، اسے حلال سمجھو، اور جس کو حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ حرام کیا رسول اللہ نے، وہ اس کے مانند ہے جس کو حرام کیا خدا نے۔

(مشکوٰۃ - اختصار کتاب و سنت - اردو ترجمہ جلد اول صفحہ ۸۸)

یہ مثلہ معہ (قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل) وہی ہے جسے وحی خفی کہا جاتا ہے اور جو روایات میں درج ہے۔ اس سے احادیث کو وحی قرار دیا جاتا ہے۔ (یہ تمام بحثیں پہلے آچکی ہیں، اس لئے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی روایات کبھی رسول اللہ کی نہیں ہو سکتیں۔ یہ بعد کی وضع کردہ ہیں۔) آیت کے آخری حصہ کو ہم نے اسی دنیا کے تصادمات پر منطبق کیا ہے۔ اگر اس کا تعلق انسان کی طبعی موت سے سمجھا جائے تو اس کی تشریح اُس پر کی جائے گی جہاں آخرت کی زندگی اور اس کے تضمنات سے متعلق بحث ہوگی۔

اگلی آیت میں ایک بڑا عمیق نکتہ سامنے آتا ہے:

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فِرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرْكُمۡ مَا
خَوَّلْنٰكُمْ وَّرَآءَ ظُهُورِكُمْ، وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُمُ الَّذِیْنَ
زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكَآءُ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ
مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝

اور خدا کہے گا کہ (تمہیں اپنی متبعین کی جمعیت پر بڑا ناز تھا۔ لیکن) آج تم ہماری عدالت میں تنہا آگئے۔ ایسے ہی تنہا جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تمہیں (مال و دولت وغیرہ) عطا کیا تھا اب

پیچھے چھوڑ آئے۔ ہم تمہارے ساتھ، تمہارے اُن رفقاء کو بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ تعلق تمہیں زخم تھا کہ وہ ہر حالت میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ آج تمہارے ان کے تعلقات منقطع ہو گئے۔ اور جسے تم حقیقت سمجھا کرتے تھے، وہ مراب نکلا۔

یہی خدا کا قانون مکافات ہے۔ نہ کوئی فرد پیدا ہوتے وقت، کسی اور کے یا اپنے سابقہ جہم کے، گناہوں کے اثرات اپنے ساتھ لاتا ہے (وہ سادہ لوح لے کر آتا ہے)۔ اور نہ ہی اُس کے اعمال کے نتائج بھگتنے میں کوئی دوسرا شریک ہو کر اس کی مصیبت کو بانٹ سکتا ہے۔ اپنے اعمال کے نتائج کو خود بھگتنا، انسانی ذات کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ (۱۹/۹۵)۔

[انسان کی ذات، نفس، وہ ہے جسے وہ "میں" کہہ کر پکارتا ہے۔ باقی ہر شے کو میری کہتا ہے، حتیٰ کہ اپنے جسم کو بھی "میرا جسم" کہہ کر پکارتا ہے۔ موت کے بعد یہ "میں" تو آگے جاتا ہے، اور ہر وہ شے جسے وہ میری کہتا تھا پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہی انسان کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ہے، اور یہی اس کے تمام اعمال کی ذمہ دار۔]

فردی کے ایک معانی وہ ہیں جنہیں مندرجہ بالا مفہوم کے پہلے حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا ذکر مفہوم کے دوسرے حصے میں کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح سابقہ جلدوں میں نفس کے عنوان کے تحت کی جا چکی ہے۔ بالخصوص دوسری جلد میں جس کے صفحہ ۲۹ پر زیر نظر آیت درج ہے۔



آیت زیر نظر کے الفاظ "وَلَقَدْ جِئْتُمُوهُمْ فِرَادٰی" سے ایک نہایت لطیف (باریک تر زمو) نکتہ عرصہ سے میرے ضمیر میں پہلو بدل رہا ہے لیکن وہ ابھی تک "مصرع موزوں" نہیں بن سکا۔ اس کے لئے مسالہ (MATERIAL) تو میرے پاس کافی ہے لیکن اس کے عنوان (یعنی مقصود) کے لئے مجھے موزوں الفاظ نہیں مل رہے۔ میرے منہ سے یہ الفاظ آپ کو شاید اچنبہ سا لگیں۔ جس شخص کی ساری زندگی الفاظ کی کہکشاں دنیا میں گزری ہو، اس کی یہ معذرت کہ اسے اپنے موضوع کے عنوان کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل رہے، یقیناً عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن ہے یہ واقعہ اور اس کی وجہ ہماری زبان کی کوتاہ دامنی ہے۔

انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ بنا بنایا نہیں آتا۔ اس نے کچھ بننا ہوتا ہے۔ بالفاظ صحیح، اس نے اپنے آپ کو کچھ بنانا ہوتا ہے۔ ضروریات زندگی، اشیائے کائنات کے سامان، اسباب یا ذرائع ہوتے ہیں جن سے اس نے

اپنے آپ کو کچھ بنانا ہوتا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے اس تمام موضوع کو ایک لفظ کے اندر مٹا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے ساز و سامانِ حیات کو متاع سے تعبیر کیا ہے۔ عام الفاظ میں متاع ان اشیاء کو کہتے ہیں جن سے وقتی ضروریات پوری کی جائیں۔ بالخصوص وہ سامان جو سفر کے لئے ضروری ہو۔ مثلاً ڈول۔ رسی۔ مشکیزہ۔ راستے کے لئے ضروریات کے مطابق کچھ کھانے پینے کا سامان۔ اس لفظ میں دو اہم مفہیم شامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ متاع زاید از ضرورت یا ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ ضرورت پوری کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد سمجھ میں آجاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ اشیاء مقصود بالذات نہیں۔ یہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یعنی ان سے انسان وہ کچھ بن سکتا ہے جو کچھ بننا اس کا مقصد حیات ہے۔ جس طرح کہار (وگل گر) کی مٹی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ اس مٹی کا اس نے کچھ بنانا ہوتا ہے۔ ————— بڈنی، آبخورہ، ہنڈیا، ٹکڑا وغیرہ۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آئیں۔ ایک وہ جو کچھ انسان نے اپنے آپ کو بنانا ہے۔ اور دوسرے وہ سامان جس سے اس نے کچھ بننا ہے۔ سامان ضروری ہے لیکن مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات وہ ہے جو اس نے بننا ہے۔

یہ ہے وہ موضوع جس کے لئے میرے پاس (MATERIAL) تو فراوان ہے لیکن عنوان کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ انگریزی زبان زیادہ وسیع اور منجھی ہوئی ہے۔ اس میں یہ الفاظ مل جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ یورپ سے واپسی پر مسوینی کی دعوت پر اسے ملنے گئے تھے۔ اس زمانے کے مسوینی کے دبدبہ اور طنطنہ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ زمانہ وہ تھا جب اقوام مغرب ایک ہونے والی جنگ (دوسری عالمگیر جنگ) کی تیاریوں کے سلسلہ میں اسلحہ کی دوڑیں ہانپ رہی تھیں۔ گفتگو کا ہی موضوع تھا۔ مسوینی نے کہا کہیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس دور میں

ONE WHO HAS STEEL, HAS EVERYTHING

علامہ نے اس سے کہا کہ میں اس میں ذرا سی لفظی تبدیلی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ

ONE WHO IS STEEL, IS EVERYTHING

انہوں نے "HAS" کو "IS" میں تبدیل کر کے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی!

اسی (IS) کے لئے مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں مل رہا! علامہ اقبالؒ کا سارا فلسفہ خودی اسی (IS) کی تفسیر ہے۔

لیکن اس کے لئے ایک جامعہ لفظ مجھے ان کے ہاں بھی نہیں ملا۔ وہ بھی اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ (قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ) انچہ خنی می خواہداں سازد ترا

بات یہاں بھی ایمائیت سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

قارئین نے میری تحریروں میں جرمن، امریکن عالم نفسیات (ERICH FROMM) کے اکثر اقتباسات دیکھے ہوں گے۔ پچھلے دنوں ایک عزیز کی وساطت سے مجھے ایک کتاب ملی جو شاید اس کی آخری تصنیف تھی۔ اس کا موضوع بھی تھا جسے میں نے اوپر پیش کیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اسے، بعد از تلاش بسیار، اس کے لئے عنوان مل گیا۔ اس کی کتاب کا ٹائٹل ہے

TO HAVE — OR — TO BE

اس (TO BE) میں جو وسعت اور گہرائی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ ”خود گری“ یا ”خوشتن سازی“ میں بھی (TO BE) جیسی جامعیت نہیں جتنی کہ یہ برکسان کے (BEING) سے بھی مختلف اور آگے ہے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ ”وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فِرَادَى“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام (HAVES) تم پیچھے چھوڑ آؤ گے کیونکہ انہوں نے اپنا مقصد پورا کر دیا تھا۔ اور (BE) ہمارے ہاں آجائے گا۔ قرآن کی تعلیم کا نچوڑ اور مقصود و منتہی یہی ہے۔ اور اس کے لئے اس میں بڑا (MATERIAL) ہے اگر حالات نے اجازت دی تو اس موضوع کو مرتب کرنے کا میرا ارادہ ہے۔ — یہ الگ بات ہے کہ اس کا ٹائٹل مجھے اُس وقت بھی نہ ملے۔

اس ضمنی بحث کے بعد پھر آیت (۶/۹۶) کی طرف آجائیے۔

خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (پہلی بار پیدا کیا)۔ سے قرآن کریم نے عقیدہٴ تناسخ کی بھی تردید کر دی جس کی دُوسرے کہا یہ جاتا ہے کہ ایک انسان لاکھوں اور کروڑوں مرتبہ، جون بدل بدل کر، دنیا میں آتا ہے۔ قرآن نے ان کی موجودہ زندگی کو پہلی مرتبہ کی پیدائش قرار دیا۔ اور اس کے بعد کی زندگی کو حیاتِ آخرت، جس سے دُنیا کی طرف مراجعت نہیں ہوگی۔ انسان کی، مرنے کے بعد کی، زندگی کے متعلق فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ فَلَنُ الْحَبِّ وَالنَّوَى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ذَلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ ۝

باقی رہا انسان کو مرنے کے بعد زندہ کرنا، سو یہ بھی ہمارے لئے کون سی مشکل بات ہے۔ اسے سمجھنے

کے لئے تم نظام کائنات پر غور کرو۔ بیج (بظاہر) مُردہ ہوتا ہے، لیکن اس میں زندگی کی صلاحیت خوابیدہ ہوتی ہے۔ مناسب ماحول سے وہ خوابیدہ صلاحیت بیدار ہو کر حیات نو (کونسل) کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اور باقی بیج مٹی میں مل جاتا ہے۔ پودا، پھر بیج پیدا کرتا ہے۔ اور اس بیج سے سلسلہ حیات آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح خدا کا قانون موت سے زندگی پیدا کرتا اور زندگی کو موت میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ یہی قانون افراد کی صورت میں کار فرما ہے اور اسی کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے بھی فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ ہے خدا کا قانون موت و حیات۔ تم اس سے منہ موڑ کر کدھر بکے جا رہے ہو؟

تو این فطرت کی کار فرمائی کی اور مثالیں:

فَالِقُ الْأَصْبَاحِ ۖ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا ۚ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا ۚ
ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝

۶
۹۷

خدا کا یہی قانون گردش ہے جو رات کا پردہ چاک کر کے نورِ سحر کو نمودار کر دیتا ہے (اور اس طرح شب کی تاریکیوں کو دن کے اُجالے میں بدل دیتا ہے)۔ تم دن بھر کام کرتے ہو۔ اس کے بعد رات کے کاروبار پر رات کا پردہ گرا دیتا ہے۔ اور تمہارے لئے آرام و سکون کا وقت آ جاتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق چاند اور سورج اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں، اور اس طرح، تمہارے لئے مہینے اور سال شمار کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں (۵/۱۱۱)۔ یہ سب اندازے اور پیمانے اُس خدا کے مقرر کردہ ہیں جو ہر شے کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے، اور ایسی زبردست قوتوں کا مالک ہے کہ کوئی شے اُس کے مقرر کردہ انداز سے ذرا اُدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی۔

اجرام کی گردش کی رُو سے، سورج اور چاند دونوں سے حساب کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد سوم میں بحث ہو چکی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۲۳)۔

ایک اور مثال :-

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ
الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

۶
۹۸

اُس کے اس کنٹرول کا نتیجہ ہے کہ فضائے آسمانی میں تیرنے والے ستارے (۲۱/۳۶) یوں ٹھیک ٹھیک انداز سے گردش کرتے ہیں، کہ تم بیابانوں اور سمندروں کے سفر میں، رات کی تاریکیوں میں

اُن سے راستے کے نشانات متعین کر لیتے ہو (اور اس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی)۔

ہم نے ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں، اپنے قوانین کو کس قدر واضح کر دیا ہے۔ (کہ وہ ذرا سے غور و فکر سے، انہیں بخوبی سمجھ سکتے ہیں)۔

دوسرے مقام پر قرآن مجید نے ساروں کی راہنمائی کو، وحی کی راہنمائی کے لئے بطور شہادت پیش کیا ہے۔
(۵۳-۱)۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی۔

قرآن کریم نے نظام کائنات کے مختلف گوشوں کو بطور شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ: قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔۔۔ یہ مثالیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے، نشاناتِ راہ ہیں۔ لیکن اُن ہی لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم نے علوم سائنس کی تحصیل پر کس قدر زور دیا ہے۔ ان علوم اور ان کی رُو سے انکشافات کو قرآنی حقائق تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ (انڈکس میں کائنات کا عنوان دیکھئے)۔

ان شہادت کے بعد وہ انسانی دنیا کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے:-

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۖ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۝ (۶/۹۹)

(یہ خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی کار فرمائی تھی۔ اب وہاں سے نیچے اتر کر، ذرا انسانی دنیا کی طرف آؤ اور دیکھو کہ وہاں اُس کا قانون ارتقاء کس حسن و خوبی سے عمل پیرا ہے) کہ اس قانون کی رُو سے تمہاری زندگی کی ابتداء، ایک جرثومہ جیات سے ہوئی (۳۴ ز ۳۹)۔ اس کے بعد تم نے ارتقائی منازل طے کرنا شروع کیں، اس طرح کہ تمہارا کاروان زندگی کچھ وقت کے لئے ایک منزل میں ٹھہرا۔ پھر اُس منزل نے اُسے دوسری منزل کے سپرد کر دیا (۴۱)۔ اس طرح یہ قافلہ منزل بہ منزل، آگے بڑھتا گیا تا آنکہ تم مقامِ آدمیت تک پہنچ گئے۔

ہم نے اپنے قوانین کو اُس قوم کے لئے کس قدر نکھار کر بیان کر دیا ہے جو سمجھ سوچ سے کام لیتی

ہے۔ (۶/۹۹)

تخلیق انسانی کی بحث، مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۳۱) میں تفصیل سے آچکی ہے۔ (وہاں زیر نظر آیت بھی دی گئی ہے)۔ نظریۂ ارتقاء کے سلسلے میں انڈکس دیکھئے۔ اگرچہ وہاں اس نظریہ کی وضاحت کی گئی ہے، لیکن اس آیت میں دو لفظ ایسے آئے ہیں جن کی تشریح کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ نظریۂ ارتقاء کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ زندگی جامد شے نہیں۔ متحرک ہے۔ یہ اپنے اولین جزو سے حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ لیکن مسلسل حرکت نہیں کئے جاتی۔ ایک منزل میں آکر تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے۔ وہاں کے ماحول سے سامان نشوونما اپنے اندر جذب کرتی ہے اور جب اس میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ رکتی اور چلتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے مستقر اور مستودع کی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو بڑی جامع بھی ہیں اور ادبی نقطہ نگاہ سے بھی بڑی لطیف۔ جب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی کسی جگہ رک جائے، تو اسے قرار کہتے ہیں۔ رکی ہوئی تو منجمد شے بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے قرار کا لفظ نہیں بولتے۔ یہ لفظ صرف متحرک اشیاء کے عارضی طور پر رک جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔

اس رک جانے کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے اسے مستودع سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی امانت کو اس کے سپرد کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیز اس منزل کے پاس (جو اس کا مستقر تھا) فطرت نے بطور امانت رکھی تھی۔ اس نے وہ امانت اس کے سپرد کر دی جس کی وہ امانت تھی۔ اور اس طرح مستقر اور مستودع کی منزلیں طے کرتی ہوئی، زندگی سلسلۂ ارتقاء کی حد آخر تک پہنچ گئی۔

آپ نے خود کیا کہ سائنس جیسے حار و یابس موضوع کو بھی قرآن کس قدر شاداب و شگفتہ انداز میں پیش کرتا ہے! لیکن اس کے باوجود یہ حقائق انہی لوگوں کی سمجھ میں آسکتے ہیں جو تفقہ (غور و فکر) سے کام لیں۔

تخلیق کے بعد وہ ربوبیت (نشوونما) کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو! ہم نے اس کے لئے بھی کس قدر حیرت انگیز انداز سے انتظام کیا ہے:

۶
۱۰۰
وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نَخْرُجُ مِنْهُ حَبًّا مَّتْرَاكِبًا وَمِنْ لَحْنٍ

مَنْ طَلَعَهَا قُنُوتًا دَانِيَةً ۖ وَجَنَّتْ مِّنْ اَعْنَابٍ وَ الزَّيْتُونِ
وَالرُّمَّانِ مُشْتَبِهًا وَ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ انْظُرُوا اِلَى ثَمَرِهِ اِذَا اَشْرَقَ
وَيَنْعِهِ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّوْمِنُوْنَ ۝

تم اس پر بھی غور کرو کہ اُس نے تمہیں پدا کیا، تو اس کے ساتھ ہی (بلکہ اس سے بھی پہلے) تمہاری نشوونما کا سامان کس حسن و خوبی سے بہم پہنچا دیا۔ وہ اس کے لئے بادلوں سے مینہ برساتا ہے، جس سے ہر قسم کی روئیدگی نکلتی ہے۔ پھر اس روئیدگی سے ہری ہری ٹہنیاں ابھرتی چلی جاتی ہیں اور ٹہنیوں میں گٹھے ہوئے اناج کی بالیں لگنے لگ جاتی ہیں۔ اسی طرح کھجور کے درخت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جس کے خوشے جھکے پڑتے ہیں۔ یہی صورت انگور، زیتون اور انار (اور دوسرے پھلوں) کے باغات کی ہے۔ کوئی آپس میں ملتے جلتے۔ کوئی بالکل الگ۔ تم ان کے پھلوں کو اس وقت دیکھو جب وہ شروع میں شاخوں میں لگتے ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ کس طرح بندریج، غیر محسوس طور پر بچنگی تک پہنچتے ہیں۔ جو لوگ نظام کائنات کی محکمیت پر یقین رکھتے ہیں، اُن کے لئے خدا کے قانون ارتقاء میں حقیقت تک پہنچنے کی، کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔

نظام کائنات میں آیات | یہاں کہا ہے: اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّوْمِنُوْنَ —

ان میں اس قوم کے لئے آیات ہیں جو ان کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے۔ یہ کونسی "سداقتیں" ہیں جن پر یقین رکھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ سمجھے سے مظاہر کائنات اور قوانین فطرت کا ذکر مسلسل چلا آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں انہی قوانین کی صداقتوں پر یقین کی طرف اشارہ ہے۔ لہذا مومن ہونے کے لئے قوانین فطرت کی محکمیت اور نظام کائنات کے معنی پر حقیقت ہونے پر علی وجہ البصیرت یقین رکھنا ضروری ہے۔ اس راستے سے انسان، اقدار خداوندی اور انسانی زندگی سے متعلق وحی کے عطا کردہ اصول و قوانین کی صداقت پر ایمان لاسکتا ہے۔ یہ ایمان علی وجہ البصیرت ہوتا ہے جو کبھی ڈلگاتا نہیں۔ قرآن کریم نے اسی لئے علوم فطرت کی تحصیل و تحقیق پر اس قدر زور دیا ہے۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو انسان (لفظی ایمان کے باوجود) توہم پرستیوں کا شکار ہو جاتا ہے فرمایا:۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوا لَهُ بَنِيْنَ وَ بَنَاتٍ

بَغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحَنَهُ وَ تَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ ۝

یہ ہے وہ خدا جس کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ نہا کائنات کا نظم و نسق قائم نہیں رکھ سکتا۔ کچھ غیر مرئی (UN - SEEN) قوتیں بھی ہیں جو اس کے ساتھ شریک ہیں۔ حالانکہ یہ غیر مرئی قوتیں (جو کائنات میں جاری و ساری ہیں) خود خدا ہی کی پیدا کردہ ہیں۔

پھر ان کی اس جہالت کو بھی دیکھو کہ انہوں نے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بھی بنا رکھی ہیں حقیقت یہ ہے کہ خدا کے متعلق، انسان، اس قسم کے تصورات، اپنے ذہن سے تراش لیتا ہے۔ وہ (خدا) ان باطل تصورات سے مبرا اور بلند ہے۔

اور اس کے لئے سب سے بہن مثال عیسائیوں کے عقیدہ انبیت حضرت مسیحؑ کی ہے۔

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنۡیَ یَّکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَٰمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ وَّ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ وَّھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیۡمٌ ۝

[پہلے کہا جا چکا ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی ہر بات فوق الفطرت اور اعجاز ہوئی چاہیے، وہ خدا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگاتے (۶/۶)۔ یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ خدا کے تخلیقی پروگرام کا ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق عالم امر یعنی تخلیق سے پہلے مرحلے سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مرحلہ میں ہنوز ”مخلوق“ ہی نہیں تھی، تو مخلوق سے متعلق (مادہ اور طبیعی) قوانین بھی کارفرما نہیں تھے۔ وہاں کے معاملات انسانی عقل و فکر سے ماوراء، فلہذا، ”اعجاز“ ہوتے ہیں۔ جب کائنات کی تخلیق ہو گئی، تو قوانین فطرت بھی ظہور میں آ گئے۔ اب اس مرحلہ میں خدا کے سب کام ان قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ وہ چاہے تو بے شک ان کے خلاف بھی سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔ لہذا ایساں کے معاملات میں کچھ بھی ”اعجاز“ نہیں۔ ان دونوں مراحل کو ایک مثال سے سمجھئے۔]

وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ فطرت کے کسی قانون کے مطابق نہیں تھا۔ فطرت کے قوانین کی رُو سے کوئی معلول (EFFECT) علت (CAUSE) کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتا۔ اب بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا بھی ہے۔ اولاد کے لئے قانون فطرت یہ ہے کہ اس کی پیدائش نر و مادہ (مرد اور عورت) کے جنسی اختلاط سے ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے، جسے خود یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں، کہ خدا کی بیوی نہیں۔ اور جب خدا کی بیوی ہی نہیں، تو اس کے ہاں اولاد کیسے ہو سکتی ہے۔

وہ ہر شے کا خالق ہے۔ کسی کا والد نہیں۔ اور اس کا عمل تخلیق، سرتاسر، علم و حکمت پر مبنی ہے۔
 ذرا سوچو کہ ”خدا کے بیٹے“ کا عقیدہ کس قدر باطل ہے، بیٹا سلسلہ تولید کا نتیجہ ہوتا ہے۔

خدا اور قوانینِ فطرت | یہ آیت مطالب الفرقان جلد دوم کے صفحہ ۳۴۳ پر آچکی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے متعلق چوتھی جلد میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس لئے یہاں کسی تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں، مجزاً اس بنیادی نکتہ کے دہرانے کے کہ تخلیق کائنات کے بعد جب خدا نے قوانین مقرر کر دیئے تو ان قوانین کی خلاف ورزی (یا ان میں استثنا) اور توادر، وہ خود بھی نہیں کرتا۔

اور اس کے بعد کس جتنی سے فرمایا کہ
 ذَلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ
 وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ۝

یہ ہے اللہ جو تمہارا نشوونما دینے والا ہے اور جس کا قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اُسکے سوا کسی اور کا اقتدار و اختیار نہیں۔ وہ ہر شے کا خالق اور کار ساز ہے۔ لہذا تم بھی اُسی کے قوانین کی محکومت اختیار کرو۔

جس قوم کا خدا اس قسم کا ہو، سوچئے کہ اُس کی زندگی کس قدر قانون کی پابند ہوگی۔ یعنی قوانینِ فطرت کے علاوہ، ان قوانین کی بھی پابند جنہیں خدا نے انسانی زندگی کے لئے متعین فرمایا ہے، پوچھئے لاگ سے کہ اس قسم کی قوم کے متعلق اُس کا اندازہ یا فیصلہ کیا ہے؟

لیکن اس سے ایسا پوچھتے وقت اُس کے سامنے خود نہ آئیے، کیونکہ اگر ہم اُس کے سامنے آگئے تو وہ ہمارے خدا کا اندازہ ہماری حالت سے لگائے گا، اور یہ جس قسم کا اندازہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے پس پردہ رہ کر اُس سے یہ پوچھئے۔ اور اس سے یہ کہئے کہ اس خدا کی یہ کیفیت بھی ہے کہ

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝

انسان کا علم، محسوسات تک محدود ہے۔ اس کی نگاہیں، غیر محدود و غیر محسوس ذاتِ خداوندی کی

کنہ و حقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس، علم خداوندی، تمام نگاہوں کو محیط ہے۔ وہ ایسا لطیف ہے کہ محسوسات کے دائرے میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ایسا خبیر ہے کہ تمام اثباتے کائنات کے احوال و کوائف سے واقف ہے۔ ”لطیف“ ہونے کی جہت سے وہ تمہاری نگاہوں کے احاطہ میں نہیں آ سکتا۔ خبیر ہونے کی وجہ سے وہ تمہاری نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے۔

ان حقائق کی وضاحت، مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۲۷۶) اور جلد سوم (صفحات ۲۲-۲۱) میں ہو چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا اعادہ کافی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عقیدہ ہے کہ ”اولیاء اللہ“ خدا سے ملتے جلتے رہتے ہیں، اور ہر شب اس کی محفل میں شریک ہوتے ہیں، وہ قرآن کریم کے صریحاً خلاف ہے۔

غلط عقیدہ | قرآن کا واضح ارشاد ہے کہ ”کوئی آنکھ خدا کو نہیں دیکھ سکتی“ اس کا ادراک بھی نہیں کر سکتی یعنی ذات خداوندی، انسان کے فکری احاطہ میں آ ہی نہیں سکتی۔

پھر جس طرح اس کی ذات غیر مرئی ہے اور اس کا اندازہ صرف اس کی تخلیق پر غور و فکر سے ہو سکتا ہے، اسی طرح اس کے قوانین بھی غیر مرئی ہیں۔ ان کی حقیقت کا علم، ان کے محسوس و مرئی نتائج سے ہو سکتا ہے۔ قانون خداوندی جب الفاظ کے پکیروں میں ہوتا ہے، غیر مرئی ہوتا ہے۔ اسے کلمات اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے جب وہ عمل میں آ کر محسوس نتائج پیدا کرتا ہے، تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان روشن دلیلوں کے بعد فرمایا:

قَدْ جَاءَكُمْ بِصَاحِبٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن ابْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۚ
وَمَن عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝

لہذا، اسے رسول اتم ان سے کہہ دو کہ تم سے مطالبہ ذات خداوندی کی کنہ و حقیقت تک پہنچنے کا نہیں۔ مطالبہ اس کے قوانین کی اطاعت کا ہے۔ اور یہ قوانین، جو کبیر علم و بصیرت پر مبنی ہیں، وحی کے ذریعے تمہارے پاس آچکے ہیں۔ (خدا کے ساتھ تمہارا تعلق صرف اس وحی کی بنا پر ہے جو قرآن میں محفوظ ہے)۔ پس جو شخص عقل و بصیرت سے کام لے کر ان قوانین کی صداقت کو تسلیم کرے گا، اس کا فائدہ خود اس کی ذات کو پہنچے گا۔ جو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لے گا، اس کی غلط روش کا نیاہ کن نتیجہ اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ میں تم پر پاسبان مقرر نہیں کیا گیا کہ تمہیں، بھیڑ بکریوں کی طرح، ایک خاص راستے پر چلنے کے لئے مجبور کروں۔

علم و بصیرت

غور کیجئے! سابقہ آیت میں کہا گیا تھا کہ تم بصارت (آنکھوں کی بینائی) سے خدا کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے متعلق کچھ معلوم کیسے ہو؟ فرمایا کہ اُس نے اپنی طرف سے ”بصائر“ نازل کر دیئے ہیں۔ یعنی وہ ان حقائق کو از روئے بصیرت سمجھاتا ہے۔ اور جو کچھ ان حقائق سے اس طرح سمجھا جاسکے، تم خدا کے متعلق اتنا ہی جان سکتے ہو۔ اس سے زیادہ جاننے کا نہ کوئی ذریعہ ہے، نہ ہی تم اس کے مکلف ہو۔ یہ جو ”علم لدنی“ اور ”معرفت“ کو خدا کو جاننے پہچاننے کے ذرائع بتائے جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے ان کی کوئی سند نہیں ملتی۔ (تفصیل کے لئے تصوف کا عنوان دیکھئے)۔

آیت کے آخری حصہ۔ (فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا)۔ نے قانونِ مکافاتِ عمل اور ہر انسان کی انفرادیت کی ایک اور سند ہم پہنچا دی۔

اس کے بعد ہے:-

وَكَذَلِكَ نَصْرِفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

اس طرح ہم اپنے قوانین کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے اور دُھرا دُھرا کر ان کی وضاحت کرتے رہتے ہیں تاکہ یہ لوگ اسے تسلیم کریں کہ تم نے، انہیں نہایت دلنشین انداز سے بیان کر دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان قوانین کی حقیقت و اہمیت انہی پر واضح ہو سکے گی جو علم و بصیرت سے کام لیں گے۔

تصریفِ آیات

جیسا کہ میں نے متعدد مقامات پر لکھا ہے، قرآن کریم نے خود ہی بتا دیا ہے کہ اسے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق کیا ہے۔ وہ طریق ہے تصریفِ آیات۔ عام انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ اسے مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اور جو موضوع جس باب سے متعلق ہوتا ہے اس میں اُس موضوع سے متعلق سب کچھ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ موضوع ایک نگاہ سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا انداز یہ نہیں۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر کہی جاتی ہے۔ اس میں اضافہ کسی اور جگہ کیا جاتا ہے۔ استثنا کسی اور جگہ۔ اس کی تشریح اور وضاحت کسی اور سلسلہ میں سامنے لائی جاتی ہے۔ پھر ایک ہی بات (اصول یا قاعدہ) کو مختلف مقامات میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس طریق وضاحت و صراحت کو تصریفِ آیات کہا کر پکارا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھر پھر بیان کرنا۔

لہٰذا تصریف و تدریسِ آیات کے سلسلہ میں دیکھئے (۳۸) ذ (۶۶) ذ (۶۵) ذ (۶۸) ذ (۶۱) ذ (۸۴) ذ (۱۸۵)

(۲۰) ذ (۲۵)

لوٹا لوٹا کر لانا۔ یہ تکرار نہیں ہوتی۔ جس مقام پر اس آیت کو لایا جاتا ہے، وہ آیت معاملہ پیش نظر کی نہایت عمدگی سے وضاحت کر دیتی ہے، اور خود اس کا مفہوم بھی زیادہ نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ لہذا قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو موضوع پیش نظر ہو، اس کے متعلق دیکھا جائے کہ قرآن مجید میں دیگر مقامات پر اس موضوع کے متعلق کیا آیا ہے۔ ان مقامات کو یک جا مرتب کر لیا جائے تو پھر بات ایسی نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے سارے قرآن پر نگاہ ہونی ضروری ہے۔ میں نے قرآن کریم کو اس انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں میری ساری عمر صرف ہو گئی۔ لیکن بتوفیق ایزدی یہ مرحلہ اس طرح کامیابی سے طے ہو گیا کہ میرے لئے قرآن کا کوئی مقام مشکل نہ رہا۔

جب میں نے قرآن کریم کو خود سمجھ کر اسے دوسروں کو سمجھانے کا فریضہ اختیار کیا، تو انہیں بھی اسی طریق سے قرآن سمجھایا۔ میری تمام تصانیف میں ہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ چونکہ میرا مقصد یہ بھی ہے کہ قرآن سمجھنے کے متمنی میرے فہم قرآن ہی پر انحصار نہ کریں، بلکہ اسے خود بھی سمجھیں، اس لئے میں نے یہی طریق انہیں بھی بتایا ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہر شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خود تصریف آیات سے قرآن کا مفہوم متعین کرے۔ اُن کی محنت بچانے کے لئے میں نے یہ کام اُن کے لئے خود کر دیا اور قرآن کی تعلیم اور پیغام کو (SUBJECT-WISE) تقسیم کر کے، اسے مرتب شکل میں پیش کر دیا۔ میری اس کتاب کا نام 'تبویب القرآن' ہے جو تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ جو حضرات قرآن پر غور و تدبر کر کے اسے از خود سمجھنا چاہیں، وہ اگر میری دو تصانیف لغات القرآن اور تبویب القرآن سے مدد لے لیں، تو ان کے لئے یہ راستہ طے کرنا آسان ہو جائے گا۔

درس کے معنی | آیۃ زیر نظر (۱/۶) میں تصریف آیات کا مقصد یہ بتایا گیا ہے۔ لَبِیفٌ وَّلَوْ اَدْرَسْتَ

تاکہ یہ لوگ اس کا اعتراف کریں کہ تو نے اسے نہایت وضاحت سے سمجھا دیا

ہے۔ اس ضمن میں ————— "اَدْرَسْتَ" کا لفظ بھی بڑا غور طلب ہے۔ گہیوں کے دانے اس کی بالوں کے اندر ملفوف ہوتے ہیں۔ دانوں کو بالوں سے الگ کرنے کے لئے کسان اسے "گاٹتے" ہیں۔ اس کے لئے وہ کرتے یہ ہیں کہ خشک فضل کو گول دائرے میں زمین پر بچھا دیتے ہیں اور پھر اس پر سیلوں کو چلاتے رہتے ہیں۔ پیل سا رادہ اس دائرے میں چکر کاٹتے رہتے اور گہیوں کی بالوں کو اپنے پاؤں تیلے روندتے مسئلے رہتے ہیں تاکہ غلہ کے دلنے چھدکوں (بھوسے) سے الگ ہو جائیں۔ عربی زبان میں اس عمل کو دَرَسْتُ کہتے ہیں (اس سے آپ درس

معنی بھی سمجھ لیجئے)۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تصریف آیات سے مقصد درس ہوتا ہے۔ معافی، الفاظ کے چھلکوں میں پلٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور عملِ تصریف و تدریس سے، وہ چھلکوں سے الگ ہو کر باہر آ جاتے ہیں۔ میری لغات القرآن عملِ تدریس (کا ہنسنے) کی مظہر ہے۔ اور تبویب القرآن تصریف کا نتیجہ۔ اگر کوئی ”شہری دانشور“ کسان کو گبیوں کا ہتے ہوئے دیکھے تو وہ کہہ دے گا کہ اس کی عقل ماری گئی ہے جو بیلوں کو دائرے میں چلائے جا رہا ہے۔ اگر انہیں سیدھے راستے پر چلائے تو وہ شام تک بیس تیس میل کی مسافت طے کر لیں۔ اسے کیا معلوم کہ اس تدریس کا مقصد کیا ہے۔ جو سطح ہیں، قرآن کے انداز و اسلوب پر تکرار کا اعتراض کرتے ہیں، وہ دراصل گاہنے کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

قرآن کی وضاحت خود خدا نے کر دی | عملِ تصریف و تدریس کے بعد کہا کہ وَلِنُبَيِّنَهُ — تاکہ ہم اسے نکھار اور ابھار کر واضح کر دیں۔ اس سے

واضح ہے کہ قرآن کریم کی وضاحت اور تشریح خود خدا نے اپنے ذمہ لی تھی۔ فرمایا: ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتٍ لِّهِ (۱۹)۔ اس کے بعد اس کتاب کے حقائق اور معانی کا اظہار ہمارے ذمہ ہے۔ بیان (مادہ - ب - ی - ن) کے بنیادی معنی الگ الگ کرنا اور مخفی چیزوں کو نمودار کرنا، دونوں ہیں۔ جب شاخوں سے پتیاں نکلتی اور شکوفوں کی نمود ہوتی ہے۔ اس کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ آپ دیکھئے تصریف و تدریس اور بیان سے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی راز (مخفی) نہیں۔ اس کے تمام رموز و اسرار کو خود اللہ تعالیٰ نے تصریف و تدریس سے واضح کر دیا ہے۔ اس کے کوئی باطنی معانی نہیں۔ اسی جہت سے قرآن کریم کو کتابِ مبین کہا گیا ہے اور تَبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶) بھی۔ یعنی خود بھی نہایت واضح اور ظاہر ہے، اور دین سے متعلق ہر بات کو واضح اور ظاہر کرنے والی بھی۔

لیکن یہ تمام عملِ میکائلی نہیں کہ از خود ہوتا چلا جائے گا۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد فرمایا۔ لَقَوْمٌ يَعْلَمُونَ

(۶)۔ اس سے وہی استفادہ کر سکیں گے جو علم و بصیرت سے کام لیں گے۔ قرآن مجید کے متعلق، اس

وضاحت کے بعد حضورؐ سے فرمایا کہ

إِتَّبِعْ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَاعْرِضْ

عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝

بہر حال، اے رسول! یہ تمہارا ساتھ دیں یا نہ دیں۔ تم اس ضابطہ خداوندی کا اتباع کرتے جاؤ جو تمہارے

نشوونادینے والے کی طرف سے، تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے سوا کسی اور کا قانون ایسا نہیں جس کا اتباع کیا جائے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے قانون کے ساتھ، اوروں کے قوانین بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ یا یہ خیال کرتے ہیں کہ خارجی کائنات میں تو خدا کا قانون نافذ العمل ہے، لیکن انسانی دنیا میں انسانوں کا خود ساختہ قانون چلنا چاہئے۔ تم ان سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔

رَسُولُ اللَّهِ كَوَاتِبَاعِ قُرْآنٍ كَا حَكْمٍ | غور کیجئے! خود حضورؐ کو بھی اسی قرآن کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ (اور اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے)۔ اس سے

ایک اصول واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ حضورؐ کے بعد جو کچھ حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (وہ تاریخ میں ہو یا کتب احادیث میں) وہ اگر قرآن کریم کے مطابق ہے تو اس کے متعلق کہا جاسکے گا کہ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو بلا تامل کہہ دیا جائے گا کہ وہ وضعی ہے حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں حضورؐ کا کوئی ارشاد یا عمل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ قرآن کا اتباع فرماتے تھے اور اس کی خلاف ورزی کو معصیت قرار دیتے تھے۔ (۱۵/۱)



ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک مشفق طبیب کی طرح حضورؐ پر یہ امر کہ لوگ تباہی کا راستہ کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں اور صحیح راستہ کی طرف کیوں نہیں آ جاتے۔ کس قدر گراں گزرتا تھا۔ (۶/۲۶)۔ آیت (۶/۲۶) میں کہا گیا ہے کہ مشرکین سے اعراض برتو، تو اس سے حضورؐ کے قلب دروحد میں ان کی تباہی کے تصور سے افسردگی کا پیدا ہو جانا

فطری امر تھا۔ اس کے لئے فرمایا:

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا ۚ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظًا ۚ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ۝ ۶
۱۰۸

تم اس سے افسردہ خاطر ہو کہ یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اپنے کائناتی قانون کے مطابق، انسانوں کو مجبور پیدا کر دیتے۔ اور اس طرح گمراہی دوسرے قوانین کی اطاعت اختیار نہ کرتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہم، انسان کا اختیار و ارادہ، جو ہم نے اسے دیا ہے، سلب نہیں کرنا چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں نہ ان پر پاسبان مقرر کیا ہے نہ داروغہ۔ کہ تم انہیں مجبوراً صحیح راستے پر چلاؤ۔ (۶/۱۰۹ ز ۶/۱۱۰)

چونکہ ہم اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں (دیکھئے عنوان تقدیر) اس لئے اس مقام پر کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔

جب مشرکین سے اعراض برتنے کا کہا تو ساتھ ہی جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ان کے معبودوں، اور بزرگوں کو بُرا بھلا کہنے لگ جاؤ۔ باطل عقائد اور مسالک سے اختلاف اور اعراض کی اور بات ہے۔ اس کے جواب دینے کا موقعہ آئے تو دلیل و برہان کی رُو سے جواب دیا جائے۔ ابتذال کی پست سطح پر اترنا مومنین کا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدُوًّا
بَغِيرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيْنًا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَلَيْهِمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ
مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

اے جماعتِ مومنین! اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کے معبود، باطل ہیں اور تم باطل پرست نہیں ہو۔ لیکن دیکھنا! کہ تم ایسی پست سطح پر نہ اترنا کہ ان کے معبودوں کو گایاں دینے لگ جاؤ۔ تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ، جہالت کی بنا پر، خدا کو گایاں دینے لگ جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں (دوستہ سرکشی اختیار کرنے والوں کے سوا) جو کچھ کوئی کرتا ہے، اچھا سمجھ کر ہی کرتا

ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جہالت کی وجہ سے اچھے اور بُرے میں تیز نہیں کر سکتا۔ اس لئے غلط راستے پر چلنے والے پر اس کی غلط روی کو واضح کرنا چاہئے اور اس کے سامنے صحیح راستہ لانا چاہئے۔ اسے بُرا بھلا کہنے سے اس میں اُلٹی ضد پیدا ہو جائے گی۔ اگر وہ سمجھانے کے باوجود صحیح راستہ کی طرف نہ آئے تو اس میں بھی غصے ہو جانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کا نقصان اُسی کو ہوگا۔ یاد رکھو! تمام لوگوں کے اعمال کے نتائج خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ صحیح روش پر چل رہے تھے یا غلط پر۔

آپ غور کیجئے۔ غلط روش پر چلنے والوں کی جہالت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا یہ لوگ غلط کام اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں وہ کام غلط یا بُرے دکھائی نہیں دیتے۔ وہ انہیں اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں ان کے اعمال کو بے نقاب کر کے دکھا دیا جائے کہ وہ کیسے ہیں۔ اور ایسا علم و بصیرت

کی رو سے ہوگا۔ بُرا بھلا کہنے سے نہیں۔ باطل مذاہب کے پیرو، اپنے عقیدہ کی رو سے، مذہبی امور میں جس قدر مشفقین اٹھاتے اور صعوبات برداشت کرتے ہیں وہ اس لئے ہے کہ وہ ان کاموں کو نیکی یا ہمارے اصطلاح میں (ثواب، کام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اگر وہ انہیں بُرا سمجھیں تو ایسا کریں ہی کیوں! آپ دیکھئے کہ قرآن کریم غیر مذاہب کے پیروں کے ساتھ کس قسم کا انداز اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

دیگر مقامات میں کہا ہے کہ وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶/۱۲۰)۔ ان کے غلط کاموں کو شیطان مزین بنا کر دکھاتا ہے۔ شیطان کے متعلق بتایا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس) کہ یہ انسان کے غلط جذبات کا دوسرا نام ہے۔ جذبات و سرکشی اور مفاد پرستی کے بھی ہوتے ہیں اور باطل مذہبیت کے بھی۔ اس کا علاج یہ ہوتا ہے کہ جذبات کے تابع چلنے کے بجائے، علم و بصیرت اور دلائل و براہین سے کام لیا جائے۔ یہ دلائل و براہین سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر یہ رسول کوئی معجزہ دکھا دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ یعنی رسول انہیں علم و بصیرت کی دعوت دیتا ہے (۱۲/۱۱۰) اور یہ اُس سے تو ہم پرستی کا مطالبہ کرتے ہیں (انڈکس میں معجزات کا عنوان دیکھئے)۔

وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ آيْمَانِهِمْ لَإِنْ جَاءَهُمْ آيَةٌ
تَيُومِنَنَّ بِهَا قُلُوبُهُمْ أَنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ
أَنَّهُآ إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

یہ (مخالفین) خدا کی قسمیں کھا لیا کرتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی محسوس نشانی دکھا دی جائے تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اسے رسول! تم ان سے کہہ دو کہ اس قسم کی نشانیاں بھیجنے نہ بھیجنے کا معاملہ خدا سے متعلق ہے (میرا کام تو خدا کا پیغام تم تک پہنچانا ہے)۔

معجزات طلبی | اسے جماعت مومنین ہو سکتا ہے کہ ان مخالفین کے اس مطالبہ سے تم میں سے بھی بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر انہیں اس قسم کا کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو اچھا

ہی ہے۔ یہ اس طرح ایمان لے آئیں گے (لیکن نہیں ان کی وہی کیفیت معلوم نہیں۔ یہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لانے کے۔ ویسے بھی، معجزات دکھا کر مومن بنانا ہمارے قانونِ مشیت کے خلاف ہے۔) (اسلئے

تم ان کی ان باتوں کا خیال نہ کرو۔ قرآن کو عقل و بصیرت کی بنا پر پیش کرتے رہو۔)

اور یہ امر واقعہ ہے۔

۶/۱۱۳

وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ
أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝

ان معتزغیبین و فحالیفین میں سے، اہل کتاب کا معاملہ تو بالکل صاف ہے (یہ پیغام، اس سے پہلے بھی ان کی طرف آتا رہا ہے، لیکن یہ اس پر ایمان نہیں لائے۔ اس لئے کہ پیغام خداوندی کی صداقت کو عقل و بصیرت کی رو سے پرکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ تعصب و توہم پرستی اور اسلاف کی آندھی تقلید کو اپنا مسلک بنالیں، ان کی عقلیں اوندھی ہو جاتی ہیں، اور وہ اپنی پیدا کردہ تاریکی کی طغیانوں میں بہے چلے جاتے ہیں۔ (۲۷)

ضد پراٹے رہنا | اگرچہ اس میں اشارہ اہل کتاب کی طرف معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے ایک اور ذہنیت کا اظہار بھی مقصود نظر آتا ہے۔ وہ ذہنیت یہ ہے کہ اگر ایک بار بلا سوچے سمجھے منہ سے نہ نکل گئی تو پھر ہزار کوشش کیجئے، وہ اپنی ضد پراٹے رہیں گے، خواہ دل میں اپنی غلطی کا احساس بھی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ (۲۸)

آٹھواں پارہ شروع

۶/۱۱۴

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَى وَحَشَرْنَا
عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قَبْلًا مَا كَانُوا إِلَيْنَا مُّرِئِينَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ
وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ۝

یقین مانو۔ اگر ہم (بفرض محال) ان کی طرف فرشتے نازل کر دیتے۔ ان سے مردے باتیں کرنے لگ جاتے اور ہم ان کے سامنے دنیا جہان کی چیزیں لاکھڑی کرتے۔ تو یہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔ اس لئے کہ ایمان وہی لا سکتا ہے جو وہ طریقہ اختیار کرے جسے خدا نے، ایمان لانے کے لئے، تجویز کر رکھا ہے۔ (یعنی عقل و بصیرت سے کام لینا۔ ۱۱۳)۔ اور ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ عقل و بصیرت کے پاس ٹپک نہیں پھینکتے۔ اور اپنی جہالت پر نازاں رہتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کے لوگ کیسے ایمان لائیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کے انکار اور سرکشی کی وجہ کچھ اور ہے، اور وہی چیز انہیں اس طرف آنے نہیں دیتی۔

یعنی ان کی مفاد پرستی۔

”إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ کے معنی یہ ہیں کہ ایمان وہی شخص لاسکتا ہے جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق عقل و فکر سے کام لے کر پیغامِ خداوندی پر غور و فکر کرے۔ اس کی وضاحت آیت کے اگلے کھڑے (وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ يَجْمَهُلُونَ) نے کر دی۔ کہ اس کے برعکس یہ لوگ جہالت میں ڈوبے رہتے ہیں اور ڈوبے رہنا چاہتے ہیں۔ خود ان کی طرف سے معجزات کا مطالبہ اسی جہالت کا مظاہرہ ہے۔ لہذا یہ لوگ کس طرح ایمان لاسکتے ہیں۔ ان کے عوام کی یہ حالت ہے کہ جہالت سے نکلنا نہیں چاہتے اور ان کا سرعہ پیغامِ خداوندی کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطَانِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝

یہ بات کوئی نئی نہیں۔ جو بھی بھی آیا، اس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنے، خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمددہ افراد تھے یا باہر، بدویت کی زندگی بسر کرنے والے غیر مہذب، اُس کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

(۲۲/۵۲)۔ (اس لئے کہ، اس دعوتِ انقلاب کی، اُن کی مفاد پرستیوں پر زور پڑتی تھی)۔ اس کے لئے

انبیاء کے دشمن | وہ یا بھی خفیہ سازشیں کرتے، اور عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے، ان سے طرح طرح کی ملمع بازی کی باتیں کرتے۔ (اس لئے، اسے رسولِ انعام کی اس روش سے

کبیدہ خاطر نہ ہو) اگر مقصود یہ ہوتا کہ دعوتِ آسمانی کی کہیں مخالفت ہی نہ ہو اور سب لوگ اسے طوعاً و کرہاً مانتے چلے جائیں، تو ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا بھی کر سکتے تھے۔ لیکن یہ ہمارے پروگرام کے خلاف ہوتا جس کی رو سے ہم نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اس لئے، تم ان سے اور ان کی فریب کاریوں سے صرف نظر کرتے ہوئے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہو)۔

شَیَاطِينِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ | ”شَیَاطِينِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ“ کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۵۲-۵۳) پر کی جا چکی ہے۔ یہاں آٹنا اضافہ کافی ہے کہ عربوں کی بہت محسوری

آبادی شہروں میں متمددہ زندگی بسر کرتی تھی اور ان کی اکثریت شہروں سے دور، صحراؤں میں خانہ بدوشی کی حالت

میں رہتے تھے۔ عربوں کے ہاں جن ان بدوی قبائل کو کہتے تھے کیونکہ وہ نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ (اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہیں) اور انس شہری آبادی کو جو ایک دوسرے سے مانوس (SOCIAL LIFE) کی زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن کریم میں ”جن و انس“ جہاں بھی آیا ہے اس سے یہی دو آبادیاں مراد ہیں۔ رہتے تو یہاں تک الگ تھے لیکن ان کا آپس میں میل جول رہتا تھا۔ جیسے ہمارے ہاں (آج سے کچھ عرصہ پہلے تک (NOMADIC TRIBES) خانہ بدوش لوگ شہروں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ قلندر، مداری، مٹی کے کھلونے بیچنے والی ان کی عورتیں وغیرہ۔ اب بھی شہروں میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن مستقل رہائش ان کی باہر صحراؤں اور جنگلوں میں ہی ہوتی ہے۔ عرب میں اب تک یہ دونوں آبادیاں ایک دوسرے سے متمیز زندگی بسر کرتی ہیں۔

جَنَات

یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ فلاں کو جن چمٹ گیا۔ اور فلاں جگہ جَنَات رہتے ہیں، یہ سب تو ہم پرستی ہے۔ اس قسم کی کسی مخلوق کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ لوگ اس ضمن میں جتنے قصے بیان کرتے ہیں، تحقیق کرنے پر وہ تو ہم پرستی پر مبنی افسانے ثابت ہوتے ہیں۔ (یہ راقم الحروف کی شنید نہیں، دید بلکہ آپ بتی ہے۔ تفصیل اس کی میری کتاب — (تصوف کی حقیقت میں ملے گی)۔

قرآن کہتا ہے کہ عوام کے یہ سرغنے، انہیں جھوٹ اور فریب پر مبنی ملمع سازی کی نہایت دلکش باتیں سناتے رہتے ہیں تاکہ وہ جہالت میں ڈوبے رہیں، اور عقل و فکر سے کام لے کر، اس پیغام خداوندی کی طرف آنے نہ پائیں ہمارے واعظ اکثر اسی قسم کے افسانے عوام کو سناتے رہتے ہیں تاکہ وہ قرآن کریم کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ ان مفاد پرست گروہوں کی یہ ٹیکنیک شروع سے چلی آرہی ہے۔ بنی اسرائیل کا ”سامری“ انہی میں سے تھا۔ سامری کے معنی ہی قصہ گو اور افسانہ تراش کے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے اسے اگلی آیت میں یوں بیان کر دیا کہ:

وَلِتَصْغِيَ إِلَيْهِ الْأَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرَبُ
ضُؤُهُمْ وَلِيُغْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ ۝

۶
۱۱۳

ان ملمع سازوں اور فریب کاریوں سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو دنیاوی زندگی کے مفاد ہی کو منہتی سمجھتے ہیں اور حیاتِ اخروی، اور خدا کے قانونِ مکافات پر یقین نہیں رکھتے، ان کی طرف جھکے رہیں۔ انکی ہاں میں ہاں ملائے ہیں۔ اور جو کارستانیاں یہ کرتے ہیں، وہ بھی ان میں شریک رہیں۔ یہ چاہتے ہیں

کہ سارہ معاشرہ انہی کے ڈھب پر چلتا جائے تاکہ کوئی کسی کو روکنے والے نہ ہو۔ (وہ تم سننے بھی اسی قسم کی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں)۔ ان سرغنوں کا مقصد قوم کی اصلاح نہیں ہوتا۔ جن باتوں سے عوام خوش ہوں یہ انہی میں انہیں الجھائے رکھتے ہیں اور جس طریق سے وہ دولت حاصل کرتے ہیں، انہیں ویسا ہی کرنے دیتے ہیں تاکہ وہ ان کی مخالفت پر نہ اتر آئیں۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ اس قسم کی ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جو خدا کے قانون مکافات عمل (حیات آخرت) پر یقین نہیں رکھتے۔ مکافات عمل پر یقین رکھنے والوں کی اثر پذیری کا معیار اور ہوتا ہے۔ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، فریب اور صداقت میں تمیز کرنا جانتے ہیں کیونکہ اس کیلئے ان کے پاس صحیح معیار ہوتا ہے۔

اور ان سب کے جواب میں، ایک اصولی بات کہی کہ:

۴
۱۱۵
أَفَعَيِّرَ اللَّهُ أَتَّبَعِيَ حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنْزَلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝

ان سے پوچھو کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر، کسی اور کے قانون کے مطابق اپنے اور تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطہ قوانین بھیج دیا ہے۔ جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے (یعنی جماعت مومنین کے ارباب علم و بصیرت - ۴/۱۱۵) وہ اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ یہ فی الواقعہ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے، حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اس لئے ان مخالفین کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ آیت دین کا غرورۃ الیقینی ہے۔ دین، حکومت خداوندی کا دوسرا نام ہے۔ اور حکومت خداوندی کی عملی شکل کتاب اللہ کی حکمرانی ہے۔ اس کی وضاحت محالب الفرقان جلد سوم (ص ۹) پر آچکی ہے۔ وہیں یہ آیت بھی درج ہے۔ یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کتاب اللہ کو مفصل کہا گیا ہے۔ تفصیل کے معنی ہوتے مفصل کے معنی ہیں بات کو نکھار کر، الگ الگ کر کے، بیان کرنا۔ ہمارے ہاں تفصیل کے معنی (DETAILS) ہوتے ہیں۔ قرآن اس معنی میں (DETAILED) نہیں کہ اس میں

قوانین کی جزئیات تک بھی دی ہوئی ہیں۔ قرآن نے قوانین، اصولی طور پر دئے ہیں اور اسے ہر زمانے کی اسلامی حکومت پر چھوڑا ہے کہ وہ ان قوانین کی جزئیات، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود وضع کر قرآنی اصول و قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور حکومت کی مرتب کردہ جزئیات (عند الضرورت) بدلتی رہیں گی۔ اور اس حقیقت کو اگلی آیت میں یوں بیان کر دیا کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

مکمل اور غیر متبدل کتاب | اس قرآن میں خدا کا ضابطہ قوانین، تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے، اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے،

مکمل ہو چکا ہے۔ اب ان قوانین خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں — یعنی، یہ مکمل ایسا ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ اور محکم ایسا کہ اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ (۱۸/۱۵) اسی لئے اب کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں رہی (۳۳/۳)۔ اور خدا نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ (۱۵/۹)۔ یہ اس لئے کہ اس خدا کا ضابطہ قوانین ہے جو سب کچھ سنستا، اور ہر بات کا علم رکھتا ہے۔ (اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ انسانی راہنمائی کے لئے جو کچھ دیا جانا ضروری تھا اس میں سے کوئی بات لاعلمی کی بنا پر رہ گئی ہو۔

اس اعلانِ عظیم نے اسلام کو تمام ادیانِ عالم میں منفرد حیثیت عطا کر دی۔ اس نے کہہ دیا کہ جو کچھ خیلے نوعِ انسان سے کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ اب ان سے کہنے کی کوئی بات باقی نہیں رہی۔ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ۔ قرآن میں پہنچ کر مکمل ہو گیا۔ یہ ہوئی پہلی منفرد خصوصیت۔ دوسری یہ کہ، نہ صرف یہ کہ اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بھی کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ قیامت تک غیر متبدل رہے گا۔ دوسری جگہ ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهِ۔ (۱۸/۱۵)۔ کوئی ایسا نہیں جو اس میں تبدیلی کر سکے۔ نیز (۳۳/۳) (۱۸/۱۴)۔ سابقہ صفحات میں آیت (۳۳/۳) کے تحت بھی اس موضوع پر گفتگو ہو چکی ہے۔

مکمل اور غیر متبدل ہونے کی خصوصیات کا ذکر یہاں آیا ہے اور آیت (۱۵/۹) کی رو سے خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ قرآن کے متعلق ان تینوں خصوصیات سے ختم نبوت از خود ثابت ہو جاتی ہے خدا نے جو کچھ نوعِ انسان سے کہنا تھا وہ قرآن میں آکر مکمل ہو گیا۔ اس میں کسی تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں ہوگی اور

یہ قیامت تک محفوظ بھی رہے گا۔ تو پھر کسی نبی کے آنے کی ضرورت کیا ہے؟ نبی تو خدا کا پیغام لے کر آتا تھا۔ جب خدا نے اب کوئی پیغام نوع انسان کو دینا ہی نہیں تو وہ نبی کس مقصد کے لئے بھیجے گا؟۔ (انڈکس میں ختم نبوت کا عنوان دیکھئے)۔

اگلی آیت میں قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ غلط اور صحیح کا معیار انسانوں کی رائے نہیں۔ نہ کسی ایک انسان کی اور نہ ہی انسانوں کی اکثریت کی۔ فرمایا:

وَإِنْ تَطَّعْ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝

اب رہا یہ سوال کہ یہ ضابطہ خداوندی اس روش کے خلاف دعوت دینا ہے جس پر نوع انسان کی اکثریت گامزن ہے تو یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کسی مسلک کے صحیح ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں کہ اسے اکثریت نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر تم (اس خیال کے مطابق) لوگوں کی اکثریت کا اتباع شروع کر دو، تو یہ چیز تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دے گی۔ دنیا کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ لوگ محض ظن و تخمین کے پیچھے ہو جاتے ہیں (اور یقینی علم کے بجائے) قیاس آرائیوں سے کام لیتے دہتے ہیں۔ (اس کے برعکس، خدا کی وحی جو کچھ پیش کرتی ہے، وہ سرتا سر علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔)

مغربی جمہوریت کے خلاف | اس آیت نے ڈیموکریسی یا جمہوریت کے نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ یہ آج سے چودہ سو سال پہلے نازل ہوئی تھی جب دنیا ہنوز

ڈیموکریسی کے نظام سے واقف تک نہیں تھی۔ اور قرآن کریم نے اس زمانے میں اس کا ابطال کر دیا۔ ڈیموکریسی کسے کہتے ہیں اور اس کے متعلق عصر حاضر کے دانشور کس نتیجہ پر پہنچے ہیں، قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے اس کی صداقت اور عظمت سامنے نہیں آسکے گی جب تک اس نظام (ڈیموکریسی یا جمہوریت کی تاریخ بیان نہ کر دی جائے۔ یہ بات ہوگی تو ذرا طویل، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت لاینفک ہے۔ بالخصوص ہمارے زمانے میں آپ اسے غور سے دیکھئے۔

کاروان انسانیت کی تاریخ، ناکام تجربات کی مسلسل داستان ہے۔ انسان ایک نظریہ وضع کرتا ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ صدیوں کی جانکاہ مشقتوں اور زہرہ گداز مسعوتیوں۔ لہزہ انگیز خویزیوں اور خشتناک فساد انگیزیوں۔ مہیب لڑائیوں اور تباہ کن جنگوں کے بعد یہ حقیقت اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا

اس کے بعد وہ اس کی جگہ ایک اور نظریہ وضع کرتا ہے، جو بالعموم سابقہ نظریہ کی ضد ہوتا ہے، اور اس پر تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ نظریہ بھی، اسی قسم کے فساد انگیز مراحل سے گزر کر ناکام ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک اسی قسم کے عمل اور ردِ عمل (ACTION AND RE-ACTION) تجارب سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ ان نظریات اور تجربات کا تعلق اس کی زندگی کے ہر گوشے — معاشرت، معیشت، سیاست وغیرہ سے ہے۔ سرورست ہم اس کے سیاسی پہلو، اور وہ بھی اس کے ذیلی شعبے، اسلوبِ حکومت سے متعلق گفتگو کریں گے اور دیکھیں گے کہ وہ آج کس مقام پر کھڑا ہے اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔ انسان مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے ہر حال، مل جل کر رہنا ہے۔ مل جل کر رہنے کا لازمی نتیجہ ہے کہ افراد اور گروہوں کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ ان میں تنازع ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جن دو فریقوں میں باہمی تنازع ہو، وہ اسے از خود نہیں سلجھا سکتے۔ اس کے لئے کسی تیسرے فریق، (ثالث) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے حکومت کا تصور پیدا ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے، انسان نے قبائلی زندگی اختیار کی جو خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا۔ اس اندازِ زندگی میں قبیلہ کا بزرگ، یعنی مورثِ اعلیٰ، واجبِ احترام قبائلی زندگی سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے سب کے لئے واجبِ الاتباع تھے۔ یہ حکومت یا مملکت کا پہلا خاکہ تھا۔ اس میں عام طور پر مرد ہی سربراہ ہوتا تھا اگرچہ کہیں کہیں عورتیں بھی سربراہ نظر آتی ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی میں (اور ابتدائی کیا؟ اب بھی جہاں جہاں جہالت ہے وہاں) پروہتوں (PRIESTS) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ فوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصور کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کا پنتا تھا اور ان کے حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان پروہتوں نے جب دیکھا کہ لوگ بزرگ خاندان (یا قبیلہ) کو اس لئے سربراہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اس کا احترام ہوتا ہے تو انہوں نے سوچا کہ لوگوں کے دل میں جو ان کا (پروہتوں کا) احترام ہے، اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا (اور عوام سے منوایا) کہ درحقیقت حقِ حکومت انہی کو حاصل ہے۔ اس سے

تھیا کرے سی | تھیا کرے سی (ندہی پیشواؤں کے اویسیاتی اختیارات) کے بیج حکومت کی طرح پڑی۔ کہیں ایسا بھی ہوا کہ کسی زور آور نے کسی طرح قوت فراہم کر لی اور اپنے ساتھ اسی قسم کے اور شہ زور افراد ملائے تو انہوں نے کمزور انسانوں کو دباننا شروع کر دیا۔ اس طرح ”حکومت بزورِ قوت“ کا انداز وجود میں آیا۔

اسے ملوکیت یا شاہنشاہیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ ان اربابِ قوت (راجاؤں۔ بادشاہوں) نے جلد ہی **ملوکیت** محسوس کر لیا کہ خالی قوت کے بل بوتے پر لوگوں کو دبائے رکھنے میں خاصی دقتیں پیش آتی ہیں۔ قوت کے ساتھ احترام یا عقیدت کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف مذہبی پیشواؤں نے دیکھا کہ قوت کے بغیر خالی عقیدت کے زور پر اقتدار قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس باہمی ضرورت کے تحت بادشاہوں اور مذہبی پیشواؤں (راجاؤں اور پرودھتوں) نے باہمی سمجھوتہ کر لیا۔ مذہبی پیشواؤں نے، راجہ کو ایشور کا اوتار، اور سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے دیا اور بادشاہوں نے کہا کہ انہیں یہ خدائی اختیارات، مذہبی پیشواؤں کی وساطت سے حاصل ہیں۔ عملی زندگی میں انہوں نے دواور اقتدار بانٹ لئے۔

سیکولرزم | مذہبی دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشواؤں کی تسلیم کر لی گئی اور دنیاوی معاملات میں بادشاہوں کی۔ اسے سیکولر انداز حکومت کہا جاتا ہے۔

اس مختصر سی روئداد سے ہم نے دیکھ لیا کہ انداز و اسالیب حکومت کتنے ہی کیوں نہ بدلتے رہے ہوں، نظریہ شروع سے اخیر تک ایک ہی کارفرما رہا ہے۔ یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ اس نظریہ کے تابع، حکمرانوں کے ہاتھوں محکوم انسان جس وحشت و بربریت کا شکار ہوئے اور جن مظالم کا تختہ مشق بنے، ان کے تصور سے خود انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب یہ بہیت اور درندگی انتہا تک پہنچ گئی تو مغرب کے بعض مفکرین کے دل میں اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا اور انہوں نے سوچا کہ انداز حکومت کچھ ایسا ہونا چاہیئے جس میں انسان کی حکومت انسان پر نہ ہو۔ ان کی فکر اس نتیجہ پر پہنچی کہ نظام حکومت لوگوں کے باہمی معاہدہ سے

نظریہ میثاق | قائم ہونا چاہیئے۔ اسے نظریہ میثاق (THEORY OF SOCIAL CONTRACT) کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء مشہور مفکر، ہابز اور لاگ سے ہوئی تھی لیکن چونکہ اس کی عملی

تفصیل روسو — (ROUSSEAU - 1712 - 1778) نے مرتب کی تھیں اس لئے، ہم اس سرگزشت کو وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی آزادی برقرار رہے لیکن تمدنی زندگی میں یہ ناممکن ہو چکا ہے، اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ تمام انسان مل کر اپنی اپنی انفرادیت کو اجتماعی معاشرہ میں جذب کر دیں۔ اس طرح اس معاشرہ کے احکام کا اتباع ہر فرد کی اپنی ذات کا اتباع ہوگا اور کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوگا۔ اس اجتماعی معاشرہ کو روسو، اجتماعی ارادہ (GENERAL WILL) سے تعبیر کرتا ہے۔

اس نے کہا کہ ہر فرد کے ”دو ارادے“ ہوتے ہیں۔ ایک ذاتی اور ایک بحیثیت شہری ہونے کے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ایک فرد کے ان ارادوں میں ٹکراؤ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ذاتی ارادے کو اجتماعی ارادے کے تابع رکھنا ہی عین آزادی ہے۔

الفاظ کی حد تک تو یہ نظریہ بڑا خوش آئند بلکہ دلکش تھا لیکن اس کے بعد جب اس کی عملی تفسیر کا مسئلہ سامنے آیا تو اس میں دشواری پیدا ہوئی۔ مسئلہ یہ سامنے آیا کہ اس ”اجتماعی ارادے“ کا تعین کس طرح کیا جائے؟ اس کے جواب میں روسونے کہا کہ اس کے لئے ہر فرد معاشرہ کی رائے دریافت کی جائے۔ لیکن یہ کہنے کے بعد اسے خود ہی خیال آیا کہ ایک مملکت کے تمام افراد کی آراء کا معلوم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کے لئے اس نے لاک کے نظریہ کا سہارا لیا جس نے کہا تھا کہ حکومت افراد کے نمائندگان پر مشتمل ہونی چاہیئے اور اگر ان نمائندوں میں کبھی اختلاف ہو جائے تو فیصلہ اکثریت کی رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ روسو اور لاک کے نظریات کے اس امتزاج کو قبول کر لیا گیا

ڈیموکریسی اور اس کے مطابق اسلوب حکومت کو ڈیموکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ اس کا ترجمہ جمہوریت کیا جاتا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ ڈیموکریسی کی بنیاد حسب ذیل مفروضات پر قائم ہوتی ہے:-

- ۱۔ اس انداز حکومت میں حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں عوام خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں۔

- ۲۔ عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

- ۳۔ کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی اکثریت رائے ہوتا ہے۔ اور

- ۴۔ اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور تمام افراد مملکت پر ان کی

اطاعت لازمی ہوتی ہے۔

شخصی حکومتوں کے ڈسے ہوئے مظلوم انسانوں نے اس نظریہ کو آئینہ رحمت سمجھا۔ اس کی شان میں مدح و ستائش کے قصائد نشید ہوئے۔ اس کے نفاذ پر مسرت اور شادمانی کے جشن منائے گئے۔ انسانیت نے سمجھ لیا کہ اس نے آزادی کے فردوس گم گشتہ کو پھر سے پایا ہے۔ اس کا شہرہ مغرب تک ہی محدود نہ رہا۔ اطراف عالم میں اس پر تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے۔ دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے آگے

بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ جمہوریت۔ جمہوریت کے نعروں سے کرّہ ارض گونج اٹھا۔ جس نے اس اندازِ حکومت کو اختیار نہ کیا، یا اس کی مخالفت کی، اسے انسانیت کا دشمن قرار دیا گیا۔

﴿

لیکن اس غلطی اور غلطی کی ہنوز صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہوئے پائی تھی کہ اسی مغرب سے اس قسم کی آوازیں بلند ہوئی شروع ہو گئیں کہ یہ نظریہ بڑا فریب انگیز ہے۔ اسے نافذ کیا گیا تھا یہ کہہ کر کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت ختم ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ اس سے انسانوں پر انسانوں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مسلط ہو گئی، اس فرق کے ساتھ کہ عہدِ جاہلیت میں حکمران بے نقاب سامنے آتے تھے۔ اب اس دورِ تہذیب میں وہ جمہوریت کا نقاب اوڑھ کر آتے ہیں اور عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا۔ یہ تمہاری اپنی حکومت ہے۔ تم اپنے آپ پر خود حکومت کرتے ہو۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (CRISIS OF CIVILISATION) کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب شائع کی تھی جس میں اس نے تہذیبِ مغرب سے روئی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کی تباہی کا بڑا سبب، اندازِ جمہوریت ہے۔ اس نے کہا تھا:

اس نظریہ کو اگر بنظرِ امعان دیکھا جائے تو ”عوام کے اقتدارِ اعلیٰ“ کا فریب نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری حقیقت سے نہیں، بلکہ عملی حقیقت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا، عملی ناممکنات سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کے ایک طبقے پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں، مملکت کو لامتناہی اختیارات کا حامل بنا دیتا ہے۔

(ص ۶۸)

اس نظریہ کے متعلق کہ اکثر بت جسے صحیح کہہ دے، وہ صحیح ہوتا ہے، پروفیسر مذکور لکھتا ہے:-
عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت سے قائم کی جانیگی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہ بالضرور صحیح ہو، اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے، نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر

کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہیں تو وہ (محض اس لئے کہ اتنے لوگوں نے اسے صحیح کہہ دیا ہے) صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ (روٹسو) کہتا ہے کہ ”منشائے عمومی ہمیشہ صحیح ہوگا، ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا“۔ لیکن اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ صحیح وہی ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر درست ہے، وہی صداقت ہے۔ (ص ۷۷)

اس کے بعد وہ لکھتا ہے :-

اقتدار اعلیٰ لفظی طور پر بڑا بلند آہنگ تصور ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم صرف اس صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ روزمرہ کی زبان میں اس کا مطلب کیا ہے؟ اقتدار اعلیٰ سے مفہوم ”اختیارات مطلقہ“ ہے۔ یعنی بلا حدود و قیود حکومت، خواہ ایسی حکومت ایک فرد کی ہو یا ایک جماعت کی۔ بنا بریں ”اقتدار اعلیٰ“ کے نظریہ کو محض ایک نظری سوال سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ آج اسی مفروضہ کو حقیقت ثابت تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، اور اس کے بعد بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فرد واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں، یا کسی نمائندہ جماعت کے ہاتھ میں۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ ”اقتدار اعلیٰ“ کا یہ تصور صحیح بھی ہے یا نہیں۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ یعنی یہ مسئلہ کہ قانون کا سرچشمہ عوام کا منشائے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ ہے۔ (ص ۷۸)

اس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھیئے کیونکہ اس میں ایسے اصولی نکات پیش کئے گئے ہیں جن کی اہمیت اس وقت سامنے آئے گی جب ہم جمہوریت کا تجزیہ قرآن مجید کی روشنی میں کریں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (ACEWING) نے اپنی کتاب (INDIVIDUAL THE STATE AND-

WORLD GOVERNMENT) میں دیا کرسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ اس

بحث کے دوران وہ لکھتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ جمہوری نظام میں استبداد یا غصب حقوق کا خطرہ

نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ اپنے اوپر استبداد، یا خود اپنے حقوق کا غصب کبھی روا نہ رکھیں گے۔ لیکن

اگر روسو، عصر حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظام جمہوریت کے متعلق

کبھی اس خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص ۱۱۶)

پروفیسر جود (C.M. JOD) کو بھی جو پہلے نظام جمہوری کا بڑا حامی تھا، بعد میں یہ کہنا پڑا کہ

سائنس (یعنی مادی نقطہ نگاہ سے) ہر چیز کی قیمت اس کی کمیت (QUANTITY) کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے، کیفیت (QUALITY) کی رُو سے نہیں۔ سائنس کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی اصول کو سیاست پر بھی منطبق کر لیا گیا۔ چنانچہ جمہوری انداز حکومت میں فیصلے ”سروں کی گنتی“ سے ہونے لگے۔ ہر سر ایک ووٹ، خواہ ایک سرمفکر کا اور دو سر اگدھے کا ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے

کہ از مغز دو عدد تر فکر انسا نے نمی آید - (DECADENCE)

مشہور فرانسیسی مفکر، (RENE GUENN) لکھتا ہے:-

قریب جمہوریت

باب جمہوریت

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین التقیضین ہے کہ ایک ہی قوم ایک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا مقتضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ پیوست کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں..... عام رائے دہندگی کا اصول اسی قریب وہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ (اس اصول کی رو سے) سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص شخص پر لگایا بھی جاسکتا ہے اور بدل بھی جاسکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD -- P. 106)

ڈیٹن انگے (DEAN INGE) نے اپنی کتاب (THE FALL OF IDOLS) میں ٹومیا کریمی کے خلاف مختلف مفکرین اور مدبرین کے اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک اقتباس ہے:-

آزاد لوگ جنگ کے زیادہ متمنی ہوتے ہیں اور جمہور نہیں، مطلق العنان بادشاہوں سے بھی زیادہ اپنے جذبات کی

غلام - (MIRABEAU)

2. 4

جمہوریت، فطری طور پر تو آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے۔

(IRVING BABBIT)

اور خود رائے کی اپنی رائے یہ ہے کہ

ایک مکمل جمہوریت بھی اس مذہب جمہوری نہیں ہو سکتی جس مذہب یہ نظریہ جمہوریت اسے جمہوری بتاتا ہے

(ص ۱۱)

۱۹۴۷ء میں، اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے منعقد کی تھی کہ وہ جمہوری نظام حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین اور مدبرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس کا نام ہے (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا تھا کہ یہ اصطلاح بالکل مبہم (AMBIGUOUS) ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد کمیٹی نے دوسرا سوال پیش کیا کہ ”کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟“ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ”یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف ایجیٹیشن کرے اور اسے بدلوادے“

یہ ہیں جمہوریت کے متعلق دورِ حاضر کے مفکرین کے خیالات۔ میں نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں، وہ میری کتاب ”انسان نے کیا سوچا؟“ میں سیاست کا باب ملاحظہ فرمائیں۔



سوال یہ ہے کہ جمہوریت کو مسترد کرنے کے بعد، یہ مفکرین کس قسم کا نظام چاہتے ہیں؟

اقتدارِ علی

اس باب میں بنیادی اور متفق علیہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ، انسانوں کے ہاتھ میں اقتدار دینے کے یکسر خلاف ہیں، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ فرانسیسی مفکر (BERTAND DE JOUVENEL) نے ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (SOVEREIGNTY) وہ اس میں لکھتا ہے:-

”ہر آدمی انسانی حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ

سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظام ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو یہ اصول اسے یکساں حق مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۹۹)

حکومت قانون کی | ان کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت انسانوں کی نہیں، قانون کی ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ان کے ہاں بحث یہ چل رہی ہے کہ وہ قانون کس قسم کا ہونا چاہیے؟ اس حقیقت کو امریکی ماہرین، ایڈورڈ کارون، اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لانا ہے۔ وہ اس میں مشہور مفقن (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:-

حقیقی قانون مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان، اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روتا کے لئے الگ قانون ہو اور اینٹھن کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک اذلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (صفحہ ۱۷۱)

مشہور اطالوی مدبّر میزینی (MAZZINI) اس باب میں اور بھی وضاحت سے لکھتا ہے:-

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کر سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں

قانون کیسا ہو؟ | وحدت عقائد نہ ہو جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بند سے بن سکتے ہیں یا انسان

کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت - آمریت) یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسان کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مطلق اور ناقابل تغیر قانون نہ ہو، جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت

قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام ہونا پارٹ رکھ لیا جائے، خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مستم نہیں۔ حکومت تو منشاء خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔ (QUOTED BY GRIFFITH-IN-INTERPRETERS

OF MAN - P.P. 46-47)

اس قانون کو ابدی اور غیر متبدل کہنے کے ساتھ ہی ان مفکرین نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی زندگی پابجولاں یا محبوس ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ قوانین و اصول تو بے شک غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق (جنہیں وہ قانون کی تعبیرات کہہ کر پکارتے ہیں) حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ و ہاٹ ہیڈ (جس کا انتقال کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا ہے) ہمارے زمانے کا بہت بڑا مفکر تھا۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:-

زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں محبوس رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس کے اصول ابدی ہوں گے لیکن ان اصولوں کی تعبیرات حالات کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔ (SCIENCE AND THE MODERN WORLD - P.P. 218-19)

متنازع مغربی مفکر (ERNEST BARKER) میزینی کی ہم نوائی میں کہتا ہے:-

مملکت کے ساتھ میری وفا شعاری ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے اگر مملکت ان اقدار کی وفا شعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رُو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفا شعاری کو عدم وفا شعاری میں بدل دوں تو اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کئے بجائے باولِ نحواستہ مزاحمت کی روش اختیار کروں۔ (۱۹۵) حقیقت یہ ہے کہ یہ

مملکت کی اطاعت

مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رُو سے اس کی اطاعت ہم پر بہر حال واجب ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے ارباب اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفا شعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے :-

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ خفیہ کسی بلند قاضی کے ساتھ نہ ٹکرائے۔

PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY - P.P. 193 ; 195 ; 220.

یہاں آپ نے دیکھا کہ ان مفکرین کے نزدیک حق حکومت نہ فرد کو حاصل ہے نہ اکثریت کو۔ حکمرانی صرف اقدار کی مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ ان اقدار میں عدل کا تقاضا سرفہرست ہے۔ مغربی جمہوریت کی رُو سے، اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ مملکت کے رائج الوقت قانون کے مطابق کر دیا جائے، تو اسے مطابق عدل کہا جائیگا لیکن اب یہ مفکرین کہتے ہیں کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ قانون کس قسم کا ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ قانون انسانوں کا وضع کر رہا ہے تو اس کی رُو سے فیصلہ مبنی پر عدل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

عدل کا مفہوم (EMIL BRUNNER) ہمارے دور کا فلسفہٴ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے وہ اس باب میں لکھتا ہے :-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی پر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الٰہیاتی (خداوندی) معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی ہی کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل قبول۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی سیالکی ہی اور ملتے سازی ہوگی۔

(JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER.)

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون ملے گا کہاں سے؟ اس کا جواب کسی ”مذہب پرست“ شخص کی زبان سے نہیں، عصر حاضر کے بلند ترین سائنسدان آئن سٹائن کی زبان سے سنئے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام ہی (OUT OF MY LATER DAYS) ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے :-

سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ ”کیا ہے“ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ ”کیا ہونا چاہیے“ اس لئے اقدار کا متعین کرنا

اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک شے "ہوتی ہے"۔ اس کی دنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین و قائم کر سکتی ہے اور نہ ہی انسانی سینے کے اندر داخل ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر یہ سائنس دان کہتا ہے:-

وحی پر مبنی | یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں ہوتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اُترتی ہیں اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

اور اسی پایہ کا ایک اور عالم طبیعیات ایڈنگٹن، اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے:-

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔

✽

غور کیجئے کہ قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا دنیا کس طرح اس کی طرف آرہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قول فیصل یہ نہیں کہ ایک بات کو کتنے لوگ صحیح یا سچا سمجھتے ہیں۔ صحیح اور سچی بات وہی ہے جسے وحی خداوندی صحیح اور سچی قرار دے۔۔۔ فیصلہ کا معیار یہی ہے۔ نہ کہ انسانوں کی آراء۔ اس لئے:

﴿ ۶ ﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يُّضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

لہذا، گمراہی اور راست روی کا معیار خدا کی وحی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس کے مطابق تیرا پروردگار فیصلہ کرتا ہے کہ کون اس کے تجویز کردہ راستے سے ہٹ گیا اور کون اس پر چل رہا ہے۔

"اَكْثَرُ مَنْ فِي الْاَرْضِ" (۱۱۷) میں ساری دنیا کے انسان آجاتے ہیں خواہ وہ کہیں ہوں اور کسی زمانے میں ہوں۔ لیکن زمانہ نزول قرآن میں مخالفین کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی۔ ان کا ایک بنیادی اعتراض یہ بھی تھا کہ اگر اسلام دین خداوندی ہے تو پھر یہ کیوں ہے کہ کئی ایک ایسی چیزیں جو ان کی شریعت میں حرام تھیں

قرآن نے انہیں حلال قرار دے دیا ہے۔ اس کی تفصیلی بحث پہلے آچکی ہے (دیکھئے عنوان ناسخ و منسوخ اور حرام و حلال۔ اس سلسلہ میں آیت ۱۶۳؎ بھی دیکھیے)۔ قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کا ذکر پہلے آچکا ہے (بالخصوص ۵۱؎)۔ ان کے علاوہ باقی سب چیزیں حلال ہیں۔ لیکن ان کیلئے بھی ایک شرط عائد کر دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ انہیں ذبح

ذبح کے وقت اللہ کا نام

کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے۔ اس ضمن میں ذیل کی دونوں آیات سامنے رکھیے۔

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِّرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ه

۶
۱۱۹

(اس معیار کی روشنی میں تم ان اہل کتاب کے اس اعتراض کا جائزہ لوجو یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے بعض ایسی چیزوں کو حلال کیوں قرار دے دیا جنہیں وہ حرام سمجھتے ہیں۔ حرام اور حلال کا معیار، خدا کی وحی ہو سکتی ہے، کسی کا اپنا مسلک نہیں ہو سکتا، خواہ اس مسلک پر چلنے والوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو)۔

لہذا، اگر تم قانون خداوندی (قرآن) پر ایمان رکھتے ہو تو (جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے ان میں سے) جن پر خدا کا نام لیا جائے، انہیں اطمینان سے کھاؤ

اور اگلی آیت۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ط
إِنَّ الشَّيْطَانَ لِيُؤْخِرَ إِلَى أُولَئِهِمْ لِيُعْبَادُوا كُمْ ه
وَإِنَّ

۶
۱۲۲

جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے

بنابریں یہ نہ کہو کہ کسی چیز کو خدا کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کرنے سے کیا بگڑتا ہے۔ اور اس پر خدا کا نام لے دینے سے کیا سنوڑتا

ہے۔ وہ چیز دونوں صورتوں میں یکساں رہتی ہے۔ اس سے ایک گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے جس سے انسان کے قلب میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ لہذا جس چیز پر خدا کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ۔ یہ چیز تمہیں صحیح راستے

۱؎ اس سے مقصد جانوروں کو ذبح کرنے وقت خدا کا نام لینا ہے۔ (۲۲۳-۲۸۶)

۲؎ جس جانور پر ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہ لیا جائے یا جس چیز کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، وہ حرام ہو جائے گی۔

سے دوسری طرف لے جائے گی۔ مخالفین کی جماعت کے سرغنے اپنے رفقاء کو اکساتے رہتے ہیں کہ وہ تم سے ان باتوں میں الجھتے جھگڑتے رہیں (اور کوشش کریں کہ تم ان کی بات مان جاؤ)۔ اسے جماعتِ مومنین! اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی انہی کی طرح مشرک ہو جاؤ گے۔

ان احکام سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ حلال جانوروں میں سے بھی انہی کا گوشت کھانا جائز ہے جن پر (ذبح کرتے وقت $\frac{۲۲}{۳۶-۲۸}$) اللہ کا نام لیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ جن پر اللہ کا نام نہ لیا جائے ان کا گوشت کھانا حلال نہیں ہوگا۔ ان آیات سے واضح ہے کہ:

حلال و حرام

۱۔ جن جانوروں پر ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔
۲۔ یا کسی کا بھی نام نہ لیا جائے۔ وہ ذبیحہ حلال نہیں ہوگا۔ حلال وہی ہوگا جس پر اللہ کا نام لیا جائے، اور صرف اللہ کا۔

درمیان کی آیت ہے:

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذَكَرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مِمَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرُّرْتُمْ إِلَيْهِ ط وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَاءِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ۝

جب خدا نے تمہیں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ کون کون سی چیزیں حرام ہیں — اور وہ بھی مجبوری کی حالت میں جائز قرار پا جاتی ہیں۔ (۱۱۶ ذ ۶)۔ تو جن چیزوں کو اس نے حلال و طیب قرار دیا ہے اور ذبح کرتے وقت ان پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے ان کے کھانے میں کیا تردد ہو سکتا ہے؟ (انہیں اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہیں)۔ یہ لوگ جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں (کہ فلاں چیز پہلے، یہودیوں کے ہاں، حرام تھی۔ اب تم اسے کیوں حلال قرار دیتے ہو) تو انکی کوئی بات وحی کے علم و یقین پر مبنی نہیں محض ان کے ذاتی خیالات ہیں جن کی بنا پر یہ تمہیں صحیح راستے سے بہکانا چاہتے ہیں۔ خدا نے حرام و حلال کی جو حدیں باندھی تھیں، ان لوگوں نے ان حدوں کو از خود آگے بڑھا دیا۔ اب اس بات کا پورا پورا علم، وحی خداوندی (قرآن) میں دیا گیا ہے کہ حرام و حلال کی صحیح حدود کون سی ہیں اور کون ان حدود سے آگے بڑھ رہا ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، چند ایک چیزوں کے سوا، باقی سب حلال ہیں۔

حلال کے ساتھ طیب بھی | اب یہ ضروری نہیں کہ جو چیزیں حلال ہوں تم پر لازم ہے کہ ان سب کو بالفور کھاؤ۔ قرآن کریم نے حلال کے ساتھ ”طیب“ بھی کہا ہے۔ یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں طبعاً پسند ہوں۔ مزاج کے موافق ہوں۔ طبعی نکتہ نگاہ سے تمہارے لئے مضر نہ ہوں خوش گوار ہوں۔ مرغوب خاطر ہوں۔ وہ کھاؤ۔ (اس سلسلہ میں انڈس میں عنوان طیب بھی دیکھئے)۔

یہ جو قرآن نے کہا **مَا لَكُمْ اَلَّا تَأْكُلُوْا**..... تو اس سے ایک اہم نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ہندو، اگر مسلمان ہو جائے تو وہ معاشرہ کی دیگر رسومات بآسانی اختیار کر لے گا لیکن اگر اس کے سامنے گائے کا گوشت رکھ دیا جائے تو اس سے اس کی طبیعت ابا کرے گی۔ اس لئے کہ وہ جس چیز کو ساری عمر اپنے لئے حرام سمجھتا چلا آ رہا تھا اس کی طرف اس کی فوراً رغبت نہیں ہو سکتی! اس حد تک تو ٹھیک ہے۔ جب تک اس کا جی نہ چاہے وہ نہ کھائے۔ اسے اس کی طبیعت کے خلاف اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر اس کا یہ ردِ عمل اس لئے ہو کہ وہ اسے ابھی تک حرام سمجھتا ہے تو یہ ٹھیک نہیں۔ جب وہ قرآن پر ایمان لے آیا ہے تو اس کا حلت و حرمت کا معیار بدل جائے گا اور اسے ہر اس چیز کو حلال سمجھنا ہوگا جسے قرآن نے حلال قرار دیا ہے۔ اگر وہ ان میں سے بعض چیزوں کو بدستور حرام سمجھتا ہے تو یہ ایمان بانقرآن کے خلاف ہے۔ کسی چیز کے ”غیر طیب“ (نامرغوب) ہونے کی وجہ سے، اسے نہ کھانا اور بات ہے اور اسے حرام سمجھنا اور بات۔ اور اس کی وضاحت اگلی آیت میں نہایت بلیغ انداز سے کر دی جب فرمایا کہ :-

وَذَرُوْا ظٰهَرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۚ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۝۶

پھر، اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ رکھو کہ جن باتوں سے روکا جائے اُن سے محض رسمی طور پر مسترد کو، بلکہ اُس ممانعت کی اصل و روح کو بھی پیش نظر رکھو۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو سمجھتے ہیں کہ احکام کی صرف ظاہر پروری ظواہر اور غائب دونوں کو ملحوظ رکھو | اسی مقصود ہے، ان کی غرض و غایت سے کچھ واسطہ نہیں۔ اور نہ ہی ان میں سے جو یہ کہتے ہیں کہ احکام کے صرف باطنی

مفہوم کا اتباع مقصود ہے، ظواہر کی کوئی حیثیت نہیں یہ دونوں غلطی پر ہیں۔ جن باتوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے — اس لئے کہ ان سے تمہاری ذات میں اضمحلال واقع ہوتا ہے — اُن کے ظاہر و باطن دونوں سے بچنا ضروری ہے تاکہ تمہارے فکر اور عمل میں پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کریں گے،

اس کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔

ظاہر الاثم اور باطن کے معنی ”ظَاهِرُ الْاِثْمِ وَبَاطِنُهُ“ لفظ تو دو ہیں لیکن ان میں قرآن

نے دونوں جہانوں کے ختائق سمیٹ کر رکھ دیئے ہیں۔ مثلاً

۱۔ بکرا حلال جانور ہے۔ اسے ذبح بھی اللہ کا نام لے کر کیا گیا ہے۔ اس کے حلال ہونے کی شرائط پوری ہو گئی ہیں۔ لیکن اگر وہ چوری کا بکرا ہے تو وہ رزقِ حلال نہیں۔ حرام ہے۔ اول الذکر شرائط کا تعلق ظاہر سے ہے۔ آخری شرط کا تعلق باطن سے ہے۔ قرآن کے مطابق عمل اس وقت سمجھا جائے گا جب ظاہر و باطن دونوں شرائط پوری ہوں گی۔ غور کیجئے کہ ان شرائط کی رو سے ہمارے معاشرہ کا کس قدر رزق حلال ہوتا ہے اور کس قدر (حلال نظر آنے کے باوجود) حرام۔ (انڈکس میں رزق۔ حرام۔ طیب کے عنوانات دیکھئے)۔ ناجائز طریق سے حاصل کئے ہوئے پیسے کا خریدنا ہوا رزق، ظاہر اہل حلال ہونی الحقیقت حرام ہی ہے۔

۲۔ خریدا ہوا بکرا ہے۔ ذبح کرتے وقت نام بھی اللہ کا لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا گوشت کسی پیر کی نیاز کے طور پر کھایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ظاہر کا حلال اور باطن کا حرام ہے کیونکہ قرآن کریم نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جو غیر اللہ کی طرف منسوب ہو۔ وَمَا أَهْلًا لِّغَيْرِ اللَّهِ بِهِ (۲۵)۔

۳۔ قرآن کے احکام و شعائرِ سماویا میکائلی طور پر ادا کئے جائیں تو انسان کی ذات (سیرت و کردار) اس سے متاثر نہیں ہوگی۔ یا یوں کہئے کہ ان کی صداقت کا احساس دل کی گہرائیوں سے نہیں اُجتڑتا۔ تو یہ بھی اثمِ باطن کے ذیل میں آجا۔ اے گا۔

اہل طریقت کا غلط مسلک اور آگے بڑھتے تو بات اور بھی اہم سامنے آتی ہے۔ ہمارے ہاں

اربابِ طریقت (اہلِ تصوف) میں سے اکثر کا یہ عقیدہ اور مسلک

ہے کہ ظاہر احکامِ شریعت کی پابندی لازمی نہیں۔ انسان کو دل سے ان احکام کا پابند ہونا چاہیئے۔ یہ ظاہر الاثم ہے۔ اسلام تو نظامِ زندگی ہے اور نظام میں مقصد اور اس کے اصول کے عملی طور پر دو ضروری ہوتے ہیں۔ اس لئے ظاہر شریعت سے بے اعتنائی بڑھ کر دعویٰ یہ کرنا کہ ”مغذیوں“ کا اتباع کر رہے ہیں، منشاء قرآن کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں فرقہ ظاہر یہ کہے مفقذین بھی ہیں جو مقاصد اور معانی کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ احکام

شریعت کی پیروی ظاہری شکل میں کافی سمجھتے ہیں۔

یہ دونوں مسالک قرآن کے منشاء کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے، مقصد، اور اس کے حصول کے طور پر

الفاظ اور ان کے معانی۔ عمل اور اس کی غایت۔ کتاب اور اس کی حکمت لازم و ملزوم ہیں۔ اسی حقیقت کو دو لفظوں میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا یا دنیا اور آخر کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (دیکھئے عنوانات دنیا۔ دین۔ ظواہر)۔

✽

ظواہر و باطن کے اسی امتیاز کو سامنے لا کر قرآن، انسانی فکر کو بہت بلند مقام کی طرف لے گیا ہے۔ اس نے کہا کہ تمہاری نگاہوں میں موت اور حیات کا محض طبعی تصور ہے۔ تمہارے نزدیک سانس کی آمد و رفت کا نام زندگی ہے اور اس سلسلہ کے ختم ہو جانے کا نام موت ہے۔ لیکن قرآنی نقطہ نگاہ سے موت اور زندگی کا ایک تصور اس سے الگ اور بلند ہے۔ فرمایا:

۶
۱۳۳
أَوْ مَن كَانَ مَيِّتًا فَأُحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَاهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ
كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

”تم اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ یوں کرو کہ، ایک شخص مردہ ہو۔ اسے از سر نو زندگی عطا ہو جائے، اسکے بعد

اسے ایسی نورانی تبدیلی دیدی جائے جس سے وہ خود بھی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے۔ اس کے برعکس، دوسرا شخص ہے جو سخت تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے نکلنا نہیں چاہتا۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کبھی نہیں۔۔۔ یہی حالت ان، صداقت سے انکار کرنے والوں، کی ہے۔ انہیں چمکاؤ کی طرح اندھیرا بہت اچھا لگتا ہے اور روشنی آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ اس لئے یہ، وحی خداوندی کے بجائے اپنے خود ساختہ مفقولات و رسومات میں خوش رہتے ہیں۔

موت اور حیات کے معنوی مفہوم کے لئے انڈکس میں عنوان ”موت“ دیکھئے۔ ان مقامات میں اس نکتہ پر سیر حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن اس مقصد کے پیش نظر کہ قرآنی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکے گا۔ نیز جلد چہارم میں زیر آیت (۳۰) جہاں بتایا گیا ہے کہ خدائے زندہ کا پیغام حیات اور انہی افراد اور اقوام کے لئے منفعت بخش ہو سکتا ہے جو زندہ ہوں یا جن میں زندہ ہونے اور زندہ رہنے کی صلاحیت اور تڑپ ہو۔ لَئِن دُرِّسَ مَن كَانَ حَيًّا (۳۱) انہی کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا (دیکھئے انڈکس جلد چہارم)۔

اس دعوت اور نظام کی مخالفت کرنے والوں کے متعلق کہا:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكْبَرًا مَّجْرِمًا لِّيُكْرَهُوا فِيهَا
وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝

یہ ہے وہ نفسیاتی کیفیت جس کی بنا پر ہمیشہ ہی ہوتا رہا کہ جہاں کسی نے خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کی دعوت دی، وہاں کے اکابر مجرمین نے اس دعوت کی مخالفت کے لئے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔ اگر وہ ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر حقیقت کھل جاتی کہ ان کی اس منصوبہ بندی میں خود ان کا اپنا نقص تھا۔ اس لئے کہ نظام خداوندی کا قیام ان کی بہتری کے لئے تھا۔ (اگر کسی گاؤں کے لوگ اپنے ہاں ہسپتال بنانے کی مخالفت کریں تو یہ مخالفت خود ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگی)۔

اکابر مجرمین کی طرف سے مخالفت | قرآن کریم، سلب و نہیب اور ظلم و استبداد پر مبنی نظام کے

ارباب حل و عقد کو "اکابر مجرمین" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی

رو سے، مجرم تو اس نظام کے تمام افراد ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے اکابر مجرمین (ارباب اقتدار (لیڈر) ہوتے ہیں جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا گیا تو انہوں نے بحضور رب العزت گزارش کیا کہ بارالہ! وہ قوم اس قدر کثیر التعداد ہے، اور ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے، اس کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی، تو جواب ملا کہ وہ قوم بے شک ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے لیکن وَكَانَ فِي الْمَدْيَنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ

فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۶)۔ اس مملکت کے دارالسلطنت میں نو صاحب اقتدار ہیں جو سارے فساد کی جڑ ہیں۔ ان کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑ رہی ہے۔ ان کی اصلاح ہو جائے تو ساری قوم سنور جائے گی۔

قرآن کی رو سے، قوموں کے بگاڑ اور اصلاح کے سلسلے میں ان ارباب اقتدار اور لیڈروں کی ذمہ داری بنیادی ہوتی ہے۔ یہی ہیں جو کاروان قوم کو (قرآن کے الفاظ میں) اس منڈی میں لاتا رہتے ہیں جہاں اس جنس کا

کاسڈ کوئی حیدر نہیں ہوتا (۲۸-۲۹)۔ لیکن وہ ان متبعین (FOLLOWERS) کو بھی بری الزمہ قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔ تمہیں چاہیئے تھا

کہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے اور تباہی اور بربادی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ ہو لیتے۔ ان لیڈروں اور ارباب اقتدار کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی۔ تم ان کی تقویت کا سامان بنے تو انہوں نے اس قدر تباہیاں مچا دیں۔

تم پر یہ حکومت بھی اسی لئے کرتے رہے تھے کہ تم ان کے سامنے جھکے رہے۔ اگر تم اٹھ کھڑے ہوتے تو یہ

خود ہی بے دست و پا ہو جاتے۔

ایں خدا تا سجدہ اش کر دی خداست پھوں یکے اندر قیام آئی فناست
لہذا یہ اور تم دونوں جہنم کے عذاب کے مستحق ہو۔ جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اس میں عوام اور خواص
سب مانخوڑ ہو جاتے ہیں۔ (۶/۴۵)۔

اس حقیقت کو قرآن نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ عوام اور ان کے لیڈر،
مذہبی پیشوا اور ارباب اقتدار، سب جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور وہاں ایک دوسرے کو طعن و تشنیع بنا
رہے ہیں۔ تفصیل اس کی مطالب الفرقان جلد چہارم۔ زیر آیت (۵/۲۴)۔ ص ۵۴۹ گزرد چکی ہے۔ (روکھئے
انڈکس جلد چہارم)۔

یوں قرآن کریم عوام اور ان کے لیڈروں۔ مذہبی پیشواؤں اور حکام کو یکساں تباہی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔



بات منکرین کی ہو رہی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ان اکابر مجرمین کی انانیت اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ جب انہیں
وحی خداوندی کے اتباع کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ:

وَإِذَا جَاءَهُمْ آيَةٌ قَالُوا الْاِنُّ نُوْمُنَ حَتَّىٰ نُوْتَىٰ مَآ اُوْتَىٰ
رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ سَيُصِيبُ الَّذِيْنَ
اَجْرًا هُوَ اَصْغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ه

پھر، ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کی طرف ہماری کوئی وحی آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر صرف اُس صورت
میں ایمان لائیں گے کہ جس طرح رسولوں پر وحی نازل ہوتی ہے، اُسی طرح ہم پر بھی برا و راست وحی نازل ہو۔

ان سے کہہ دو کہ خارجی دنیا میں تو خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ ہر نوع کے ہر فرد کو براہ راست وہ راہنمائی دے دیتا
ہے جس کے مطابق اُس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے، لیکن انسانی دنیا میں اس کا یہ پروگرام نہیں۔ یہاں ہر

قاعدہ ہے کہ ایک منتخب فرد کو وحی دی جاتی ہے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔
(۶/۴۲)۔ اور یہ بات ان کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ چاہے اسے تسلیم کر لیں اور چاہے اُس سے انکار کر دیں۔

اگر ہر فرد کو برا و راست وحی دی جائے، تو اشیائے کائنات کی طرح، انسان بھی اُس کے مطابق زندگی بسر
کرنے پر مجبور ہو جائے اور عقل و فکر کو کام میں لا کر صحیح فیصلہ کرنے کا سوال باقی نہ رہے، حالانکہ یہی چیز باعث

شرف انسانیت ہے)

اس مقصد کے لئے خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کون سا فرد ہے جسے اس بلند منصب (یعنی وحی دیئے جانے) کیلئے منتخب کرنا چاہیئے (۱۲۸/۳)

لیکن یہ سب انکی کٹ جھتیاں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ناہائز کمائی کا لہو، کچھ اس طرح ان کے منہ کو لگ گیا ہے کہ یہ اسے چھوڑنا چاہتے ہی نہیں۔ ان سے کہہ دو کہ تم جو جی میں آئے کر دیکھو، تمہیں ایک دن، اس نظام کے آگے جھکنا پڑے گا، اور اس وقت تمہیں ان سازشوں کی سخت سزا ملے گی۔

سابقہ جلدوں میں وحی۔ نبوت۔ رسالت کے متعلق تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھئے۔ جہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جا۔ ئے گی کہ وحی میں کسی کے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ خالصتہً وہی علم تھا جسے اللہ تعالیٰ اس برگزیدہ ہستی کو عطا کر دیتا تھا۔ جسے اُس مقصد کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔ (ضمناً) قرآن کریم نے ان مجربین کے اس قسم کے مطالبہ کو ”مکر“ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ اس قسم کا مطالبہ سنجیدگی سے نہیں کرتے تھے۔ یہ محض کٹ جھتیاں اور اپنے جرائم کی پردہ پوشی کی فریب کارانہ تدبیریں ہوتی تھیں۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يَضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاتِمًا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

اسی قسم کی دونوں جہاعتیں شروع سے چلی آرہی ہیں۔ یعنی مانسنے والوں کی، اور مخالفت کرنے والوں کی۔ اور یہ کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص تعصب اور کم ظرفی

سینے کی کشادہ کو چھوڑ کر، اپنی نگاہوں میں اتنی وسعت اور سینے میں اتنی کشادہ پیدا کر لے کہ اسلام کے حقائق پر کھلے دل سے غور و فکر کر سکے، اس پر صحیح راستہ واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن جو

شخص تعصب اور تنگ نظری سے کام لے، اس پر یہ راہ واضح نہیں ہوتی۔ تعصب سے اس کا سینہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ حق کو قبول کرنا اس کے نزدیک بڑی سخت گھائی پر چڑھنے کے مراد ہو جاتا ہے، جہاں قدم قدم پر اس کی سانس پھول جائے (۱۲۸/۹)۔

جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیں اور یوں ہی وحی کی صداقت سے انکار کئے جائیں، (۱۲۸/۲) اُن پر بات واضح

نہیں ہو سکتی۔ اُن کے لئے معاملہ ہمیشہ مشتبہ رہتا ہے (نیپ)۔
 کہا کہ اس قسم کی کٹ جھتیوں اور فریب کارانہ سازشوں کا نتیجہ رخص ہوتا ہے۔ رخص کے معنی ہوتے ہیں،
 معاملہ کا یکسو اور صاف نہ ہونا۔ اس میں شب، تردد، التباس پیدا ہو جاتا۔ اور اس کی وجہ سے اضطراب
 لاحق ہو جاتا۔ سورہ یونس میں ہے۔ وَيَجْعَلُ الرَّجُلُ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (نیپ) جو لوگ عقل و فکر
 سے کام نہیں لیتے ان پر معاملات مشتبہ رہتے ہیں۔ شدید ترین۔ رخص منافقت کو کہا گیا ہے (۹/۲۵) مومنین کی
 کیفیت ان کے برعکس ہوتی ہے (۲۵-۱۲۴)۔

ان کے برعکس صاف۔ سیدھی۔ واضح راہ، وحی کی عطا کردہ ہے۔
 وَهَذَا صِرَاطٌ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَضَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ه لَّهُمْ دَأْسُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ان کے برعکس، جو لوگ عقل و فکر سے کام لے کر وحی کی صداقت پر ایمان لے آتے ہیں، وہ، تیرے نشوونما دینے
 والے کی طرف سے متعین کردہ، سیدھی اور متوازن راہ پر چلتے ہیں۔
 دیکھو! ہم اپنے قوانین و حقائق کو، اُن لوگوں کے لئے جو انہیں پیش نظر رکھنا چاہیں، کس قدر واضح طور پر بیان کر
 دیتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے حسن عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں، ان کے نشوونما دینے والے کی طرف سے، ہر طرح
 کی سلامتی نصیب ہوتی ہے، اور قانونِ خداوندی کی کار سازی اور رفاقت انہیں میسر آ جاتی ہے۔
 اس جماعت کا مقصد نظامِ خداوندی کا قائم کرنا ہوتا ہے۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا يَمْعَشَرُ الْجَنِّ قَدْ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ وَقَالَ أَوْلِيُوهُمْ مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَّغْنَا
 آجَلَنَا الَّذِي أَجَلْتَ لَنَا قَالَ النَّاسُ مَثُوكُمْ خَلِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝

جب وہ نظام قائم ہو گا تو ان مخالفین کی تمام پارٹیاں اکٹھی کی جائیں گی۔ شہری لوگ جو اسکیمیں بنا پا کرتے
 تھے، اور بدوی، جو ان سکیموں کو کاہل بنانے کے لئے ان کے دست و بازو بنا کرتے تھے۔

ان بدوی لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم نے ان شہری پارٹیوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ اور ان پارٹیوں کے سرغنہ اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ ہم اس دعوت کی مخالفت میں ایک دوسرے کو استعمال کیا کرتے تھے تا آنکہ وہ وقت آپہنچا جو ہمارے اعمال کے ظہورِ نتائج کے لئے مقرر تھا۔ (اور آج ہم اس طرح بندھے کھڑے ہیں)۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہارا ٹھکانہ تباہیوں کا وہ جہنم ہے جس میں تمہیں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس میں تبدیلی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہوگا نہیں۔ وہ قانون یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

”جن وانس“ کا قرآنی مفہوم سابقہ صفحات (زیر آیت ۶۱) اچکا ہے۔ ظہورِ اسلام کے زمانے میں جب یہ نظام قائم ہوا ہے تو اس کی مخالفت کے لئے قریش وغیرہ شہری لوگ اور بدوی قبائل سب متحد ہو گئے تھے لیکن انہیں اس قدر فاش شکستیں ہوئیں کہ یہ اٹھنے کے قابل نہ رہے اور ذلت اور پستی کے عذاب میں مبتلا ہو گئے یہ ان کے ساتھ اس دنیا میں ہوا۔ اور اخروی عذاب اس سے بھی شدید ہوگا۔

یہی تھا اسلامی نظام کے خلاف ان پارٹیوں کا متحدہ محاذ جس کے متعلق فرمایا:

وَكَذَلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

اس طرح ہم، سرکش لوگوں کی مختلف پارٹیوں کو، ان کے مشترکہ جرم کی بنا پر، ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا کرتے ہیں۔ اور یوں وہ اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے ایک ہی بن جاتے ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ سنت اللہ (خدا کی غیر متبدل روش) ہے کہ:

۱۔ کسی قوم کو تباہ نہیں کیا جاتا جب تک اسے پہلے متنبہ نہ کر دیا جائے کہ ان کی غلط روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔

۲۔ ان میں غلط اور صحیح کے سمجھنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو چکی ہو۔ (دیکھئے آیات ۱۶۵ ۲/۱۶۵ - ۵/۱۶۵ -

مطالب الفرقان جلد چہارم)۔

اسی سنت اللہ کے مطابق فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمُ

۶
۱۳۱-۱۳۲

لہ قرآنی اسلوب یہ ہے کہ جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَاءَ اللہ وغیرہ آئے، جس سے مقصود مشیتِ خداوندی ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اُس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو لغات القرآن - جلد چہارم۔

اٰیَتِیْ یُنْذِرُوْكُمْ لِقَاءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا قَالُوْا شَہِدْنَا عَلٰی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمْ
الْحٰیوۃُ الدُّنْیَا وَشَہِدُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اِنَّهُمْ کَاٰنُوا کٰفِرِیْنَ ۝ ذٰلِکَ اَنْ لَّمْ یَكُنْ
رَبُّکَ مُہْلِکَ الْقَرٰی یُظْلِمِ وَاَهْلُہَا غٰفِلُوْنَ ۝

ہم اُس دن دونوں گروہوں — بدویوں اور شہریوں — سے پوچھیں گے کہ کیا تمہاری طرف
ہمارے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمہارے اپنے ہی بھائی بند تھے۔ کوئی غیر نہیں تھے۔ وہ تمہارے سامنے
ہمارے قوانین پیش کرتے تھے اور تمہیں آگاہ کیا کرتے تھے کہ ایک دن تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے
سامنے آکر رہیں گے (۶/۳۹)۔ اس پر وہ اقرار کرینگے کہ یہ ٹھیک ہے۔ اس کے لئے کسی خارجی شہادت
کی بھی ضرورت نہیں، ہم خود اپنے خلاف شہادت دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ صداقت تو ان لوگوں کے سامنے آجاتی ہے اور اسے پہچاننے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن
طبیعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد کی چمک دمک نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے اور وہ اس کے فریب
میں آجاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آتے ہیں تو اس وقت ان کی آنکھیں
کھلتی ہیں اور وہ اپنے خلاف آپ شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے حق و صداقت کا انکار کر کے واقعی
جرم کیا تھا۔ (۶/۶۱)۔

تباہی کی دو شرائط (یہ سب کچھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ تباہ یا جائے کہ) تیرا رب یہ نہیں کرتا کہ

کسی قوم کو اس کا تو علم ہی نہ دیا جائے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جن کے انکار سے

تباہی آتی ہے، اور انہیں، اس جرم کی پاداش میں تباہ کر دیا جائے کہ تم نے ان قوانین سے انکار کیوں کیا تھا۔ ایسا
کہ نابڑی زیادتی ہے۔ اور خدا کسی پر زیادتی نہیں کیا کرتا۔

ان قوموں کی تباہیاں اور جماعت مومنین کی کامرانیاں اور خوش حالیاں یونہی اتفاقیہ واقع نہیں ہو جاتیں۔ یہ
سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

وَلِكُلِّ دَرَجَتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ط وَ مَا سَرُّبُکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ۝

ہمارے قانون کی رو سے، سزا اور جزا عمل کے مطابق ملتی ہے، اور عمل ہی کے مطابق ہر ایک کا درجہ متعین
ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ کسی کا کوئی عمل، ہمارے قانونِ مکافات کی نگاہوں
سے ادھل نہ رہنے پائے۔

کے مطابق کام کرنے جاؤ۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد نتائج خود بتا دیں گے۔ اور بہت جلد بتا دیں گے۔ کہ آخر الامر دنیا میں کامیابی کسے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اہل قانون ہے کہ جو قوم انسانیت کے حقوق میں کمی کرتی ہے، اس کی کھینچی کبھی بار آور نہیں ہو سکتی۔ ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا۔

دعاوی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا معیار — نتائج | تم کہتے ہو کہ جس روش پر تم چل رہے ہو اس کا نتیجہ کامرانیوں اور

فتح مندیوں ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہاری روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ فلاح و بہبود اس روش کا نتیجہ ہوگا جس کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے یہ نظری دعویٰ ہے۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ کس کا دعویٰ سچا ہے۔ کہا کہ یہ کچھ مشکل نہیں۔ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے جاؤ۔ ہم اس میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے ہیں تم اس میں دخل نہ دینا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نظر آجائے گا کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا جھوٹا۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ظالم کی کھینچی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ ظلم کا یہ انجام کس طرح سامنے آجاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے دعوے کی صداقت کے پرکھنے کا کس قدر عظیم اصول پیش کیا ہے؟ ”مذہب“ میں ہر عمل کے نتیجہ کو ”قیامت“ پر اٹھا رکھا جاتا ہے۔ دین میں دعوے کا (PRAGMATIC TEST) ہوتا ہے۔ یعنی وہ دعاوی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا معیار عملی نتائج قرار دیتا ہے۔ مذہب میں اپنے اپنے دعاوی کے ثبوت کے لئے مناظرے اور مباحثے کئے جاتے ہیں۔ اور مباحثوں اور مناظروں سے کبھی فیصلہ کن حقیقت سامنے نہیں آتی۔ دین ایک نظام قائم کرتا ہے اور اس کے محسوس نتائج جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں، اس کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بن جاتے ہیں جن کے جھٹلانے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی۔

ہم دن رات، چلا چلا کر، اعلان کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ لیکن اس کا کوئی عملی ثبوت ہم پیش نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے دن رات کے دعاوی اور تبلیغی مشنوں کے باوجود، دنیا اس کی طرف رخ نہیں کرتی۔ اگر ہم کسی ایک خطہ زمین میں قرآنی نظام قائم کر دیں تو اس کے زندہ اور درخشاں نتائج کو دیکھ کر دنیا فوج و فوج اس کی طرف آجائے۔

قرآن کریم نے اس چیلنج کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے (مثلاً) زیر نظر آیت کے علاوہ (۱۱/۹۳، ۱۱/۱۳۱، ۲۹/۳۹) اسی سلسلہ میں اندکس میں عنوان ”مکافاتِ عمل“ اور قانون مکافاتِ عمل بھی دیکھیے۔ مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔

صفحات ۴۹-۱۲۸) پر زیر نظر آیت کی تشریح بھی دی گئی ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ بڑا عظیم ہے اور جس اعتماد کے ساتھ اسے پیش کیا گیا ہے، وہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ لیکن اس کے لئے مومنین کی جماعت کی ضرورت ہے جو اسے دنیا کے سامنے پیش کرے۔ ہم تو ان آیات کو بھی اس ”ثواب“ کی خاطر پڑھ لیتے ہیں جو آخرت میں جا کر ملے گا۔



صدر اول کی جماعت مومنین نے مخالفین کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا اور پھر اس کے عملی نتائج سے، جو چند سالوں کے عرصہ میں محسوس شکل میں دنیا کے سامنے آگئے تھے، اس کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ مخالفین میں اس چیلنج کے قبول کرنے کی جرأت نہ پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی، اسے قرآن اگلی آیات میں بتاتا ہے۔ ان آیات کو دیکھا اور ج کر دیا جاتا ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۚ وَكَذَلِكَ نَرِيكَ كَثِيرٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادِهِمُ شُرَكَائُهُمْ لِيَرُدُّوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ط وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۚ وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرِثٌ حَجَرٌ قَطَطٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَن نَّشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرَّ مَتَّ طَهُورٌ هَآءِ أَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ أَسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءٌ عَلَيْهِ ط سَيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۚ وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا وَإِنْ يَكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ط سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ط قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۚ

اور لوگ بھلا تمہارے مقابلے میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں، جن کی جہالت کا ابھی تک یہ عالم ہے کہ انہوں

نے عجیب و غریب قسم کے عقائد و رسومات وضع کر رکھے ہیں جو کیسر توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ (مثلاً) یہ لوگ اس فصل میں سے، اور ان مویشیوں میں سے، جو خود خدا کے پیدا کردہ ہیں، ایک حصہ الگ کر لیتے ہیں اور، بزعم خویش، کہتے ہیں کہ یہ حصہ خدا کا ہے۔ اسی طرح ایک اور حصہ الگ کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے (خدا کے) شریکوں کا ہے۔ جو حصہ اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لئے مختص کرتے ہیں اسے ان کے توہم پرستیاں پر پروہت لے جاتے ہیں۔ اس میں سے اللہ تعالیٰ کو کچھ نہیں پہنچتا۔ (یعنی خدا کے مستحق بندوں کو کچھ نہیں ملتا)۔ اور جو اللہ کے لئے نکالتے ہیں، وہ بھی ان کے پر پروہت یہ کہہ کر لے جاتے ہیں کہ ہم اسے اللہ تک پہنچا دیں گے۔ اس طرح نام تو اللہ کا لیتے ہیں اور لے جاتے ہیں ان کے وہ پروہت جو معبودان باطل کے نمائندے بنتے ہیں۔

پہرا اور پروہت فرامو جائے کہ انکے یہ عقائد کس قدر برے ہیں؛ (۱۳۷) یہیں تک بس نہیں۔ انکی توہم پرستی اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ جنہیں یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، انکے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم انکے حضور اپنی اولاد قربان کر دیں تو بڑی نیکی کا کام ہے۔ (یہ سب انکے مذہبی پیشواؤں کی کارستانیوں میں جو اس قسم کی توہم پرستیوں کو دین خداوندی کا نقاب

قتل اولاد اور حاکم پیش کرتے ہیں، اور سادہ لوح عقیدہ مندوں کے ہاتھوں) ان کی اولاد جیسی عزیز شے کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ (ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کی باتوں کو دیکھ کر تمہارا جی بہت کڑھتا ہے اور تم چاہتے ہو کہ یہ اس قسم کے عقائد کو چھوڑ کر دین حقہ اختیار کر لیں۔ لیکن، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہ کچھ افہام و تفہیم کے ذریعے کرنا ہو گا۔ ورنہ اگر انسان کو مجبوراً سیدھے راستے پر چلانا مقصود ہوتا تو) ان کی کیا مجال تھی کہ اس قسم کی حرکات کرتے (لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے تم ان تک ہمارا پیغام پہنچاتے رہو اور اس کے بعد) انہیں، مع ان کے خود تراشیدہ عقائد و مسالک کے ان کے حال پر چھوڑ دو۔ (۱۳۸)

(ان کی جہالت آمیز رسموں کا کیا پوچھتے ہو!) یہ، اپنے مویشیوں اور کھیتی میں سے کچھ حصہ الگ کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے کوئی نہیں کھا سکتا۔ بجز ان کے جنہیں ہم، اپنے عقیدے کے مطابق، کھلانا چاہیں۔ اس طرح، یہ بعض جانوروں کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ (یہ فلاں پیر کا اونٹ ہے) اس پر کوئی سواری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بعض جانور ہیں جنہیں ذبح کرتے وقت، یہ اللہ کا نام نہیں لیتے (ان کا نام لیتے ہیں جن کے لئے انہیں بطور نذر و نیاز ذبح کیا جاتا ہے)۔

اب عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ان کے اس قسم کے خود تراشیدہ عقائد و رسومات کے

نتائج ان کے سامنے آجائیں گے۔ اب جہالت اور توہم پرستی کا دور جانے والا ہے۔ (۱۳۶)
 اسی طرح ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ فلاں جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے اسے صرف مرد کھا سکیں گے عورتوں
 اس کا گوشت حرام ہو گا۔ لیکن اگر وہ بچہ مردہ پیدا ہو تو اس میں مرد اور عورتیں سب شریک ہو سکتے ہیں۔
 اب عنقریب انہیں ان کی ان توہم پرستیوں کی سزا ملے گی (اور خدا کا وہ دین عام ہو جائے گا جو) یکسر
 علم و حکمت پر مبنی ہے۔ (۱۳۷)

ذرا سوچئے کہ جو لوگ، ایسے باطل عقائد کی بنا پر، محض جہالت اور حماقت ہے اپنی اولاد جیسی متابع عزیز کو اپنے
 ہاتھوں ہلاک کر دیتے ہیں، اور جو کچھ اللہ نے کھانے پینے کو دیا ہے اسے، محض اپنی افترا پر رازیوں سے،
 اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں، اور پھر ان توہمات کو منسوب کرتے ہیں خدا کی طرف۔ تو ایسے لوگ اپنا
 کس قدر نقصان کرتے ہیں؟

جو لوگ اس طرح جہالت اور توہم پرستیوں کے غلط راستوں پر آنکھیں بند کئے چلتے ہیں، ان پر زندگی
 کی صحیح راہیں کس طرح کھل سکتی ہیں؟ (ہم نے پہلے کہا ہے کہ یہ لوگ تمہارے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے
 (۱۳۷) اب اس کی وجوہات تمہارے سامنے آگئیں۔ کامیابی کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ
 ان کے دل میں، قوانین خداوندی کے سوا، کسی کا خوف نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ انسان عقل و فکر سے کام
 لے۔ جو لوگ پتھر کی مورتیوں، جانوروں اور موشیوں، اور اپنے جیسے انسان — پیروں اور پر و ہنوں
 سے اس درجہ خائف ہوں کہ انہیں خدا بنا لیں، اور جہالت کا وہ عالم ہو جس کا ذکر کیا جا چکا ہے،
 وہ قوم، اس قوم کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے جس کا دل، خوف سے خالی اور جس کا دماغ عقل و بصیرت
 سے منور ہو۔ اسلام، قوموں میں اسی قسم کا انقلاب پیدا کرتا ہے۔)

ان آیات میں عوام کی جہالت کا ذکر تو ہے ہی لیکن آیت (۱۳۷) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حقیقت مذہبی پیشواؤں کی
 کارستانیوں میں جو اپنے (تھوڑے سے) مفاد کی خاطر لوگوں کی جہالت کی گہمیں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے
 رہتے ہیں۔ ان آیات کا تعلق زمانہ نزول قرآن کے چہلا، اور ان کے فریب کار مذہبی
 پیشواؤں سے ہی نہیں۔ ان کا تعلق خود ہم سے بھی ہے۔ ہمارے ہاں مردوں سے
 متعلق مذہبی رسومات دیکھئے۔ اسقاط۔ قتل۔ جمعراتیں۔ چالیسویں۔ ان میں کھانے پینے کی چیزیں پھل۔ کپڑے۔
 سب مولوی صاحبان سے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا ثواب مرحوم کو پہنچے گا۔ یہ تو انفرادی "ایصالِ ثواب"

ہماری توہم پرستیاں

کی تقریبات ہیں۔ اجتماعی طور پر بزرگوں کے مزادوں پر نذر، نیاز۔ ان کے عرس اور آئے دن کی تقریبات پر کروڑوں روپے، انہی پیشواؤں اور متولیوں کے جیب میں چلے جاتے ہیں۔ اور عوام مطمئن ہوتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کے نام پر ہوتا ہے اور (مرحوم) ”حضرت صاحب“ تک پہنچ جاتا ہے جس کے بدلے میں وہ ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں۔ جو کچھ زمانہ جاہلیت عرب میں ہوتا تھا اور جس کے خلاف قرآن نے یہ کچھ کہا تھا، وہ سب ہم مسلمانوں کے ہاں ہوتا ہے اور اسے عین اسلام (بلکہ مغز اسلام) کہا جاتا ہے۔

علاوہ اس کے کہ ان توہم پرستانہ رسومات پر اس قدر مال و دولت کا ضیاع ہوتا ہے، اس شرک سے سینے جس قدر خوف سے معمور ہوتے ہیں، اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ (اس کی تفصیل کے لئے شرک اور خوف کے عنوانات دیکھئے)۔

آپ کسی وعظ کی مجلس میں جائیے۔ مولوی صاحب جھوم جھوم کر ان آیات کی تلاوت فرما رہے ہوں گے اور ان توہم پرستیوں کی مذمت کر رہے ہوں گے۔ وہ انہیں زمانہ قبل از اسلام کی جاہلیت سے متعلق تو بتائیں گے، اپنے مخاطب (مسلمانوں) سے کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ یہ خود تمہارا ہی بیان ہے اور اس لئے نہیں کہیں گے کہ یہ خود ان کا معاشی مسئلہ ہے۔ جب مذہب کو ذریعہ معاش بنایا جائے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے، اور ذریعہ رزق کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ عوام کو توہمات کی تاریکیوں میں مستحکم رکھا جائے۔ اس قسم کی قومیں کبھی ان قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو علم و عقل سے کام لے کر حالات کا مقابلہ کریں۔ ہم (مسلمان) جو صدیوں سے بہت وزبوں حالی کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں اس کی وجہ اسی قسم کی توہم پرستانہ مذہبیت ہے۔ جو شخص ان کے خلاف لب کشائی کی جرأت کرے، اسے مادہ پرست۔ مغرب زدہ۔ ملحد۔ بے دین قرار دے کر نگوڑا بنا دیا جاتا ہے۔



ان دیوی دیوتاؤں اور پیروں فقیروں کے مقابلہ میں، اللہ تعالیٰ ہے جس نے تمام سامان رزق پیدا کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوفٍ وَغَيْرِ مَّعْرُوفٍ وَنُحْشٍ وَالنَّخْلَ
وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرَّهْمَانَ مَتَشَابِهًا وَغَيْرَ
مَتَشَابِهٍ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ

وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

(یہ ہیں ان کے دیوی دیوتا اور پیر پر وہت۔ ان کے برعکس) خدا کی ذات وہ ہے جس نے (تمام انسانوں کی پرورش کے لئے) باغات کا سلسلہ پھینکا دیا ہے۔ بعض بڑے بڑے مضبوط درخت جو بغیر کسی سہارے کے کھڑے ہیں۔ بعض نرم و نازک (انگور کی سی پللیں) جو ٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں۔ نیز سرفلک کھجوروں کے پیڑ۔ اور مختلف پیداوار والی کھیتیاں۔ اور زیتون اور انار — ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی، اور الگ تھلگ بھی۔

جب یہ درخت ثمر بار ہوں تو ان کے پھل شوق سے کھاؤ۔ اور اس میں سے ”اس کا حق“ دے دیا کرو۔

(یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد، باقی دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے عام کر دو۔ (۲/۳۱۹) اور اپنی ضروریات کے تعین میں بھی) اسراف سے کام نہ لو۔ خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت میں حقہ کے معنی ”اللہ کا حق“ کہئے جاتے ہیں اور اس کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فہرستیں

مرتب کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں کہیں بھی ”حقوق اللہ“ کے الفاظ نہیں آئے۔ قرآن کریم میں انسانوں کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں ہی کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم اور پیغام کا مقصد انہی حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین اور ان سے

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بحث

عہدہ براہونے کی تلقین کرنا ہے۔ ان احکام خداوندی کے مطابق عمل پیرا ہونے کا نام ”خدا کی اطاعت“ ہے، نہ کہ ”اس کے حقوق کی ادائیگی“۔ بادی تدبیر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن مجید میں جن امور کے متعلق ”فی سبیل اللہ“ کہا گیا ہے ان کا تعلق انسانوں کی فلاح و بہبود سے ہے۔ اللہ تو غنی عن العالمین ہے۔

حقہ کا مفہوم | اس آیت میں حقہ کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ آپ ”قرآن کے معاشی نظام“ کے

موضوع کو دیکھئے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ وہ اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتی ہے تاکہ وہ اس کا ایسا انتظام کرے جس سے افراد انسانہ کو رزق بہم پہنچا رہے۔ اس انتظام کے تابع کاشتکار زمین کی کاشت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس فصل میں سے ان کا شکار و کئی

ضروریات بھی پوری ہوں گی۔ اور جو اس سے زائد ہوگا، وہ حکومت کے پاس چلا جائے گا تاکہ وہ اسی سے دوسرے

معاشی نظام | ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرے۔ اس فصل میں سے جس قدر حصہ حکومت کی تحویل

میں چلا جائے گا، اسے حقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے واجبات (DUES)۔

یوں اس فصل میں خود کاشت کار اپنا حق (ضرورت کے مطابق حصہ) لے لیگا اور دیگر ضرورت مند اپنا حصہ جو حکومت کی وساطت سے اُن تک پہنچے گا۔ ان الفاظ کے معانی کچھ بھی لیجئے۔ مقصد یہی ہے کہ اس فصل میں جس طرح کاشتکار کا حق ہے، اسی طرح دیگر ضرورت مندوں کا بھی حق ہے۔ اور اسی اصول پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگلی آیت میں رَزَقْكُمْ اللہ کے الفاظ نے بات اور بھی واضح کر دی۔ یعنی جو کچھ خدا نے پیدا کیا ہے، وہ انسانوں کے لئے ذریعہ رزق ہے۔ خدا کو اس میں سے کچھ نہیں چاہیئے۔

وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةٌ وَفَرَشَاتٌ كُلُوا مِن مَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ تَمْنِيَةَ أَنْزَوِجَ ۚ مِنَ الضَّانِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ قُلْ أَلَا الذِّكْرُ بَيْنَ حَرَمٍ أَمْ لَا تُثْبِتُنْ أَمْ أَشْتَمَلْتُ عَلَيْهِ أَمْ حَامُ الْأُنثَيْنِ نَبَّؤُنِي بِعِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ أَلَا الذِّكْرُ بَيْنَ حَرَمٍ أَمْ لَا تُثْبِتُنْ أَمْ أَشْتَمَلْتُ عَلَيْهِ أَمْ حَامُ الْأُنثَيْنِ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءُ إِذْ وَصَّكُمْ اللَّهُ بِهَذَا ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

اور دیکھو اُسی خدا نے تمہارے لئے چار پائے پیدا کر دیئے ہیں۔ کچھ بلند قامت، جو بوجھ لادنے کے کام آتے ہیں۔ اور کچھ پست قامت (زمین سے لگے ہوئے)۔

جو کچھ اس نے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا کیا ہے، اُسے شوق سے کھاؤ۔ لیکن اپنے اپست جذبات کے پیچھے نہ لگو (جن کا تقاضا یہ ہے کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لو)۔ ایسا کرنا، عالمگیر انسانیت سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ نہ ہی تو ہم پرستی میں پڑو۔

ان تو ہم پرستوں سے پوچھو کہ خدا نے ان مویشیوں میں سے (جو تمہارے ہاں عام طور پر پائے جاتے ہیں) آٹھ قسمیں پیدا کی ہیں (۳۹)۔ بھڑ۔ نر اور مادہ۔ اور بکری۔ نر اور مادہ (باقی چار کا ذکر آگے آتا ہے)۔

حرام و حلال کی انسانی فہرستیں | ان سے پوچھو کہ تم نے جو حرام اور حلال کی فہرستیں از خود مرتب کر رکھی ہیں، ان کی کوئی خدائی سند بھی ہے؟ (خدا نے کہیں بھی یہ کہا ہے کہ ان (بھڑ بکریوں) کے زحرام ہیں (اور مادہ حلال) یا مادہ حرام ہیں (نر حلال)۔ یا ان بچوں کو حرام

قرار دیا ہے۔ جو ان کے پیٹ میں ہوں۔ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو (کہ تمہاری حرام اور حلال کی فہرستیں خدا کی مرتب کردہ ہیں) تو مجھے بتاؤ کہ تمہارے پاس اس کی سند کیا ہے؟ (۶/۱۳۶)

اسی طرح خدا نے زراور مادہ اونٹ پیدا کئے ہیں اور گائے اور بیل بھی۔ (یہ سب مل کر آٹھ زراور مادہ ہو گئے یعنی چار زراور چار مادہ)۔ ان سے پوچھو کہ کیا ان میں سے بھی خدا نے نروں کو حرام کیا ہے یا مادیات کو۔ یا ان بچوں کو جو ان کے پیٹ میں ہوں۔ (تم جو کہتے ہو کہ تمہاری حرام و حلال کی تقسیم خدائی تقسیم ہے تو بتاؤ کہ) جب خدا نے ایسا حکم دیا تھا تو تم اُس وقت موجود تھے؟ (اسے، ان کے مذہبی پیشواؤ! تم سوچو کہ) تم جو، علم و سند خداوندی کے بغیر لوگوں کو اس طرح گمراہ کرتے ہو، اور اپنی خود ساختہ فہرستوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہو، تو اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور ایسے اکابر مجرمین، قانون خداوندی سے کس طرح ہدایت حاصل کر سکتے ہیں؟

اگلی آیت میں پھر واضح کر دیا کہ حلت و حرمت کے اختیارات سب خدا کو حاصل ہیں کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کرنے بیٹھ جائے۔

قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خَنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۶/۱۳۶)

ان سے کہو کہ (حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے)۔ اُس نے میری طرف جو کچھ وحی کیا ہے، میں اس میں کسی چیز کو، جسے عام طور پر لوگ کھاتے ہیں، حرام نہیں پانا، بجز (ان چار چیزوں کے۔ یعنی) مردار۔ ہنسا ہوا ابو۔ خنزیر۔ کا گوشت۔ حکم خداوندی کے علی الرغم، ان کا کھانا شرف انسانیت کی نشوونما کے روک دینے کا باعث اور غلط راستوں کی طرف سے جانے کا موجب ہے۔ نیز جس (حلال) چیز کو خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ (یہ چیزیں حرام ہیں۔ انہیں مت کھاؤ، بجز اس کے کہ) اگر کوئی شخص (حلال) چیزوں کے نہ ملنے کی وجہ سے مجبور ہو جائے اور اس کی نیت قانون شکنی یا ہوس پروری کی نہ ہو۔ اور وہ اپنی اضطراری ضرورت سے آگے نہ بڑھے (تو اپنی جان کی حفاظت کے لئے ان چیزوں میں سے جو میسر آجائے اسے کھا سکتا ہے)۔ ایسی حالت میں ان چیزوں کے کھانے سے تمہاری ذات پر جو مضر اثرات مرتب ہوں گے، قانون کے احترام کا محکم احساس تمہیں ان اثرات سے محفوظ رکھے گا۔ اور تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما بدستور ہوتی رہے گی۔ (۶/۱۳۶) (۵)

ان امور کی وضاحت "حرام و حلال" کے عنوان میں ہو چکی ہے { اندکس میں دیکھیے }

﴿

آیت (۶/۱۱۴) میں، یہودیوں کے اس اعتراض کا ذکر کیا گیا تھا (جو وہ کہتے تھے کہ) جو چیزیں ان کی شریعت میں حرام ہیں، قرآن نے انہیں حلال کس طرح قرار دے دیا۔ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ وہ چیزیں ان پر کیوں حرام قرار دی گئی تھیں۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شَعُورَهُمَا إِلَّا مَا حَصَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَدِّقُونَ ۝

۶
۱۱۴

یہودیوں پر حرام کردہ اشیاء | اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی،

بجز اس چربی کے جو ان جانوروں کی پیٹھ یا انٹریوں کے ساتھ لگی ہو۔ یا جو ہڈیوں کے اندر ملی ہو۔ (تو یہ چیزیں عام حالات میں حرام نہیں تھیں۔ بات یہ تھی کہ) انہیں ان کی قانون شکنی کی سزا دی گئی تھی، اور بطور سزا ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا تھا (۶/۱۱۴)۔ یہ ہے اصل واقعہ (لہذا) ان کا یہ اعتراض کہ جن چیزوں کو خدا نے پہلے حرام قرار دے دیا تھا، اب انہیں کیسے حلال قرار دیا جا رہا ہے، بے بنیاد ہے۔

اس ضمن میں آیت (۶/۱۱۴) دیکھئے۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہودیوں پر جو زائد چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں، تو ایسا ان کے جرائم کی سزا کے طور پر کیا گیا تھا۔ قرآن کریم نے مسلمانوں پر چند ایک چیزیں حرام قرار دی تھیں، لیکن ہمارے فقہانے ان کے علاوہ بھی حرام اشیاء کی، لمبی چوڑی

ہمارے فقہاء کی فہرستیں

فہرستیں مرتب کر دیں جو تمام امت پر، قیامت تک، حرام قرار دے دی گئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں پر تو ایسا، ان کے جرائم کی سزا کے طور پر کیا گیا تھا، امت محمدیہ پر ایسا، ان کے کن جرائم کی بنا پر کیا گیا ہے؟

اس کے بعد کہا کہ قرآن کریم میں ان چیزوں کو حلال قرار دینے کا (جنہیں یہودیوں پر حرام قرار دیا گیا تھا) ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کی سزا کی مدت ختم کر دی جائے۔ یعنی یہ اگر قرآن پر ایمان لے آئیں تو وہ چیزیں ان پر حلال ہو جائیں لیکن یہ ہیں کہ خدا کی اس رعایت اور رحمت سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے۔ جیل خانہ کا دروازہ، ان کے لئے کھول

ویا گیا ہے، لیکن یہ باہر آنا ہی نہیں چاہتے۔ سو جو شخص اپنے اوپر اس طرح سزا وارد کرے، یا سزا کو برقرار رکھنا چاہے اسے اس عذاب سے کون چھڑا سکتا ہے؟

[۶/۱۳۸] فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَبِّكُمْ ذُو سَرْحَةٍ وَاسِعَةٍ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝

لیکن اگر اس بتیان حقیقت کے بعد بھی یہ لوگ نہ مانیں، اور تمہیں جھٹلاتے چلے جائیں۔ (اور کہیں کہ نہیں! یہ تمام چیزیں حرام ہیں) تو ان سے کہہ دو کہ خدا تو اپنی ربوبیت اور رحمت کے دامن کو وسیع رکھنا چاہتا ہے۔ (لیکن، اگر تم اس کے باوجود، اسے سکیڑنا چاہتے ہو، اور اپنے ہاں کی حرام چیزوں کو اب بھی حلال نہیں تصور کرنا چاہتے، اور اس طرح اپنی سزا کی مدت کو ختم کرنے پر رضا مند نہیں ہوتے، تو تمہاری مرضی)۔ جو خود مجرم بنے رہنا چاہے، اس سے سوا کیسے مل سکتی ہے؟ (جو اپنا دروازہ بند رکھنا چاہے، اُس کے کمرے میں روشنی کیسے آ سکتی ہے؟) اور اپنی اس خدا اور حماقت کی تائید میں وہی کہنہ دلیل!

[۶/۱۳۹] سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَمْنَا مِنْ شَيْءٍ ط كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّى ذَاقُوا بَأْسَنَا ۖ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝

عقیدہ تقدیر کی تردید | یہ لوگ جب چاروں طرف سے لاجواب ہو جاتے ہیں اور اپنے مسلک کے جواز میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کر سکتے، تو پھر یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ (دنیا میں خدا کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا)۔ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم باہم سے اباؤ اجداد کبھی شرک نہ کرتے۔ نہ ہی کسی شے کو حرام قرار دیتے (اس لئے اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ یہ سب مرضی مولا ہے)۔

یہ بات بھی کچھ نئی نہیں۔ ان سے پہلے لوگ بھی اس قسم کی کٹ جھتیوں سے حقیقت کو جھٹلاتے رہے، تا آنکہ انہوں نے، اپنی غلط روش کے نتیجہ میں ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل ہے (کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔ یہ مجبور محض ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے)۔ اگر ہے تو اسے پیش کرو۔ (۳۶/۳۳ ذ ۳۶/۳۴)۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی سند اور دلیل نہیں۔ تم محض ظن و قیاس کے پیچھے چلتے اور اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہو۔

اس کی تفصیل کے لئے عنوان تقدیر دیکھیے۔ اس کے برعکس دلیل۔

قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝

۱۵۰

ان سے کہو کہ محکم اور حقیقت اس دلیل صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے وحی الہی کی دلیل۔ (اگر تمہارے

پاس وہ دلیل ہے تو اسے پیش کرو۔ باقی رہا مشیت کا مسئلہ۔ تو) اگر خدا چاہتا تو وہ تمہیں بھی

کائناتی قانون کے تابع رکھتا (اور اختیار و ارادہ نہ دیتا)۔ اس صورت میں تم بھی (جبراً اور قہراً)

سب کے سب اس کے قانون کے مطابق چلتے۔ (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے

تمہیں صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا)۔

اس سے واضح ہے کہ دین میں قابل قبول سند، شہادت، دلیل صرف اللہ (یعنی کتاب اللہ) کی ہو سکتی

ہے۔ اسی سلسلہ میں کہا:۔

قُلْ هَلْ مِمَّنْ شَهِدَ آءَ الْاٰذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا اِنْ فَاِنْ

۱۵۱

شَهِدُوْا فَاَلَا تَشْهَدُوْا مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاَ الْاٰذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآٰيٰتِنَا

وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يٰعْدِلُوْنَ ۙ

ان سے کہو کہ ذرا ان لوگوں کو سامنے تولاؤ جو اس کی گواہی دیں کہ ان چیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا تھا۔ (اگر یہ اپنے

اجار و رہبان کو لائیں، تو ان سے اس باب میں خدا کی سند مانگو۔ اگر وہ اس پر بھی اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو

تم ان سے کہدو کہ) ہم تمہارے ساتھ، اس غلط مسلک کے صحیح ہونے کی شہادت نہیں دے سکتے۔

جو لوگ دین خداوندی کی تکذیب کریں، مستقبل کی زندگی (اور خدا کے قانون مکافات) پر یقین نہ رکھیں (کیونکہ

اگر انہیں اس قانون پر یقین ہو تو وہ یہ کچھ کریں ہی کیوں؟) اور اپنی خود ساختہ شریعت کو وحی خداوندی کا درجہ

دے دیں۔ تم ان کے مسلک کی پیروی مت کرو۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، قابل تسلیم شہادت، کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کے پاس اللہ کی کتاب اپنی

اصلی شکل میں تھی نہیں۔ ان کے پاس سند یا شہادت ان کے فقہاء (اجار و رہبان) کے احکام یا فیصلے تھے۔

قرآن کے نزدیک یہ شہادت قابل قبول نہیں تھیں۔ اصول یہ ہے

سند صرف خدا کی کتاب ہے

کہ کوئی قول یا فیصلہ، جو کتاب اللہ کے خلاف جائے، وہ دین میں

سند اور حجت نہیں ہو سکتا خواہ وہ کسی کا ہو (یا اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کی گئی ہو)۔ یہودیوں کی مشکل

یہ تھی کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں۔ اس لئے انہیں اپنے فقہاء کے فیصلوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ہماری حالت عجیب ہے۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ لیکن ہم دین میں سند اور حجت اس کتاب کو نہیں بلکہ انسانوں کی شہادت (فقہ - تاریخ - روایات) کو قرار دیتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی بات قرآن سے مکرائے تو عقیدہ یہ ہے کہ سند انسانوں کے قول کو سمجھا جائے۔ اور قرآن کے حکم کو منسوخ قرار دیا جائے۔

اس کے بعد قرآن کریم نے اپنے چند ایک بنیادی احکام کو مرکز کر کے یک جا بیان کر دیا ہے۔ فرمایا:-

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّيَ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا
وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْ لَا دَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرُ
نُرْقِكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَ بُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

یہ تورا کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق۔ اس کے بعد ان سے کہو کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے نشو و نما دینے والے نے تم پر کُن بانوں کو واجب قرار دیا ہے۔ یہ کہ

۱۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ (یعنی اُس کے قانون کے ساتھ کسی اور کے قانون کو واجب الاتباع نہ سمجھو۔ اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کر دو۔)

۲۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ (وہ بڑھاپے کی وجہ سے تمہاری نگرانی اور مدد کے محتاج ہیں۔ اُن کی مدد کرو۔ اس طرح جو کی اُن میں آگئی ہے اسے پورا کر دو)

۳۔ اپنی اولاد کو، اس خدائے سے کہ اُن پر خرچ کر کے تم غریب ہو جاؤ گے، صحیح تعلیم و تربیت اور نشو و نما سے محروم نہ رکھو۔ ہمارا نظام اس بات کی ذمہ داری ہوتا ہے کہ وہ تمہارے لئے اور تمہاری اولاد

۴۔ قتل کے بنیادی معنی مار ڈالنا اور ذلیل و خوار کرنا، دونوں ہیں۔ یہاں پر (نیز لکھا ہے) کہ تم اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے ”قتل نہ کرو“ جہاں تک تاریخ باقی ہے، جاہلیہ عرب میں، ایک آدھ قبیلہ کے سوا، مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کا رواج کہیں نہیں ملتا۔ البتہ شرم کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی شہادت ملتی ہے، اور

نشو و نما نہ کرنا ہے۔ ویسے بھی قتل (معنی مار ڈالنے) کے متعلق بھی اسی آیت میں آیا ہے۔ قتل نفس بغیر الحق، میں قتلِ اولاد بھی آجاتا ہے۔

۳۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاہُمْ۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ خدا کی یہ ذمہ داری کس طرح پوری ہوتی ہے، اسے عنوان ”قرآن کا معاشی نظام“۔ مطالب الفرقان۔ جلد اول۔ (صفحہ ۱۰۵) میں دیکھیے۔ یہ ذمہ داری اُسی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوگی جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی۔

۴۔ فواحش کے قریب بھی نہ جاؤ۔ فحش کا لفظ بڑا جامع ہے۔ جو عام بے حیائی سے لے کر اُس کے منتہی تک کے لئے بولا جاتا ہے۔ فواحش سے ممانعت کے سلسلے میں یہ کہنا کہ ان کے قریب نہ جاؤ، نفسیاتی اہمیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ پھر ماحظہر و مابطن نے اسے اور بھی جامع بنا دیا۔ یہ بحث سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ باطن کے متعلق اس نے کہا ہے کہ یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ۔ (۱۰۴)۔ وہ (خدا) نگاہ کی خیانت اور دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر کام کے ضمن میں (بالعموم) لیکن جنسیات (SEX) کے ضمن میں بالخصوص، اس حدودِ فراموشی کا آغاز نیت یا ارادے سے ہوتا ہے۔ اس کو قرآن نے نگاہ کی خیانت یا دل کے پوشیدہ خیالات سے تعبیر کیا ہے۔ اگر نیت یا دل میں فتور نہ ہو تو فحش کاری تک کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ اس لئے قرآن کریم، نگاہ کی پاکبازی اور قلب کے تقویٰ پر بڑا زور دیتا ہے۔ انسانی جذبات میں، جنسی خواہش سب سے زیادہ پُر زور ہوتی ہے۔ یہ اگر ابھرائے تو اس کا جنسی خواہش اور ارادہ روکنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اسے نیت یا ارادہ کس طرح آسانی سے روک دیتا ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ ایک نوجوان، بد فحاش لڑکا جنسی بے باکی میں اس قدر حدودِ فراموش ہے کہ راہِ چلتی لڑکیاں تک اس کی دست درازی سے مامون نہیں ہوتیں۔ وہی لڑکا رات کو اپنے کمرے میں سوتا ہے۔ اس کمرے میں اس کی جوان (اور خوبصورت) بہن بھی سو رہی ہوتی ہے۔ کمرہ میں ہی نہیں پورے مکان میں کوئی اور نہیں ہوتا۔ لیکن یہ لڑکا اپنی بہن کی طرف نگہ بد سے دیکھتا تک نہیں! ایسا کیوں ہے؟ وہ کون سی قوت ہے جو اس کی جنسی بے باکی اور بدنہادی پر اس قدر زبردست کنٹرول رکھے ہوئے ہے؟ یہ صرف دل کا ارادہ یا نیت ہے۔

قرآن کریم اپنی عظیم الشان تعلیم سے، قلب و نگاہ کی تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ قوم کے نوجوان لڑکے،

بر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتے ہیں اس لئے ان کی طرف نگاہ تک اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ ایسا کنٹرول کسی اور طریق سے نہیں ہو سکتا۔ وہ ”باطن“ پر کنٹرول سے ”ظواہر“ کی حدود بندی کر دیتا ہے۔ اور یہی لَا تَقْرَبُوا سے مراد ہے۔

۵۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ انسانی قتل کے متعلق انڈکس میں دیکھیے۔ نیز

سابقہ صفحات میں آیت (۵ / ۲۷) کے تحت۔ یہاں جو کہا نَفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ۔ تو اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ انسانی جان جس کا ناحق قتل کرنا خدا نے حرام قرار دیا ہے، اور دوسرے معانی یہ کہ ہم نے ہر انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا ہے، اس لئے اسے ناحق قتل مت کرو۔

(ضمناً) قرآن کریم نے ہر انسانی جان کو یکساں واجب الاحترام قرار دیا ہے (جلی)۔ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق

عورت کی دیت مرد سے نصف

نہیں۔ لیکن ہماری فقہ میں ہے کہ جرم قتل میں جو خون بہا دایا جائے، تو مقتولہ عورت کا خون بہا، مقتولہ مرد کے خون بہا سے آدھا ہوگا! البعظۃ اللہ! یعنی ان حضرات کے نزدیک، عورت کی جان کی قیمت مرد کی جان کی قیمت سے آدھی ہے۔

اس کے باوجود ہم ساری دنیا سے چلا چلا کر کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو وہ مقام مساوات و ہمدوشی عطا کیا ہے جس کی مثال کسی مذہب اور تہذیب میں نہیں ملتی! یہ ہے اس مساوات کی شہادت!

قتل بالحق اور قتل بغیر الحق کے متعلق بھی انڈکس میں دیکھیے۔ انہی احکام کے تسلسل میں فرمایا:

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا بِالْكَيْلِ وَالْمِيزَانِ بِالْقِسْطِ ۚ لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَإِذَا قُلْتُمْ قَاعِدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَلِكُمْ وَصَّكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

اس کا یہ بھی حکم ہے کہ

دیگر اہم احکام | ۶۔ یتیموں کے مال کو ہاتھ تک نہ لگاؤ، الا یہ کہ خود ان کے فائدے، اور نگہداشت کے لئے عمدہ طریق سے کچھ خرچ کرنا پڑے۔ یہ بھی اس وقت تک کہ وہ جوانی کی عمر

تک نہ پہنچ جائیں۔ (۴ / ۱۲۴)۔

۷۔ ماپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ (یعنی معاشی معاملات میں ہمیشہ حق اور انصاف کو

پیش نظر رکھو۔ (۱۴/۳۵ - ۸۳/۱)۔ یاد رکھو! ان احکام سے یہ نہ سمجھو کہ تم پر خواہ مخواہ پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔ بات یہ نہیں۔ ہمارے احکام اور قوانین کا مقصد تو یہ ہے کہ انسانی ذات میں وسعتیں پیدا ہوں۔ صحیح قوانین کی پابندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے (۲/۲۸۶ - ۴/۳۲)۔ (۲۳/۶۲)۔

۸۔ اور تم جب بھی کوئی بات کہو، عدل کو سامنے رکھو، خواہ اس کی زد تمہارے قریبی رشتہ دار پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ (۲/۱۳۵)۔

۹۔ اپنے اس عہد و پیمان کو پورا کرو جو تم نے، مومن ہونے کی حیثیت سے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رکھا ہے (۹/۱۱۱)۔

یہ ہیں وہ احکام جنہیں خدا اس لئے بیان کرتا ہے کہ تم انہیں، زندگی کے ہر گوشے میں سامنے رکھو۔

۱۔ نیامی کے متعلق بحث سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ (دیکھیے انڈکس)۔

۲۔ کیا اور میزان کو عدل و انصاف کے ساتھ پورا رکھنے کے متعلق ”معاشی نظام“ میں بحث آچکی ہے۔ ان الفاظ کا مطلب صرف باپ اور تول کے پیمانوں اور اوزان کا ٹھیک ٹھیک رکھنا ہی نہیں۔ اس سے مراد معاشی نظام کو عدل کے تقاضوں کے مطابق قائم کرنا ہے۔

۳۔ لَا تَكْلِفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ کا مفہوم، مطالب الفرقان۔ جلد سوم (ص ۴۹)، میں گزر چکا ہے۔

۴۔ عدل کے متعلق انڈکس میں دیکھیے۔ نیز چوتھی جلد میں آیت (۴/۱۳۵) کے تحت۔

۵۔ عہد اللہ سے عمومی مراد تو خدا کے ہر حکم کی تعمیل ہے۔ انسان جب خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لا کر جماعت مومنین میں شریک ہو جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا سے عہد کرتا ہے کہ وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔ جامع شکل میں یہ عہد آیت (۹/۱۱۱) میں آیا ہے۔

اور یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر حضور نبی اکرمؐ خود گامزن تھے اور جس کے اتباع کا حکم مومنین کو دیا گیا۔

وَإِنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ ۝

(ان سے کہہ دو کہ) یہ ہے تمہارے خدا کی مقرر کردہ توازن بدوش راہ، جو تمہیں سیدھی منزل مقصود تک لے جائے گی۔ میں بھی اسی راہ پر چلتا ہوں۔ تم بھی اسی پر چلو۔ اسے چھوڑ کر اور راستوں کو اختیار نہ کرو۔ وہ تمہیں خدا کی راہ سے الگ کر دیں گے۔ اُس نے تمہیں اس کا اس لئے حکم دیا ہے کہ تم زندگی کے تمام خطرات سے محفوظ رہ کر، امن و سلامتی سے اپنے نصب العین تک جا پہنچو۔

صراطِ مستقیم

ہمارے ہاں ”اطاعتِ رسول“۔ ”اتباعِ سنتِ رسول“ وغیرہ مسائل پر بڑی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ ان بحثوں کا کسی نقطہ آخر میں تک پہنچنا تو کجا، ابھی تک خود ”سنت“ کا کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا، نہ ہی یہ طے پایا ہے کہ حضورؐ کی یہ ”سنت“ جامع طور پر کس کتاب میں ملے گی۔ (یہ بحث ”ادارہ طلوع اسلام“ کی طرف سے شائع کردہ کتاب ”مقامِ حدیث“ میں ملے گی)۔

سنت رسول اللہ لیکن قرآن کریم نے دو لفظوں میں اس بحث کو سمٹا دیا، جب مختلف احکامات دینے کے بعد، حضورؐ کی زبان مبارک سے کہلوا دیا کہ (إِنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَتَّبِعُوهُ)۔ ”یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر میں کامزن ہوں۔ تم سب اسی کا اتباع کرو“ اس سے واضح ہے کہ قرآنی احکام کا اتباع ہی اتباعِ سنت رسول اللہ ہے۔ اسے کسی اور جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ جس کا نتیجہ تقویٰ ہے۔

سنت رسول اللہ کی تفصیلی بحث چوتھی جلد میں زیرِ آیت (۳/۱۵۵) کی جا چکی ہے۔



پہلے بات یہودیوں سے ہو رہی تھی۔ ان قرآنی احکام کے بعد ان سے کہا:

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ۝

۶
۱۵۵

(اُن سے یہ بھی کہہ دو) ہم نے، اس سے پیشتر، موسیٰؑ کو بھی، اسی قسم کا ضابطہ قوانین دیا تھا تاکہ، اس کے ذریعے، اُس قوم پر انعامِ نعمت کر دیا جائے جو حسن کار انداز سے زندگی بسر کرے۔ اُس میں تمام ضروری احکام کو الگ الگ کر کے، نکھار کر، بیان کر دیا گیا تھا۔ اس میں صحیح راہ نمائی اور انسانی ذات کی نشوونما کا سامان تھا۔ یہ سب اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ قوم، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھے۔

جن احکام کا قرآن مجید میں اعادہ کیا گیا ہے، اسی قسم کے احکام کتابِ موسیٰؑ میں بنی اسرائیل کو دیئے تھے۔

کتاب موسیٰ لیکن انہوں نے اپنی کتاب میں تحریر کر دی۔ یہ جو انہیں قرآنی احکام اور اپنے احکام شریعت میں تفاوت اور اختلاف نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتاب میں تحریر ہو

چکی ہے (جس کا خود انہیں بھی اعتراف ہے۔ اس کی تفصیل، میری کتاب ”مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں“ میں ملے گی) اس کے بعد اس کتاب کو اسلئے نازل کیا گیا ہے کہ سابقہ آسمانی کتابوں میں سے کوئی بھی اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھی۔ نیز اس لئے کہ اسے دین کا آخری ضابطہ قرار دینے کے لئے اس میں احکام کی تکمیل کر دینا مقصود تھا۔

وَهَذَا كِتَابُنَا أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

اب اس کے بعد، یہ مبارک کتاب (قرآن کریم) دی گئی ہے۔ پس اب تم سب اس کا اتباع کرو اور تخریبی رشتوں سے بچتے رہو، تاکہ تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف راہ نمائی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ عرب میں حضرت اسمعیلؑ کی اولاد سکونت پذیر تھی۔ تاہم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمعیلؑ کے بعد اس قوم کی طرف کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ (۳۶)۔ اس اعتبار سے بھی ان کی طرف کتاب کا بھیجنا ضروری تھا۔

أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أُنْزِلَ الْكِتَابُ عَلَى طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۖ وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ ۝ أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۖ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۚ سَنَجْزِي الَّذِينَ يَصْدِفُونَ عَنْ آيَاتِنَا سُوءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يَصْدِفُونَ ۝

یہ کتاب اس لئے بھی تمہاری طرف نازل کی گئی ہے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے، یہود و نصاریٰ کی طرف جو کتاب بھیجی گئی تھی ہم اس کے پڑھنے پڑھانے سے ناواقف تھے۔

اہل عرب کی طرف کتاب یا تم یہ کہو کہ اگر تمہاری طرف بھی ضابطہ قوانین بھیجا جاتا تو ہم ان سے

بھی زیادہ ہدایت یافتہ بن کر دکھاتے۔

لہذا، تمہاری طرف (بھی) تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے وہ کتاب آگئی جس میں واضح دلائل ہیں۔

اس میں (سفر زندگی کے لئے) صحیح راہ نمائی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما کا پورا پورا سامان۔

اب بتاؤ کہ اس سے زیادہ بد بخت اور کون ہوگا جو احکام خداوندی کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔ لیکن جو لوگ ان سے منہ موڑتے ہیں وہ کسی اور کا نقصان نہیں کرتے۔ خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کی اس روش کا نتیجہ ان کیلئے بدترین قسم کی تباہی ہوگا۔

یہاں قرآن کریم نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ہمارے لئے موجب صدمہ و عبرت ہے۔ پہلے کہا کہ قرآن کے اولین مخاطب (اہل عرب) کی طرف قرآن مجید تمام حجت کے لئے بھیجا گیا۔ یعنی اس لئے کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہماری طرف خدا کی راہ نمائی آئی ہی نہیں۔ اگر وہ راہ نمائی آتی تو ہم بتاتے کہ اس کے مطابق کیسے زندگی بسر کی جاتی ہے!

وہ کتاب آگئی لیکن انہوں نے اس سے اعراض برتنا اور اس طرح دین کی تکذیب کی۔ ایک چیز ہوتی ہے کفر یعنی کسی صداقت کا ماننا ہی نہیں۔ اس کے صادق ہونے سے انکار کر دینا۔ اور دوسری چیز ہوتی ہے تکذیب۔ یعنی زبان سے اسکا اقرار کر لینا لیکن اس کے بعد اپنے اعمال سے اس کے دعاوی کو جھوٹا ثابت کرنا (دیکھئے اندکس)۔ اس سے وہ قوم شدید عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

خدا کی وہ کتاب ہمارے پاس محفوظ شکل میں موجود ہے۔ لہذا ہمارے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ اگر ہمیں بھی آسمانی راہ نمائی مل جاتی تو ہم راہ ہدایت پر چل کر دکھاتے۔

ہماری حالت ہم نے کتاب سے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کے خلاف زندگی بسر کرنے سے، دنیا کی نگاہوں میں اس کے دعاوی کو جھوٹا ثابت کر دکھایا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کتاب کے ماننے والے (مومن) تمام اقوام پر غالب رہیں گے۔ ہم نے دنیا سے کہا کہ ہم اس کتاب کے ماننے والے ہیں، لیکن اس کے بعد ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اقوام عالم میں پست ترین درجہ پر ہیں۔ اس سے وہ اقوام کس نتیجہ پر پہنچیں گی؟ اسی نتیجہ پر کہ اس کتاب کا یہ دعویٰ (کہ اس کے ماننے والے تمام اقوام عالم پر غالب رہیں گے) (معاذ اللہ) جھوٹا ہے اس طرح ہماری حالت، قرآن کریم کے دعویٰ کی تکذیب کر رہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہے وہ مسلسل عذاب جس میں ہم ماخوذ چلے آ رہے ہیں۔

ان تصریحات اور تنبیہات کے بعد کہا:

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ
بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ

تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ اُنْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

اس قدر وضاحت کے ساتھ سمجھا دینے کے بعد بھی، یہ لوگ جو بات نہیں مانتے تو شاید انہیں اس کا انتظار ہے کہ ان پر فرشتے نازل ہوں۔ یا خود خدا ان کے پاس چل کر آئے۔ یا اس کی طرف سے کچھ محسوس نشانیاں ان کے سامنے آکھڑی ہوں (تو یہ ایمان لائیں)

ان سے کہہ دو کہ جس دن خدا کی ”محسوس نشانیاں“ سامنے آیا کرتی ہیں، اُس وقت کسی ایسے شخص کا ایمان لانا اُس کے لئے نفع بخش نہیں ہوتا جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا تھا۔ یا جس نے اپنے ایمان کے ساتھ عمل خیر نہیں کیا تھا۔ ان سے کہو کہ تم ان چیزوں کا انتظار کرو، اور میں اس کا انتظار کرتا ہوں (کہ تم پر تباہی کی گھڑی کس وقت آتی ہے؟)۔

ایمان بلا عمل خیر | ”ایمان لانے“ کے معنی ہوتے ہیں کسی دعویٰ کو یقینی طور پر سچا تسلیم کر لینا (مثلاً) قرآن کریم نے کہا کہ اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ۔ (۶/۲۱)۔ ظالم کی کھیتی کبھی پرب نہیں سکتی۔ ظالم کا میاب نہیں ہو سکتا۔ اس دعویٰ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دل کے پورے یقین کے ساتھ سمجھ لیا جائے کہ ظلم کی روش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ ہیں ایمان کے معانی۔ اور ایمان سے مقصد یہ ہے کہ اس کے بعد اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں تو ایمان بے مقصد ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اس صداقت کو اس وقت تسلیم کرے جب اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے وقت ہی نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ زبان سے تو اس دعویٰ کی صداقت کو تسلیم کر لیا جائے لیکن عمل اس کے مطابق نہ کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں ایمان بے معنی اور بے مقصد ہوگا۔ ایسے ایمان کو قرآن، ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اقبال کے الفاظ میں ”مردہ آلِ ایمان کہ ناید در عمل“ اس ضمن میں توبہ کا عنوان دیکھئے۔ نیز ”مہلت کا قانون“ جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس وقت غلط اعمال کے نتائج سامنے آجائیں اس وقت توبہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ فرعون کو ایمان کا اعلان کرنے پر یہی جواب ملا تھا۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم ص ۲۴۹)۔



دین کا مقصود و منشی، نوع انسان کے اختلافات اور تفرقات کو مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنادینا ہے۔ اس کے لئے اس نے آغاز کار کے لئے، ایک اُمت متشکل کی جس میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ

نہ تھا۔ اس امت کو متنبہ کر دیا کہ یاد رکھو! امت کی وحدت کو توڑ کر اس میں فرستے پیدا کر دینا، شرک ہے (۳) پھر نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ:

إِنَّ الَّذِينَ فَسَقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ
إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

دین، ایک راستے پر چلنے کا نام ہے۔ مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور الگ الگ گروہ بن جائیں۔ اسے رسولؐ اتیران سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ قانونِ خداوندی کے سپرد کرو۔ وہی بتائے گا کہ ان کی اس روش کا نتیجہ کیا ہو گا؟ (۳۱، ۳۲)

غور کیجئے کہ فرقہ بندی کے متعلق قرآن نے کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر یہ امت فرقوں میں بٹ گئی تو اس کا خدا سے کوئی تعلق رہے گا نہ اس کے رسولؐ سے کوئی واسطہ۔ ان امور کی وضاحت کے لئے انڈکس میں ”فرقہ بندی“ کا عنوان دیکھئے (قرآن کریم میں واضح الفاظ میں یہ تنبیہات موجود ہیں۔ تمام مسلمان بالعموم اور ہمارے مذہبی پیشوا بالخصوص ان آیات کو پڑھتے ہیں، خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں، اور فرقہ بندی کی گہروں کو مستحکم سے مستحکم تر کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔)

فرقہ بندی سے رسولؐ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا

سوچئے کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلام باقی بھی رہتا ہے؟

میں چالیس سال سے امت کی توجہ قرآن کریم کی ان آیات کی طرف مبذول کرتا چلا آ رہا ہوں۔ بجائے اس کے کہ ہمارے علماء حضرات ان پر غور کرتے اور سوچتے کہ فرقوں کو مٹانے کی کوئی صورت کی جائے، اُلٹا مجھ پر کفر کے فتوے صادر کر دیئے! لیکن اس سے فرقہ بندی کا شرک توجید میں تو نہیں بدل گیا! یہ تو خود خدا کا فیصلہ ہے۔ اس نے جو کہا تھا کہ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ۝ (۳۱)۔ یہ لوگ دعویٰ ایمان کے باوجود مشرک مشرک رہتے ہیں، تو یہ ہمارے ہی متعلق ہے کہ ہم مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور فرقوں میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان کے آئین میں فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا کر دی گئی ہے کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں۔ اس کے باوجود، اس مملکت کو اسلامی کہا جاتا ہے اور ان احکام کو بھی اسلامی!

اس کے بعد قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک اصول بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ:

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا

يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

ان سے کہہ دو کہ جو شخص (وین کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے) حسن کا رانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے، اس کے عمل کے بیج، دس دس گنا پھل لاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی سے برائی سرزد ہو جائے تو اس کی سزا، اس کے برابر ہی ہوگی۔ اور اس پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔

حسنِ عمل کے نتائج کی فراوانی کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم (صفحات ۴۱۶ : ۴۲۳) میں تشریح آچکی ہے۔ آیت کے دوسرے حصے میں عدل کا بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے کہ غلط کام کی پاداش اس کام کے مطابق ہوگی۔ زیادہ نہیں۔ کیونکہ اس میں زیادتی ظلم ہو جائے گا۔ اگر اس کا تعلق جرائم سے سمجھا جائے، تو بھی اس کا جرم کی سزا جرم کے مطابق | مفہوم یہ ہوگا کہ جرم کی سزا، جرم کی نوعیت اور شدت کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس سلسلہ میں اندکس میں جرم

اور سزا“ اور ”جزا اور سزا“ کے عنوانات دیکھئے (نیز ۱۶۴ ز ۴۲۳)۔

اگرچہ میں فقہ کی بحثوں میں نہیں الجھا کرتا لیکن اس ضمن میں ایک ایسی بات سامنے آگئی ہے جس کی بابت میں متعدد بار سوچا کہ اس کا ذکر کر دیا جائے یا نہ، لیکن چونکہ ہمارے ہاں فقہی قوانین کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ بھی کیا جا رہا ہے، مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس کی ایک آدھ مثال پیش کر دی جائے تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے فقہی قوانین کس قسم کے ہیں۔ ان کے سامنے سوال یہ ہے کہ جرم کی سزا کس طرح دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے متعلق قرآن نے خود بتا دیا ہے جب کہا ہے کہ وَجْزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲۳ ز ۱۶۴) یعنی ”جرم کی سزا اُس جیسی دی جائے“ اس سے اصول یہ وضع کیا گیا کہ مجرم نے جس قسم کی ضرب، مضروب کو لگائی ہے اسے اسی قسم کی ضرب لگائی جائے اور اسی آلہ ضرب سے لگائی جائے۔ اس سے آگے بڑھے تو کہا کہ قاتل نے جس طریق سے مقتول کو قتل کیا تھا اسے اسی طریق اور اسی قسم کے آلہ قتل سے قتل کیا جائے۔ لیکن یہاں ایک دشواری پیش آئی۔ او یہی وہ مقام ہے فقہ کا شرمناک فیصلہ | جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ میں نے متعدد بار سوچا کہ اس کا ذکر کیا جائے یا نہ۔ (اسے اب قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت کے ساتھ، سینے پر

پتھر رکھ کر بیان کیا جانا ہے)۔ ان کے سامنے دشواری یہ آئی کہ اگر کسی کی موت اِغْلَام (SODOMY) سے واقع ہو، تو اصولِ مماثلت کی رو سے قاتل کو کس طرح موت کی سزا دی جائے۔ اس کے متعلق فیصلہ یہ کیا گیا:

وَلِلشَّانِعِیۡہِ قَوْلٌ اِنَّہٗ یَقْتُلُ بِذٰلِکَ فِیَنْخِذُہٗ عَوۡیۡلٌ تِلْکَ الصِّفَتِ وَیُطَعَنُ بِہٖ فِی دُبُرِہٖ حَتّٰی یَمُوتَ۔

(تفسیر قرطبی جلد پنجم - ص ۳۵۸ بحوالہ ماہنامہ محدث لاہور -

بابت رجب و شعبان ۱۳۹۹ھ - ص ۲۶)

عصمتِ ظلم اس کا ترجمہ کرنے سے مانع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کام لکڑی سے بیا جائے (استغفر اللہ) یہ ہے ایک مثال اس ہج کی جس کے مطابق ہمارے قوانین فقہ مرتب کئے گئے تھے قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہے کہ جرم کی سزا، جرم کی نوعیت کے مطابق دی جائے۔ اس سے زیادہ سزا دینا مجرم پر ظلم ہوگا۔



دین کے یہ احکام اور عدل کا اصول بیان کرنے کے بعد کہا:

قُلْ اِنِّیۡ ہٰدِیۡ سَبِیۡلِیۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیۡمٍ دِیۡنًا قِیۡمًا مِّلَّةَ اِبْرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا وَّ مَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیۡنَ ۝

۶
۱۴۲

ان سے کہہ دو کہ میرے نشوونما دینے والے نے، میری راہ نمائی، زندگی کی سیدھی اور متوازن راہ کی طرف کر دی ہے یعنی ایک ایسے نظامِ زندگی کی طرف جو خود بھی (اپنے زور و دُوروں کی بنا پر) قائم ہے اور انسانیت کے قیام کا باعث بھی ہے۔ یہ وہی نظامِ زندگی ہے جسے ابراہیمؑ نے، ہر طرف سے منہ موڑ کر، اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ اس میں، کسی اور روش اور طریقہ کو شریک نہیں کرتا تھا۔

مِلَّتِ اِبْرٰہِیۡمَ | انڈکس میں ان مقامات کو بغور دیکھیے جن میں (حضرت) ابراہیمؑ کا تذکرہ جلیلہ آیا ہے ان سے واضح ہو جائے گا کہ قرآن کریم نے خاص طور پر ملتِ ابراہیمیؑ کے اتباع کا کیوں حکم دیا ہے۔ ملت کے معنی روش۔ طریقہ یا مسلک ہوتے ہیں۔ یعنی جس طریق (راستہ یا روش) پر چل کر حضرت ابراہیمؑ، امامتِ نوعِ انسان کے مستحق قرار پائے تھے، اس طریق کو بطور نمونہ (اسوہ) سامنے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر، ان کے حنیف ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ حنیف کے معنی ہوتے ہیں، ہر طرف سے منہ موڑ کر، کٹ کر،

حَنِیۡفٌ | کسی ایک کا ہو جانا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اور جس کی زندگی ایسی ہو وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیۡنَ (۶/۱۳۷)۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس کے سامنے منزلِ منیعین ہو اور اس تک پہنچنے کا راستہ صاف اور واضح، اسے (دھڑا دھڑ، دیکھنے یا کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی یہی حنیف ہونے کی خصوصیت ہے۔ اس میں، انسان کی ساری زندگی، اس کے خیالات، میلانات، رجحانات،

جذبات، سب کچھ اس مقصد کے حصول کے لئے وقف ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا (۶/۴) اور اسی کا اعادہ حضور نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں فرمایا کہ:

قُلْ إِن صَدَقْتُ وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝

ان سے کہہ دو کہ (اس دین کو، اس انداز سے اختیار کرنے کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ) میرے تمام فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے۔ میرا مرنا اور جینا، خدا کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف ہے۔

اسلام اسے کہتے ہیں | میں اس میں کسی اور مقصد، جذبہ، یا خواہش کو شریک نہیں کرتا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور، سب سے پہلے، میں نے

خود اس حکم کے سامنے تسلیم خم کیا ہے۔ اپنے آپ کو مسلم کہنا سزاوار ہی اس کو ہے جو یہ کہے کہ:

عشق میں ایک تم ہمارے ہو باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

حضورؐ نے یہاں اپنے آپ کو "اول المسلمین" کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے مسلم ہونے کے اعلان کے ساتھ ہی جماعت مسلمین کی تشکیل کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ مذہب میں ہر فرد الگ الگ "خدا پرست" ہوتا ہے۔ دین میں وہ امت مسلمہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔

(ضمناً) آیت (۶/۴) کا مطلب تو مذکورہ مفہوم سے واضح ہے۔ لیکن ایک لفظ کی وضاحت ضروری ہے اور وہ ہے "نُسُكِي"۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "قربانی" اور پھر اس ترجمہ کی رو سے ان قربانیوں کے لئے سند لائی جاتی ہے جو عید الاضحیٰ کے موقع پر دی جاتی ہیں۔ انڈکس میں قربانی کا عنوان دیکھئے۔

نُسُك کے معنی | اس سے قربانی کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ اس ضمن میں لفظ نُسُك کا مفہوم بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ (مطالب الفرقان۔ جلد سوم۔ ص ۲۴ جہاں یہ آیت بھی درج ہے)۔

اس کے بعد کہا گیا:

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغَىٰ رَبًّا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

ان سے کہو کہ کیا (تم چاہتے ہو) میں خدا کو چھوڑ کر کسی اور نشوونما دینے والے کو تلاش کروں؟ حالانکہ وہ کائنات کی ہر شے کا نشوونما دینے والا ہے۔ انسانی صلاحیتوں کے بارے میں اس کا قانون نشوونما یہ ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کا ذمہ دار خود ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ اُسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ (۲/۱۱۶ ذ ۲۸۶)۔ کوئی بوجھ خدا کے سوا کوئی رب نہیں | اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ہر ایک کا قدم خود بخود، خدا کے قانون مکافات کی طرف اٹھتا ہے

ہر ایک کے اعمال کے نتائج اس کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ اور وہیں سے اُن معاملات کے فیصلے ہوتے ہیں جن میں لوگ اختلاف کرتے ہیں۔

آیت (۶/۱۱۵) میں ”أَفَعْبِرُوا اللَّهَ ابْتِغَاءَ حُكْمٍ“ کہا گیا تھا۔ یعنی کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم تسلیم کروں؟ یہاں ”سَرَبًا“ کہا گیا ہے ان دونوں میں بڑی گہری مماثلت اور مطابقت ہے۔ خدا کو حاکم تسلیم کرنے سے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اس میں خود انسان ہی کا فائدہ ہے۔ اور وہ یہ کہ احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت سے انسان کی نشوونما ہوتی ہے۔ اگر خدا کے قانون مکافات عمل کی اطاعت کی جائے تو انسانی ذات مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور قانون مکافات عمل کی عین عمل کی عین اور بنیاد یہ ہے کہ ہر فرد اپنے ہر عمل کے نتائج کا خود ذمہ دار ہے۔ اور کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داریاں اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ یا کوئی شخص اپنی ذمہ داری کسی اور کے سر نہیں تھوپ سکتا۔

یہ نقشہ اس حکومت کا ہو گا جو خدا کے نام پر قائم کی جائے گی۔ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ نہ ہی ایسا ہو گا کہ مجرم کوئی کرے اور اس کی سزا کوئی اور بھگتے۔ ہر شخص اپنے ہر کام کا ذمہ دار آپ ہو گا۔ اور اس کا نتیجہ بھگتے گا۔ منشاء خداوندی یہی ہے کہ اس انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ اس میں حکومت کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہوگی جو ربوبیت عامہ کی ذمہ داری لے گا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلِيفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ط إِنَّ سَرَبَكُمْ سَرِيعُ الْعِقَابِ ۚ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

خدا وہ ہے جس نے اپنے قانون مشیت کے مطابق، تمہیں (سابقہ اقوام کا) جانشین بنایا ہے۔ اُسی کے قانون کے مطابق مختلف اقوام کے مختلف مدارج متعین ہوتے ہیں تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ جس قوم کو جو کچھ دیا جاتا

اقتدار سے ذمہ داریوں کی پرکھ ہے، وہ اسے کس مقصد کے لئے کام میں لاتی ہے (۱۶۶) خدا کا قانون مکانات، اقوام کے اعمال کے نتائج ساتھ

کے ساتھ مرتب کئے جاتا ہے۔ لیکن جو اقوام اس کے قانون کے مطابق، اپنی صلاحیتوں کو کافی مستحکم کر لیتی ہیں، وہ چھوٹی موٹی لغزشوں کے نقصان رسا اثرات سے محفوظ رہتی ہیں، اور ان کی نشوونما میں فرق نہیں آتا (جو ایسا نہیں کرتیں، وہ تباہ ہو جاتی ہیں)۔

جب اُمت مسلمہ کو حکومت عطا ہوئی تھی تو ان سے بھی یہی کہا گیا کہ **ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ** (۱۶۶)۔ اقوام سابقہ کے بعد ہم نے تمہیں حکومت اس لئے عطا کی ہے کہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ سیکور حکومت اور اسلامی حکومت میں یہ بنیادی فرق ہے۔ سیکور حکومت میں جسے بھی اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) حاصل ہو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے اوپر کوئی ایسی انتھارٹی نہیں جو اس سے بڑھ سکے کہ تم اپنے اختیارات کا استعمال کس طرح کرتے ہو۔ لیکن اسلامی حکومت میں اس قسم کا اقتدار اعلیٰ کسی شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں اقتدار اعلیٰ خدا (کی کتاب) کو حاصل ہوتا ہے۔ اور مملکت کی اعلیٰ ترین انتھارٹی بھی جوابدہ ہوتی ہے۔ اس کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اگر اس کے فیصلے اس کے مطابق نہیں ہوتے تو اس سے اقتدار چھین لیا جاتا ہے اور **يُسْتَبَدَلُ قَوْمًا غَيْرَكُمْ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ** (۱۶۶)۔ اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”استبدال واستخلاف قومی“)۔



سورة الانعام ختم شد

سُورَةُ اَعْرَافِ آیات ۱ تا ۵۸

قرآنی حقائق کی نقاب کشائی

- ۱۔ اتباع اور اطاعت میں فرق۔
- ۲۔ اطاعت زندہ اتھارٹی کی کی جاتی ہے۔
- ۳۔ ملکیت میں نہ اطاعت ہوتی ہے نہ اتباع۔ صرف استبداد ہوتا ہے
- ۴۔ اعمال کا وزن
- ۵۔ متاع کا مفہوم۔۔۔۔۔ قرآن کے معاشی نظام کا نقطہ ماسکہ۔
- ۶۔ تقلید اور تقدیر (عقیدہ جبر) دونوں خلاف قرآن ہیں۔
- ۷۔ زیب و زینت کو کوئی حرام نہیں قرار دے سکتا۔
مذہبی پیشوا بیت کا خدا کو چیلنج۔
- ۸۔ قوم کی اجل کا مفہوم۔
- ۹۔ بہائیوں کی گمراہی۔ قرآن ابد تک کے لئے کتاب زندہ ہے۔
- ۱۰۔ جہنم میں قوموں کا مکالمہ۔
- ۱۱۔ اہل جنت کے سینہ میں غل نہیں ہوگا۔
- ۱۲۔ فرانس کے ڈاکٹر مارس بکائی کی قرآنی تحقیق۔
ذوقِ تحقیق و تجسس کی کار فرمایاں۔
- ۱۳۔ تبویب القرآن کی اہمیت۔
- ۱۴۔ اذن کے معنی قانونِ خداوندی۔

دوسرا باب

آغاز سورة الاعراف

الْمَصِّ ۚ كَتَبَ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ
لِتُنذِرَ بِهِ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝

۷۱-۷۲

خدا کے عليم و حکيم و بصير کا ارشاد ہے کہ

ہم نے اس ضابطہ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے، تاکہ تو، اس کے ذریعے، غلط راستے پر چلنے والوں کو، اُن کی روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ اور جماعتِ مومنین کو اُن کے فرائضِ زندگی کی یاد دلاتا رہے، اور اس طرح یہ اُن کے لئے شرف و عروج کا باعث بن جائے۔

اس فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے تمہیں قطعاً گھبرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی مشکلات تو ضرور ہوں گی، لیکن منزل پر پہنچ کر ہر قسم کی آسائشیں اور خوشگواریاں میسر آئیں گی۔ (۷۱-۷۲)۔

نازل ہونے کی اہمیت | قرآنِ کریم کے لئے لفظ نزول آیا ہے۔ اس میں بھی ایک خاص معنوی حقیقت مضمر ہے۔ وحی کے متعلق سابقہ جلدوں میں لکھا جا چکا ہے کہ

اس سے مراد وہ علم ہے جو حضراتِ انبیاء کرام کو خدا کی طرف (یعنی خارج) سے ملتا تھا۔ انسانی علم اس کے اپنے فہم و ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ علم داخلی (SUBJECTIVE) ہوتا ہے۔

یعنی انسان کے اندر سے باہر آتا ہے۔ اس کے برعکس وحی کا علم خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے یعنی یہ انسان کے اندر سے باہر نہیں آتا۔ باہر سے اندر جاتا ہے۔ اوپر سے نیچے آتا ہے۔ اسے عربی زبان میں

نَزَلَ (نازل ہونا) کہتے ہیں۔ لہذا ایک لفظ (انزال) سے علم وحی کی خصوصیت واضح ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ”کَتَبَ أَنْزَلَ إِلَيْكَ“ کے معنی ہوئے ”یہ وہ کتاب ہے جو، اے رسول! تجھے بذریعہ وحی

ملی ہے۔

آیت کا اگلا کڑا ہے فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ - حَرَجُ کے معنی ہوتے ہیں اضطراب
 عدم اطمینان، کبیدگی، خاطر، احساسِ مشقت۔ آیت کے یہ معنی نہیں کہ رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ تم قرآن
 کی وجہ سے اپنے دل میں کبیدگی پیدا نہ ہونے دینا۔ سورہ طہ میں ہے: مَا أَنزَلْنَا
 عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ (۲۰)۔ ”اے رسول! ہم نے یہ قرآن تیری طرف اس لئے نازل نہیں کیا کہ
 اس کی وجہ سے زندگی تجھ پر بارگراں بن جائے“ آیت (۲۱) کا مطلب یہ ہے کہ جو انقلابی پروگرام اس
 کتاب میں دیا گیا ہے، اسے بروئے کار لانے کے لئے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔
 یہ راستہ بڑا دشوار گزار ہوگا۔ لیکن قرآن تمہارے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دے گا کہ تم ان مشکلات اور
 تصادمات سے قطعاً نہیں گھبراؤ گے۔ تم میں انہیں بطیب خاطر برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جائیگی
 مشکلات اور تزامات کو اس طرح بطیب خاطر اور خندہ جبینی سے برداشت کرنے کی صلاحیت کو
 قرآن نے شرح صدر (سینے کی کشادگی) کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ
 جاؤ اور فرعون سے ٹکدو، تو آپ نے دُعا کی تھی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (۲۰)۔ ”اے میرے نشوونما
 دینے والے! میرے سینے میں ایسی کشادگی پیدا کر دے کہ میں ان مشکلات کا دل کے پورے اطمینان سے
 مقابلہ کر سکوں اور کسی مقام پر گھبرا نہ جاؤں“ اور یہی شرح صدر تھی جس سے حضور نبی اکرمؐ کو اُس وقت نوازا
 گیا تھا جب آپ کو ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لئے مامور کیا گیا تھا، اور جس کا تذکرہ اس انقلابی
 پروگرام کی کامیابی کے بعد ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ

الَّذِي نَشْرَحُ لَكَ صَدْرَكَ ۖ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۖ الَّذِي
 أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۖ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۖ (۹۲-۹۱)

اے رسول! ذرا سوچو کہ اس عظیم پروگرام کے آغاز میں آنے والی مشکلات کس قدر ہمت شکن تھیں، لیکن تمہیں
 ایسی کشادگی عطا ہوئی کہ جو ہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی، وہ نہایت آسان ہو گئی، اور ذمہ داریوں کے احساس
 کے جس بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی، وہ کس قدر ہلکا ہو گیا! اور تمہارا نام اور تمہارے پروگرام کی عظمت تباہ
 نہ ہوئی۔

اس کے بعد ایک اصول بیان فرمایا کہ:

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۚ (۹۴-۵)

یاد رکھو! کامیابیاں اور کامرانیاں، مشکلات برداشت کرنے کے بعد ہی حاصل ہو کرتی ہیں۔ یہ ہمارا اٹل قانون ہے۔

اس پروگرام کے راستے میں جن جانگسل مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تیغ و سنان کے زخم ہی نہیں تھے طنز و طعن کے تیروں کی بوچھاڑ بھی تھی۔

طعن و تشنیع کے نشتر | جھوٹے الزامات، کذب و افترا پر مبنی اتہامات، حتیٰ کہ منافقین کی طرف سے سویقہ حربے حضور نبی اکرمؐ کے سینے میں بھی ایک انسان کا دل تھا جس کا ان یورشوں سے متاثر ہو جانا بعید نہیں تھا۔ لیکن جگر شکاف طعن و تشنیع سے طول خاطر ہو جانا اور بات ہے اور ان کی وجہ سے بد دل ہو جانا اور ہمت ہار دینا اور بات۔ قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے سے جو کشاد قلب (شرح صدر) حاصل ہوتی ہے، وہ انسان کو ہمت نہیں ہارنے دیتی۔ ایسے ہی مقامات تھے جن کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

فَاعْلَمْ أَنَّا بِكَ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَصَاحِبُكَ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كُتُبٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ ط وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ (۱۱۱) (نیز ۱۵۲، ۱۶۲)

(اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں سے جو کہا جاتا ہے کہ ان پر تنبیہ آنے والی ہے، تو یہ بات انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن) یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تو، ان کی دلجوئی کے لئے، وحی کے ان مقامات کو چھوڑ دے جن میں (اس قسم کی تنذیرات آتی ہیں۔

مُعْجَزَاتِ طَلَبِ | یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ لوگ جب کہتے ہیں کہ اگر تو خدا کا رسول ہے تو تجھ پر خزانے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ یا فرشتے تیرے جلو میں کیوں نہیں چلتے، تو ان کی، طعن آمیز باتوں سے تو افسردہ خاطر

ہو جاتا ہے۔ لیکن توجیب فریضہ رسالت و انذار کے لئے مامور کیا گیا ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔

(یہ ذمہ داری بڑی سخت اور فریضہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں) اللہ کا قانون ہر معاملہ کی

کار سازی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے (اس لئے تالی کار، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ۹۴)۔ (۱۱۱)

ان آیات میں مخاطب تو حضور نبی اکرمؐ سے ہے، لیکن ان کا اصولی اطلاق جماعتِ مومنین پر بھی

ہوتا ہے۔ (مثلاً) جس طرح حضورؐ سے کہا گیا کہ یہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تصادمات و مزاحمت میں تمہارے دل میں اضطراب اور پست حوصلگی پیدا نہ ہو، اسی طرح جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي السَّيِّئَاتِ مِنْ حَرَجٍ ط (۲۲)۔ ”تمہارے لئے اس دین کا انتخاب اس لئے نہیں کیا گیا کہ تم مصیبتوں میں پھنس جاؤ۔ اس سے تمہیں دنیا اور آخرت کی حفاظت حاصل ہوگی“۔ یہ اس لئے کہا کہ اسلامی انقلاب کے لئے شرحِ صدر لا ینفک ہے فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ (۶۶)۔ (نیز ۲۹)۔ قرآن کریم کے متعلق جو کہا ہے: شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰۵)۔ ”یہ جملہ نفسیاتی امراض کے لئے شفا کا ضامن ہے“، تو اس سے مراد اسی قسم کے امراض ہیں۔

قرآنی تعلیم و تربیت سے کشادہ قلب اور وسعتِ نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ جس سے انسان کے حوصلے بڑھتے اور ہمیں جوان ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے۔ (دیکھئے جلد دوم صفحہ ۳۳۴ و جلد سوم صفحہ ۲۶) حضورؐ کی ”کبیدگی“ خاطر کی ایک اور نوعیت کا ذکر بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ اسے کبیدگی خاطر نہیں، بلکہ دلسوزی اور رقتِ قلبی سے تعبیر کیا جائے گا۔ جب حضورؐ دیکھتے کہ ان کے مخالفین، اس قدر تذیرات و تنبیہات کے باوجود تباہی کے جہنم کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں، تو ان کے انجام کے تصور سے حضورؐ کو دلی صدمہ ہوتا۔ [دیکھئے آیات (۵)، (۱۰)، (۱۴)، (۲۶)، (۳۵)] غور فرمائیے کہ ایک رسولؐ (اور رسولوں کے اتباع میں ایک مصلح مشفق) کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے؟ مخالفین گالیاں دیتے اور تپھر مارتے ہیں، اور یہ اُن کی تباہی کے احساس سے خون کے آنسو روتے ہیں!

❦

زیرِ نظر آیت (۲) میں لَتُنذِرَ بِهِ آیہ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی تعلیم دیتے تھے، اور اسی کے ذریعے فریضہٴ تذیرواد فرماتے تھے۔

قرآن کو ذِکْرُی لِلْمُؤْمِنِیْنَ کہا گیا ہے (۲)۔ ذکر کا مفہوم سابقہ جلدوں میں آچکا ہے۔ (دیکھئے اندکس)

❦

اس کے بعد فرمایا:

﴿تَبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ط قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ (۲)۔

اسے جماعتِ مومنین اتم اس ضابطہٴ قوانین (قرآن) کا اتباع کرو جسے تمہارے نشوونما دینے والے نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اور اس کے سوا کسی کار ساز و رفیق کار کا اتباع مت کرو۔ (انسانوں کے لئے صحیح روش زندگی یہی ہے۔ لیکن) بہت تھوڑے ہیں جو اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ (وہ ہدایتِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے فیصلوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ شرک ہے)۔ { (۱۳۶) ذ (۱۴) ذ (۳۹) ذ (۴۰) } اس کے

قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کا مقصد ان کی اطاعت کرنا ہے۔ اس کے لئے

اتباع اور اطاعت میں فرق

اطاعت اور اتباع کے الفاظ آئے ہیں۔ مفہوم تو اتباع کا بھی اطاعت ہی ہے، لیکن ان میں ایک لطیف، سافنی ہے۔ اطاعت اُن احکام کی کی جاتی ہے جو کسی اتھارٹی کی طرف سے صادر ہوں (مطالب الفرقان جلد چہارم کے اندکس میں ”اللہ اور رسول“، ”حکومت“ اور ”اسلامی نظام“ کے عنوانات دیکھئے)۔ ان سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ الدین، قرآنی نظام کا نام ہے جس میں اطاعت اُن احکام کی کی جاتی ہے جو اس نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف نافذ ہوتے ہیں۔ اس لئے اطاعت کے ساتھ سمعنا کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ”ہم نے سنا اور اطاعت کی“ (۵ ذ ۲۸۵ ذ ۲۸۶ ذ ۲۸۷) اس نظام کی اطاعت کو قرآن نے ”اللہ اور رسول“ کی اطاعت کہہ کر پکارا ہے۔ جلد چہارم میں اس موضوع پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ { دیکھئے بالخصوص (۳۱ ذ ۵۹ ذ ۶۰ ذ ۶۱ ذ ۶۲ ذ ۶۳) کی تشریحات }

اتباع کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ دیکھئے کہ عرب اس لفظ کو کس مقام پر استعمال کرتے تھے جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ اپنی ماں (گائے) کے پیچھے پیچھا کرتا ہے، اسے

اتباع کے معانی

وہ اتباع سے تعبیر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بچہ کسی خارجی حکم کی اطاعت کرتا ہو اپنی ماں کے پیچھے پیچھا نہیں چلتا۔ یہ اُس کی اندرونی کشش کا تقاضا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کے متعین کردہ راستے پر اس قسم کی کشش اور اندرونی تقاضا کی رو سے چلنے کا نام اتباع قرآنی ہو گا جس طرح جب آپ کو پیاس لگتی ہے تو آپ اٹھ کر پانی پیتے ہیں۔ آپ ایسا کسی کے حکم کی اطاعت کی رو سے نہیں کرتے۔ اپنے اندرونی تقاضے کی رو سے کرتے ہیں۔ اسے اتباع کہتے ہیں۔ انسان اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور حکمرانوں کے حکم کی اطاعت۔ یہ نکتہ بڑا لطیف ہے کہ قرآن کے لئے اطاعت کا لفظ کہیں نہیں آیا، اتباع کا لفظ ہی آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرد کتاب کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ اس کی اطاعت ایک اتھارٹی کی رو سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن ہدایت (یعنی راہ نمائی) عطا کرتا ہے۔ ایک راہرو جو سمجھ سچ کر کسی راہ نما کے پیچھے چلتا ہے۔ تو وہ اس کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کرتا۔ وہ خود اپنے اندرونی تقاضا

کی رُو سے ایسا کرتا ہے۔ اس کو اتباع کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا ہے (۱۶۷/۲) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس روش پر حضرت ابراہیمؑ کامزن رہے تھے، تم بھی اُس کی پیروی کرو۔ انہوں نے اپنے اور بیگناہ کا معیار یہ قرار دیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعْنِيْ فَاِنَّهُ مِنِّيْ (۱۶۷/۲)، ”جو میرا اتباع کرتا ہے، وہ میرا ہے“ یہی امت مسلمہ کی تشکیل کا بنیادی نکتہ ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اطاعت کسی حکم کی کی جاتی ہے۔ اگرچہ خود لفظ اطاعت میں بھی، بطیب خاطر تعمیل کا پہلو مضمر ہوتا ہے، لیکن حکومت کے احکام کی اطاعت، میکا کی طور پر بھی کی جاسکتی ہے، اور یہ اطاعت قانونی تقاضا پورا کر دیتی ہے لیکن انسانیت کے بیشتر تقاضے ایسے ہیں جو اس قسم کی اطاعت کے دائرے میں آہی نہیں سکتے۔ (مثلاً) قرآن کریم میں ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيعُوْا اَمْرًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۱۶۷/۲)۔ ”خدا تمہاری نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ ارادوں اور خواہشات تک کو جانتا ہے“، دُنیا کا کون سا قانون ہے جو نگاہ کی خیانت اور دل کے مخفی ارادوں پر لاگو ہو سکے؟ اور کون سا نظام ہے جو ان کی گرفت کر سکے۔ اس کے لئے تو انسان کے اندر ایک تبدیلی کی ضرورت ہے جس کی رُو سے اس قسم کی خیانت اور تخریبی ارادوں سے باز رہنا اس کا اندرونی تقاضا بن جائے۔ یا (مثلاً) اس قسم کی ہدایات کہ بُوْرُہے ماں باپ سے درشت کلامی سے پیش نہ آؤ: فَلَا تَقُلْ لِّهٖمَا اٰفٍ (۱۶۷/۲)۔ یا (مثلاً) چلا کر نہ بولو: وَ اَغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (۱۶۷/۲)۔ اور اگر کم مت چلو (لَا تَمْسِسْ فِی الْاَرْضِ مَرْحًا) (۱۶۷/۲) اس قسم کی ہدایات پر قانوناً یا عملاً عمل نہیں کرایا جاسکتا۔ ان کا اتباع اندرونی تقاضا ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی

یُغَیِّرُوْا اَمَّا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۶۷/۲)۔ ”خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے“ تو اس ”اندرونی تبدیلی“ کا مظاہرہ اتباعِ ہدایتِ خداوندی کی شکل میں ہوتا ہے۔ احکام کی اطاعت سے معاشرتی نظم و نسق قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن قوم میں حقیقی تبدیلیِ اتباع ہی سے ہو سکتی ہے۔ قرآنی نظام میں، اطاعت اور اتباع دونوں لازمی ہیں۔ یعنی ایک زندہ اتھارٹی کی طرف سے صادر کردہ احکام خداوندی کی اطاعت اور قلبی تقاضا کی رُو سے منشا لے خداوندی کی تکمیل۔ اسلام کے صدرِ اول میں جو نظام قائم ہوا تھا، اس میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ بعد میں جب اس نظام کی جگہ ملکیت نے لے لی تو اسلام کا نظام ہی ختم ہو گیا۔

عہدِ ملکیت میں اسلام باقی نہ رہا | سلاطین نے اپنے احکام منوانے شروع کر دیئے۔ مذہبی پیشوائیت نے ”اطاعتِ ”خدا و رسول“ کا مفہوم

اس طرح بدلا کہ اس میں نظام (یا زندہ اتھارٹی) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ انہوں نے کہا کہ ”اللہ کی اطاعت“ سے مراد ہے کتاب اللہ کی اپنے اپنے طور پر اطاعت، اور ”اطاعت رسول“ سے مراد ہے احادیث کی اطاعت۔ اس میں سمعنا (ہم نے سنا) کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس طرح دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لئے فقہ کے قوانین مرتب کئے گئے اور عقیدہ یہ پیدا کیا گیا کہ احکام فقہ کی اطاعت، خدا اور رسول کی اطاعت کے مترادف ہیں۔ اس سے تھیا کہ ایسی وجود میں آگئی اور امت فرقوں میں بٹ گئی۔ باقی رہا اتباع تو اس کے لئے بزرگوں کے نقوش قدم کی پیروی شروع ہو گئی (یعنی مسلک اسلاف اور مرشدان طریقت کے منہاج کی پیروی)۔

اور یہی ہے وہ اسلام جو آج تک رائج چلا آ رہا ہے۔ قرآن کریم نے اَتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ سَرِّكُمْ کے مثبت حکم سے، اتباع کے لئے، صرف کتاب اللہ میں عطا فرمودہ راستہ بتایا تھا۔ اور وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ اَوْلِيَاءَ کے منفی حکم سے، کتاب اللہ کے سوا، ہر مسلک و مشرب کے اتباع کی مخالفت کی تھی۔ لیکن مروجہ اسلام میں قرآن کریم تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا ہے، اور اتباع کے لئے اپنی اپنی پسندیدہ شخصیتیں مقرر کر لی گئیں (اولیاء) کا مفہوم مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۴۴۴ پر واضح کیا گیا ہے۔

حضور بھی قرآن کا اتباع کرتے تھے | یاد رکھیے! اسلام نام ہے اس نظام کی اطاعت کا جو کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کرے، اور اس راستے کا اتباع جو قرآن میں متعین کیا گیا ہے۔ حضور نبی اکرم بھی قرآن کریم کا اتباع کرتے تھے۔ ارشاد ہے: اِنْ اَتَّبِعْ اِلَّا مَا يُوحَىٰ اِلَيَّ (۱۵۱)۔ ”میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے“ اور اس کی خلاف ورزی سے جو عذاب خداوندی وارد ہوتا ہے، اس سے خائف رہتے تھے (۱۵۲)۔ حضور کو اسی کا حکم دیا گیا تھا: وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ اِلَيْكَ (۱۵۳)۔ ”اے رسول! جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے، اس کا اتباع کیا کرو“ (نیز ۱۵۴)۔ اسی راستے کے اتباع کو حضور نے صراطِ مستقیم کا اتباع قرار دیا جب فرمایا:

وَاِنَّ هَذِهِ صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۱۵۵)۔

راہ سے کہہ دو! یہ ہے تمہارے خدا کی مقرر کردہ، توازن بدوش راہ، جو تمہیں سیدھی منزل مقصود تک لے جائے گی۔ میں بھی اسی راہ پر چلتا ہوں۔ تم بھی اسی پر چلو (اسی کا اتباع کرو) اسے چھوڑ کر اور راستوں کو اختیار نہ

کرو۔ وہ تمہیں خدا کی راہ سے الگ کر دیں گے۔ اُس نے تمہیں اس کا اس لئے حکم دیا ہے کہ تم زندگی کے تمام خطرات سے محفوظ رہ کر، امن و سلامتی سے اپنے نصب العین تک پہنچ جاؤ۔

اسی کا نام اتباع سنت رسول اللہ ہے۔ اس کی تشریح پہلے باب میں زیر آیت (۷۴/۱) گزر چکی ہے۔ باقی رہا اسلاف کے راستے کا اتباع، سو قرآن کریم نے اس سے سختی سے منع کیا ہے۔ اس مسلک کے متبعین کے متعلق فرمایا: **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا** ط اَوْ كُ

اسلاف کے مسلک کا اتباع

كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۷۴/۲) ”ان لوگوں کے پاس اپنے غلط نظام کی سند صرف یہ ہے کہ یہ نظام ان کے اسلاف سے سوارث چلا آ رہا ہے۔ سوچئے کہ یہ بھی کوئی سند ہے، یاد رکھئے! غلط اور صحیح، حق اور باطل کی سند اور معیار صرف یہ ہے کہ خدا کی کتاب کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن یہ کبھی اُسے معیار تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ خدا نے (قرآن میں) نازل کیا ہے، اُس کا اتباع کرو، تو یہ کہیں گے کہ نہیں! ہم اُسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔“

یعنی خواہ ان کے اسلاف نہ عقل و بصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے صحیح راستے پر گامزن ہوں، یہ پھر بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے! (۷۴/۵) ذ ۱۰/۸ ذ ۱۱/۶ ذ ۱۱/۸ ذ ۲۱/۵ ذ ۲۳/۲۷ ذ ۳۴/۳۸ ذ ۴۳/۲۳) ”مزید تفصیل“ تقلید کے عنوان کے تحت دیکھئے۔

انسان شخصیتوں کا اتباع ان جذبات کی رو سے کرتا ہے جو ان شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم، ان جذبات کے اتباع کو، جو ہدایت خداوندی کے خلاف ہوں، انتہائی ضلالت قرار دیتا ہے: **وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ** ط (۷۴/۲)۔ ”اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو گا جو ہدایت خداوندی کے علی الرغم اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔“

”اولیاء“ کی تشریح مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۴۴۴) میں آچکی ہے جہاں زیر نظر آیت (۷۴/۱) بھی درج ہے۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ **وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ** تو اس سے واضح ہے کہ قرآن مجید کے سوا کسی کا اتباع بھی جائز نہیں خواہ وہ کتنی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں آیات (۷۴/۱۲) ذ ۱۳/۱۴ ذ ۱۴/۳۹ اور (۷۴/۱۲) پر بھی ایک نگاہ ڈال لینی چاہیے، جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اگر قرآن کریم کے سوا کسی کا بھی اتباع کیا جائے تو وہ شرک ہو جائے گا۔ دین میں سند اور حجت، اور قولِ فیصل صرف کتاب اللہ

کا ہے۔ اگر کسی انسان کے قول یا فعل کو یہ حیثیت دے دی جائے تو یہ شرک ہو جائے گا۔ قرآن ، انسان پرستی کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ اُس نے واضح طور پر کہا کہ جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی، تباہ ہو جائے گی۔ اقوام سابقہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ ۚ فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝

(ان سے پہلے) کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں (اُن کی غلط روی کی وجہ سے ہمارے قانونِ مکافات نے) ہلاک کر دیا یہ تباہی کسی قوم پر ایسے وقت میں آئی جب وہ لوگ رات کو (اطمینان سے) سو رہے تھے، اور کسی پر اس وقت جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے (یعنی وہ خواب غفلت میں پڑے تھے اور زندگی کے حقائق کی طرف سے یکسر غافل تھے۔

اقوام سابقہ پر تباہی وہ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدست تھے کہ انہیں اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان پر تباہی آئے گی۔ اور جو شخص انہیں اس سے متنبہ کرتا تھا،

اس سے کہتے تھے کہ ہم کون سے ایسے بُرے کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے ہم پر تباہی آئے گی (۲۱)۔ لیکن جب اُن پر تباہی کا عذاب آیاتِ اُن کی آنکھ کھلی، اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم واقعی ظلم اور زیادتی پر اترے ہوئے تھے (۲۱-۱۱)۔

قوموں کی تباہی کے اسباب و علل اور اُن کے عروج و زوال کے ابدی اصولوں کے متعلق سابقہ جلدوں میں تفصیلی بحث آچکی ہے۔ راند کس جلد سوم میں دیکھئے عنوانات ”استبدال و استخلافِ قومی“ اور قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول“ اور راند کس جلد چہارم میں عنوان ”اقوام کے استبدال کا قانون“۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل آیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے: (۵۴) و (۵۹) و (۶۸) و (۶۹) و (۷۰) و (۷۱) و (۷۲) و (۷۳) و (۷۴) و (۷۵) و (۷۶) و (۷۷) و (۷۸) و (۷۹) و (۸۰) و (۸۱) و (۸۲) و (۸۳) و (۸۴) و (۸۵) و (۸۶) و (۸۷) و (۸۸) و (۸۹) و (۹۰) و (۹۱) و (۹۲) و (۹۳) و (۹۴) و (۹۵) و (۹۶) و (۹۷) و (۹۸) و (۹۹) و (۱۰۰)۔

ان میں آیات (۲۱-۱۱) کا تعلق براہِ راست اس موضوع سے ہے جس کا ذکر آیہ زیرِ نظر (۲۱) میں کیا گیا ہے، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان کے مفہوم کو یہاں پیش کر دیا جائے اس سے بات واضح تر ہو جائے گی۔ فرمایا:

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ۝
فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ۝ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا
إِلَى مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسْكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَسْأَلُونَ ۝ قَالُوا يَٰوَيْلَنَا
إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا
خَامِدِينَ ۝ (۲۱-۱۱)

تباہی کا عبرت آموز نقشہ | (اگر تم اپنی زندگی کا نقشہ نظام خداوندی کے مطابق کر لیا، تو تمہیں رقت و عظمت حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے، تو تم بھی اُسی

طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے جس طرح) ہم نے (تم سے پہلے) کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اور پھر، اُن کے بعد، ان کی جگہ، دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔ (۲۱)

اُن کی غلط روش کے نتائج، غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اُنہیں اُن کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اُس روش سے باز آجائیں، لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج، آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے، حتیٰ کہ) جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ لگے بھاگنے (۱۸۲/۶، ۱۶۶/۱۶) - (۲۱/۱۲)۔

(لیکن اُس وقت بھاگنے کا کونسا موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے اُنہیں لٹکا اور کہا کہ) اب کہاں بھاگ کر جاسکتے ہو؟ مت بھاگو۔ اب اُسٹے پاؤں انہی عیشِ سامانیوں کی طرف چلو (جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کئے تھیں) اور اپنے اُن محلات کی طرف پلٹو (جن کے اندر تم اپنے آپ کو استفادہ محفوظ سمجھا کرتے تھے)۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا۔ اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (۱۰۲/۱۸) - (۲۱/۱۳)

اُس وقت اُنہیں، اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے، اور اپنے کئے پر سخت متاسف۔ (۲۱/۱۴)

(لیکن اس وقت اس تاسف سے کیا ہو سکتا تھا؟ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر وہ پٹا نہیں کونے)۔ چنانچہ وہ برابر چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں، اُن پر وہ بے حد متاسف ہیں، لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے اُنہیں ایسے کر دیا جیسے گناہوا کھیت، جس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے

کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ (یا نبجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے - ۳۶/۲۸)..... (۲۱/۱۵) یہ ہوتا ہے حشر ان اقوام کا جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہیں۔

پہلے شرائط | قرآن کریم نے متعدد مقامات میں بتایا ہے کہ کسی قوم کی تباہی سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ یعنی (۱) ان تک خدا کا پیغام پہنچ چکا ہو۔

(۲) ان میں ایسے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ تفصیل ان امور کی مطالب الفرقان جلد چہارم (آیت ۴/۱۶۵ صفحہ ۱۸۴) آیت ۵/۱۹ - صفحہ ۸۴) میں گزر چکی ہے، اس مقام پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ۝

یقیناً ہم ان سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف ہم نے اپنے پیغامبروں کو بھیجا تھا (کہ تم نے اس پیغام کو

سننے کے بعد کیا کیا تھا)۔ اور خود رسولوں سے بھی پوچھیں گے (کہ تمہاری دعوت کا جواب کیا ملا تھا؟

”جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا“ میں دونوں گروہ آگئے۔ ایک وہ جنہوں نے اس پیغام کے ماننے سے

انکار کر دیا تھا، اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا جنہوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔ ان کے ذمہ یہ فریضہ بھی عائد ہوتا ہے کہ

وہ اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچائیں، جن تک یہ پہنچ نہ چکا ہو۔

جماعت مومنین کی ذمہ داری | غور کیجئے کہ جماعت مومنین پر یہ کس قدر عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد، وہ تمام ذمہ داریاں جو رسولوں پر

عائد ہوتی تھیں، اس امت پر عائد ہو گئیں، کیونکہ اسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ (۳۵/۳۴)

اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ رسولوں یا لوگوں سے اس طرح دریافت کرنے کے معنی یہ نہیں

کہ خدا کو اس کا علم نہیں ہوگا۔ خدا کو تو ایک ایک بات کا علم ہوتا ہے۔ یہ دریافت کرنا کچھ اس طرح سمجھئے، جیسے

عدالت میں موزم سے اعتراف جرم کرایا جاتا ہے، خواہ جج کو ذاتی طور پر اس کا علم بھی کیوں نہ ہو۔ اور قرآن کریم میں

اس کے بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے قانون کا علم ہو جائے اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس۔

فرمایا:

فَلَنَقْصَنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَ مَا كُنَّا غَائِبِينَ ۝

(اور یہ پوچھنا کچھ اس قسم کا نہیں ہوگا جیسے کوئی ناواقف کسی بات کو دریافت کر رہا ہو)۔ یہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے، کیونکہ ہم کسی وقت بھی غیر حاضر نہیں ہوتے۔ ہم سب کچھ خود بتا دیں گے (کہ انہوں نے کیا پہنچایا اور انہوں نے اس کا استقبال کیسے کیا)۔

ظہورِ نتائج کے وقت ہر انسان کے اعمال کے ذرہ ذرہ کا وزن ہوگا:

وَالْوِزْنُ يَوْمَ مِيزَانٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝

ثقل وخفت موازين (اس سے ظاہر ہے کہ جس جماعت کے ذمے پیغامِ رسانی کا فریضہ عائد ہوتا ہے، اُس سے بھی پوچھا جائے گا کہ اُس نے اپنی ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کیا تھا) حقیقت یہ ہے کہ ظہورِ نتائج کے وقت، ہمارے قانونِ مکافات کی میزان، ہر ایک کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن بتا دیتی ہے۔ جس کے مثبت، تعمیری اور صلاحیت بخش اعمال کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ وہ کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ (یہ اُلجھ) اور جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوتا ہے، تو یہی لوگ ہیں جو اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے قوانین سے سرکشی برتنے کا۔

قانونِ مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس جلد سوم۔ عنوانات ”مکافاتِ عمل“ اور ”قانونِ مکافات“۔ نیز انڈکس جلد چہارم، عنوان ”مکافاتِ عمل“)۔ لیکن اس آیت میں جو ”میزان“ کا ذکر آیا ہے تو اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔

میزان سے مراد نظامِ کائنات، قانونِ ارتقاء کے تحت جاری و ساری ہے۔ اس قانون کی رو سے ایک چیز (یا نوع) اپنے نقطہ آغاز سے، ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتی ہوئی، اپنے منہتی تک پہنچتی ہے۔ اس راستے کی ہر منزل میں اُس کا ٹکراؤ، تخریبی قوتوں سے ہوتا ہے۔ اگر اس میں تعمیری قوتوں کا غلبہ ہے تو وہ تخریبی قوتوں کو شکست دے کر باقی بھی رہتی ہے، اور ارتقاء کی اگلی منزل کی طرف بڑھ بھی جاتی ہے (قرآنِ کریم اسے ”حق و باطل کی کش مکش“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ کش مکش کا یہی سلسلہ انسانی زندگی میں بھی جاری ہے۔ تخریبی جراثیم ہر آن کروڑوں کی تعداد میں انسانی جسم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ اگر اس فرد کی قوتِ مدافعت مستحکم ہے، تو وہ ان تخریبی عناصر کو شکست دے دیتی ہے۔ اس سے اُس کی صحت قائم

رہتی ہے۔ اگر تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں، تو وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ علاج کے معنی ہوتے ہیں اُس کی مدافعت کی قوت میں اضافہ کرنا۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ ورنہ بیماری بڑھتی جاتی ہے، اور آخر الامر اُس کی موت واقعہ ہو جاتی ہے۔

لیکن (جیسا کہ آپ سابقہ جلدوں میں دیکھ چکے ہیں) انسان صرف اُس کے طبعی جسم سے عبارت نہیں جسم کے علاوہ اس کی ذات (نفس) بھی ہے۔ تعمیری اور تخریبی قوتوں کی کش مکش کا جو سلسلہ اس کے جسم میں جاری رہتا ہے، وہی اس کی ذات میں بھی ہنگامہ خیز رہتا ہے۔ اس کی تعمیری قوتیں، اعمالِ صالحہ (حسنات) سے مستحکم ہوتی ہیں، اور تخریبی قوتیں، اعمالِ سیئہ (سیئات) سے پرورش پاتی ہیں۔ اگر اُس کی تعمیری قوتیں غالب رہیں تو اُس کی ذات (جسے اقبال خودی سے تعبیر کرتا ہے) محکم ہو جاتی ہے۔ اور اس قابل کہ وہ سلسلہ ارتقاء کی اگلی منزل میں پہنچ جائے۔ (اسے جنت کی زندگی کہا جاتا ہے)، اور اگر تخریبی قوتیں غالب رہیں، تو اُس کے ارتقاء کا سلسلہ رک جاتا ہے، اور وہ منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ (اسے جہنم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ انڈکس میں متعلقہ عنوانات دیکھئے)۔

قرآن کریم اس کش مکش کو میزان کے پلڑوں کی نہایت بلیغ تشبیہ کی رو سے سمجھاتا ہے۔ اگر تعمیری پلڑا بھاری ہوتا ہے (جھکتا ہے)، تو انسانی ذات مستحکم ہوتی ہے۔ اور آگے بڑھنے کے قابل۔ اگر یہ پلڑا ہلکا ہوتا ہے (اوپر اٹھتا ہے)، تو وہ ناچختہ رہتی ہے۔ اس تشبیہ میں قانون ارتقاء کی ساری کارفرمائی آئیٹنے کی طرح سامنے آجاتی ہے۔ اس قانون کی رو سے ایسا نہیں ہوتا کہ باقی وہی رہے اور آگے وہی بڑھے جو تخریبی عناصر سے پاک اور صاف ہو۔ تخریبی عناصر اس میں بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ تعمیری عناصر کے مقابلہ میں کمزور ہوتے ہیں۔ اس لئے مغلوب رہتے ہیں۔ یہی کیفیت انسان کی ذات کی ہوتی ہے۔ (عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس قانون کی رو سے)

سوال معصوم ہونے کا نہیں

(سے) جنت میں جانے کا اہل وہی نہیں ہوتا ہے جو بالکل معصوم ہو، جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ جس کا دامن کسی لغزش سے آلودہ نہ ہو۔ صاحب اختیار و ارادہ انسان سے غلطی کا سرزد ہو جانا عین ممکن ہے۔ سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا غلطیوں کا وزن زیادہ ہے یا حسنِ عمل کا وزن۔ اس لئے وہ مومنین کے متعلق کہتا ہے کہ
الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّسَمَ ط (۲۳)۔ وہ بڑے بڑے گناہوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ اُن سے خفیف سی لغزشیں کبھی کبھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ (اُن کے

اعمالِ صالحہ، اُن لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ کر دیتے ہیں) وہ اس کے لئے ”پڑھوں کے جھکنے اور اٹھنے“ کو معیار قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ط (۱۱)۔ (نیز ۲۵ ذ ۲۸)۔ ”حسنات کا جھکا ہوا پلٹا، سیات کا ازالہ کر دیتا ہے“

اس حقیقت کو ایک اور مثال کی رو سے سمجھیے۔ سکولوں اور کالجوں کے امتحانوں میں (PASS-MARKS) رکھے جاتے ہیں۔ ”پاس مارکس“ (مثلاً) اگر ساٹھ فی صد ہیں، تو جو طالب علم اتنے نمبر حاصل کر لیتا ہے، اُسے اگلی کلاس میں ترقی دے دی جاتی ہے، حالانکہ اُس کا چالیس نمبر کا پرچہ غلط ہوتا ہے۔ ساٹھ فی صد کی قابلیت، چالیس فی صد کی کمزوری کا ازالہ کر دیتی ہے۔

لیکن اس میں ایک نکتہ مزید غور کا متقاضی ہے۔ ان مضامین میں بعض لازمی (COMPULSORY) ہوتے ہیں جن میں پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم لازمی مضمون کے پرچہ میں فیل ہو جاتا ہے، تو اُس کے باقی پرچے دیکھے ہی نہیں جاتے۔ اس کی سب محنت رائیگاں چلی جاتی ہے۔

دین کی امتحان گاہ میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس میں جو شخص لازمی مضمون میں فیل ہو جاتا ہے، اُس کے سب اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم اُسے

حبطِ اعمال

حبطِ اعمال کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۳۰۷۔ آیت ۲۱۷۔ اور جلد چہارم صفحہ ۴۵ آیت ۲۱۔ ۲۲)۔ جلد چہارم میں (ص ۴۲ پر) جو اہم آیت (۱۸) درج کی گئی ہے، اس میں حبطِ اعمال کے بعد کہا گیا ہے: فَلَا تُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا۔ ”اُن کے اعمال تولنے کے لئے میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی“

قرآن کریم نے مکافاتِ عمل کا اصول یہ بتایا ہے کہ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ط وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (۹۹)۔ ”جو ذرہ برابر بھی قانونِ خداوندی کا اتباع کرے گا، اس کے حسنِ عمل کا خوشگوار نتیجہ اُس کے سامنے آجائے گا۔ اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا، اس کی سزا پائے گا۔ ہر شخص کے اعمال کا ذرہ ذرہ اُس کے سامنے آجائے گا“ اس اصول کی روشنی میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ کون ہیں جن کے اعمال تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؟ یہ وہی ہیں جو لازمی مضمون میں فیل ہوں گے، یا انہوں نے ان مضامین میں امتحان ہی نہیں دیا ہوگا۔ دین کے نصاب میں یہ (لازمی) مضامین ہیں۔ توحید اور ایمان بالآخر

توحید کے معنی یہ ہیں کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ جو کسی انسان کے لئے حق حکومت کو جائز سمجھتا ہے وہ اس مضمون میں فیل ہو جاتا ہے۔ اور ایمان بالآخرت سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنے ہر عمل کا نتیجہ بھگتنا ہوگا، خواہ وہ اس دنیا میں سامنے آجائے اور خواہ مرنے کے بعد آخرت میں۔ یہ بھی لازمی مضمون ہے۔ اور جو اس میں فیل ہو جاتا ہے۔ اس کے اعمال کے تولنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے، اس لئے وہ اپنے اچھے کاموں کے ثمرات اسی دنیا میں لے لیتا ہے۔ بغرض تفہیم کہا کہ کفار کے نیک اعمال کا بدلہ! یہ لوگ جب جہنم رسید کئے جائیں گے، تو کہیں گے کہ ہم نے دنیا میں کچھ اچھے کام بھی تو کئے تھے۔ ان کا بدلہ تو ہمیں ملنا

چاہیے۔ اُن سے کہا جائے گا کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۲۶)۔ تم دنیاوی زندگی ہی کو منتہی سمجھا کرتے تھے، اس لئے تم نے اپنے اچھے کاموں کے نتائج اُسی زندگی میں دیکھ لئے۔ تمہاری موت کے ساتھ تمہارے وہ اعمال بھی وہیں رہ گئے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ آپ جلد چارم صفحہ ۴۴ پر حِطَّتْ اَعْمَالُهُمْ کی تشریح ایک بار پھر دیکھئے۔ نظر آجائے گا کہ ہمارا مقام کیا ہے۔ ویسے میزان کا موضوع (۲۱-۲۲) ز (۲۳-۲۴) اور (۲۵-۲۶) میں بھی آیا ہے { ایک اور مثال اس سے بھی زیادہ نمایاں اور بلیغ ہے۔ ایک شخص بڑا امن پسند ہے۔ معاشرہ کے رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، جس کی وجہ سے

اُس کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اُس کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت ہو جاتا ہے، جس کی سزا موت ہے ظاہر ہے کہ اس ایک جرم کی بنا پر اُس کے ماضی کے تمام اچھے کام رائیگاں چلے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، توحید کے معنی یہ ہیں کہ حق حکومت صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے، وہ مملکت خداوندی کا وفادار شہری ہے۔ جو اس کے ساتھ کسی انسان کی حکومت کو بھی شریک کرتا ہے اور انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو قوانین خداوندی کا درجہ دیتا ہے، وہ اس مملکت کے خلاف جرم بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدٌ (۱۸) وہ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ انڈکس میں دیکھئے حکم اور حکومت کے عنوانات قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے شرک کہا جاتا ہے، اور یہ ناقابلِ تلافی جرم ہے۔ (جلد سوم اور چہارم کے انڈکس میں عنوان ”شرک“ دیکھئے)۔ یہ ہے وہ جرم جس کے مرتکبین کے اعمال تولنے کے لئے میزان

تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔ وہ سب رائگاں جائیں گے۔ ہم (مسلمان) صدیوں سے انسانوں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرتے ہوئے، حکومت خداوندی کے خلاف مجرم بغاوت کے مرتکب ہوتے چلے آ رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے وہ اعمال (نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ) جنہیں ہم بزعیم خویش نیک اعمال سمجھ کر ادا کرتے ہیں، نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔ رائگاں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ قانون خداوندی کی رو سے ان کے تولنے کے لئے میزان ہی کھڑی نہیں کی جاتی۔

گناہوں کی بخشش کا سوال ہی نہیں | آخر میں ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا جائے کہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے، گناہوں کی معافی،

بخشش۔ سفارش وغیرہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال، اعمال کے وزن کا ہے۔ جس کا اعمال حسنہ (قرآن کے مطابق اعمال) کا پلڑا بھاری ہے، وہ جنت کا مستحق ہے۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہے، وہ اس سے محروم رہے گا۔

ایک نکتہ اور ————— آیت زیر نظر (۶) میں کہا گیا ہے: فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ

نقصان اُن کی ذات (نفس) کا ہو گا۔ اُخروی زندگی میں نفع یا نقصان کا تعلق انسانی ذات سے ہو گا۔

ذات کا نقصان | انسان کی طبعی زندگی اور اُس کے لوازمات یہیں رہ جائیں گے۔ اسی لئے ہم نے شروع میں کہا ہے کہ ”نیک اعمال“ وہ ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام

ہوتا ہے۔ ”برے اعمال“ وہ جن سے اس میں ضعف لاحق ہوتا ہے۔ بخود لفظ ”خسران“ کے معنی کسی چیز میں کمی رہ جانے کے ہیں۔



اس کے بعد انسانی زندگی کے کوائف و ماجریات کو قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن

تمبیذا یہ کہا گیا ہے کہ

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ط قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ؕ

۷۰
۱۰

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں منگن کیا، اور اس میں تمہاری روزی کا سامان رکھ دیا۔ (یہ سب کچھ بلامزدہ

معاوضہ عطا کیا)۔ لیکن تم میں بہت کم ہیں جو اس کے قدر شناس ہیں۔ (یعنی بجائے اس کے کہ اس سامانِ زلیّت کو عالمگیر انسانیت کی نشرو نما کے لئے کھلا رکھیں، اسے فساد یعنی ناہمواریاں پیدا کرنے کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔)

نوع انسان کا تمکّن فی الارض | اس آیت میں مخاطب تمام نوع انسان سے ہے۔ اس اعتبار سے جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَاشٍ کی حقیقت بڑی غور

طلب ہے۔ ارض (زمین) — تمام نوع انسان کے لئے سرچشمہٴ رزق ہے۔ خاص افراد کے لئے نہیں۔ کوئی ایسا نظام جس میں کوئی فرد رزق سے محروم رہ جائے، منشائے خداوندی کے خلاف ہوگا۔ (انڈکس میں معاشی نظام کا عنوان دیکھئے)۔

اس کے بعد آیات (۱۱) سے (۱۲) تک ابلیس و آدم کا قصہ مذکور ہے۔ یہ داستان، سورہ بقرہ کی آیات (۲) تا (۹۲) میں آچکی ہے، جن کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم۔ صفحات ۱۳۶-۱۳۷ میں کی گئی ہے۔ اور ان میں آیات (۱۱-۱۲) بھی آگئی ہیں۔ لہذا ان آیات کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں، ان کا صرف مفہوم درج کر دیا جاتا ہے، اور ان کے سامنے مطالب الفرقان جلد دوم کے صفحات کا حوالہ دیدیا گیا ہے، جہاں متعلقہ آیت کی تشریح ملے گی۔ { مفہوم آیات (۱۱-۱۲) } :

۱۱ یہ فساد کس طرح پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے تم اپنی سرگزشت پر غور کرو۔ (جسے ہم قصہٴ آدم کے عنوان سے پہلے بھی بیان کر چکے ہیں) (۱۱-۱۲) اور جسے مزید تصریحات کے ساتھ پھر دہراتے ہیں۔)

وہ سرگزشت یہ ہے کہ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے کی ہے (۱۳)۔ پھر (زندگی کو مختلف ارتقائی مراحل سے گزارتے ہوئے اسے) پیکر بشریت میں لے آئے۔ پھر تم میں ایسی صلاحیتیں رکھ دیں جنکے سامنے کائناتی قوتیں جھک جائیں۔ (تم فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لو) لیکن، اس کے ساتھ تمہارے جذبات بھی ہیں کہ (جن کی اگر صحیح تربیت نہ کی جائے تو وہ) تم سے سرکشی اختیار کر لیتے ہیں، اور تم اتنی بڑی قوتوں کے مالک ہونے کے باوجود، بے بس ہو کر رہ جاتے ہو۔

اسے مثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ ملائکہ سے ہم نے کہا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ، تو وہ جھک گئے، لیکن ابلیس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ (۱۱)۔ { حوالہ - جلد دوم صفحہ ۹۸ }

۱۲ ہم نے اس سے پوچھا کہ جب ہم نے تجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا، تو وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں اس حکم کی تعمیل سے باز رکھا؟ (۱۲)۔ اُس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور

اسے مٹی سے۔ (آب و گل کے پکڑ انسان پر، اُس کے تند و تیز جذبات غالب رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے اندر، وحی کے اتباع سے شرف انسانیت کو بیدار کر لیتا ہے، تو پھر وہ ان جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا (۱۵-۱۴)۔
[حوالہ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۰]

ہم نے کہا کہ (یہ تمہاری غلط نگہی ہے)۔ یہ چیز (کہ تم میں سُندھی سرکشی ہے) تمہاری بڑائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ تم اس زعمِ باطل کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گئے۔ تم نے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ سو تم یہاں سے نکل جاؤ یہاں انسان کے دو بنیادی غلط تصورات کی نزدیک کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ پیداؤنشی امتیاز باطل ہے۔ اور دوسرے یہ کہ تعمیر کی کام کئے بغیر بڑائی کا دعویٰ نہ ہونا غلط ہے۔ تکبر بالحق جائز ہے۔ (۱۴-۱۳) ذ (۱۵-۱۴)۔
[حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۰]

اُس نے کہا کہ (اب اگر میرا اور آدم کا باہمی تصادم رہنا ہے تو) مجھے اُس وقت تک انسان کے ساتھ رہنے کی مہلت دے دے، جب تک یہ اپنے راستے سے ان موانعات کو دور نہ کرے جو اسے آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ اُس وقت اسے ایسی حیاتِ نو مل جائے گی جس میں میرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ یا جب تک یہ دنیا سے اٹھانہ لیا جائے۔ (جذبات کی سرکشی اُسی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ انسانی ذات میں اس قدر استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ انہیں غالب نہ آنے دے۔ یہ اس دنیا میں، انسان کی حیاتِ نو ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ جذبات مرتے دم تک غالب رہتے ہیں) (۱۴-۱۳)

جواب ملا کہ ہاں! تمہیں اُس وقت تک کی مہلت ہوگی (۱۵-۱۴) ذ (۱۵-۱۴) (۱۴-۱۳)۔
[حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۸]

اُس نے کہا کہ تو نے جو مجھے گمراہ کر کے مجھ پر ہمیشہ کے لئے سعادت کی راہ بند کر دی ہے اور مجھے تباہ و برباد کر دیا ہے، تو میں بھی بنی آدم کی گھات میں بیٹھا رہوں گا کہ وہ اُس توازنِ بدوش راہ سے

بھٹک جائیں جو تیری طرف لے جانے والی ہے۔ (۱۴-۱۳)

اس کے لئے میں ان پر ہر طرف سے یورش کر دوں گا۔ سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے پھر تو ان میں اکثر کو دیکھے گا کہ وہ تیری ان غیابات کے، جو تو نے ان پر رزاں فرمائی ہیں، قدر شناس نہیں

ہوں گے۔ (۱۵-۱۴) ذ (۱۴-۱۳) ذ (۱۵-۱۴)

[حوالہ۔ مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۰]

۷
۱۸

خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ذلیل و درمختار ہوا ہے۔ (سرکش جذبات، جو انسان کو شرف انسانیت سے محروم کر دیں، ایسے ہی ہوتے ہیں)۔ جو ان میں سے تیرا اتباع کرے گا، تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ (وہ حیوانی سطح پر چسپاں گئے اور ان کی انسانی صلاحیتیں جُلس کر رہ جائیں گی)۔ (آدم سے بھی معصیت ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا، تو اُس نے ندامت سے گردن جھکائی اور کہا کہ میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں خواستگارِ عضو ہوں (۷/۲۲)۔

جواب ملا کہ تو نے جب اپنی غلطی کا اعتراف اور اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے، تو اس سے نظر آتا ہے کہ تیری اصلاح کا امکان ہے۔

یہی سوال جب ابلیس سے کیا تو، اُس نے کہا کہ میں کون ہوں انکار اور سرکشی کرنے والا؟ تیرے حکم کے بغیر پیٹہ نہیں مل سکتا، اس لئے مجھے تو نے خود گمراہ کیا ہے!

جواب ملا کہ جب تو اپنی غلطی کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اپنے جرم کو عقیدہ کا جبر کے نقاب میں چھپاتا ہے تو تیری اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔

(یہ ہے ملخص ابلیس و آدم کے تمثیلی قصہ کا)

{ حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۶ }

۷
۱۹

انسان (مرد و عورت) کو اس قدر متضاد صلاحیتیں دے کر دیا میں بسایا گیا۔ (یعنی ایک طرف اس کی قوتوں کا یہ عالم کہ تمام اشیائے فطرت اس کے سامنے جُجک جائیں۔ اور دوسری طرف اس کی یہ کیفیت کہ اپنے سرکش جذبات کو اپنے قابو میں نہ رکھے تو ان کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو جائے)۔

ابتداءً انسانی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشوونما کی بڑی فراوانی تھی۔ چنانچہ اُن سے کہا گیا کہ تم جہاں سے جی چاہے اپنی ضروریات پوری کرتے رہو۔ یہاں ”سیری اور تیری“ کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن اگر تم نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے اور وحدتِ انسانیت کے بجائے خاندانوں قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئے تو تم پر گروہ بنانہ جذبات غالب آ جائیں گے اور اس طرح یہ جنتی زندگی تم سے چھن جائے گی (۷/۲۵)۔ (۷/۲۶)

{ حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۱۱ }

یہ زندگی بڑی فراوانی اور خوشگوار کی تھی (۷/۲۸)۔ لیکن انسان کے سرکش جذبات نے اُس کے

۷
۲۰-۲۲

دل میں دوسو سے پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ اس کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے۔ جہاں تک ایک فرد کی طبعی زندگی کا تعلق ہے، اسے موت سے مفر نہیں۔ اسے جیات جاوید اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ یہ وحی کے اتباع سے اپنی ذات کی نشوونما کر لے۔ لیکن اس کے حیوانی تقاضے اسے اور طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ شیطان نے آدم کے کان میں یہ افسوس بھونکا کہ خدا نے جو تمہیں کہا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہنا چاہیئے، تو اس سے اُس کا مقصد یہ ہے کہ تم کہیں بے پناہ قوتوں کے مالک نہ بن جاؤ، یا جیات جاوید حاصل نہ کرو۔ تم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اولاد میں تمہیں اس کا طریق بتاؤں (۲۱)۔ تم زندہ رہ سکتے ہو اپنی اولاد کے ذریعے۔ مرنے کے بعد، تمہاری اولاد تمہارا نام زندہ رکھے گی۔ اس طرح تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ یوں اُس نے انسان کے جنسی جذبات کی تسکین کو مقصود جیات بتا کر، اُس کی زندگی کو حیوانی سطح تک محدود کر دیا، اور بلند انسانی زندگی کے تصور کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ (۲۲)۔

شیطان نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اس میں میرا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیر خواہی کے لئے کر رہا ہوں۔ (۲۳)

چنانچہ اُس نے، اس قسم کی باتوں سے انسان (مرد اور عورت) کو بہکا دیا اور انہیں اُن کے مقام بلند سے گرا دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ عقل و شعور سے کام لے کر، وحی کی روشنی میں، اپنا نظام تمدن و معیشت قائم کرنا جسلی خواہشات اس پر غالب آگئیں، اور یوں اس کے تحت الشعور (UN-CONSCIOUS) میں چھپے ہوئے جذبات بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔

بہر حال، انسان کے سرکش جذبات نے اُس کی توجہ، انسانی ذات کی طرف سے ہٹا کر، محض زندگی کے طبعی تقاضوں پر مرکوز کر دی۔ اس نے انہی کی تسکین کو مقصود جیات سمجھ لیا۔ اس سے انفرادی مفاد پرستی

۱۔ بائبل میں آدم کی لغزش کا ذمہ دار اُس کی بیوی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس لئے عورت کو تمام گناہوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن، مرد اور عورت دونوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ صرف عورت کو ہی نہیں۔

غالب آگئی۔ انسانوں میں باہمی تشدد و افتراق پیدا ہو گیا، اور عالمگیر انسانیت کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ نسل کو وجہ یکانگت قرار دینے کا لازمی نتیجہ قبائلی اور قومی زندگی ہے جس سے عالمگیر انسانیت کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ خدا نے آدم (مرد و عورت) سے کہا کہ کیا میں نے تمہیں اس بیج زندگی سے روکا نہیں تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، اس کے فریب میں نہ آ جانا؟ (۲۳۷)۔

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۱۶)۔

انہوں نے (مرد و عورت نے) کہا کہ اسے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا (جو تیری بات نہ مانی)۔ اگر تیری طرف سے ہماری حفاظت اور محنت کا انتظام نہ ہوا، تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

(جب خدا نے ابلیس سے کہا تھا کہ تم نے ہمارا حکم کیوں نہ مانا، تو اُس نے اس کا ذمہ دار خدا کو قرار دیا تھا) (۲۳۷)۔ یہ جبر کا عقیدہ ہے جس سے انسان پر ابدی مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ (ابلیس کے بنیادی معافی ہی ہیں)۔ لیکن آدم نے اپنی خطا کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو قرار دیا۔ اس لئے اس کے لئے اصلاح کے امکانات پیدا ہو گئے۔

(حوالہ: مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۰۱)

خدا نے کہا کہ ایسا بھی ہو جائے گا (۲۳۷) لیکن اب تمہاری زندگی کا نقشہ کچھ اور ہو گا۔ تم نے اپنے آپ کو اُس مقام بلند سے گرایا جس میں تم سب ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے { (۲۳۷)؛ (۲۳۸) } اب تم گروہوں میں بٹ جاؤ گے، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہو جائے گا۔ نسلی یا قومی تشوؤں تمدن کی بنیاد قرار دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ اب تمہیں یہاں ایک مدت تک رہنا ہے، اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اٹھانا ہے۔ (لہذا اب تمہاری معاشی زندگی کی دشواریاں شروع ہو گئیں۔

(حوالہ کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۲۵) (۲۳۸-۱۱۶)

آیت (۲۳۷) میں ہے: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ | متاع کا مفہوم | مُسْتَقَرٌّ کا مفہوم سابقہ باب (آیت ۲۳۷) میں بیان ہو چکا ہے۔ مَتَاعًا کا لفظ، البتہ، غور طلب ہے۔ سابقہ جلدوں میں، ”معاشی نظام“ کے عنوان

کے تابع بتایا گیا ہے کہ قرآن کے نظام کا حاصل یہ ہے کہ کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ اور کسی کے پاس زائد از ضرورت (اندوختہ کرنے کے لئے) نہ رہے۔ قرآن کریم نے سامانِ زیست کو متاع کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور (قرآن کا اعجاز ہے کہ) اس ایک لفظ میں اس کے معاشی نظام کا اصل الاصول سمٹ کر آ جاتا ہے۔ عربوں کی زندگی صحرا نوردی اور وشت پیمائی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ وشت و صحرا میں ضروریات زندگی کا فقدان ہوتا تھا۔ اس لئے ہر مسافر کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایسی چیزیں اپنے ساتھ رکھے جو سفر میں لائیفک ہوں۔ عربوں کے ہاں۔ اَلْمَتَّعَةُ۔ ضروریات سفر۔ مثل ڈول۔ رسی۔ مشکیزہ۔ توشہ، کو کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مسافران چیزوں کے بغیر سفر بھی نہیں کر سکتا تھا اور انہیں زائد از ضرورت ساتھ بھی نہیں لے جاتا تھا۔ مثلاً وہ دو چار ڈول یا مشکیزے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ صرف ایک ایک ساتھ رکھتا تھا۔ سامانِ زیست کی اس تشبیہ (متاع) سے آپ غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے اپنے معاشی نظام کو کس حسنِ اعجاز، لیکن جامعیت سے بیان کر دیا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ۔ حیاتِ ارض میں تمہیں متاع کی ضرورت ہے۔ تم یہاں مسافر ہو۔ تمہارے پاس ضروریات سفر کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن زائد از ضرورت تمہارے لئے بار دوش بن جائے گا۔ اس مسافت کو اس طرح طے کرو۔

اس کے بعد ہے:

قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ۝ (۴۵)

تمہاری زندگی، ارض (زمین) سے وابستہ ہے جو تمہارے رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس کے غلط نظام سے تم پر موت طاری ہو جائے گی، اور جب اس نظام کو صحیح خطوط پر لے آؤ گے تو تمہیں حیاتِ نول جائیگی اور حیاتِ نو کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ انسانی ذات کا ارتقاء، مادی اسباب و ذرائع کو ترک کر دینے سے نہیں ہوگا۔ ان اسبابِ معیشت کو مسافروں کی طرح استعمال میں لایا جائے گا۔ بقدر ضرورت۔ تم اس جہانِ آب و گل میں رہو گے اور اس سے ابھر کر تمہیں حیاتِ نو حاصل ہوگی۔ ارتقاءِ ذات کی اولین شرط تسخیرِ مادہ ہے۔

مرنے اور جینے کا مفہوم | ہمارے ہاں عام طور پر "فِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ" کے معنی لئے جاتے ہیں کہ تم نے مرنے کے بعد اس زمین میں دفن ہونا ہے اور پھر اسی زمین سے دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونا ہے۔ یہ مفہوم بوجہ صحیح نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہاں مخاطب

بنی آدم (تمام نوع انسان) سے ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی بہت سی اقوام (بلکہ مذاہب) ہیں جو اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے۔ (حیاتِ آخرت کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ ہمارے نزدیک اس سے مراد، انسانی زندگی کا اس محبسِ آب و گل سے نکل کر، ارتقاء کی اگلی منزل میں چلے جانا ہے۔ (دیکھئے عنوان ارتقاء)۔

اس سلسلہ میں فرمایا:

۴۶ یٰبَنیَّ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاَتِکُمْ وَ
یُرِیْطُ وِلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ۚ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّہُمْ
یَذَکَّرُوْنَ ۝

اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ طبعی زندگی کے تقاضے، یعنی اس دنیا کی زیب و زینت کی چیزیں، قابلِ نفرت

زیب و زینت کی چیزیں حرام نہیں

ہیں اور صحیح مسلک وہ ہے جس میں ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ بالکل نہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو تمہارے لئے وجہِ جاذبیت بنایا ہے۔ (۳۱)۔ انہیں کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا (نہ)۔ ان کے حصول اور استعمال میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو ان میں سے کوئی چیز بھی شر نہیں رہے گی۔ سب خیر ہی خیر ہوگا۔ یہ امور ضابطہ خداوندی سے متعلق ہیں اور اس لئے بیان کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ انہیں اپنے پیش نظر رکھیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی کہ

۴۷ یٰبَنیَّ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَا اَخْرَجَ اٰیُوْبُکُمْ مِّنَ
الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا سَوْاَتِہِمَا ۚ اِنَّہُ یَرٰکُمُ
ہُوَ وَ قَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنٰہُمْ ۚ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیْطٰنَ اَوْلِیَآءَ
لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

سرکش جذبات کا غلبہ | اے نوعِ انسانی! تم کہیں شیطان (سرکش جذبات) سے مغلوب نہ ہو جانا، ورنہ وہ تمہارے لئے بھی اسی طرح مصیبت کا موجب بن جائیگا

جس طرح اُس نے تمہارے مورثین کو جنی زندگی سے نکلوا دیا تھا، اور انہیں شرفِ انسانیت کے لباس سے عریاں کر دیا تھا۔ اس سے کبھی مامون اور غیر محتاط نہ رہنا۔ وہ اور اس کا گروہ، ایسے ایسے مقامات میں تمہاری گھا

میں رہتا ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ (یہ جذبات تمہارے دل کی گہرائیوں اور لاشعور میں چھپے رہتے ہیں)۔
لیکن یہ انہی کے فنیق و مسازمتے ہیں جو ہمارے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے۔ جو لوگ بند
انسانی زندگی، مستقل اقدار، قانون مکافاتِ عمل اور حیاتِ اخروی پر یقین رکھیں، وہ حیوانی سطح کے
جذبات سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ وہ انہیں ہماری عائد کردہ حدود کے اندر رکھتے ہیں۔

”جنت“ سے یہاں مراد وہی نظام ہے جس میں معاشرہ اقدارِ خداوندی کا پابند ہوتا ہے، اور کوئی فرد
ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ ابلیس اور شیطان کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (باب اول)
میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ انسان کے بے باک جذبات کا نام ہے۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ ”وہ تمہیں وہاں سے
دیکھتے ہیں جہاں تم انہیں دیکھ نہیں سکتے“ تو اس میں علم النفس (سائیکالوجی) کے ایک عمیق نکتہ کی طرف
تحت الشعور کی دنیا | اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جذبات انسان کے ”لا شعور“ کی
گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جہاں انہیں ”شعور“ کی نگاہ مہیا نہیں

سکتی۔ جب آپ کا غصہ فوری طور پر بھڑک اٹھتا ہے اور آپ فریقِ مقابل کو ٹھپڑ (بلکہ گولی) مار دیتے
ہیں، تو آپ کے شعور کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ اقدارِ خداوندی کی پابندی ان جذبات کو ساحلِ فراموش نہیں
ہونے دیتی۔ اسی لئے کہا ہے کہ ان کا غلبہ ”لَا يُؤْمِنُونَ“ پر ہوتا ہے۔ دیگر متعدد مقامات پر بھی واضح کیا گیا
ہے کہ خدا کے مخلص بندوں پر ابلیس کا کوئی بس نہیں چل سکتا۔ قرآن کریم نہ تو (مسکب ربانیت یا تصوف
کی طرح) جذبات کو فنا کرتا ہے، (جذبات فنا ہو نہیں سکتے۔ وہ صرف دب جاتے ہیں جسے SUPPRE-
SSION بلکہ REPRESSION کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ PERVERSION ہوتا ہے) اور نہ ہی انہیں

بے باک ہونے دیتا ہے۔ وہ ان سے، اقدارِ خداوندی کی راہنمائی میں، تعمیری کام لیتا ہے۔
اس کے بعد قرآن، ابلیس کے ایک نہایت فریب انگیز حربہ کا ذکر کرتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ابلیس
نے اپنی غلط روی اور معصیت کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی، بلکہ کہا تھا کہ یہ سب خدا نے کرایا ہے، وہی اس کا
ذمہ دار ہے۔ وہ یہی سبق انسانوں کو پڑھاتا ہے۔ فرمایا:

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا
بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ اتَّقُوا اللَّهَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا
تَعْلَمُونَ ۝

ابلیس کا خطرناک حربہ | جب حیوانی جذبات انسان کو کسی بے حیائی کی بات پر آمادہ کرنا چاہیں، تو شروع شروع میں انہیں اس کے لئے کچھ زور لگانا پڑتا ہے۔

لیکن جب اس قسم کی باتیں دو ایک نسلوں تک متواتر آگے چلتی جائیں، تو پھر لوگوں میں وہ جھجک باقی نہیں رہتی۔ جب ان سے کہا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے اسلاف کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے، اور (چونکہ ہمارے اسلاف خدا کے احکام کو ہم سے بہتر جانتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ انہیں) اس قسم کا حکم خدا ہی نے دیا ہوگا۔

ان سے کہو کہ خدا بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیا کرتا۔ تم جس بات کا علم نہیں رکھتے اسے خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو؟ جس بات کے لئے تم کہو کہ وہ شریعت خداوندی ہے، اس کے متعلق تمہیں خود علم ہونا چاہیئے کہ وہ واقعی ایسی ہے۔ یہ کہہ دینا کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے، اس لئے جس بات کو انہوں نے خدا کا حکم کہہ دیا ہے وہ واقعی خدا کا حکم ہوگا، کوئی دلیل اور سند نہیں۔

ابلیس کے حربے۔ تقدیر اور تقلید دونوں | یہاں دیکھئے تقلید اور تقدیر دونوں کو ابلیس حربے بتایا گیا ہے۔ (سابقہ جلدوں میں ان

موضوعات پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے)۔ اس کے ان دونوں حربوں سے محفوظ رہنے کا طریق یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ خدا کا اس باب میں ارشاد کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا کے ارشادات، اُس کی کتاب (قرآن) ہی سے مل سکتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ ہم (مسلمان) صدیوں سے، ابلیس کے ان دونوں پھندوں (تقدیر اور تقلید) میں جکڑے چلے آ رہے ہیں! علاج اس کا کتاب اللہ سے راہنمائی حاصل کرنا تھا۔ اسے ہم نے ”ایصالِ ثواب“ کے لئے رکھ چھوڑا۔ ارشاد خداوندی ہے کہ

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ۝

اُن سے کہو کہ میرا نشوونما دینے والا اعتدال کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے سکتا، اس لئے تم، نہ تو اپنے جذبات کا بے باکانہ اتباع کرو۔ نہ اسلاف کی روش کو بطورِ سند پیش کرو۔ تم اپنی تمام توجہات کو قوانینِ خداوندی پر مرکوز رکھو۔ اُن کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دو

اور اطاعت کو اُسی کے لئے خاص کر دو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کر دو۔ اس طرح تم پھر اُسی جنتی زندگی کو حاصل کرو گے جس سے انسانیت کا آغاز ہوا تھا۔ (اور جس کا ذکر اوپر قصۂ آدم میں کیا گیا ہے۔

مسجد کے معنی ”سجدہ“ کا مفہوم، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۹۸ پر بتایا جا چکا ہے، اور ”مسجد“ کے متعلق جلد سوم صفحہ ۱۰ (نیز جلد اول صفحہ ۲۱۷) پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس آیت میں ”مسجد“ کا لفظ اطاعت گاہ کے لئے نہیں استعمال ہوا ہے۔ یہ مصدری معنوں میں آیا ہے جس کے معنی اطاعت کرنا ہیں۔

آیت میں کَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ آیا ہے۔ یعنی جس قسم کے معاشرہ سے تمہاری ابتدا ہوئی تھی، وہی معاشرہ پلٹ آئے گا۔ ہم (مسلمانوں کے لئے) اس سے مراد وہ معاشرہ ہے جسے قرآنی اقدار کی رو سے، محمد رسول اللہ والذین معہ نے قائم کیا تھا، اور جسے ”فرعون۔ ہامان اور قارون“ کی سازشوں نے برباد کر دیا تھا۔ حضورؐ نے اپنے اس جنتی معاشرہ کے متعلق فرمایا تھا کہ

”أَنَّ الزَّمَانَ قَدْ اسْتَدَاءَ كَهَيْئَةِ يَوْمٍ مَخْلُوقٍ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“

زمانہ پھر پھر آج پھر اُسی نقطہ پر آگیا ہے جس پر اللہ نے اسے آغازِ کائنات کے وقت متعین کیا تھا۔

(خطبہ حجتہ الوداع)

یہ کَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ کی تفسیر تھی جنت سے نکلے ہوئے آدم کے لئے، جنت کی بازیابی کا اس کے سوا کوئی طریق نہیں کہ یہ حضور خاتم النبیینؐ کے نقوش پا کو خضر راہ بنائے۔ زمانہ نوح انسان سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

جنہیں حقیر سمجھ کر بچھا دیا تو نے وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی



یہ وضاحت کرنے کے بعد کہا کہ

۷۳ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنََّّهُم مُّهْتَدُونَ

لیکن ہم جانتے ہیں کہ تم، سب کے سب، اس طریق کو اختیار نہیں کرو گے۔ تم دو گروہ بن جاؤ گے۔

ایک گروہ ہمارے قوانین کا اتباع کر کے زندگی کی سیدھی راہ پر گامزن رہے گا۔ دوسرا گروہ، اپنے جذبات یا اسلاف کی اندھی تقلید کی روش پر چلے گا، تو اس پر سعادت کی راہیں بند ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ انہوں نے، اللہ کے قانون کو چھوڑ کر، وہ سری قوتوں کو اپنا کار ساز بنایا اور بزعم خویش سمجھتے رہے کہ ہم بالکل سیدھی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔

اس آیت میں دو بنیادی نکات مجملًا بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں گروہ دو ہی ہیں، ایک وحی خداوندی کے مطابق صحیح راستے پر گامزن، اور دوسرا گروہ جو دیگر راہوں پر چلے۔ انسانوں کی یہ تفریق و تمیز دو قومی نظریہ کی بنیاد ہے۔ یہ دونوں (باہم دیگر متضاد اور متخالف گروہ) مل کر ایک قوم بن نہیں سکتے۔ انڈکس میں قوم۔ قومیت اور دو قومی نظریہ کے عنوانات دیکھئے)

دوسرا نکتہ یہ کہ لوگ چلتے تو ہیں غیر خداوندی (شیبطنت کے) راستوں پر، اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم بالکل صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ انڈکس میں ”جبط اعمال“ کا عنوان دیکھئے جس سے واضح ہو جائے گا کہ جو لوگ ”بزعم خویش“ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے نیک کام کر رہے ہیں، درحقیقت کسی خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں (سابقہ صفحات میں آیات (۶۰-۶۱) کی تشریح بھی دیکھئے)

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اعلانیہ، خدا۔ وحی۔ حیات اخروی کا انکار کرتے ہیں۔ عام طور پر انہیں ملحد یا (ATHEISTS) کہا جاتا ہے۔ یہ گمراہ تو ہوتے ہیں، لیکن خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ خود فریبی میں مبتلا مذہب پرست طبقہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ سراسر غلط راہوں پر چلتے ہیں، لیکن بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ حق و کھلے ہوئے ملحد صدافت کے راستے پر گامزن ہیں۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ فَزَيِّنْ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ (۱۶) و دیگر متعدد مقامات) ”شیطان ان کے (غلط) کاموں کو مزین (مستحسن) بنا کر دکھاتا ہے“ ملحدین سے عقل و بصیرت کی بنا پر (دلائل و براہین کی رُو سے) بات کی جاسکتی ہے، اور اگر وہ مطمئن ہو جائیں تو صحیح راستے پر آ بھی جاتے ہیں، لیکن مذہب پرست طبقہ کو راہ راست پر لانا، ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتا ہے۔ وہ علم و بصیرت کی رُو سے بات کرنا تو ایک اور فریب خور وہ مذہب پرست طرف، بات سننے تک کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے، اور اسلاف کے راستے سے (جسے انہوں نے بغیر موچے سمجھے موصیٰ تقلید اختیار کر رکھا ہوتا ہے) ایک قدم ادھر ادھر ہٹنے کو کفر و الحاد سمجھتے ہیں۔ یہ میرا مدت العمر کا

ذاتی تجربہ ہے۔ مغرب کے (ATHEISTS) میرے ہاں آتے ہیں۔ ان سے دلائل و براہین کی رُو سے بات کی جاتی ہے۔ وہ نہایت اطمینان و سکون سے سُنتے ہیں، اور جب وہ مطمئن ہو جائیں، تو کشادہ نگہی سے اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ لیکن مذہب پرست طبقہ کے افراد آتے ہی لٹھ لئے ہوتے ہیں۔ مقصد ان کا تلاشِ حقیقت نہیں ہوتا۔ ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی | اپنی بات کو دوسرے پر ٹھونسنا ہوتا ہے۔ جب ان سے حق و صداقت کی کوئی بات کہی جائے، تو ان کا پہلا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ کیا اس

پہلے بھی کسی نے ایسا کہا ہے؟ یعنی اس بات کے غلط یا باطل ہونے کی دلیل یا سند یہ ہے کہ اسلاف میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا۔ سوچئے کہ اس قسم کی ذہنیت دلوں کو حق و صداقت کی کوئی بات بھی سمجھائی جاسکتی ہے؟ وہ آتے ہی اس ذہنیت کے ساتھ ہیں کہ یَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّقْتَدُونَ۔ اور جاتے بھی یہی ذہنیت لئے ہوتے ہیں۔ اور ساری عمر اپنے اس مسلک پر قائم رہتے ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ (جیسا کہ آیت ۲ کی زیر تشریح بتایا جا چکا ہے) قبولیت حق و صداقت کے لئے ”سینے کی کشادگی“ کس قدر ضروری ہے۔

﴿

دُنیَا سے نفرت | مذہب پرست طبقہ میں باہمی اختلافات ہزار ہوں، ایک چیز ان سب میں بطور قدر مشترک ملے گی، یعنی مادی دنیا سے نفرت اور زیب و زینت، آرائش و زیبائش کی چیزوں سے خدا واسطے کا پیر۔ اہل شریعت میں یہ بغض و نفرت پھر بھی ایک حد تک ہوتا ہے، لیکن اربابِ طریقت (اہل تصوف) میں یہ انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ آرائش و زیبائش ہی نہیں، وہ کھانے پینے کی چیزوں کو بھی (جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال طیب قرار دے رکھا ہے) اپنے اوپر حرام قرار دے بیٹے ہیں اور اس اجتناب و تنفر کو حصولِ قربِ خداوندی کے لئے لازم سمجھتے ہیں۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”تصوف کی حقیقت“ میں ملے گی)۔ اُس نے ان باطل عقائد کی تردید کے لئے فرمایا:

﴿۳۱﴾ یٰبَنیَّ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَ کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۗ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝

ترکِ زینت کا مسلک خلافِ قرآن ہے | ”اے نوعِ انسانی! (یہ تصور غلط ہے کہ اطاعتِ خداوندی کے لئے ترکِ دنیا۔

ترکِ لذات۔ ترکِ زیبائش و آرائش ضروری ہے۔ دنیاوی زیب و زینت، اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں

ہوتی۔ اس کے برعکس) اس اطاعت سے خود زیب و زینت کے پہلوؤں بھرتے ہیں، کیونکہ اطاعتِ قوانینِ خداوندی کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہوتا ہے۔ لہذا، تم ان چیزوں سے ضرور فائدہ اٹھاؤ۔ کھاؤ۔ پیو۔ لیکن، اُن حدود کا خیال رکھو جو خدا نے مقرر کر رکھی ہیں۔ حدود شکنی، قانونِ خداوندی کی رو سے پسندیدہ نہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ”مسجد“ کے معنی سجدہ (یعنی اطاعت) کرنا ہیں۔ ان معانی کی روشنی میں یہ نکتہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اُس نے ہی نہیں کہا کہ زندگی کے عام معمولات میں بھی حسن و رعنائی۔ (زیب و زینت) کو ملحوظ رکھو، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اطاعتِ خداوندی کی ہر روش میں، اسے بالخصوص اپنا معمول قرار دو، یعنی اطاعتِ خداوندی نہایت حسن کا رازِ انداز سے بجا لاؤ۔ بلکہ یوں کہئے کہ اطاعتِ خداوندی خود تمہاری زندگی کو حسین بنا دے گی۔ آپ

اطاعت سے زندگی حسین ہو جاتی ہے

سوچئے کہ اُس نے چار لفظوں میں کس طرح، ان باطل عقائد کی تردید کر دی جن کی رو سے ترکِ دنیا۔ ترکِ زیب و زینت اور ترکِ لذات کو قربِ خداوندی کی راہ میں رکاوٹیں سمجھا جاتا تھا۔

ان اشیاء کے استعمال کا حکم دینے کے ساتھ، یہ تنبیہ بھی ضروری سمجھی کہ لَا تُسْرِفُوا۔ اسراف کا ترجمہ عام طور پر فضول خرچی کیا جاتا ہے۔ فضول خرچی (یعنی جتنی ضرورت ہو اُس سے زیادہ خرچ کرنا) بھی اسراف ہے (کیونکہ اس کے بنیادی معنی حد سے تجاوز کرنا ہیں) لیکن اس استعمال کی رو سے اس لفظ کے معانی اس سے زیادہ وسیع ہیں۔ اس مفہوم کو ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ کھیتوں کو پانی دینے کے لئے نالیاں بنائی جاتی ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان نالیوں کے اندر بہ کر پانی کھیت تک پہنچ جائے۔ اگر کسی نالی کا کنارہ (حد) راستے میں ٹوٹ جائے۔ تو یہ پانی کھیت تک پہنچنے کے بجائے راستے میں بیکار ہو جاتا ہے۔ اسے بھی اسراف کہا جاتا ہے۔ اسی سے ظاہر کہ سامانِ زینت کو جس مقصد کے لئے عطا کیا گیا ہے، اسے اس مقصد کے حصول کے لئے صرف اور استعمال کرنا، جائز ہی نہیں، ضروری ہے۔ لیکن جس طرح اس سے اجتناب اور نفرت کرنا، خلافِ مشیتِ خداوندی ہے۔ اُسی طرح اُن کے استعمال میں حدود سے بڑھ جانا، یا انہیں ضائع کر دینا بھی خلافِ منشائے ایزدی ہے۔

یہاں تک تو ان باطل عقائد کی تردید مقصود تھی۔ لیکن اگلی آیت میں اس قسم کے عقائد رکھنے والے کو چیلنج دیا گیا۔ اور جس تحدی سے یہ چیلنج دیا گیا ہے، اسی سے واضح ہے کہ اس قسم کے عقائد کس طرح غیظ و غضبِ خداوندی کا موجب ہیں۔ فرمایا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

زیب و زینت کو کون حرام قرار دے سکتا ہے؟ | اسے رسول اتم ان ارباب شریعت اور مسلک خالقہایت

کے پیروکاروں سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو اور خوشگوار اشیائے خورد و نوش کو حرام ٹھہرا سکتا ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ چیزیں اس دنیا کی زندگی میں، مومنین اور دوسروں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہیں (اور ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق جس کا جی چاہے انہیں حاصل کر سکتا ہے) (۱۷۲-۱۸۱)

لیکن آخر وہی زندگی میں یہ مختص ہوں گی ان کے لئے جنہوں نے ایمان و اعمالِ صالحہ سے اپنے آپ کو ان کا مستحق بنایا ہوگا (یعنی اہل جنت کے لئے)۔

اس طرح ہم، ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں اپنے قوانین واضح طور پر بیان کر دیتے ہیں۔ ان آیات سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے جمایاتی پہلو کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اس موضوع پر میں نے، (المطالب الفریقان جلد اول میں) سورہ فاتحہ کے پہلے لفظ، حمد، کی تشریح کرتے ہوئے، ضمناً روشنی ڈالی تھی، لیکن ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے زیب و زینت کی چیزوں (بلکہ فنونِ لطیفہ) کے خلاف جس شد و مد سے اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا ”آرٹ اور اسلام“۔ اس کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں:

آرٹ اور اسلام | ۱۔ گلاب کے پھول کے متعلق کسی طبیب سے پوچھئے۔ وہ بتائے گا کہ اس کا مزاج حار و یابس ہے اور تاثیر کے اعتبار سے یلین اور مدّر۔ خواص کی طرف آئیے تو یہ منقوی درمفرج قلب ہے اور جگر کی اصلاح میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس کے عرق اور کلغہ کا شمار منفعاتِ بخش

ادویات میں ہوتا ہے۔ فطرت نے اس میں بڑے فوائد رکھے ہیں۔

جمالیاتی پہلو | لیکن یہی پھول جب ایک ایسے صاحب ذوق کی نگہ حسن شناس کے سامنے آئے جسے فطرت نے حس لطیف سے نوازا ہو، تو اسے اس کے اندر، دلکش رخیائوں اور کیف اور

زیبائیوں کی ایک دنیا مسکراتی، مچلتی، کھیلتی، ناچتی دکھائی دے گی۔ اس کی نرم و نازک پتیوں کی لطافت۔ اس کی شفق آمیز رنگینیوں کی لطافت۔ اس کی نکھت جاں نواز کی عطر بیزیاں۔ اس کی شگفتگی و شادابی کی مسرت خیزیاں، ہر چشم جمال آشنا کو یہ کہہ کر دعوتِ نظارہ دیں گی کہ

مرثہ برہم مزن، تان شکنی رنگ تماشارا

اور کشش و جذب کا یہ عالم، پھولوں تک ہی محدود نہیں۔ اس نگہ سے دیکھئے تو صحنِ چمن کا نأت کا ایک ایک گوشہ، دامنِ باغبان و کفِ گل فروش کا آئینہ دار نظر آئے گا۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں دکھائی دے گی جس میں افادی پہلو (UTILITARIAN ASPECT) کے ساتھ جمالیاتی پہلو (AESTHETIC PHASE) موجود نہ ہو۔ سورج کی نور پاشیوں میں، چاند کی ضیا باریوں میں، ستاروں کی مرصع کاری میں، کہکشاں کی روشن نگاری میں، بادلوں کی سبک خرامی میں، نسیمِ سحر کی خوش پیامی میں، سمندر کی تلاطم خیز یوں میں، ندی کی سکوت آمیزیوں میں، سرو و قافص درختوں کی پر شکوہ صفت آرائی میں، اور ان کی طرف لپک کر آنے والے پرندوں کی فغم سرائی میں، غرضیکہ نگار خانہ کائنات کی کسی شے کو سب سے، اس میں منفعت بخشی کے ساتھ ساتھ، جمال آفرینی یوں سموئی ہوئی نظر آئے گی جیسے کسی خوبصورت، محو خواب بچے کے خاموش لبوں کی بہار آفریں مسکراہٹ۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کی پروردگاری (نشوونما۔ ربوبیت) کا ذمہ لیا، تو ضروری تھا کہ اس کی زندگی کے ہر گوشے کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کیا جاتا۔ انسان کی ضروریات، طبعی ہی نہیں، جذباتی بھی ہیں اور اس کے جذباتی تقاضوں کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے مہیا کردہ سامانِ نشوونما میں افادی اور جمالیاتی دونوں عناصر موجود ہوتے۔ حیوان اور انسان میں ایک خط امتیاز یہ بھی ہے کہ حیوان کے تقاضے صرف طبعی ہوتے ہیں لیکن انسان کو ذوقِ جمالیات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ایک گائے کے نزدیک پھول اور گھاس، یکساں چارہ اور شکم پری کا سامان ہیں۔ لیکن انسان ان دونوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ بشرِ طبع وہ حیوانی سطح سے ابھر کر، انسانی سطح پر اُچکا ہو۔

لیکن جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کے لئے چند قواعد و ضوابط کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کی جذباتی زندگی کے تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے بھی حدود و قیود لاینفک ہیں۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، وہ حدود و قیود متعین کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسان کی طبیعی اور جذباتی زندگی کے تقاضے پورے کرنے سے، انسان کے جسم اور اس کی ذات، دونوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور اس طرح انسان اس دنیا میں بھی جنت بدارماں زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی، مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں دو اصطلاحیں مروج ہیں — جلال اور جمال۔ جلال میں قوت بھی شامل ہے اور ہر شے کا افادی پہلو بھی، کیونکہ افادی پہلو کا صحیح استعمال، قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کے برعکس، جمال، کسی شے کا تحسینی پہلو ہے۔ یعنی اس کی (APPRECIATIVE VALUE) اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔

۳۔ خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق کہا ہے:

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (۳۲)۔

(خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو حسین ترین انداز میں پیدا کیا ہے۔)

خدا کا عمل تخلیق حسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کے توازن و تناسب (PROPORTION) میں ذرا سا فرق آیا، اُس کا حسن جاتا رہا۔ پس کمال نے ٹھیک کہا

تھا کہ اگر قیو پطرہ کی ناک ذرا چبٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق بڑی تحدی کے ساتھ کہا ہے کہ تم اس میں کہیں عدم توازن نہیں دیکھو گے۔ کسی شے کو غیر متناسب نہیں پاؤ گے۔ اُس کے کہنے کا انداز ملاحظہ کیجئے۔ سورہ الملک میں ہے: مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفْوُتٍ ۚ تَمَّ خدائے رحمن کی تخلیق (ایشیائے کائنات) میں کہیں کوئی جھول۔ کوئی سلوٹ۔ کوئی شکن نہیں دیکھو گے، کہیں عدم تناسب نہیں پاؤ گے۔ — فَاَرْجِعِ الْبَصَرَ ۖ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۚ طائر نگاہ کے پر کھول کر اسے کائنات کی فضا میں اذنِ بال کشتی وہ اور پھر اس سے پوچھو کہ کیا اسے کہیں کوئی سقم،

کوئی عیب، کوئی شکاف، کوئی بدنمائی دکھائی دی ہے؟ — ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ ۚ يَكُ يَرْجِعُ الْبَصَرَ بار بار نگاہ سے کہو کہ وہ اچھی طرح دیکھے۔ خوب تلاش اور تجسس کرے۔ — يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ

نَخَاسًا وَهُوَ خَسِيرٌ (۶۷)۔ وہ خاسر اور داماندہ۔ ناکام اور بایوس کا شائبہ چشم میں لوٹ آئے گی۔ نگارخانہ فطرت میں اسے کہیں کوئی سقم دکھائی نہیں دے گا۔

۴۔ سورہ نحل میں، افادی اور جمایا تی پہلو، بڑے حسین انداز میں سامنے لائے گئے ہیں۔ پہلے کہا:

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۶۸)

موشیوں کی دنیا ”تم موشیوں کو دیکھو۔ ان میں تمہارے لئے کس قدر فائدے کی چیزیں ہیں۔ ان کی اُون سے تم گرم کپڑے بناتے ہو۔ ان کا گوشت تمہارے کھانے کے کام آتا ہے“ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ يَكُونُوا بَلِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ (۶۹) ”ان میں جو بار برداری کے کام آتے ہیں، وہ تمہارا سامان اٹھا کر دور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ سامان خود اٹھانا پڑتا، تو تم کس مصیبت میں پڑ جاتے؟ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا (۷۰) پھر تم گھوڑوں، خجروں اور گدھوں کو دیکھو، وہ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں، وَزِينَةً (۷۱) اور بعض ان میں سے تمہارے لئے سامان زینت بھی بنتے ہیں۔“

یہ سب کچھ گنانے کے بعد کہا کہ ان میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ لیکن اُس کچھ اور کے دیکھنے کے لئے نگہ نگارہ جو کی ضرورت ہے، کہ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تَرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۷۲)۔ ”ذرا چشم تصور سے دیکھو کہ علی الصبح، تاروں کی چھاؤں میں، نور کے ترشکے، جب فضا کی آنکھیں میوڑ نیم خوابیدہ، نیم وا ہوتی ہیں، اور چاروں طرف سکوت کا عالم، اُس وقت جب تم ان موشیوں کو چوپال سے نکال کر، باہر چراگا ہوں کی طرف لے جاتے ہو، تو یہ منظر کس قدر جمال آفرین ہوتا ہے۔

اور پھر شام کے وقت، جب سورج تھک کر، پہاڑوں کی اوٹ میں سستے چلا جاتا ہے۔ فضا پر چاروں طرف دھند لگا چھا جاتا ہے۔ کھیت اُداس اور راستے خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو اس وقت جب تم ان موشیوں کے گلے کو چراگا ہوں سے خرماں خرماں بستی کی طرف واپس لاتے ہو، تو یہ سماں بھی کس قدر کیف بار ہوتا ہے۔ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تَرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۷۳)۔ تمہاری نگاہیں ان کے افادی دائروں میں محدود ہو کر رہ گئی نہیں۔ لیکن اگر تمہارے سینے میں برت کی قاش نہیں دھڑکنے والا دل ہے، تو تم محسوس کرو گے کہ ان کے اس جمایا تی پہلو کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ یہ جیسے ہوا ہیں۔

آپنے موشیوں کے اس طرح چراگاہوں کی طرف جانے اور واپس آنے کے مناظر، کسی عظیم ترین مصوّر کے ناوِ شاہکار میں دیکھے ہوں گے اور یا پھر قرآن کریم کے ان چند الفاظ میں۔ ذرا چشمِ تصور سے کام لیجئے اور دیکھئے کہ کیا ان الفاظ کے محاکاتی اعجاز کے سامنے ہر نگہ جمال آشنا جھک جھک نہیں جاتی؟

۵۔ جنت کی نعماء | خدا نے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ جنت بتایا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جنت۔ اس جنت کی جو تفصیل

قرآن کریم میں آئی ہیں۔ اس دنیا میں حقیقی معنوں میں اور اُخروی زندگی میں تمثیلی انداز سے جن کا بیان ہوا ہے، ان پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حُسن و زیبائش کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جو اس میں نہ آگیا ہو، سب سے پہلے محاکاتی انداز میں اس منظر کو سامنے لائیے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ۔ آبِ دِل کے کنارے، سبزہ نازستہ، گھنیرے درختوں کی چھاؤں، بہار کا موسم جس میں نہ زیادہ سردی نہ گرمی۔ لَا يَدْرُونَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا (۷۴)۔ دوسری طرف، اعلیٰ درجے کے صوفے، حریر و اطلس کے پردے۔ نرم و نازک ریشم کے ملبوسات (۱۸)۔ چاندی اور سونے کے برتن۔ بلوریں آنچورے سونے کے کنگن۔ موتیوں کے ہار { (۷۴) (۱۵-۲۱) } (۲۳)۔ مختصراً یہ کہ مَا تَشْتَهُيهِ إِلَّا نُفِيسٌ وَ تَلَذُّ الْأَعْيُنُ (۲۴)۔ اس میں ہر وہ شے ہوگی جس کی آرزو انسان کرے اور جس سے نگاہیں لذت یاب ہوں۔ حتیٰ کہ فَرْحُهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (۲۵)۔ سرسبز و شاداب باغات میں نہایت شستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسیقی کی محفلیں حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ (الْحَبْرَةُ) میں حُسن و جمال، زیبائی و رعنائی اور انبساط و مسرت کے تمام مظاہر آجاتے ہیں، خواہ وہ جنتِ نگاہ ہوں یا فردوسِ گوش۔ یہ ہے وہ جنتی معاشرہ جس کا وعدہ اس دنیا میں کیا گیا ہے اور جس کا تمثیلی بیان جنتِ اُخروی کے سلسلہ میں قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ آپ سوچئے کہ زیب و زینت کی جن حسین و جمیل اشیاء کو قرآن نے جماعتِ مومنین کی حسن کارانہ زندگی کا حاصل بتایا ہے، کیا انہی اشیاء کے استعمال کو خدا حرام قرار دے گا؟

نعمائے جنت کی جن حسین و جمیل اشیائے زیب و زینت کا ذکر قرآن میں آیا ہے، ہمارے اربابِ شریعت انہیں حرام قرار دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ خدا کبھی ایسا بھی کرے گا کہ جو چیزیں اس دنیا میں حرام ہوں، انہیں جنتی زندگی میں حلال ہی نہیں، بلکہ اپنی طرف سے نعماء قرار دے دے؟ یہ محرمات

ہماری وضع کردہ ہے۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے درود و صاف رنگ جو کچھ دیکھتے ہو، میرے پیمانے کا ہے جہاں تک کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، ان کے لئے انڈکس میں ”حرام و حلال“ کا عنوان دیکھئے اس میں نظر آجائے گا کہ خدا نے تو نین چار چیزوں کو حرام قرار دیا تھا، لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے حرام و حلال کی طول طویل فہرستیں مرتب کر رکھی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا تھا: مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ط وہ کون ہے جو خدا کی حلال قرار دادہ اشیائے زیب و زینت اور رزق طیب کو حرام ٹھہرا دے؟ خدا پوری تحدی کے ساتھ یہ کہتا ہے، اور ہمارے ارباب شریعت و صراط کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں!

یہ تو ارباب شریعت کا حال ہے۔ اہل تصوف سرے سے اس دنیا ہی کو قابل نفرت قرار دیتے اور اسے ترک کر دینے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس کا نام رکھتے ہیں ”مغز دین“۔ اس کے متعلق انڈکس میں تصوف کا عنوان دیکھئے۔



اس کے بعد کہا کہ یہ لوگ تو خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حرام قرار دیتے ہیں۔ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ خدا نے کن باتوں کو حرام قرار دیا ہے:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنْزَلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا
عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

خدا کی حرام کردہ | ان چیزوں کو خدا نے حرام نہیں قرار دیا۔ جن چیزوں کو اُس نے حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:-

۱۔ ہر قسم کی بے حیائی کی باتیں، خواہ وہ کھلی ہوئی ہوں یا پوشیدہ (عملاً ہوں یا ان کی آرزوئیں دل میں کر وٹیں

یعنی رہیں)۔

۲۔ ایسے امور جن سے انسانی صلاحیتوں میں افسردگی اور اضمحلال پیدا ہو، اور عملی قوتیں مفلوج ہو جائیں۔

۳۔ دوسری طرف، ناحق سرکشی اور زیادتی۔

۴۔ خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرنا (اس کے قوانین کے ساتھ انسانی قوانین کو واجب الاتباع سمجھنا)۔

اس کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ (سند صرف منزل من اللہ ہو سکتی ہے)

۵۔ اور یہ کہ تم خدا کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہ ہو کہ وہ فی الواقع خدا کی ہیں (خدا کی باتیں

قرآن کریم کے اندر ہیں۔ خارج از قرآن کہیں نہیں)

فواحش کا مفہوم | اس آیت میں ”فواحش“ کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق انڈکس، نیز سابقہ باب میں آیت (۱۵۲)، کی تشریح دیکھئے۔ فواحش کے عام معانی قوبے جیائی کی باتیں

ہیں، لیکن قرآن کریم نے بعض مزموم اور شنیع افعال کو بالتصریح فحش بتایا ہے۔ مثلاً آیت (۴) میں عام بے جیائی کی باتوں کو فحش کہا گیا ہے۔ اور اس سے ملحقہ آیت (۳) میں سحاق کا ذکر ہے۔ اس کے بعد آیت (۴) میں زنا کو فحش کہا گیا ہے (نیز (۱۴) میں)۔ آیت (۵) میں لواطت کے متعلق بھی یہی لفظ آیا ہے۔ سورہ نور کی آیت (۲۴) میں فاحشات کی نشر و اشاعت سے بھی منع کیا گیا ہے۔ قرآن نہایت سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ متشکل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جن امور سے خدا منع کرتا ہے، اُن کا تخریبی اثر افراد تک ہی محدود نہیں رہتا۔ وہ قوموں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ اسی لئے وہ اگلی آیت میں کہتا ہے کہ

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْذِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتُنْفِذُونَ ۝

ہمارا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم صحیح نظام پر کاربند رہتی ہے، اُسے عروج حاصل ہوتا ہے جب وہ اس روش کو چھوڑ دیتی ہے، تو آہستہ آہستہ تنزل کی طرف چل جاتی ہے تا آنکہ وہ وقت آجاتا ہے جب اس کا شمار زندہ قوموں میں رہتا نہیں۔ یہ اس قوم کی میعاد زندگی کہلاتی ہے (۱۳)۔ جب یہ وقت آجاتا ہے تو اس قوم کی تدبیریں اور اسکیمیں اسے ذرا بھی آگے پیچھے نہیں کر سکتیں۔ (۱۵)۔

(ہمارا وہ قانون جس کی طرف اُپر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ فلاح و بقا اُسی نظام کے لئے ہے جس میں تمام نوع انسان کی بہبود اور منفعت پیش نظر ہے۔ (۱۳)

قوموں کے عروج و زوال سے متعلق اصول و قوانین کا ذکر سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر آچکا ہے۔ اس کے لئے انڈکس دیکھئے۔ (جن آیات کا حوالہ انڈکس میں دیا گیا ہے، ان کے علاوہ یہ آیات بھی اس موضوع سے متعلق ہیں) (۹/۱۳۸، ۲۹/۳۸، ۴۲/۸۲، ۴۵/۲۳، ۴۶/۲۴، ۵۹/۲) اور ”استبدال و استخلا“ کے سلسلہ میں، جو اسی موضوع کا دوسرا عنوان ہے۔ (۲/۲، ۲/۹، ۵/۵، ۹/۳۸، ۱۱/۵، ۲۱/۱۱، ۳۸/۵، ۳۸/۳۸، ۴۶/۳۸، ۴۶/۴۶)۔

قوم کی اجل | اجل کا مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۲۵۳ (زیر آیت ۳/۱۳۸) آچکا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اجل کے معنی ”موت کی گھڑی“ نہیں، بلکہ وہ مدت ہے جس میں ایک قوم زندہ رہتی ہے، اور یہ مدت قوانین خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہے۔ اور یہ ہر قوم کے اپنے بس کی بات ہے کہ وہ اپنی زندگی کی مدت متعین کرے۔ جب تک کوئی قوم قوانین خداوندی کا اتباع کرتی رہے گی، زندہ رہے گی جب ان سے سرکشی برتے گی، زوال پذیر اور بالآخر ختم ہو جائے گی۔ لکھلِ اجلِ کتاب (۱۳/۵، ۱۵/۱۵)۔

”برئیت کے لئے قانون مقرر ہے۔“

بہائیوں کی غلط نگہی | لکھلِ اجلِ کتاب سے نگاہ بہائیوں کی غلط نگہی یا کوتاہ فہمی کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں دو وکاذب (مدعیان نبوت پیدا ہوئے۔ ایک

مرزا غلام احمد (قادیانی) اور دوسرا بہاء اللہ (ایرانی)۔ مرزا غلام احمد نے کہا کہ وہ نبی تو ہے، لیکن کوئی کتاب نہیں لایا۔ (انڈکس میں مرزا غلام احمد۔ احمدی۔ کتاب کے عنوانات دیکھئے)۔ اس کے برعکس، بہاء اللہ نے کہا کہ قرآن ایک خاص مدت تک نافذ العمل رہنے کے لئے دیا گیا تھا۔ وہ مدت ختم ہو گئی ہے۔

میں اس کی جگہ ایک نئی کتاب لایا ہوں۔ اور اس کے لئے سند، اس آیت سے پیش کی۔ لکھلِ اجلِ کتاب۔ اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ ہر کتاب کے لئے ایک اجل (میعاد) مقرر ہوتی ہے۔ علاوہ دیگر

امور، خود اس آیت کے الفاظ، اس ترجمہ (یا مفہوم) کی تردید کرتے ہیں۔ آیت کے الفاظ یہ نہیں کہ ”لکھلِ قرآن ہدی ضابطہ خداوندی ہے“ کتابِ اجل یعنی ہر کتاب کے لئے میعاد مقرر ہے بلکہ الفاظ ہیں۔ ”لکھلِ اجلِ کتاب“۔

”ہر میعاد کے لئے قانون مقرر ہے“ قرآن تمام نوع انسان کے لئے ضابطہ ہدایت ہے۔ (۱۵/۴)

دو دیگر آیات)۔ اس لئے جب تک نوع انسان کا ایک فرد بھی کرۂ ارضی پر زندہ رہے گا، قرآن زندہ رہا پائندہ رہے گا۔ اس لئے اس کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی، اور یہ بات بنی آدم سے شروع ہی میں کہہ دی گئی تھی۔

﴿۳۵﴾ یٰبَنیٰ اٰدَمَ اِمَّا یٰتِیْنٰکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقْصُوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیَّ لَا فَمِنْ اَتَقٰی وَاصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

اس کے متعلق ہم نے، انسان کی تمدنی زندگی کی ابتداء ہی میں، بذریعہ وحی کہہ دیا تھا کہ تمہاری طرف ہمارے پیغامبر آئیں گے جو ہمارے قوانین تم تک پہنچائیں گے۔ سو جو لوگ بھی ان قوانین کی نگہداشت کریں گے، اور زندگی اور کائنات کو سنوارنے والے کام کریں گے، اُن کے لئے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۳۳ (زیر آیت ۲۸) آچکی ہے۔ علاوہ ازیں انڈکس میں ”خوف و حزن“ کا عنوان بھی دیکھئے۔ ان کے برعکس؛

﴿۳۶﴾ وَالَّذِیْنَ کَذَبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْہَا اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ۝

ان کے برعکس، جو قوم ان قوانین کو جھٹلائے گی اور ان سے سرکشی برتے گی، وہ تباہ و برباد ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جائے گی۔

تکذیب کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے (دیکھئے انڈکس) ہم نے اُوپر چھوٹے مدعیانِ نبوت کا اشارۃً ذکر کیا ہے۔ ان کے متعلق کہا۔

﴿۳۷﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلٰی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ط اُولٰٓئِکَ یَنَالُہُمْ نَصِیْبُہُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ ط حَتّٰی اِذَا جَآءَتْہُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْا نَہُمْ لَا قَالُوْا اٰیٰنَ مَا کُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط قَالُوْا صَلُّوْا عَلَیْنَا وَشَہِدُوْا عَلٰی اَنْفُسِہُمْ اَنْتُمْ کَاٰنُوْا کٰفِرِیْنَ ۝

یہ ہے وہ اصول جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوں گے۔ اور یہ قوانین ہماری

ظرف سے بذریعہ وحی ملیں گے۔ انسانوں کے خود ساختہ نہیں ہوں گے۔

مفسر علی اللہ | اب یہ سوچو اس سے بڑا مجرم اور کون ہوگا جو اپنے جی سے باتیں گھڑے، اور انہیں قوانینِ خداوندی کہہ کر پیش کر دے۔ (اس طرح وہ نہ معلوم کتنے لوگوں کو تباہ کر دیگا)

دوسری طرف، اس سے زیادہ بد نصیب کون ہوگا جس کے پاس ہمارے صحیح قوانین پہنچیں اور وہ انہیں مجھلا دے۔ ایسے مجرمین کی گرفت یقیناً ہوگی، لیکن ہمارا قانون مہلت ایسا ہے کہ اس کی رو سے اعمال کے نتائج کا ظہور، کچھ وقت کے بعد جا کر ہوتا ہے۔ اس دوران میں مجرمین بھی،

باقی لوگوں کی طرح، قانونِ طبعی کے مطابق، سامانِ زندگی سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہوتی ہے (۳۶)۔

جب ان کی گرفت ہوگی تو ان سے پوچھا جائے گا کہ اب بتاؤ! وہ ہستیاں کہاں ہیں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ کہیں گے وہ تو اب کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ اُسکے بعد، ان کی حالت پکار پکار کر کہے گی کہ قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کرتا ہے۔

قرآن کریم نے محاکاتی انداز میں بتایا ہے کہ جب جہنم میں لیڈر اور ان کے متبعین (عوام) یا مذہبی رہنما اور ان کے معتقدین اکٹھے ہوں گے، تو وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ وہ ان کی وجہ سے جہنم میں باز پرس

عذابِ جہنم میں ماخوذ ہوئے ہیں۔ اس کا اجمالی ذکر مطالب الفقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۹ (زیر آیت ۵/۲۶) کیا گیا ہے۔ اس مقام پر قرآن نے کہا کہ یہ صورت افراد ہی کی نہیں کہ وہ اپنے مفتداؤں اور لیڈروں کی اندھی تقلید سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی بھی یہی حالت ہے۔ جو قوم ترقی یافتہ ہو، کمزور اور پس ماندہ قومیں اُس کی ہر روش کی تقلید کو اپنے لئے مایہ ناز سمجھتی ہیں، اور آخر الامر اسی جہنم میں جا گرتی ہیں، جس میں وہ ترقی یافتہ اقوام گر کر تباہ ہوتی ہیں۔ اگلی آیات میں ان کے مکالمہ کا ذکر ہے:

سے کتابت کی غلطی سے وہاں مکار کو مقالہ، اور مکالمات کو مقالات لکھا گیا ہے۔ قارئین اپنی کتاب میں تصحیح فرمائیں۔

۳۸-۳۹

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا حَتَّىٰ إِذَا دَارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا ۖ قَالَتْ أَخْرِصْهُمْ وَلَاوْلَهُمْ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّونَا ۖ فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۚ قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ ۝ وَقَالَتْ أُولَٰئِهِمْ لِأَخْرَجَهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْهَا مِنْ فَضْلٍ فذُقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۝

ایسی قوموں سے کہا جائے گا کہ اب تم بھی، ان مہذب اور غیر مہذب قوموں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ، جو اس سے پہلے، قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کر کے، تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔

جہنم میں قوموں کا مکالمہ | قوموں کی حالت بھی عجیب ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی تقلید کرتی ہے لیکن، جب، کچھ عرصہ بعد، یہ بھی اسی گڑھے میں جا گرتی ہے جس میں پہلی قوم

گری تھی، تو یہ (بعد میں آنے والی قوم) پہلی قوم کو مطلع کرنے لگ جاتی ہے کہ اُس کی وجہ سے اس کا بھی ایسا حشر ہوا۔ اس طرح قومیں تباہی کے جہنم میں اکٹھی ہوتی رہتی ہیں (تاریخ اقوام اس کی شاہد ہے)۔ بعد میں آنے والی قومیں، ہمیشہ پیش رو قوموں کو مورد الزام قرار دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ، اُسے ہمارے نشوونما دینے والے! ان قوموں نے ہمیں بھی گمراہ کر دیا تھا۔ اس لئے اُنہیں دُگنا عذاب دینا۔ (ایک عذاب، اُن کی

سب کو دُگنا عذاب | اپنی گمراہی کی وجہ سے، اور دوسرا، اس لئے کہ اُنہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا) اُنہیں جواب ملتا ہے، تم سب کو دُگنا ملے گا۔ گمراہ کرنے والوں کو

گمراہ کرنے کی وجہ سے، اور گمراہ ہونے والوں کو اس لئے کہ اُنہوں نے، اپنی غفلت و بصیرت سے کام لینے کی بجائے، اُن کی اندھی تقلید کیوں کی۔ نیز اس لئے بھی کہ یہ بھی تو بعد میں آنے والی قوموں کے لئے گمراہی کا موجب بنی تھیں)

اور پہلی قومیں، بعد میں آنے والی قوموں سے کہتی ہیں کہ، محض اس بنا پر کہ تم نے از خود کوئی غلط نظام وضع نہیں کیا تھا، بلکہ ہمارے قائم کردہ نظام پر چلتی رہی تھیں، تمہیں ہم پر کوئی فوقیت نہیں مل سکتی۔ اس لئے تم اپنے جرائم کی سزا بھگتو۔ یہ کیوں کہتی ہو کہ تمہارے جرائم کی سزا بھی ہم ہی بھگتیں؟

تاریخ انسانیت، اقوام عالم کی انہی کیفیات کی داستان ہے۔ مختلف قوموں کی طرح، ایک قوم میں

یڈروں اور اُن کے متبعین کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ دیکھئے (۳۳-۶۸) ذ (۳۴-۳۳) ذ (۳۵-۳۴) اور (۳۸-۳۷) ذ۔

یہاں جو کہا گیا ہے کہ پسماندہ (مقلد) قوم کہے گی کہ ان کی پیش رو قوم کو دو ہر عذاب دیا جائے، تو یہی بات یڈروں اور عوام کے مکالمہ کے سلسلہ میں کہی گئی ہے۔ (۳۳-۶۸)۔ مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۹ پر ہم نے اُن کی اس استدعا اور خدا کی طرف سے اُس کے جواب کا ذکر کیا ہے۔ انڈکس میں تقلید اور مکافاتِ عمل کے عنوانات دیکھئے اور سوچئے کہ قرآن کریم کس طرح ہر فرد اور ہر قوم کو اس کا مکلف ٹھہراتا ہے کہ وہ وحی کی روشنی میں اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر صیغ اور غلطی میں خود تمیز کرے۔ اُن کا یہ عذر کہ ہم نے فلاں (بزرگ، یڈر یا قوم) کا اتباع کرتے ہوئے غلط راستہ اختیار کیا تھا، قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل و فکر کی روشنی عطا کی ہے، اور سے صاحب اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اگر کوئی فرد یا قوم وحی کی روشنی اور اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتی، اور آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلی جاتی ہے، تو وہ بھی قابلِ مواخذہ ہے۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا انسان کو خود موردِ جہنم بنا دیتا ہے (۳۹-۶۸)۔ انہیں دو ہر عذاب اس بنا پر ہے کہ ایک تو وہ غلط راستے پر چلے اور دوسرے انہوں نے اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیا۔ اُن کا انجام کیا ہوتا ہے، فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تَفْتَحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝ لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝

حقیقت یہ ہے کہ جو قوم بھی قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرے گی اور ان سے سرکشی برتنے گی (خواہ وہ از خود ایسا کرے، یا دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی، یہ روش اختیار کر لے)، وہ کبھی زندگی کی ان خوشگوار یوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گی جو خدا کے متعین کردہ آسمانی نظام کے اتباع کا فطری نتیجہ ہیں (۳۹-۶۸)۔ ان کا معاشرہ کبھی جنتی معاشرہ نہیں بن سکے گا۔ یہ ایسا ہی ناممکن ہے جیسا (معاورہ کے الفاظ میں) کسی موٹے رتہ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا۔ مجرمین کی غلط روش کے نتائج ایسے ہی ہوتے ہیں۔ (۴۰) ایسی قوموں کا اوڑھنا بچھونا، جہنم کا عذاب ہوتا ہے۔ ظلم و سرکشی کا نتیجہ ہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ (۴۱)

تکذیب و تکذیب

یہاں تکذیب آیات اور استکبار، دو جرائم بتائے گئے ہیں۔ استکبار تو کھلے بندو
اقدارِ خداوندی سے انکار کر کے، علی الرغم ان کے خلاف نظام قائم کرنا ہے۔ جیسے
اقوامِ مغرب کی سیکولرزم تکذیب یہ ہے کہ زبان سے ان اقدار کی صداقت کا اعتراف کیا جائے، اور عملاً
اُن کی خلاف ورزی کی جائے جیسے ہمارے ہاں کی سیکولرزم۔ (اس کی تشریح، مطالب الفرقان جلد دوم
صفحہ ۱۳۶ اور جلد سوم صفحہ ۳۳۴ پر کی جا چکی ہے)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ اُن کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ ”اسی سورۃ میں ذرا آگے
چل کر کہا گیا ہے، وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ
وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ“ (۷۶)۔

”اگر یہ بتیوں والے ایمان و تقویٰ کا شعار اختیار کرتے تو ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے
کھل جاتے۔ لیکن انہوں نے قوانینِ خداوندی کی تکذیب کی، تو اپنے غلط اعمال کی پاداش میں پکڑے گئے۔“
مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۳۹ پر آیت (۷۶) کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ زمینی دروازوں کا
کھل جانا، رزق کی فراوانی ہے، اور آسمانی دروازوں کے
کھل جانے سے مراد ہے ہدایتِ خداوندی کا مل جانا،

زمین اور آسمان کے دروازے

سابقہ جلدوں میں ”معاشی نظام“ کا عنوان دیکھئے۔ زمین و آسمان کے ربطِ باہمی کا نام اسلام ہے۔ یعنی ارضی
معاملات (انسانی زندگی) کو وحیِ خداوندی کے تابع رکھنا۔ اقبالؒ اسے ”عشق اور زیر کی کا آمیزہ“ کہہ کر
پکارتا ہے۔ جاوید نامہ میں ہے :

غریباں را زیر کی راز جیات شرقیاں را عشق راز کائنات
خیز و نقشِ عالم دیگر بند عشق را بازیر کی آمیزہ (صفحہ ۷۱)

ان کے برعکس :

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

جو قوم ہمارے قوانین کی صداقت کو تسلیم کرے گی اور ہمارے مقرر کردہ صلاحیت بخش پروگرام

پر عمل پیرا ہوگی، تو ان کا معاشرہ، جتنی معاشرہ ہوگا ————— اس دنیا میں کبھی اور آخرت میں بھی —————

غِلّ کے معنی

اَلْغِلُّ - دل میں چھپی ہوئی دشمنی کو کہتے ہیں۔ اس مادہ میں چھپا کر رکھنے کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اس مقام پر جس مفہوم کے لئے یہ لفظ آیا ہے، اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اُس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی۔

جنتی زندگی

غِلّ کے بنیادی معنی اسی قسم کی گرہ سمجھ لیجئے۔ اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو ہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے۔ یہ ہے مفہوم غِلّ سے جنتی معاشرہ کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غِلّ نہیں ہوگا۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے گا یہ گرہیں کھول دی جائیں گی۔ اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

وَسَرَعْنَا صَافِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (۱۵)

اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ ”وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے“ لیکن لفظ سُرُر کا مادہ (س۔ر۔ر) ہے، جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (FACE) (TO FACE) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔

يَلْقَوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا (۲۵)

”وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے“ یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہوگا۔ اس کے برعکس جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا مَرَحًا بَيْنَهُمْ (۳۸) ”وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے (بظاہر نہایت خندہ پیشانی سے) پیش آتے ہیں، لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے دل کر کبھی خوش نہیں ہوتے، اس لئے کہ اُن کے دلوں میں غِلّ بھرا ہوتا ہے“

انتزاع غِلّ

اس غِلّ کے نکالنے میں ایک اور بھی عین نکتہ مضمرب ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غِلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ۔ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیر کر یا کھینچ کر نکالنا۔ جیسے پھانس نکال دی جائے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔

ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض سمجھ کر ان کے طبیوں علاج سوچے گئے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرینِ علم النفس

(PSYCHOLOGISTS) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں۔ انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز گہرہ گیر ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز، پھانس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی، لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی۔ اب ان، تحت الشعور میں پیوست، پھانسوں کا علاج تجزیہ نفس کی رو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح ”کھینچ کر“ باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریق علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کئی اعتماد ہونا چاہئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال دیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آئیے قرآن کریم کی اس آیت جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غَلٍٍّ (۳۴)۔ ”ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائیگا“ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جتنی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جا گزیر ہر مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی انکے شرح صدر کی۔

دوسری بات (۳۵) میں یہ کہی گئی ہے کہ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا هُدَانَا اللَّهُ (۳۵)۔ ”اگر ہمیں خدا کی طرف راہنمائی نہ ملتی تو ہم اس مقام تک کبھی نہ پہنچ سکتے“ اس سے واضح ہے کہ ہدایت راہنمائی صرف وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ملے، اور جواب اُس کی کتاب قرآن مجید میں محفوظ ہے۔

اور تیسری بات یہ کہ تِلْكَمُ الْجَنَّةُ أَوْ رِثْمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ ”یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں، تمہارے اعمال کے نتائج میں مالک بنایا گیا ہے“ یعنی جنت صرف انسان کے اپنے اعمال کے بدلے میں مل سکتی ہے۔ اس اعلان خداوندی نے، سفارشوں اور شفاعتوں کے تمام غیر قرآنی معتقدات کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں

خداوندی سے سرکشی اختیار کرے گی، وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جائے گی۔ سو وہ ہو کر رہا۔
یعنی وہ قوم جو خدا کی طرف لے جانے والی راہ — خدا کے نظام ربوبیت کے راستے —
میں روک بن کر کھڑی ہوگی اور انسانیت کو اس کی طرف آنے نہیں دے گی — اور ایسے سیدھی راہ
میں پیچ و خم پیدا کرے گی۔ یہ لوگ حقیقت نہ خدا کے قانون مکافات پر ایمان رکھتے تھے، اور نہ ہی انہیں
حیاتِ اخروی پر یقین تھا۔



دونوں کے درمیان پردہ | اگلی آیت میں کہا ہے: **بَيْنَهُمَا حِجَابٌ**۔ ان دونوں کے
درمیان ایک حجاب (پردہ) ہوگا۔ سورہ بنی اسرائیل میں اسے
حِجَابًا مَّسْتُورًا کہا گیا ہے (۱۴۱)۔ یعنی وہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوگا، اسے دیکھا نہیں جاسکے گا
اس پردے کا تجربہ تو ہم یہاں ہر روز کرتے ہیں۔

جیوانات میں آپ دیکھئے۔ کسی ایک نوع کی شکل و صورت دوسری نوع سے نہیں ملتی۔ اس لئے وہ
ایک دوسرے سے دھوکا نہیں کھاتے۔ بکری کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ جو سامنے سے آرہا ہے، ہرن ہے،
اس لئے وہ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ اور وہ بھڑپا ہے جو مجھے کھا جائے گا۔ لیکن نوع انسان کی صورت یہ
ہے کہ اس میں ہر فرد، انسانی شکل لئے ہوتا ہے، اس لئے ہم انسانی ہرن اور بھڑپا میں تمیز نہیں کر سکتے،
اور ہر شاطر اور چالاک ”دندہ انسان“ سے مار کھاتے ہیں۔ اس طرح انسان اور انسان کے درمیان ایک ”حجاب
مستور“ ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ لیکن ایسا کچھ جہنی معاشرہ میں ہوتا ہے۔ جہنی معاشرہ میں ایسا کوئی حجاب
نہیں ہوگا (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان کے سینے سے غل نکال دیا جاتا ہے، جن سے ان کا ظاہر و
باطن یکساں ہو جاتا ہے۔ کیا اطمینان بخش ہوگا وہ معاشرہ جس میں بھڑپا اور ہرن دُور سے پہچانے جائیں،
اور کوئی کسی سے دھوکا نہ کھائے۔ وہاں مجرم، شریف انسانوں سے الگ کھڑے ہوں گے (۳۶/۵۹)۔
مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے (۴۴/۵۹)۔

ان (اہل جہنم، ظالمین) میں دونوں گروہ شامل ہیں۔ ایک وہ جو کھلے بندوں لوگوں کو خدا کی طرف
لے جانے والے راستے سے روکتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اس راہ میں پیچ و خم پیدا
کر دیتے ہیں۔ راستہ بظاہر وہی ہوتا ہے، لیکن وہ صراطِ مستقیم نہیں ہوتا۔

اس میں ہزار بیچ و خم ہوتے ہیں جو راہ رو کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ، غیر مسلموں کا ہے اور دوسرا گروہ مذہبی پیشواؤں کا جو کہ اول الذکر سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ وہ بھیڑیا ہوتا ہے تو بھیڑیے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ بھیڑیا، بکری کی کھال اوڑھے ہوتا ہے۔

ضمناً۔ اَلْعَوَجُ (ع کے زیر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے نظر آجائے اور اَلْعَوَجُ (عین کے زیر کے ساتھ) اس ٹیڑھ پن کو جو آنکھوں سے دیکھا نہ جاسکے، عقل و بصیرت کی رو ہی سے نظر آسکے۔ قرآن کریم نے عَوَجَا کہا ہے (عین کے زیر کے ساتھ)۔ اس سے واضح ہے کہ مذہبی پیشوائیت، اَلْعَوَجُ اور اَلْعَوَجُ میں فرق | دین کے راستے میں کس قسم کا بیچ و خم پیدا کرتی ہے۔ ہم اسی بیچ و خم میں الجھائے ہوئے راہرو راہ جات ہیں۔

سورہ حدید میں منافقین اور اہل ایمان کے درمیان حائل شدہ دیوار کا ذکر ہے جس کے باطن میں رحمت ہے اور ظاہر میں عذاب (۵۷-۱۳۳)۔ (اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ اس کے بعد ہے:

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيْمَتِهِمْ وَنَادُوا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلِّمُوا عَلَيْهِمْ فَكُلَّمَا دَخَلُوا مِنْهَا قَالُوا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمٍ يَخْرُجُونَ فِي سُبُطٍ مُّطَهَّرَةٍ تَأْتِيهِمْ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْمُومَةٌ وَوِجَاهٌ يَّسْتَوُونَ ۝

جنت اور دوزخ کی زندگی کا فرق تو اس قدر نمایاں ہے، لیکن کفر اور ایمان کے درمیان ایک ادھ سی ہی ہوتی ہے ورنہ نگاہ میں تبدیلی ہو جائے تو انسان ادھر سے ادھر چلا جاتا ہے (۵۷-۱۳۳)؛ (۱۴-۱۳۵)۔ جنتی معاشرہ کے ارباب نظم و نسق جو اپنے کردار اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے بلند مقامات پر ہوں گے (۲-۱۳۳؛ ۲-۱۳۴؛ ۲-۱۳۵)۔ مختلف لوگوں کے انداز و رجحان سے جانچ لیں گے کہ ان کا رخ کس سمت کو ہے۔ وہ ان لوگوں سے، جو ہنوز اس معاشرہ میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن جو اس کی آرزو دل میں رکھتے ہوں گے، آگے بڑھ کر کہیں گے کہ (تمہیں انتظار کس بات کا ہے!) آگے بڑھو اور اس معاشرہ میں داخل ہو جاؤ تاکہ تمہیں بھی ہر طرح کی سلامتی حاصل ہو جائے۔

اہل اعراف | حجاب کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس آیت میں تشریح طلب مقام اہل اعراف کا ہے۔ عرف (معرفت) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر سے اس کا ادراک کر لینا۔ یہ ارباب علم و بصیرت کی اہم خصوصیت ہے کہ خارے دید و احوال چمن گفت،

اسی اعتبار سے یہ لفظ رفعت و بلندی کے لئے بھی آتا ہے۔

ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کے بین بین ایک مقام ہوگا، جس میں وہ لوگ ہونگے جن کی قسمت کا ہنوز فیصلہ نہیں ہوا ہوگا۔ کہ انہیں جنت میں بھیجا جائے گا یا دوزخ میں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہونگے جن کے مقدمہ کا فیصلہ التوا میں رکھا جائے گا اور اس کا انہیں انتظار ہوگا۔

لیکن یہ مفہوم درست نہیں۔ قرآن کریم نے دو ہی گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ فَرِیقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیقٌ فِی السَّعِیرِ (۲/۲۲)۔ ”ایک گروہ جنت میں، اور ایک جہنم میں“ اس میں کسی تیسرے گروہ کا ذکر نہیں ہے۔ ابھی، قانونِ مکافات کی رُو سے یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ عدالتِ خداوندی کسی کا سختی فیصلہ نہ کر سکے، اور اسے انتظار (SUSPENSION) میں رکھے۔

اس لفظ کے جو معانی اوپر بتائے گئے ہیں، ان کی رُو سے تو یہ لوگ اہل جنت میں بھی بلند اور ممتاز مقام کے حامل نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الواقعہ میں ان کے متعلق کہا گیا ہے: وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۝ اُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ۚ فِی جَنَّتِ النَّعِیمِ (۱۲-۱۳)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اُخروی زندگی کی کیفیات کو ہم اپنی موجودہ زندگی کی سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ انہیں مثالوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ اس اعتبار سے (کم از کم) میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اہل اعراف سے کون لوگ مراد ہیں۔ البتہ جہاں تک اس دُنیا کی حقیقی زندگی (قرآنی معاشرہ) کا تعلق ہیں، بات واضح ہے۔ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو، باقی نوعِ انسان کے مقابلے میں، بڑا بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ اُنہیں شہداءِ اَعْلٰی النَّاسِ (۲/۱۳۹) کہہ کر پکارا ہے، اور رسول اللہؐ کو تمام اقوامِ عالم کے نمائندوں پر نگران (۱۳۹) تفصیل کے لئے مطالب القرآن جلد سوم صفحہ ۹۰ آیت (۲/۱۳۹) اور جلد چہارم صفحہ ۳۲۳ دیکھیے۔ یہ کہ اہل اعراف سے مراد ”اُمّتِ محمدیہ کے اربابِ علم و بصیرت ہیں“ اس سے بھی واضح ہے، جو اُنکے متعلق کہا گیا ہے کہ یَعْرِضُونَ کُلًّا لِّیَسِیْرُہُمْ (۲/۱۳۹)۔ ”وہ سب کو اُن کے آثار و کوائف سے پہچانیں گے“ میں نے انہی معانی کی رُو سے آیات (۲/۱۳۹-۱۴۰) کا مفہوم متعین کیا ہے۔ اس لیے ان کے صریح مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ اِذَا صُورَتْ اَبْصَارُہُمْ تَلْقَآءُ اَصْحٰبِ النَّارِ لَا قَالُوْا سَرَبْنَا
لَا تَجْعَلُنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ ۝

یہ لوگ (جو ہنوز انتظار میں تھے) جب اُن لوگوں کی حالت پر نظر ڈالیں گے جو جہنمی معاشرہ میں گرفتار ہونگے تو وہ (فوری فیصلہ کریں گے اور) پکاراٹھیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم ان لوگوں کے ساتھی نہیں بننا چاہتے جنہوں نے تیرے قوانین سے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

اس کے بعد ہے:

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رَجُلًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ
قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُم جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تُتَكَبَّرُونَ
أَهُؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ أَدْخُلُوا
الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ۝

پھر وہ اربابِ نظم و نسق (اعراف، والے) دوسری روش کے حامل لوگوں سے کہیں گے، جنہیں وہ ان کے انداز و رجحان سے پہچان لیں گے، کہ دیکھو! تمہاری سرمایہ داری تمہارے کسی کام نہ آسکی، نہ ہی دو وقت و اقتدار جس کی بنا پر تم قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتا کرتے تھے۔

(وہ جنت میں جانے والوں کی طرف اشارہ کر کے، ان جہنم والوں سے کہیں گے کہ) کیا یہ وہی لوگ نہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ انہیں کبھی خدا کی رحمت نصیب نہیں ہو سکے گی۔ دیکھو! آج انہی لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم پر جنت کے دروازے کھلے ہیں، تمہیں اس میں نہ کسی کا خوف ہو گا نہ حزن۔

اہل جنت اور اہل جہنم کے مکالمات کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی میں ایک اور اضافہ ہے:

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ
أَوْ مِمَّا سَرَقْتُمْ لَللَّهِ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ مِمَّا عَلَى الْكُفْرَيْنِ ۝

اور جہنمی معاشرہ والے، جتنی معاشرہ والوں سے کہیں گے کہ یا تو ان زندگی بخش ذرائع نشوونما میں سے، جو تمہیں میسر ہیں، ہمیں بھی دے دو تاکہ ہماری کھیتیاں بھی میسراب ہو جائیں۔ یا جو سامان زیست تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے اُس میں سے تھوڑا سا ہمیں عطا کر دو (۵۷) وہ کہیں گے کہ یہ چیزیں تو قوانینِ خداوندی پر ایمان لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا فطری نتیجہ ہیں۔ انہیں ان کی طرف منتقل کیا ہی نہیں جاسکتا جو ان قوانین سے انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہوں۔ (جو اپنی آنکھیں بند کر رکھے، اُسے دوسرے کی بینائی کچھ فائدہ

نہیں دے سکتی نہ ہی کوئی شخص اپنی بصارت دوسرے کی طرف منتقل کر سکتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں:

الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْ لَهُمُ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا ۖ فَالْيَوْمَ نَنسِفُهُمْ كَمَا نَسَوْا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَذَا ۖ وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ۝

۵۱

یہ لوگ (جو ان نعمائے خداوندی سے یوں محروم رہ گئے ہیں) وہ ہیں جنہیں طبعی زندگی کی نگاہ فریب جاذبیتوں نے ایسا دھوکا دیا کہ انہوں نے اس حقیقت پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا کہ نظریہ حیات

اپنے دین سے مذاق کرنے والے | اور اس نظام کو، جس کے مطابق انسان زندگی بسر کرتا ہے، کس قدر اہمیت حاصل ہے (بجۃ) انہوں نے

یہ سوچا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کا مُنتہی یہی دنیوی زندگی نہیں جو موت کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ سو یہ لوگ، بلند انسانی زندگی کے شرف و اعزاز سے اسی طرح محروم رہ جائیں گے جس طرح یہ اُس زندگی کے وجود سے مُنکرت تھے، اور ہمارے قوانین سے، محض خدا و تعصب کی بنا پر، انکار کیا کرتے تھے۔

اپنے یا دوسرے کے دین کا مذاق اُڑانے والوں کے متعلق تفصیلی طور پر مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۳۲ آیات (۵۸-۵۷)، نیز سابقہ باب میں زیر آیات (۶۸-۶۷) دیکھئے۔

سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ کسی قوم کی تباہی سے پہلے دو شرائط پوری کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ قوم عقل و بصیرت کی رو سے بات سمجھنے کے قابل ہو، اور دوسری یہ کہ اس تک صحیح بات (قوانین خداوندی) پہنچ چکی ہو۔ یہاں اُن اہل جہنم سے ہی کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عَلَيْهِمْ هُدًى وَرَحْمَةً ۖ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۖ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ الَّذِينَ نُسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ فَهَلْ لَنَا مِنْ شَفْعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا ۚ أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلْ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۖ قَدْ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

۵۲-۵۳

ان تک ہدایت پہنچ چکی تھی | (اے رسول! ان مخاطبین سے کہہ دو کہ) ہم نے انہیں ایک ایسا

ضابطہ عیادت دیا ہے جو ہر بات کو، علم و حقیقت کی بنیادوں پر، کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقت پر یقین رکھیں، سامان ہدایت و رحمت اپنے اندر رکھتا ہے۔

یہ لوگ (جو اس قدر واضح حقائق پر بھی ایمان نہیں لاتے) کیا اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی غلط روش زندگی کے جس تباہ کن انجام کی انہیں خبر دی جا رہی ہے، وہ ان کے سامنے آجائے (تو پھر اس پر ایمان لائیں؟) — (۱۱۳)

ان سے کہہ دو کہ جب غلط روش کا انجام سامنے آکھڑا ہوگا، تو وہ لوگ جنہوں نے اُسے آج یوں فراموش کر رکھا ہے، پکار اٹھیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نشوونما دینے والے کی طرف سے، جو پیغامبر آئے تھے وہ واقعی حق پر تھے۔ اُس وقت وہ تلاش کریں گے اور کہیں گے کہ کوئی سفارشی ایسا مل جائے جو ہمیں اس عذاب سے چھڑا دے۔ یا ہم پیچھے لوٹا دیئے جائیں تو ہم جو کچھ (غلط) کام کیا کرتے تھے، اُن کے برعکس کام کر کے دکھا دیں۔ لیکن اُس وقت یہ باتیں قطعاً فائدہ نہیں دیں گی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر لیا اور اُن کا ساختہ پر داختہ اُن کے کسی کام نہ آیا۔

یہاں پہلی بات تو قرآن کریم کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ نہایت واضح کتاب ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں۔ دوسری بات یہ کہ انہیں کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ملے گا۔ (انڈکس میں شفاعت کا عنوان دیکھیے)۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ کہیں گے کہ ہمیں دنیاوی زندگی کی طرف لوٹا دیا جائے تاکہ ہم اچھے کام کر سکیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رُوسے مرنے کے بعد پھر کسی کو اس دُنیا کی طرف لوٹایا نہیں جائے گا۔ (مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۱۳۴۔ آیت (۱۶۴)۔ نیز نظریۂ تاسخ کے ابطال کے لئے جلد اول صفحہ ۴۴ آیت (۱۵۰)۔)

اس امر کی شہادت اور ثبوت کے لئے کہ قانونِ خداوندی کی کار فرمائی میں کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ (سفارش یا شفاعت سے یہی مراد ہوتی ہے)۔ قرآن نے حسبِ معمول، خارجی کائنات کے نظام کو پیش کر دیا۔ فرمایا:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ تَفْ يَغْشَى الْيَلَّ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالتَّجُومُ مَسَحَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ إِلَّا لَهُ
الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝

نظامِ فطرت

ان سے کہہ دو کہ تمہارا نشو و نما دینے والا وہ خدا ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مراحل میں پیدا کیا اور اس کے بعد، اس کا مرکزی کنٹرول خود اپنے دستِ قدرت میں رکھا۔ (۱)۔ اُس کے قانون کے مطابق آسمانی گزے اس طرح گردش کرتے ہیں کہ رات کی تاریکیاں دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہیں اور پھر (یوں نظر آتا ہے جیسے) دن، رات کے پیچھے لپکے چلا آ رہا ہے، اور سورج اور چاند اور ستارے، سب اُس کے قانون کے مطابق اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو! یہ عالم محسوسات، اور اس کے ماوراء وہ عالم، جہاں سے اس کائنات کی تدابیر امور ہوتی ہے۔ سب خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں مصروف کار ہیں۔

کس قدر بابرکت ہے وہ ذات جس نے کائنات کی نشو و نما کیلئے ایسا مجر العنقول انتظام کر رکھا ہے!

اس میں جو الفاظ، یا اصطلاحات آئی ہیں، ان کے معانی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ "عالمِ امر و خلق" کے متعلق دیکھئے مطالب الفرقان جلد اول (صفحہ ۲۷۲؛ صفحہ ۲۸۳)۔ تخلیق ارض و سموات کے لئے جلد اول (صفحہ ۳۵۲) ایام (واحد یوم) کے لئے جلد اول (صفحہ ۲۹) عرش کے لئے، جلد دوم (صفحہ ۶۷) اور جلد چہارم (آیت ۳/صفحہ ۲۱)۔ مبارک کا مفہوم سابقہ صفحات میں زیر آیات (۹۳)؛ (۱۵۶) بیان ہو چکا ہے۔

کائنات کا تخلیقی آغاز کیسے ہوا۔ چھ ایام (STAGES) سے کیا مراد ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر نکات، جو قرآن کریم کے متعدد مقامات میں پھیلے ہوئے ہیں، کا تعلق علومِ سائنس سے ہے اور ان کی تشریح بڑی ادق اور تکنیکل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات کے متعلق میری معلومات مطالعاتی ہیں، براہِ راست میری اپنی تحقیق کا نتیجہ نہیں، کیونکہ یہ میرا میدان نہیں۔ میں نے اپنی مطالعاتی معلومات کو اپنی "تالیف" انسانِ سائنس کے انکشافات اور قرآنی آیات پر مشتمل ہے۔ جس چیز کا تعلق قرآن کے طالبِ علم

بلکہ ایک مسلمان سے ہے، وہ سائنٹفک معلومات نہیں۔ وہ یہ اہم نکتہ ہے کہ قرآن نے خارجی کائنات کے متعلق جو کچھ کہا ہے، سائنس کے انکشافات اس کی تائید کرتے ہیں یا اس کے خلاف جاتے ہیں۔ ہمارے حلقہٴ احباب میں سے ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے، قرآن کریم کی بیشتر (متعلقہ) آیات کے متعلق ثابت کیا ہے کہ عصر حاضر کے سائنٹفک انکشافات کس طرح ان کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن غیر مسلم سائنسدانوں میں سے جس محقق کا نام سرفہرست آتا ہے، وہ پیرس کے ایک نامور ڈاکٹر (سرجن) (MAURICE BUCCAILLE) ہیں جن کی کتاب کا نام ہے (THE BIBLE, THE QURAN AND SCIENCE)۔ ہمارے پیش نظر

ڈاکٹر مارسل بکائے | موضوع کے سلسلہ میں تو اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ اُس نے قرآن کریم کی متعدد آیات کے متعلق ثابت کیا ہے کہ سائنس کی تحقیقات کس طرح ان کی تائید کرتی ہیں،

لیکن میں اس کا ذرا تفصیلی تعارف مناسب سمجھتا ہوں۔ میں ایسا کیوں سمجھتا ہوں، اس کی وجہ آپ کو اس کے تعارف سے سمجھ میں آجائے گی۔ اُس نے لکھا ہے کہ ”میں نے اس نگاہ سے بائبل کا گہرا مطالعہ کیا کہ اس میں مظاہر فطرت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سائنس کے انکشافات کے مطابق ہے یا اُس کے خلاف، یہ دیکھ کر مجھے بڑی مبہوسی ہوئی کہ اس میں جو کچھ اس باب میں کہا گیا ہے، جہالت اور توہم پرستی پر مبنی ہے۔ اس سے لامحالہ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر، (جیسا کہ ہم سے منوایا جاتا ہے) یہ خدا کی کتاب ہے، تو پھر وہ خدا (معاذ اللہ) بڑا ہی جاہل ہے۔ اور اگر خدا عظیم و بصیر ہے تو پھر یہ کتاب خدا کی نہیں ہو سکتی۔ زمانہ قبل از تہذیب کے انسانوں کی پریشاں خیالیوں کا مجموعہ کہلا سکتی ہے۔

اس کے بعد اُس نے کہا ہے کہ ”میں نے سوچا کہ یہودیت اور عیسائیت کے بعد دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب اسلام بھی ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ جس کتاب کو اس مذہب کے پیرو منزول من اللہ کہتے ہیں، اس باب میں اس کی کیا کیفیت ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ ”میں اسلام کا معتقد نہیں“۔ میں نے ایک سائنسدان

۱۔ ان کی کتاب کا نام ہے (PHENOMENA OF NATURE AND QURAN)۔ ان سطور کی

تحریر کے وقت ان کی دوسری کتاب زیر طبع ہے۔

۲۔ اسے (AMERICAN TRUST PUBLICATIONS, INDIANAPOLIS, U.S.A.) نے شائع کیا ہے۔

کی حیثیت سے خالصتہً علمی نکتہ نگاہ سے اس کتاب کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ بھی علوم سائنس کی حد تک۔ سائنس میں بھی نیکس نے اُن مسائل کو نہیں یا جو ہنوز نظریات میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف اُن انکشافات کو یا جو حقائق (FACTS) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اُس نے کہا ہے کہ ”میں عربی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس لئے لامحالہ مجھے قرآن کے تراجم کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ جہاں تک اہم حقائق کا تعلق ہے کوئی ایک ترجمہ دوسرے سے نہیں ملتا اور جہاں تک سائنس کے انکشافات کا تعلق ہے، تفائیر بیشتر طب و یا بس کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر ریسرچ کا شوق ہے تو پھر اس کتاب کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ عربی سیکھی جائے، اور عربی بھی جدید نہیں، بلکہ وہ قدیم عربی جس میں قرآن نازل ہوا تھا“

آگے بڑھنے سے پیشتر آپ سوچئے کہ اس شخص کی نگاہ کتنی دوز تک پہنچی اور اُس نے کس طرح اس حقیقت کو پا لیا کہ قرآن مجید محاورہ عرب کی رومی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ عربی سیکھنے کے لئے خود عرب پہنچا۔ اُس نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں اُس کی شاہ فیصل (مرحوم) سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

قرآن غیر محرف صحیفہ ہے | عربی زبان پر اس قدر دسترس حاصل کرنے کے بعد اُس نے سوچا کہ اُسے اس کا بھی اطمینان حاصل کرنا چاہیئے کہ جو کتاب آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بعینہ وہی ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے اپنی امت کو دیا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب کا ایک پورا باب اس تحقیق کی نظر کیا ہے اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ کتاب بالکل غیر محرف ہے اور بلا شائبہ تشکیک اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود۔ اس تحقیق کے دوران وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ یہ خدا کی کتاب ہے، اس لئے نہ اس کتاب کو محمدؐ کی کتاب کہنا چاہیئے، نہ اسلام کو محمدؐ کا دین۔

اُس نے لکھا ہے کہ ”یہ مغربی مستشرقین کی سازش تھی جو انہوں نے مسلمانوں کو (MOHAMMADANS) اور اسلام کو (MOHAMMADANISM) کہنا شروع کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ خود مسلمان بھی اس فریب میں آگئے محمدؐ نے کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ اسلام اُن کا وضع کردہ دین ہے“

اس کے بعد اُس نے لکھا ہے کہ ”میں نے سائنس کے ان ثابت شدہ حقائق کو یا جن کا تعلق تخلیق کائنات، ہولکات، ارضیات، نباتات، حیاتیات اور خود انسانی تخلیق اور جنس کی پیدائش سے ہے، اور ان موضوعات کے متعلق قرآن کی

ورق گردانی شروع کی۔ میں نے دیکھا کہ قرآن کا یہ انداز نہیں کہ وہ ایک موضوع پر، ایک ہی مقام پر، سب کچھ کہہ دے۔
تبویب القرآن | وہ اس کے متعلق مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوا کہ میرے پیش نظر موضوعات کے متعلق قرآن میں جہاں جہاں کچھ آیا ہے اسے الگ مدون کیا جائے۔ چنانچہ اس طرح اُس نے قرآن کے ان حصوں کی تبویب کی۔

آپ نے غور فرمایا کہ محاورہ عرب کے بعد یہ وہ دوسرا بنیادی طریق ہے جسے قرآن کریم نے قرآن فہمی کیلئے خود تجویز کیا ہے اور جس پر میں پچاس سال سے کار بند چلا آ رہا ہوں۔ یہ ریسرچ سکالر آج تک مجھ سے نہیں ملا اور جہاں تک میرا خیال ہے، میری کوئی کتاب بھی اس کی نظر سے نہیں گزری ہوگی۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس نے قرآن فہمی کا یہ انداز مجھ سے مستعار لیا ہے۔ یہ انداز خود قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اور جو شخص بھی آدوانہ قرآن پر غور کرے گا، اُس کے سامنے یہ طریق خود بخود آجائے گا۔

اس کوہ کنی کے بعد وہ قرآنی سرچشمہ سے جوئے شیر لانے کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ وہ سائنس کی کسی ایک ثابت شدہ حقیقت کو لے کر اس سے متعلقہ آیات کو سامنے رکھتا ہے اور پھر آیت کے الفاظ کے معانی بنیادی عربی زبان کی رو سے متعین کرتا اور ثابت کرتا ہے کہ ان معانی کی رو سے قرآن میں پیش کردہ حقیقت کس طرح سائنس کے انکشافات کے عین مطابق ہے۔ وہ ایسے مقامات پر یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے قدیم مفسرین تو معذور تھے کہ وہ قرآن کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے کیونکہ ان کے زمانے میں علم انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، لیکن مجھے افسوس آتا ہے دور جدید کے مترجمین اور مفسرین پر کہ وہ بھی آنکھیں بند کئے اُسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ وہ موجودہ دور کے تراجم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

قرآن کے ترجموں کی کیفیت | ان تراجم میں اس قسم کی فاش غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ قدیم زمانہ کے مفسرین نے جو کچھ کہہ دیا

یہ لوگ بلا تحقیق اسی کو سند تسلیم کئے چلے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق تو یہ عذر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک لفظ کے متعدد مفاہیم میں سے، اُس خاص مفہوم کا انتخاب نہیں کر سکتے تھے جو قرآن میں بیان کردہ سائنٹفک حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اب سائنس کے انکشافات نے اس مسئلے کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ لہذا اب ضرورت ہے کہ انسانی علوم کی روشنی میں ان تراجم اور تفاسیر پر نظر روشانی کی جائے۔ (صفحہ ۱۱۸)

وہ ایک ایک کو دیتا ہے۔ اس طریق سے اُس کا مفہوم متعین کرتا ہے۔ اس کے بعد بتاتا ہے کہ سائنس کے جدید ترین انکشافات کس طرح اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد وجد و کیفیت کے عالم میں مضمون کو کہتا ہے کہ اُسے دُنیا کے دانشور و اُخدار مجھے بناؤ کہ کیا آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی فکر کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی حقیقت بیان کر سکتا ہے ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اُس زمانے میں کوئی انسان یہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا نہ کہہ سکتا۔ اس حقیقت کے بعد ہمارے لئے یہ تسلیم کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے کہ اس علم کا سرچشمہ ماوراء عقل انسانی ہے؟ وہ ایک مقام پر بائبل اور قرآن کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

قرآن انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتا | ان موضوعات کے متعلق جہاں بائبل میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں، قرآن میں مجھے اس قسم کی

کوئی ایک غلطی بھی نہیں ملی۔ ایسے مقامات پر کھڑے ہو کر مجھے سوچنا اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑا کہ اگر قرآن کا مصنف کوئی انسان تھا تو اس کے لئے کیسے ممکن تھا کہ وہ سائنس کے ان حقائق کو ساتویں صدی عیسوی میں پیش کر سکتا جن کا انکشاف اس دور میں آکر ہوا ہے۔ جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلا شک و شبہ وہی ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے دُنیا کو دیا تھا۔ لہذا اس میں بعد کے کسی رد و بدل، اضافہ یا آمیزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا عقل انسانی اس کی کوئی توجیہ پیش کر سکتی ہے کہ اُس زمانے میں ایک انسان نے یہ کچھ کیسے معلوم کر لیا؟ میں تو اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا..... (صفحہ ۱۲۰)

اس سے ذرا آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے وہ لامحالہ انسان کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک انسان، متنوع حقائق کا ثبات کے متعلق، جو اُس زمانے میں انسانوں کے سامنے آئے ہی نہیں تھے، ایسی باتیں کہہ دے جو چودہ سو سال کے بعد کہیں جا کر بے نقاب ہوئی ہوں۔ بنا بریں میں تو قرآن کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہو سکتا ہے۔ (صفحہ ۱۲۵)

ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ:

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو اُن کے زمانے سے آگے تھیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ اُن کے ہاں رطب و یابس کا ملغوبہ ہے۔ جہاں

ایک بات صحیح ملتی ہے تو ننانوے باتیں اُس دور کی ادھام پرستی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کی یہ حالت نہیں۔ اس میں بے شمار ایسے حقائق کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق عصر حاضر کے علوم سے ہے، لیکن ان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی تردید دورِ حاضرہ کے سائنٹیفک انکشافات نے کی ہو۔ یہ ہے فرق انسانی مفکرین کی دورنگی اور قرآن کے تبیانِ حقیقت میں!..... (صفحہ ۱۶۳)۔

اس سے بھی واضح ہے کہ قرآن کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا نابغہ کیوں نہ ہو۔ اس سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ میں نے اس کتاب اور اس کے مصنف کا اس قدر تفصیلی تعارف کیوں ضروری سمجھا ہے! ضمناً۔ جب میں نے (اس کتاب کی اشاعت کے تھوڑا عرصہ بعد، ۱۹۷۸ء میں) اسکا تعارف کرایا، تو بعض اجاب نے کہا کہ جب یہ شخص قرآن کی عظمت کا اس قدر قائل ہے، تو پھر یہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ میں نے کہا کہ بابا! اسے کچھ دن اور آزادانہ ریسرچ کر لینے دو۔ مسلمان ہو گیا تو پہلے ہی دن شور مچا دیا جائے گا کہ یہ شخص "سلف صالحین کی تفاسیر کے خلاف کہہ رہا ہے۔ پکڑو۔ یہ جانے نہ پائے۔ اور پھر اس کے خلاف کفر کے فتوؤں کی بوچھاڑ ہو جائے گی۔ سرسید (بے چارے) نے اتنا ہی کہا کہ مسلمانوں کو فطرت (نیچر) کی قوتوں کو مسخر کرنا چاہیئے، تو اُسے "نیچری قرار دے کر اُس کے خلاف، مکہ۔ مدینہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کفر کے فتوے لے آئے تھے۔ قرآن پر، کسی "مسلمان نام رکھنے والی" قوم کی اجارہ داری نہیں۔ اس کا خطاب تمام عالمِ انسانیت سے ہے۔ لہذا، اگر کوئی غیر مسلم دانشور اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے، تو وہ مستحقِ تحسین و تبریک ہے۔ ڈاکٹر (BUCCAILLE) قرآن کی صداقت کا تو قائل ہے، لیکن وہ (غالباً) مسلمان اس لئے نہیں ہوتا کہ (بہم) مسلمانوں کی حالت اس کے سامنے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم (مسلمان) اُن کے راستے میں حائل نہ ہوتے، تو اقوامِ عالم میں سے کئی ایک حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکی ہوتیں۔



خارجی کائنات کی شہادت کے بعد، قرآن پھر قدرِ خداوندی کی اطاعت کی طرف آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا مرکزی موضوع تو انسانی راہنمائی ہے۔ اس کے ساتھ وہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ اس کے اس مرکزی موضوع کی تائید و توثیق کے لئے ہوتا ہے۔ فرمایا:

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

جب اس طرح قانونِ خداوندی کے مطابق، معاشرہ میں جمہوریاں پیدا ہو جائیں، تو پھر اُس میں ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ (تمہاری عقل خود بین، کبھی تم سے کہے گی کہ تم دو سروں کی مدد کرتے کرتے خود تنگ دست ہو جاؤ گے اور کبھی تمہیں یہ لالچ دلائے گی کہ ذرا سی بددہانتی سے، ہفت میں، اتنا کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اسے کیوں چھوڑا جائے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آنا بلکہ) ہر ایسے مقام پر اپنی راہنمائی کے لئے، قانونِ خداوندی کو آواز دینا۔ یاد رکھو! جو شخص بھی خدا کے قانون کے مطابق، حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے، خدا کا عطا کردہ سامانِ نشوونما اُس کے ہر وقت قریب رہتا ہے۔ (اس لئے اُسے نہ افلاس کا خطرہ ہوتا ہے، نہ زیادہ سمیٹنے کا لالچ۔

رفعِ مضرت اور جلبِ منفعت، دو ہی جذبات میں جو انسان کو آمادہ برعمل کرتے ہیں۔ قرآن نے نہ رفعِ مضرت کی خدمت کی ہے نہ جلبِ منفعت کی۔ اُس نے کہا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں قوانینِ خداوندی کو ملحوظ رکھو۔ اس سے تمہارے عمل میں توازن برقرار رہے گا۔ نہ تو رفعِ مضرت میں تم کسی اور کو نقصان پہنچاؤ گے نہ ہی جلبِ منفعت میں کسی کا حق چھینو گے۔ اسی اعتدال کا نام حسنِ عمل ہے اور ایسے لوگوں کو محسن کہا جاتا ہے۔ انہی کو سامانِ نشوونما حاصل ہوتا ہے۔ طبعی زندگی کے لئے بھی اور انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اس کی تائید میں پھر قوانینِ طبعی کی شہادت پیش کر دی۔ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

نظامِ فطرت | تم ذرا نظامِ کائنات پر غور کرو اور دیکھو کہ اُس میں خدا نے نشوونما کا کیا عجیب انتظام کر رکھا ہے۔ وہ بارانِ رحمت سے پہلے، خوشگوار ہوائیں بھیجتا ہے جو بارش کی خوشخبری لاتی ہیں۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اُڑتی ہیں تو اُس کا قانون، انہیں زمینِ مُردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، جہاں روئیدگی کا نشان تک نہیں ہوتا۔ اُن بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے اُسی زمینِ مُردہ سے ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں، اور ہر طرف زندگی کی نشوونما ہو جاتی ہے۔

ہم اس طرح خارجی کائنات میں، موت کو زندگی سے بدل دیتے ہیں۔ ہم ان حقائق کو بیان اس لئے کر رہے ہیں کہ تم انہیں اپنی دنیا میں بھی پیش نظر رکھو۔

وحی کی راہ نمائی اور انسانی محنت

ترباری (پھل پیدا کرنے) کے لئے دو شرائط ضروری ہیں۔ ایک تو زمین کی روئیدگی کی صلاحیت، اور دوسرے اس کی آبیاری۔ صلاحیت تو اس کے اندر ہوتی ہے، اور پانی خارج سے ملتا ہے۔ انسانی زندگی میں یہ خارج سے ملنے والا سامان سیرابی، وحی خداوندی ہے۔ لیکن وحی خداوندی اسی صورت میں نتیجہ خیز ہوتی ہے جب اس کے ساتھ انسانی صلاحیت اور محنت شامل ہو۔ وحی خداوندی تو صرف راہ نمائی دیتی ہے۔ چلنا تو انسان نے خود ہوتا ہے۔ اگر مسافر آمادہ سفر نہ ہو تو خالی راہ نمائی کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ اگر مسافر کو صحیح راستے کا علم نہ ہو تو وہ منزل مقصود تک پہنچ نہیں سکے گا۔

بارش سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں وہ عرصہ ہے جس میں نظام خداوندی ہنوز قائم نہ ہوا ہو اور جماعت مومنین اس کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہو۔ اس کے قیام کے بعد بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے کَذَلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ كَمَا أَتَيْنَ تَعْلَقُ تَوْرَمِينَ مُرْدَةً كَوَحْيَاتٍ تَازَهُلْ جَانِئِیْنَ سَیِّئِیْنَ لَیْكِن ثَانِیَا اِسْ مِیْنِ اِنْسَالُوْیْ كِی حِیَاتٍ بَعْدَ الْمَمَاتِ كِی طَرَفِیْ اِشَارَہٗ پَاِیَا جَاتَا ہِیْ۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، جس کے متعلق ضمنی طور پر کچھ کہنا مفید نہیں ہوگا۔ اس لئے اسے ہم مناسب موقع تک ملتوی رکھتے ہیں۔ مسئلہ اب ہم بھی بے اور نازک بھی۔

زمین کی صلاحیت کے متعلق فرمایا:

وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا تَكْدًا ۚ كَذَلِكَ نَصْرَفُ الْأَيَّاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ۝

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ زمین سے فصل پیدا ہونے کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک بارش، اور دوسرے اس زمین کا اچھا ہونا جس پر وہ بارش برسے۔ اس قانون کے مطابق اچھی زمین سے عمدہ فصل پیدا ہوتی ہے، لیکن زمین خراب ہو تو اس پر محنت اور مشقت بھی زیادہ کوئی پڑتی ہے، اور اس کے بعد اس میں فصل بھی کم پیدا ہوتی ہے۔ اور جو پیدا ہوتی ہے وہ بھی ناقص!

دیکھو! اس طرح ہم اپنے قوانین کو، مختلف پہلوؤں سے سامنے لا کر واضح کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی کوششیں بھروسہ نتائج پیدا کریں وہ ان سے راہ نمائی حاصل کر لیں۔
 (اوپر کی مثال میں بارش ہمارا قانون ہے۔ اور زمین، تمہاری کوششیں۔ دونوں کی ہم آہنگی سے
 عمدہ نتائج مرتب ہو سکتے ہیں)۔

طیب اور خبیث قرآن کی دو اصطلاحیں ہیں جو متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ ان کے مفہوم کے لئے دیکھئے
 (۲۴۷/۲، ۱۷۸/۳، ۲/۴، ۱۰۵/۵)۔ ان کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے۔ کلمہ طیب
 اور کلمہ خبیث کا ذکر (۱۴۴/۲) میں آیا ہے۔

اذن کا مفہوم | ضمناً آیت (۷۷/۵) میں زمین سے کھیتی اگنے کے متعلق کہا یا اذن ربہ۔
 (خدا کے اذن کے مطابق)۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد زراعت سے متعلق قانون
 خداوندی ہے۔ اس قانون کا ذکر خود انہی آیت (۷۷/۵، ۷۸/۵) میں کیا گیا ہے۔ زمین کا کاشت
 کے قابل ہونا اور پھر اس کی سیرابی۔



سورۃ اعراف - آیات ۵۹ء تا ۱۰۳ء

انبیاء سابقہ و اقوام گزشتہ

- ۱۔ داستان حضرت نوحؑ۔
- ۲۔ طوفان نوحؑ۔
- ۳۔ دو قومی نظریہ کا آغاز۔
- ۴۔ کشتی حضرت نوحؑ کی افسانوی تفصیلات۔
- ۵۔ حضرت نوحؑ کی عمر۔
- ۶۔ قوم عاد۔ حضرت ہودؑ
- ۷۔ وہ قوم قوت اور علم و بصیرت و دونوں کی حامل تھی۔
- ۸۔ قوم ثمود۔ حضرت صالحؑ
- ۹۔ خداوندی نظامِ معیشت کا بنیادی نقطہ۔ ناقصہ اللہ کا مفہوم۔
خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے۔
- ۱۰۔ قوم لوط اور حضرت لوطؑ
- ۱۱۔ خلاف وضع فطری جنسی اختلاط
- ۱۲۔ قوم مدین۔ حضرت شعیبؑ
- ۱۳۔ مذہب اور سیاست
- ۱۴۔ صلوة کا دائرہ عمل
- ۱۵۔ سیکولرازم کا باطل تصور
- ۱۶۔ دین و دنیا کا ارتباط
- ۱۷۔ دل ماننا ہے لیکن جھوٹی عزت کا خیال اس کا اعتراف نہیں کرنے دیتا۔

تیسرا باب

اقوام سابقہ کی داستانیں

(آیات ۷۹ تا ۷۳)

قرآن کریم اپنے دعاوی کی صداقت کی تائید میں خارجی کائنات سے متعلق قوانین کی عمل پیرائی بھی پیش کرتا ہے اور تاریخی شواہد بھی۔ وہ تاریخ کو کس قدر اہمیت دیتا ہے، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۵۱) میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ یہاں اس نے پہلے خارجی کائنات سے متعلق قوانین فطرت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انبیاء سابقہ (اور ان کی اقوام) کی سرگزشت سامنے لایا ہے۔ اور اس کی ابتدا حضرت نوحؑ کے تذکارِ جلیلہ سے کرتا ہے۔

میں نے انبیاء سابقہ کی داستانیں متفرق مقامات پر بیان کی ہیں، لیکن (میری تصانیف) جوئے نور، برقی طور اور شعلہ مستور میں یہ تسلسل مذکور ہیں۔ انہیں ان کتابوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ میں سلسلہ مطالب الفرقان کو خود مکلفی (SELF-CONTAINED) بنانا چاہتا ہوں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس میں تفصیلاً بیان کر دیا جائے۔ یہاں حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا ذکر مختصراً پانچ آیات (۷۴-۷۹) میں آیا ہے۔ لیکن (قرآن کریم) دیگر مقامات میں ان واقعات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، انہیں یکجا کر دیا جائے تو اس سے یہ ایک مسلسل داستان بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم ان تمام واقعات کو اسی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد جوئے نور میں مذکور داستان ہے

داستان حضرت نوحؑ و قوم نوحؑ

آج دنیا کے گوشے گوشے میں انسانوں کی آبادی نظر آتی ہے لیکن دنیا شروع سے اسی طرح آباد نہیں چلی آئی۔ علمائے تاریخ الامم رفتہ رفتہ اثری انکشافات سے اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نسل انسانی کا اولیٰں مرتبہ کسی ایک مقام پر تھا جہاں

اس کی سوتیلی پھوپھیں اور زندیوں اور دریاؤں کی شکل میں اطرافِ عالم میں بہ نکلیں۔

انسانی آبادی کا اولیٰ سرچشمہ | قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ اولیٰ سرچشمہ جمیل کیسپین (CASPIAN SEA) کے اطراف و جوانب میں واقع تھا۔ اس قیاس کے تحت علمِ اقوام

والسہ کے محققین نے اقوامِ عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بناء پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ آریائی (ایرین) مثلاً ہندی، ایرانی اور فرنگستانی اقوام۔

۲۔ تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی، چینی۔

۳۔ سامی (سمٹک) مثلاً عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

بعض علمائے انساب، اقوامِ عالم کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بناء پر کرتے ہیں۔ یعنی سفید فام (مثلاً اہم سامیہ اور فرنگی) سیاہ فام یا سرخ فام (باشندگانِ افریقہ) اور زرد فام (جاپانی اور چینی وغیرہ) ان کے برعکس تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافت (JAPHETH) حام (HAM) اور سام (SHEM) سے آگے بڑھی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ ان تینوں نسلوں میں سے تورات کو صرف سامی نسل (SEMITIC RACE) سے تعلق ہے کیونکہ انبیائے کرامؑ کا وہ سلسلہ جس کا ذکر تورات میں ہے اسی نسل سے متعلق تھا۔

بنی سام کی اس قوم کا مولد و مسکن کون سا علاقہ تھا، یہ مسئلہ علمائے تاریخ کے نزدیک اہم مباحث کا مرکز رہا ہے۔ اگرچہ تاریخ کی قدیم ترین کتابوں میں اس موضوع پر بہت کچھ ملتا ہے لیکن اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اثری انکشافات نے بحث و نظر کا رخ اس طرح بدل دیا ہے کہ اب بیسویں صدی میں یہ مسئلہ گویا متحقق ہو چکا ہے کہ اہم سامیہ کا اولیٰ وطن، ملکِ عرب تھا، جہاں سے نکل کر وہ بابل، سیریا، مصر اور فینیشیا تک پھیل گئے۔ ان تحقیقات سے یہ اہم حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آرہی ہے کہ اہم سامیہ سابقہ اور مللِ قدیمہ کی تاریخ و تمدن میں عرب کو کیا اہمیت حاصل رہی ہے۔ یعنی مصر و شام، فلسطین و عراق وغیرہ کی تمام قومیں جنہیں الگ الگ سلسلہ کہا جاتا ہے، درحقیقت ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں جو سرزمینِ عرب سے اُبھرا۔ اس اعتبار سے ان تمام اقوام کی زبانوں کی اصل بھی عربی زبان کی قدیم شکل قرار پائے گی۔ یہ امور ہنوز ان انکشافات کا نتیجہ ہیں جو معرضِ شہود میں آچکے ہیں۔ کیا معلوم آگے چل کر ان میں کیا کیا اضافے ہوتے چلے جائیں گے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآنِ کریم نے بالتخصیص انہی اقوام اور انہی انبیائے کرامؑ کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہو سکتا ہے (اور قرآن اس پر شاہد ہیں) کہ مزید انکشافات سے انسانی آبادی کی موجودہ تقسیم (جس کا ذکر اوپر

آچکا ہے، سمٹ سٹا کر اس نقطہ پر مرکوز ہو جائے کہ ان تمام اقوام عالم کی ابتداء و ریگستان عرب ہی سے ہوئی جہاں کے شہر مکہ کو قرآن کریم اُمّ القریٰ (آبادیوں کی ماں) قرار دیتا ہے۔ بہر حال آج یہ قریب قریب متحقق ہو چکا ہے کہ سامی اقوام کا مولد اول عرب تھا جہاں سے وہ اطراف و حوالی میں پھیلیں۔ ان اقوام کے مورث اعلیٰ سام، حضرت نوحؑ کے بیٹے تھے۔ اس لئے قوم نوحؑ کا وطن بھی انہی علاقوں میں تھا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی جو دی پہاڑ پر جا کر بھری۔ نورات نے اس کا نام ”اراراط“ بتایا ہے۔ جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ آرمینیا کے سلسلہ کوہ میں واقع ہے اس سلسلہ کوہ سے دجلہ و فرات (TIGRIS AND EUPHRATES) بہتے ہوئے جنوب کی طرف آتے ہیں اور خلیج فارس کے کچھ اوپر آپس میں مل کر اس میں گرجاتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ قوم نوح کا وطن دجلہ و فرات ہی کا درمیانی علاقہ تھا۔

اور زمانہ | اب رہا یہ کہ اس قوم کا زمانہ کون سا تھا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قوم عا، قوم نوح کی جانشین (SUCCESSOR) تھی۔ (دیکھئے ۶۹)۔

قوم عا کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ اہم سامیہ اولیٰ کا سب سے وسیع قبیلہ تھا جس کی شوکت و عظمت کی داستانوں نشان قدیم تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس قبیلہ نے عرب، بابل اور مصر میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ عا کا زمانہ تین ہزار سال ق م سے پیشتر کا متعین کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ قوم نوح کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح (یا آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ اس لئے کہ ایک شخص (سام) کی اولاد کو قوم بننے اور پھر اتنی شوکت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اُس زمانہ میں ہزار پندرہ سو سال کی مدت تو درکار ہوگی۔ بہر حال یہ قیاس و تخمین ہے جس کی بنیاد علمائے تاریخ و اثاریات کی تحقیقات پر ہے۔ قرآن کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوع انسان کے لئے ضابطہ ہدایت ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں اقوام و ملل کا تذکرہ بھی اسی ضمن سے آیا ہے۔ بایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام اقوام قدیمہ کے متعلق رہن کی بابت، اور تو اور خود عربوں کے پاس بھی عمومی اور سطحی تعارف کے سوا معلومات کا کوئی ذخیرہ نہ تھا۔ تاریخ و اثری انکشافات سے جو کچھ ابھر کر سامنے آ رہا ہے وہ ان خطوط و نقوش کے خلاف نہیں جن کا اجمالی تذکرہ قرآن کریم میں ہے۔ وہ بلکہ ان کی تائید و تصدیق کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اسلئے یہ ہے کہ جہاں کہیں حقیقت قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد کی نمود ہوگی، ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے کسی اجمالی یا تفصیلی بیان سے مختلف ہو۔ اس لئے کہ قرآن کیسے حقیقت ثابتہ ہے۔ اس میں ظن و تخمین اور ریب و تشکیک کا شائبہ تک نہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ علمی تحقیقات کی روشنی میں جہاں دیگر مذاہب کے عام ”مسمیات“ افسانوں میں

تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں، قرآنی اجمالات کی توشیح و تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کو ابھی اور علمی ترقی کرنے دیجئے وہ خود بخود دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آلِيتِنَا فِي الْأَوَّاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهٗ الْحَقُّ ط (۵۹)

ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی دنیا پر یار عربوں کے اپنے اندر اوزان کے باہر کی اقوام میں، اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابت ہے۔

حضرت نوحؑ کی بعثت اپنی قوم کی طرف | یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ انسان کے عہد طفولیت میں سلسلہ آمد و رفت اور ذرائع

رسل و رسائل ایسے محدود تھے کہ جو قبیلہ جہاں آباد تھا ایک مستغنی عن الغیر وحدت (SELF CONTAINED UNIT) تو جسے باہر کی دنیا کے ساتھ بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا دائرہ بھی اس خاص قبیلہ یا قوم تک محدود ہوتا تھا، جس میں وہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ط إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (نیز ۱۱/۲۳ و ۲۳/۲۹ و ۲۹/۲۴)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا: ”اے میری قوم صرف تانوں خداوندی کی اطاعت کرو اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے) تو تم پر سخت تباہی آجائے گی۔“

حضرت نوحؑ بھی اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمُ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ (۲۶)

جب ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا: ”کیا تم قوانین خداوندی کی نگہداشت نہیں کرو گے؟“

ویسے بھی، قبائل کی تقسیم نسلی امتیاز پر ہوتی تھی اور ایک قبیلہ (یا تھوڑی سی وسعت کے بعد قوم) ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد پر مشتمل ہوتا تھا اس لئے قبائل کے نام بھی یا تو ان کے جدِ اولیٰ کے نام پر ہوتے تھے۔ یا اس قبیلہ کی کسی عظیم

شخصیت کی طرف منسوب۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے

قوم آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کی تکذیب کر چکی تھی، اور حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں خدا کے قانون مکافات

مطابق اس قوم کے جرائم کے ظہور تاج کا وقت قریب آچکا تھا۔ سورہ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶)

قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی۔

اسی طرح سورہ فرقان میں ہے۔

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ

آيَةً ۖ وَاعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۲۵)

اور جب قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے کو غرق کر دیا۔ اور (انے والے) انسانوں کے لئے آئیہ عبرت

بنا دیا حقیقت یہ ہے کہ قانون مکافات کی رو سے ظالموں کے لئے دردناک تباہی کا عذاب تیار رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس قوم کی طرف سے تکذیبِ رسل ان کی غرقابی سے پہلے ہو چکی تھی۔ (یعنی یہ نہیں کہ قوم نوح کے تفسیر افرو کی آئندہ نسلوں نے تکذیبِ رسل کی تھی جسکی طرف مندرجہ صدر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے) یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت نوح کے زمانہ میں اس قوم کے مختلف حصوں میں بیک وقت بہت سے حضرات مرسلین تشریف لائے ہوں (جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی وقت میں مبعوث ہوئے تھے) بہر حال یہ رسول حضرت نوح سے پیشتر مبعوث ہوئے ہوں یا آپ کے ہم عصر ہوں قرآن کریم سے یہ ظاہر ہے کہ غرقابی قوم نوح کے وقت ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ اللہ کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی تھی۔

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ (۲۴) نیز (۲۵)

اور ان سے قبل قوم نوح کی قوم تھی۔ وہ بھی اس لئے تباہ ہو گئی کہ وہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتی تھی۔

ان لوگوں نے خدا سے واحد کی عبودیت کو چھوڑ کر کھلی ہوئی بت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضرت نوح نے انہیں

خدا سے واحد کی محکومیت کی دعوت دی تو ان کی قوم کے سرغنوں نے قوم سے کہا کہ:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَ

يَعُوقَ وَتَسْرَاجًا ۝ (۲۳)

انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو مت چھوڑو۔ اور ود اور سواع اور یغوث اور یعوقی اور نسروہ تو اؤں کو مت ترک کرو۔

یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت نوح تشریف لائے۔ آپ نے ان لوگوں کو سب سے پہلے خدا سے واحد کی عبودیت اختیار کرنے کی

دعوت حضرت نوحؑ اور توحید

دعوت دی کہ یہی پیغام حضراتِ انبیاء کرام کی دعوت کا سنگِ بنیاد ہے۔

۷۹ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۖ (۷۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اپنی قوم کی طرف (تبلیغ حق کے لئے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا ”اے میری قوم اللہ تعالیٰ ہی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوائے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔

سورۃ ہود میں ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۚ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمِ الْيَوْمِ ۚ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرِيكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نَرِيكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِآدَائِ الرَّأْيِ ۚ وَمَا نَرِي لَكَ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكَ كَاذِبِينَ ۚ (۷۹-۸۰)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا (لوگو!) میں تمہیں (قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے کے نتائج سے) کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت و محکومیت اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ اس پر قوم کے سرداروں نے جن کے ہاں مال و دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی کہا۔ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ پست درجے کے لوگ ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہوئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے مقابلے میں کوئی برتری نہیں پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔

خدا کی محکومیت | یہ دعوتِ نوحی کا اولیٰ اور اساسی مطالبہ تھا۔ یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کریں۔ حکومتِ خداوندی کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ اُسے قائم کرنے والے کی اطاعت

کی جائے۔ اس لئے حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَأَطِيعُوا ۚ (۸۱-۸۲)

مجھے خدا کے تمہاری طرف امن و سلامتی کا پیامبر بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تم تمہاری ہی سے بچنا چاہتے ہو تو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو کیونکہ میں انہی قوانین کو نافذ کرنے پر مامور ہوں۔

انقلابی دعوت

دعوتِ نوحی کی تعلیم کے ان عناصر پر غور فرمائیے۔ یہ تعلیم کیا تھی؟ اس مسلک کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج جو اس قوم کے آباء و اجداد (اسلاف) سے متواتر چلا آ رہا تھا اور

ان کے سردارانِ معنی، اربابِ ثروت و اقتدار کے تغلب و تسلط کے خلاف بغاوت، تباہی و انحطاط کے اوراق کو اٹھتے جائیے۔ حق و باطل کی کشمکش میں یہی دو مقام ہیں جو ہمیشہ قبولیتِ حق و صداقت کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہوتے ہیں۔ معتقداتِ خواہ کس قدر غلط کیوں نہ ہوں، جب آباء و اجداد سے منتقل ہو کر آئیں تو انسان کے نزدیک

تقلیدِ آباء

ایسے گراں بہا متاع بن جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان کے چھپنے سے اس کی ساری کائنات ٹٹ رہی ہے لیکن کسی

عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے! رائڈ کس میں تقلید کا عنوان دیکھئے۔

دوسری رکاوٹ

اعترافِ حق و صداقت کی راہ میں دوسرا سنگ گراں نشہء حکومت و سطوت ہے۔ یوں تو انسان ہر شکار میں لذت محسوس کرتا ہے لیکن اس کی لذت کی انتہا اس مقام پر پہنچ کر

ہوتی ہے جہاں اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ تباہی و عالم پر نگاہ ڈالئے۔ یہ مید و میاد کی ایک مسلسل داستان نظر آئے گی۔ جس میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں کمزور اور ناتوان انسان، زبردست اور قوی انسانوں کے نیچے تغلب و تسلط میں تڑپتے پھڑکتے، سسکتے، بلبلا تے، سکراتِ موت کی ہچکیاں لیتے دکھائی دیں گے۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ کی بعثت کی سب سے اہم غرض یہ ہوتی تھی کہ وہ ان کمزور اور ناتوان انسانوں کو جابر و ظالم انسانوں کے نیچے استبداد سے چھڑا کر آزادی کی فضا میں اُڑن پر کشائی دیں جہاں وہ پوری سرفرازی و سر بلندی سے انسانوں کی طرح چل پھر سکیں اور انسان

صحیح آزادی کی دعوت

اور خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہ ہو۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے قانون کے سوا کسی اور کا محکوم نہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ ارباب

حکومت و تسلط اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ اس قسم کی انقلاب انگیز آواز کا گلا اپنے آہنی ہاتھوں سے گھونٹ دیں۔ وہ اپنی ایسی سائنسی سیاست کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ ان کے دام تغلب کے حلقے کمزور نہ ہونے پائیں۔ داعیانِ حق و صداقت کی راہ میں یہ دوسرا مرحلہ جس سے تصادم و

تضادم ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے دعوتِ نوحی کے ضمن میں اس تصادم کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ فرمایا:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ لَا يُرِيدُ

اَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْهِمْ وَ كَوْشَاءَ اللّٰهُ لَآنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مِّنْ سَمٰٓءٍ فِي
الْبَآئِنَاتِ الْاُولٰٓئِیْنَ ؕ (۲۳)

اس قوم کے اکابرین نے جنہیں سامان زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور لوگوں سے کہنے لگے کہ شخص اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے اپنا مسلک مسلط کر دے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے آباء و اجداد سے تو کوئی ایسی بات سنی نہیں۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ تصادم اس سلسلہ آسمانی کے ساتھ ہر مقام پر رہے گا کہ بقول اقبالؔ
ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

سرمایہ دار گروہ کی طرف سے مخالفت | آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن نے ان مخالفین کے لئے اَلْمَلَاۤءُ کا لفظ

استعمال کیا ہے اس کے نفی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں۔ یعنی وہ جنہیں سامان زریست کی فراوانیاں حاصل ہوں جن کے پاس کثرت سے مال و دولت ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی دولت کے بل بوتے پر اقتدار کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں۔ اور پھر غریب انسانوں سے اپنا حکم منواتے ہیں۔ اسی کا نام (دورِ حاضر کی اصطلاح میں) نظام سرمایہ داری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آسمانی انقلاب جس کے داعی حضرات انبیائے کرامؑ تھے، اس غیر خداوندی نظام کو مٹانے کے لئے آتا تھا جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کے قبضے میں رہتے ہیں۔ وہ ان ذرائع رزق کو انسانوں کے ہاتھوں سے چھین کر، قانونِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے۔ تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ اس انقلاب کی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصادم ہے جس کا ذکر سب سے پہلی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں سامنے آ رہا ہے۔ سورہ اخراف کی آیات ۶۴۔ ۵۹ میں اس کا اجمالی سا ذکر ہے۔ تفصیل دیگر مقامات میں مذکور ہے۔ مثلاً سورہ ہود میں بیان کر دہ۔

اس مخالفت کی وجہ بھی سن لیجئے۔

فَقَالَ الْمَلَاۤءُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَزَّلَكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُنَا

..... اَنْلِزْ مُكْمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كِرْهُوْنَ ۝ (۲۸-۲۷)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جنہوں نے سرکشی کی راہ اختیار کی تھی کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔ اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ ہم میں نچلے درجے کے ہیں۔ اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نوح نے کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن لئے ہوں اور اس نے اپنے ہاں سے مجھے وحی کی رحمت بھی عطا کر دی ہو۔ مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟ یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں۔

سورۃ شعراء میں ہے۔

قَالُوْا اَنْتُمْ مِّنْ لَّا تَتَّبَعُكَ الْاَرْدَلُوْنَ ۝ (۲۶)

(قوم کے سرداروں نے کہا) کیا تم تمہاری دعوت قبول کر لیں، حالانکہ (ہم) دیکھ رہے ہیں کہ صرف کیسے (نچلے درجے کے لوگ) تمہارے پیچھے ہو لئے ہیں؟

ان آیات پر غور فرمائیے۔ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو صاحب دولت و ثروت تھا۔ اور جو بات مخالفت میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کیا ہم اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں جو ذلیل لوگوں پر مشتمل ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ حق و صداقت کی دعوت پر لبیک، سب سے پہلے غریب طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ارباب ثروت و حکومت کے جو رواستند او سے تنگ آچکے ہوتے ہیں اور ہر اس آواز کا بطیب خاطر

استقبال کرتے ہیں جو انہیں حقیقی آزادی کی طرف دعوت دے اور زندگی کی خوشگوار یوں سے ہمکنار کر دے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمانہ حضرت نوح میں طبقات کی تقسیم وجود میں آچکی تھی۔ یعنی وہ قبائلی زندگی کا ایسا ابتدائی زمانہ نہیں تھا جیسے انسانی عزت و تکریم، دولت و ثروت کے معیار سے نہ ماپا جاسکے۔

قَالَ وَاَمَّا عَلِيُّ بَمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۷)

(حضرت نوح نے) کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ان لوگوں کا پیشہ کیا ہے۔ نہ ہی مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کیا کام کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت انسانوں کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے وجود میں آچکی تھی جو ذاتیات کی تقسیم

بنیادی تھمر ہے اور جو انسانی مساوات کی جڑ پر ایسی کاری ضرب ہے، کہ لعنت آج تک دور نہیں ہو سکی حضرات انبیائے کرامؑ کا منصب، مساوات انسانی کو قائم کر کے عزت و عظمت کا معیار حسن سیرت و کردار قرار دینا تھا۔ یعنی یہ معیار کہ جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور اس طرح نوع انسانی کی منفعت کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو، وہی معاشرہ میں سب سے زیادہ عزت و توقیر کا مستحق ہے چنانچہ حضرت نوحؑ کا جواب اس پر شاید ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان وجہ جامعیت ایمان ہے اور میں محض تمہاری خاطر مومنین کی جماعت کو دھتکار نہیں سکتا۔ یعنی اس جماعت کو جو اس کا اقرار اور تہیہ کر چکی ہے کہ وہ خود بھی قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور ان قوانین کو معاشرہ میں رائج بھی کرے گی۔

قَالَ مَا عَلِمْنِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ اِنْ حَسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝
وَمَا اَنَا بِطَارِدٍ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۱۱۵-۱۱۳)

نوحؑ نے کہا ان کے پیشہ اور کام سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے ہاں عزت و ذکریم کے پہلے اور ہیں جن کا حساب ہمارا خدا رکھتا ہے۔ اے کاش! تم اس حقیقت کو سمجھ سکتے! اسے بہر حال اچھی طرح سمجھ لو کہ میں یہ کبھی نہیں کروں گا تمہاری خاطر اس جماعت کو دھتکار دوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں غلط زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا رہوں۔

(نیز ۲۹ ذ ۱۰۶-۱۰۹)

اگر میں انہیں اس لئے دھتکار دوں کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں تو میں اپنے اللہ کے ہاں مجرم ٹھیسرا یا جاؤں گا۔ کہیئے اس وقت مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچا سکے گا؟ (۱۱۳-۱۱۵)

یہ لوگ جو بظاہر تمہیں بے کس و بے بس مفلس و نادار نظر آتے ہیں تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کن نعمتوں اور عظمتوں سے نوازنے والا ہے؟ (۱۱۳)

ارباب استبداد کا جواب | اس کے جواب میں قوم نے کیا کہا؟ وہی جو سرکش و تکبر کہا کرتے ہیں!

قَالُوا يَبْنُوْهُ قَدْ جَادَلْتُنَا فَاكْثَرْتَ جِدَالَ النَّاسِ
فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۱۱۳)

اس پر ان لوگوں نے کہا: اے نوحؑ تو نے ہم سے مفت میں جھگڑا شروع کر رکھا ہے اور اس میں بڑھتے ہی چلے جا رہے ہو، (ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس تباہی کی تم دھمکیاں دیتے ہو اسے لے آؤ!

یعنی توجہ میں بار بار کہتا ہے کہ ہماری غلط روش زندگی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگی، در آنحالیکہ ہم نہایت خوش حالی اور فارغ ابالی

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو تو اس تباہی کو ہمارے سامنے لے آ۔ بات صاف ہو جائے گی!

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا۔

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيَكُمْ بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ وَأَنَا
بِرَبِّي مِمَّا تَجْحَرُمُونَ ۝ (۳۵-۳۴)

نوحؑ نے کہا۔ تباہی اور بربادی خدا کے قانون مکافات کے مطابق آیا کرتی ہے تم اسے روک نہیں سکتے۔ اگر اس قانون کے مطابق تم اس مقام تک پہنچ چکے ہو جہاں تباہی آکر رہتی ہے تو پھر میری غمخواری تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی تمہارے فیصلے تمہارے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق ہو کر رہیں گے۔ تمہیں کشاں کشاں اس کی طرف جانا ہے۔

رحم الہی ہوا۔ اے نوحؑ! کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اپنے جی سے یہ بات گھڑ لی ہے؟ تو کہہ دے۔ اگر میں نے یہ بات گھڑ لی ہے تو میرا جرم مجھ پر، اور تم جو جرم کر رہے ہو (اس کی پاداش تمہارے لئے)۔ میں اس بری الذمہ ہوں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ حضرت نوحؑ خود اسی قوم میں سے تھے۔ زندگی انہی میں گزاری تھی۔ قوم نے اس سے پشت پناہی کی۔ اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی دعوت کی تبلیغ شروع کی تو قوم نے سمجھا کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل ہو گیا ہے جو اس قسم کی بکی بکی باتیں کرنے لگا ہے جو نہ ہماری دید میں ہیں نہ شنید میں۔ انہوں نے کہا
إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جَنَّةٌ قَلْبًا يَبْصُرُ بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ ۝ (۲۳ ذ ۵۴)
(اس کے سوا کچھ نہیں کہ) یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو) کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

لیکن جب دیکھا کہ اسے جنون نہیں، اپنے مشن سے عشق ہے اور وہ پاگلوں کی طرح
تخلیف و تربیب
بے ربط و بلا مقصد باتیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی بر خباثت اور حرکت ایک خاص قبلہ مقصود

کی طرف منجر ہوتی ہے تو وہ ان اچھے ہتھیاروں پر اتر آئے جو قوت کے نشہ کا آخری حربہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَنُوشَ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ۝ (۲۴)

اے نوحؑ! تم ان آدمی لوگوں کو مساوات کا سبق پڑھا کر معاشرہ میں فساد برپا کر رہے ہو (اگر تم اس روش سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

یہ دھمکی انفرادی طور پر نہیں تھی بلکہ قبیلہ کے سب سے بڑے سردار کی قیادت میں ایک بڑی سازش کے تحت اس کا اعلان ہوا تھا۔

قَالَ نُوحٌ رَبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَ مَكْرُوًّا مَكْرًا كَبَارًا ۝ (۲۲-۲۱)

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو دیکھ رہا ہے کہ یہ لوگ برابر میری مخالفت کئے جا رہے ہیں اور اس شخص کے پیچھے لگ رہے ہیں جس کی اس کے سوا کوئی خصوصیت نہیں کہ اس کے پاس بہت سی دولت ہے اور افراد خاندان کی کثرت۔ حالانکہ یہی چیز اس کی تباہی کا موجب ہے۔ یہ میری دعوت کے خلاف بہت بڑی سازش کر رہے ہیں۔

دھمکیوں کے جواب میں..... لیکن کیا ان دھمکیوں سے خائف ہو کر حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت چھوڑ دی؟ ایسا کس طرح ہو سکتا تھا! خدا کے بندوں کو کسی طرح کی تخویف

و تزییب ان کے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان دھمکیوں کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَ تَذْكِرِيْ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اَقْضُوا اِلَيَّ وَلَا تَنْظُرُوْنَ ۝ (۲۱-۲۰)

اگر تم پر بات شاق گزرتی ہے کہ میں تمہیں (دعوت و ہدایت کے لئے) مقيم ہوں اور قوانین خداوندی کے مطابق تمہیں پند و نصیحت کرتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اس میں اپنا پورا زور لگاؤ

اور اپنے حمایتیوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ کوئی گوشہ نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (اور دیکھو آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے)

مخالفت کی انتہا چنانچہ ان کی مخالفت دن بدن بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت نوحؑ ان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔

قَالَ رَبِّ اَنْصُرْنِيْ بِمَا كَدَّ بُؤْنٍ ۝ (۲۳-۲۲) ذ (۲۴-۲۳)

(اور کہا) خدایا انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر۔

حضرت نوحؑ کی پکار وہ قوم مخالفت اور سرکشی میں اس قدر بڑھ چکی تھی اور ان کے جرائم اس قدر متعدد ہوئے جاتے رہے تھے کہ دوسرے انسانوں کو ان کے اثرات سے بچنا ناہایت ضروری تھا۔

اس لئے حضرت نوحؑ نے اپنے رب سے فریاد کی کہ۔

قَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۱۶۴)

اے میرے پروردگار! ان سرکشوں میں سے کسی ایک گھرانے کو بھی ملک میں بسنے کے لئے باقی نہ چھوڑ۔

اس لئے کہ

إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (۱۶۵)

اگر تو نے ان سرکش لوگوں کو چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو بری طرح گمراہ کریں گے اور ان کی اولاد بھی (موروثی اور

تریتی اثرات کی وجہ سے) انہی جیسی) بدکردار اور سرکش ہوگی۔ (اس لئے ان کا سلسلہ ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے)

ابتداء میں اس دعوت کا جمالی پہلو نمایاں تھا۔ آخر میں اللہ کے قانونِ مکافات کے ماتحت اس کا جلالی پہلو سامنے آگیا۔ ادھر سرکشی و تمرد انتہا کو پہنچ گئی۔ ادھر قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق

کشتی کی تیاری

مہلت کا زمانہ گزر کر نتیجہ برآمد ہونے کا وقت آگیا۔ حضرت نوحؑ سے ارشاد ہوا کہ ایک کشتی تیار کر لو۔

وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنَ يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيُنَا وَلَا تُمَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ إِنَّهُمْ مُّغْرَقُونَ ۝ (۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸)

اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لاچکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں رہے پس جو کچھ بہ کر رہے ہیں، اس پر (بیکار کو) غم نہ کھاؤ۔

اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دو اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کرنا۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہو جائے واپس نہیں۔

یہ کشتی بنا رہے تھے اور قوم کے سرکش سردار، ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ مضحکہ خود انکی اپنی حالت پر تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی گرفت انہیں کس سختی سے پکڑنے والی ہے۔

قوم کا تمسخر

وَيَصْنَعُ الْفُلَ تَفْوَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأَ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ وَيَجْلُ عَلَيْهِ عَذَابٌ مَّقِيمٌ ۝ (۱۶۹-۱۷۰)

چنانچہ نوحؑ کشتی بنانے لگا۔

اور جب کسی ایسا ہوتا کہ ان کی قوم کے سردار ادھر سے گزرتے اور انہیں کشتی بنانے میں مشغول دیکھتے تو تمسخر کرنے لگتے۔

نوح کی طرف سے انہیں جواب ملا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو راز (لو) جس طرح تم آج ہماری ہنسی اڑاتے ہو، ایک وقت آئے گا کہ ہم اسی طرح تمہاری حماقتوں پر ہنسیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اسے رسوا کر دے۔ وہ عذاب وقتی نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دینے والا ہوگا۔

ظہور نوح کا وقت | کشتی تیار ہو گئی اور تباہی کا وقت آپہنچا۔ حکم ہوا۔
حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنْوِيرُ وَمَا آمَنَ مَعَهُ

إِلَّا قَلِيلٌ ۝ (۱۱۱-۱۱۲)

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک کہ قانونِ خداوندی کے مطابق ان کی تباہی کا وقت آگیا تو ارد گرد کی پہاڑیوں سے بارش کلابانی جوش مارتا ہوا وادی میں آنا شروع ہو گیا (۱۱۱) اور اس نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی تو ہم نے (نوح سے) کہا کہ ہر ضرورت کی شے کے دو دو جوڑے کشتی میں رکھ لو۔ اور اپنے اہل کو بھی ساتھ لے لو، مگر اہل میں وہ لوگ داخل نہیں جن کی روشنی ثابت کر چکی ہے کہ وہ اہل ایمان میں سے نہیں۔ نیز ان لوگوں کو بھی ساتھ لے لو جو ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

اور اس کے بعد۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ جَزَاءً لِّمَن كَانَ كُفْرًا ۝ (۱۱۲-۱۱۳)
پس ہم نے موسلا دھار بارش کے لئے بادلوں کے دروازے کھول دیئے۔ اور زمین سے چشمے ابھرنے لگے۔ تو اس طرح زمین و آسمان کا پانی اس مقصد کے لئے جس کا قانون مکافات کے مطابق اندازہ ہو چکا تھا ایک جگہ جمع ہو گیا۔ اور ہم نے اُسے (نوح کو) میخوں اور تختوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کر دیا۔ وہ ہماری زیر نگرانی چل رہی تھی۔ (اس طرح نوح اور اس کے رافقی اس تباہی سے بچ گئے اور جنہوں نے نوح کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا غرق ہو گئے۔

زمین سے پانی۔ آسمان سے پانی۔ پوری کی پوری وادی لبریز۔ اس کے بعد

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَسْمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيَضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۱۴)

اور (پھر اللہ کا) حکم ہوا کہ اے زمین! تو اپنا پانی پی لے! اور اے بادو! تم تھم جاؤ! (جنا نچہ پانی کا چڑھاؤ اتر گیا اور جو ہوتا تھا ہو گیا۔ پھر وہ کشتی، جو دی پر ٹھہر گئی۔ اور جماعتِ مومنین کو بتایا گیا کہ وہ لوگ تباہ ہو گئے ہیں جو تم پر ظلم کیا کرتے تھے۔

اس طوفانِ بلا کے سامنے سرکش و مغرور قوم اور اس کے وہ تمام ساز و سامان جس کے بل بوتے پر انہوں نے ظلم و استبداد کی روش اختیار

کر رکھی تھی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور اس تباہی سے وہی محفوظ رہے جو کل تک بے یار و مددگار اور بے ساز و سامان سمجھے جاتے تھے اور جن کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ طوفانِ تھما کشتی جو دی پر جا کر رکی اور ارشاد ہوا۔

قِيلَ يٰ نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِنَّا وَ بَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ اُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ ۗ وَ اٰمَمٌ
سَمِعْنَاهُمْ قَدْ يَمَنُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيمٌ ۝ (۱۸)

اور ہم نے نوحؑ سے کہا کہ اب خطرہ کوئی نہیں رہا لہذا کشتی سے اتر پڑو۔ یہاں نہیں اور تمہارے رفقا کو سامانِ زیست بُری فراوانی سے ملے گا۔ باقی رہیں وہ جماعتیں جو تمہارا ساتھ نہیں دینی تو تمہارے قانونِ طبعی کے مطابق رزق تو وہ بھی حاصل کر دیں گی لیکن ان کا مستقبل تاریک ہوگا اور انجام کار وہ الم انگیز تباہی کا شکار ہوں گی (۲۰۰-۲۰۱) ذ ۱۵-۱۶

(۱۴-۱۵ : ۲۲-۲۳)

یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے اہل کو عذابِ الیم سے محفوظ رکھا اور مخالفین کو نیست و نابود کر دیا۔ (۲۱-۲۴) ذ (۲۴-۲۵)

اہل کا مفہوم ان آیات میں ”اہل“ کا لفظ غور طلب ہے۔ یہ اپنے اندر ایک عظیم الشان حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے جو تاریخ

انسانیت میں مہماتِ اصول میں سے ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ اور ان کے ”اہل“ کو اس عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ عام اصطلاح میں ”اہل“ سے مراد کنڈ اور خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن آسمانی لغت میں اسے مفہوم کچھ اور ہے۔ سورہ مومنین میں ”اہل“ میں ایک استثناء (EXCEPTION) بنائی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اَنْ اَصْنَعَ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا..... اِنَّهُمْ مُّفْرَقُونَ ۝ (۲۳)

پس ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ۔ جب ایسا ہو کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق تباہی کا وقت آجائے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو کشتی میں (ہر فرد کی چیزوں کے) دو دو جوڑے ساتھ رکھ لو۔ اور اپنے اہل کو بھی۔ مگر اہل کے ایسے لوگوں کو نہیں جن کے کفر و عدوان نے تباہ رکھا ہے کہ وہ تمہارے متبعین میں شامل نہیں ہوں گے۔ اور دیکھو جن لوگوں نے سرکشی پر کمر باندھ رکھی ہے ان کے بارے میں کچھ ہم سے عرضِ معرض نہ کیجیو۔ وہ ڈوب کر رہیں گے۔

اس کی تفسیر سورہ نوحؑ میں ان الفاظ سے کر دی گئی ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۝ (۲۴)

(نوحؑ نے کہا) اے میرے رب! تو ان سرکشوں کی دراز دستی سے میری اور میرے ماں باپ کی حفاظت فرما اور میرے اہل خانہ میں سے اس کی بھی جو ایمان لائے۔ ان کے علاوہ دوسرے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی بھی اور (ظالموں کو) جو ایمان نہیں لاتے، تباہی اور بربادی میں اضافہ کئے جا۔

اپنوں اور غیروں کا قرآنی معیار | اس سے واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں ”اہل“ سے مراد کیا ہے۔ یہاں اپنوں اور غیروں کی تقسیم، نسب اور قرابت داری کی رو سے نہیں ہوتی بلکہ کفر اور ایمان کی رو سے ہوتی ہے۔ دعوتِ نوحی میں یہ مقام ایسا بلند ہے جسے قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے تاکہ یہ اصولی اور اساسی معیار تقسیم واضح طور پر سامنے آجائے کیونکہ انسانی تمدن اور عمرانیات کی صحیح اور غلط تعمیر اسی معیار کے صحت اور سقم پر مبنی ہے۔ ذرا غور کیجئے، چاروں طرف طوفانِ بلا انگیز موجزن ہے۔

وَهِيَ تَجْرِي بِهَمِّهِ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ نَفثَ (۱۱۳)

اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑوں کی طرح اُٹھتی ہیں کشتی انہیں لئے جا رہی ہے۔

بیٹا سامنے آجاتا ہے۔ محبتِ پدری جوش میں آتی ہے۔ آواز دیتے ہیں۔

وَنَادَى نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يُبْنَىٰ الرُّكْبَ مَعَنَا وَلَا تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِينَ ۝ (۱۱۴)

اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ کنارہ پر (کھڑا) تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا۔ کافروں کے

ساتھ نہ رہ۔

بیٹا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے۔

قَالَ سَاوِنِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۖ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَهُ ۚ وَخَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ۝ (۱۱۵)

اس نے کہا: میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا، وہ مجھے پانی کی زد سے بچالے گا تمہارے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہوں گا۔

نوحؑ نے کہا: تو کس خیال غام میں پڑا ہے! اس طوفان سے جو قانونِ خداوندی کے مطابق آیا ہے بچانے والا کوئی نہیں اس سے

وہی بچ سکے گا جو ایمان لائے اس کے آغوشِ رحمت میں پناہ لے لے۔ اتنی بات ہوئی تھی ان دونوں کے درمیان ایک موج

حائل ہو گئی۔ اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ ڈوب گیا۔

جب کشتی سے اتر کر حضرت نوحؑ کو اطمینان نصیب ہوا تو

وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي ۖ وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ

أَحْكَمُ الْحَكَمِينَ ۝ (۱۱۵)

اور نوحؑ نے اپنے رب سے عرض کیا کہ بارالہا! تیرا وعدہ تھا کہ تو میرے اہل کو بچائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا۔ تو پھر وہ کیوں نہ محفوظ رہا اور تیرے وعدے کو ہمیشہ سچے ہوا کرتے ہیں اور تیرا فیصلہ آخری فیصلہ۔ اس درخواست کے جواب پر غور فرمائیے کہ یہی جواب تاریخ انسانیت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ ارشاد ہوا۔
قَالَ يَنْوُحُ إِنَّهُ لَيَسَّ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ (۱۱۶)
(خدا نے) کہا اے نوحؑ تو نے اہل کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ بے شک وہ تیرا بیٹا تھا۔ لیکن وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ (تیرے اہل وہی ہو سکتے ہیں جن کی روش زندگی ہمارے قوانین کے مطابق ہو۔ یعنی ان کے اعمال صالح ہوں۔ اور اس کے اعمال غیر صالح تھے۔ تو نے ہم سے یہ سوال اس لئے کر دیا کہ تو اس حقیقت سے واقف نہ تھا۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔

نسلی امتیاز اور قوموں کی تقسیم | واقعہ تو اتنا سادہ ہے لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آپ یونہی آگے نہ بڑھ جائیں بلکہ اس پر مزید غور کریں کہ اس کے اندر کس قدر عظیم المنظر حقیقت مضمر ہے۔ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ جب انسانوں نے غاروں اور درختوں کی ابتدائی انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر قبائل کی اجتماعی زندگی شروع کی تو ان میں بوجہ جامعیت اشتراک نسل تھی۔ یعنی ایک مورث اعلیٰ کی اولاد بل جمل کو اکٹھی رہتی تھی۔ اس کا نام قبیلہ تھا۔ یہاں ایک قبیلہ، وہاں دوسرا قبیلہ۔ باہمی مفاد کے تصادم پر ان قبائل میں جنگ و پیکار کے مظاہرے بھی رونما ہوتے رہتے تھے۔ اس جنگ میں حریت و حلیف ہونے کا معیار حق و باطل کا معیار نہ تھا۔ بلکہ اپنے قبیلہ اور غیر قبیلہ کا معیار تھا۔ یعنی قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور دوسرے قبیلہ کا مخالف۔ یہ تھی انسان کی ابتدائی زندگی۔ اب ہزاروں سال کی تاریخ کے اوراق کو الٹ کر اپنے زمانہ میں پہنچ جائیے جو علم و تمدن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ابتدائی دور جہالت سے اتنا مختلف سمجھتا ہے۔ جتنا انسان اپنے آپ کو حیوان سے مختلف قرار دیتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ جہاں تک تقسیم انسانی کا تعلق ہے اس دور ہندیب و تمدن کا انسا

آج کی تقسیم | اس دور جہالت و ظلمت کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے، وہاں انسانوں کی تقسیم، قبائل کی

۱۔ سورۃ نوحؑ کی آیت (۱۱۶) جو پہلے درج کی جا چکی ہے اور جس میں حضرت نوحؑ نے صرف اپنی اہل خانہ کی مغفرت کی دعا کی ہے جو صاحب ایمان ہوں۔ زیر نظر واقعہ کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

رُو سے ہوتی تھی۔ یہاں وہ تقسیم اقوام کی رو سے ہوتی ہے۔ اور قوم کیا ہے؟ قبیلہ کی پھیلی ہوئی شکل۔ یعنی جب ایک قبیلہ بڑا ہو جائے تو اسے قوم کہا جاتا ہے۔ قوموں کی ابتدائی تقسیم اختلافِ نسب کی رو سے ہوئی۔ (مثلاً ایرانی، تورانی، سامی) یا اختلافِ رنگ کی بناء پر (مثلاً سفید، سیاہ اور زرد اقوام) اس بنیادی تقسیم سے آگے بڑھتے تو چھوٹی چھوٹی تقسیمیں جغرافیائی حدود کی رو سے طے پاتی ہیں۔ یعنی کسی دریا یا پہاڑ کی حدود کے اندر بسنے والے لوگ دوسری قوم۔ غور فرمائیے! بایں ہمہ ادعائے تہذیب و تمدن انسان ابھی تک اسی چکر میں گرفتار ہے جہاں سے اس نے اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ ذرا یورپ کی تقسیم اقوام پر نگاہ ڈالئے اور پھر ان کی سمیت و ہیمنیت اور وحشت و زندگی پر غور کیجئے۔ کیا آپ کو آلاتِ حرب و ضرب کی نوعیت اور سامان و ذرائعِ تباہی و بربادی کی ساخت و پرداخت کے علاوہ اُس دورِ جہالت اور اُس دورِ تمدن میں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! اس لئے کہ انسانی ہیئیتِ اجتماعیہ سے متعلق مسائل کا صحیح حل صرف وحی کی روشنی میں مل سکتا ہے اور یورپ اس روشنی سے محروم ہے۔ وَفِی طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔

اس کے برعکس اس مسلکِ حیات کو دیکھئے جو وحی کی روشنی میں متعین کیا گیا۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد ہیں لیکن جو نبی ان کی دعوت کی ابتدا ہوتی ہے قوم و وحشتوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک وہ جو اس دعوتِ آسمانی پر ایمان لاتا ہے۔ دوسرا وہ جو اس کی تکذیب و مخالفت کرتا ہے۔ اس دوسرے طبقے میں صاحبانِ دولت و ثروت ہیں۔ اونچے گھرانے کے افراد ہیں۔ دوسری طرف مفلس و نادار انسانوں کی جماعت ہے جنہیں اول الذکر طبقہ "ارذل" شمار کرتا ہے۔ لیکن یہ جماعت مؤمنین (حزب اللہ) اللہ کے قانون کی حفاظت اور رسول کی تربیت و شفقت کے سائے میں بڑھتی ہے۔ جماعتِ مخالفین خود انہی کی قوم کے افراد ہیں۔ یقیناً ان کے رشتہ دار بھی ہونگے۔ لیکن ان کے سانحہ اب ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے تعلقات کی بنیاد اب ایک اور ہی جذبہ ہے، اور وہ جذبہ ایمان کا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا بھی چونکہ مکذبین کی جماعت میں ہے، اس لئے اس قدر قریبی رشتے کے باوجود ان کے "اہل" میں سے قرار نہیں پاتا۔ اب "اہل" اور "غیر" کی تقسیم کا معیار کچھ اور قرار پا چکا ہے۔ اب ان کے "اہل" وہ "غیر" ہیں جن سے اس سے پیشتر قرابت داری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ دعوتِ نوحی سے اس حقیقتِ عقلی کی ابتدا ہوئی۔ اس سے آگے آپ دیکھیں گے کہ ہر رسول کے زمانہ میں اس تقسیم کے مظاہرے سامنے آتے جائیں گے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی اس تقسیم کی رو سے کفار کی جماعت میں شامل تھی، نبی کے اہل میں سے نہیں تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ اس تقسیم کی رو سے "غیر" میں شامل تھے۔ انہوں میں سے نہیں تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم، باوجود اشتراکِ وطن، قومِ فرعون سے الگ تھی لیکن قومِ فرعون میں سے جو لوگ اشتراکِ ایمانی میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھے وہ قومِ موسیٰؑ میں سے قرار دیئے گئے۔ یہ سلسلہ اسبطر

وسیع ہوتا چلا گیا۔ تا آنکہ رسول کا فتیٰ للناس کے عہد مبارک میں تمام نوع انسانی کی تقسیم اسی اصول کے تحت قرار پائی۔ قرآن کریم نے جہاں ”قوم الکافرین“ کہا ہے تو اس میں دنیا میں ہر گوشے میں بسنے والے کفار آ گئے۔ جب ”قوم الظالمین“ اور ”قوم الفاسقین“ اور ”قوم المجرمین“ کہا گیا تو تمام صفحہ ارض کے ظالمین و فاسقین و مجرمین اس جدید ”قومیت“ کے حلقے میں آ گئے۔ اس کے برعکس جب ارشاد ہوا کہ ”انما المؤمنون اخوة“ تو اس قوم کی عالمگیریت و آفاقیت بھی حد و نا آشنا اور قیود و فراموش قرار پائی۔ لہذا اس اصول کی رُو سے ساری دنیا کے مومن، باوجود اختلاف رنگ و زبان و وطن، نسب ایک قوم کے فرد اور اس کے برعکس دنیا بھر کے منکرین، جماعت مخالف کے افراد۔ ان دونوں جماعتوں میں دنیا بھر کے اشتراک و وجوہات کے باوجود کوئی اشتراک نہیں تا آنکہ وہ آسمانی وجہ اشتراک یعنی ایمان کے رشتہ سے اس قومیتِ حقہ کے رکن نہ بن جائیں کہ

اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یہ سبے وحی کی روشنی میں معیار قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی تقلید آسمانی نہ تھی، لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراک و وطن یا نسل کو وجہ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعار ملی بتایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ اس غلط معیار تقسیم انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آچکا ہے۔ اور اس کے ارباب فکر و نظر، قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدت افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیئے نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے اس لئے اس مقام پر مزید تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی (انڈکس میں ”قومیت پرستی“، ”دوقومی نظریہ“، ”اسوہ حضرت ابراہیم“ جیسے عنوانات دیکھئے)۔



داستان حضرت نوحؑ تو ختم ہو گئی لیکن اس میں دو ایک نکات ایسے ہیں جن کی مزید تشریح ضروری ہے۔

۱۔ حضرت نوحؑ نے دعا کی تھی کہ

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّاسًا ۝ (۲۱/۴۱)

اور نوحؑ نے دعا کی۔ اے اللہ! نہ ماننے والوں میں سے ایک کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ دو۔

کیا طوفانِ نوح عالمگیر تھا؟ | بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر تھا اور تمام صفحہ ارض

اس کی پیٹ میں آگیا تھا۔ اور روئے زمین پر کوئی ذی روح باقی نہیں رہا تھا سوائے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کے جو کشتی میں سوار تھے۔ یہ خیال صحیح نہیں اور راستہ یا غیر شعوری طور پر تورات سے مستعار لیا گیا ہے۔ (تورات: کتاب پیدائش) میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے کہا کہ میں چالیس دن اور رات متواتر مبینہ برسوں گا اور ہر ذی روح کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے فنا کر دوں گا۔ (پیدائش ۶) چنانچہ چالیس شب و روز کی بارش کے بعد ایک سو پچاس دن تک طوفان کا پانی موجیں مارتا رہا۔ اور ساتویں مہینے سفینہ نوح اراط کی پہاڑیوں پر جا کر رکھا۔ اور دسویں مہینے میں جا کر پہاڑ کی چوٹیاں دکھائی دیں۔ (پیدائش ۶) اور جب زمین نئے سرے سے خشک ہوئی تو جو جاندار کشتی نوح میں تھے ان کے علاوہ اور کہیں کوئی متنفس باقی نہ تھا (پیدائش ۶-۷)۔ لیکن قرآن کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ برعکس اس کے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نوح کا مخاطب اپنی قوم سے تھا۔ ان کی دعوت انہی کے لئے تھی اور اس دعوت کی تکذیب بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہذا یہ بنا ہی بھی انہی پر وارد ہوئی۔ باقی دنیا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، طوفان نوح کی آماجگاہ وہی وادی تھی جہاں یہ قوم آباد تھی۔ باقی رہا یہ کہ حضرت نوح نے اپنی دعاء میں یہ کہا تھا کہ

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَيَّ الْأَرْضَ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۶۴)

اے میرے رب ان ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑ۔

تو اس میں (الْأَرْضُ) سے مراد تمام صفحہ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی، قرآن کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں (الْأَرْضُ) سے مراد ایک خاص علاقہ ہے۔ مثلاً قصہ حضرت موسیٰ میں فرمایا ہے کہ

وَإِنْ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ ج (۸۴)

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک مصر میں بڑا ہی سرکش تھا۔

یہاں الارض ملک مصر کے لئے آیا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرد اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا، بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤد کے متعلق فرمایا۔

بَلَدًا ۚ وَ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ (۳۸)

اے داؤد ہم نے تجھے ملک (ارض) میں واکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤد کی سلطنت تمام صفحہ ارض پر نہیں تھی۔ بلکہ ایک خاص خطہ ملک میں تھی۔ لہذا ان مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں، بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعہ زیر نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصہ حضرت نوح میں "الارض" سے ہے۔

۲۔ حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے ۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا

(۲۹)

اس کا عام ترجمہ یہ ہے ۔

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا ۔

عمر نوحؑ | اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی؟ اگر تواریک کی طرف جائیے تو حضرت نوحؑ آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ نو سو سال کی لکھی ہیں چین کے مذہب (TAOISM) کا ایک بہت بڑا مبلغ (KWANG) چوتھی صدی قبل مسیح میں گورا ہے ۔ وہ یہ بتانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے ، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم رو بہ انحطاط نہیں ہوا ۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت لمبی لمبی لکھی گئی ہیں ۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورث اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی ۔ یہ عرصہ حکومت اس مورث اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا ۔ یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا ۔ اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی ۔ زیر نظر آیت میں ہے ۔

فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۲۹)

اس میں ایک ہزار سال کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِينَ کے ساتھ عَامًا کا ۔ سَنَةٍ اور عَامًا دونوں کے معنی سال ہیں اس فرق کے ساتھ کہ سَنَةٍ بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں ۔ اور عَامًا خوشحالی کے سال کو کہتے ہیں ۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا ۔ جو نو سو سال تک رہا ۔

اس ساڑھے نو سو برس کی مدت کو حضرت نوحؑ کے زمانہ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مندرجہ سدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نو سو باون سال کا فرق ہے ۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے ۔

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی غور طلب ہے ۔ عربی لغت میں سَنَةٍ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں

چار ہوتی ہیں۔ یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اَلْفَ سَنَةٍ کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال۔ اور عام طور سے سال کو کہتے ہیں۔ اس لئے اَلْخُمْسِينَ عَامًا (پچاس سال) کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔

بہر حال یہ منور تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضرات کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی اس لئے ان قیاسات میں سے جو بھی حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات انہیں ایسا ثابت کر دیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔



جماعتِ مومنین کی حفاظت ہم نے دیکھا ہے کہ جب حضرت نوحؑ کو آنے والے طوفان کی خبر دی گئی تو ان سے کشتی بنانے کے لئے کہا۔ اور اسی کشتی کے ذریعے انہیں اور ان کی جماعت کو غرقابی سے محفوظ رکھا گیا۔ اس سے واضح ہے کہ اس طبعی دنیا میں حفاظت اور ملامت، طبعی اسباب کے ذریعے ہوتی ہے۔ فوق النظر اسباب سے نہیں حضرت نوحؑ کے مخالفین انہیں کشتی بناتے دیکھتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اگر وہ ذرا بھی سوجھ بوجھ سے کام لیتے اور انہیں دیکھ کر اپنی کشتی بنا لیتے تو وہ بھی غرق ہونے سے بچ جاتے جتنی کہ جب حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو آواز دی تھی، تو اگر وہ باپ کا کہنا مان کر کشتی میں سوار ہو جاتا، تو وہ بھی غرقابی سے محفوظ رہ جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک طبعی اسباب اور طبعی قوانین فطرت کا تعلق ہے، کافر اور مومن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا اطلاق سب پر کیا ہوتا ہے (اس نکتہ کی مفصل بحث مختلف مقامات پر سامنے آئی جائے گی)۔

اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ابتدائی ادوار میں، عام طبعی اسباب کے لئے بھی وحی کی راہنمائی کا محتاج ہوتا تھا۔ حضرت نوحؑ کے زمانے میں لوگ کشتی بنانا بھی نہیں جانتے تھے۔ اس کے لئے وحی نے راہنمائی کی۔ اس سے ترشح ہوتا ہے کہ زندگی کے اسباب و عوامل جو آج پیش پا افتادہ اور عام ہیں، ان کی ابتداء وحی کی راہنمائی سے ہوتی ہوگی۔ جنوں جو انسانی علم و بصیرت نے ترقی کی، ان گوشوں میں وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہ رہی۔ اس کا دائرہ اقدار و اصولی حیات تک محدود ہو گیا۔ یہ وہ وحی ہے انسان جس کا ابد تک محتاج رہے گا۔ اسی لئے اسے مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ کر کے، وحی کا دروازہ بند کر دیا۔



یہ ہے قوم نوحؑ کی داستانِ عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضور پر وحی فرمایا:-

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۱۱۴)

راے رسول! یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو خود جانتا تھا اور نہ تیری قوم بمقصد اس سے یہ ہے کہ ان تاریخی شواہد سے یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے کہ دعوتِ خداوندی کو کن صبر کرنا مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخر الامر کامیابی اسی کے لئے ہوتی ہے۔

عیسائی معتزین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے قصے نبی اکرم کے زمانہ میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا ذکر کرتے رہتے تھے اس لئے حضورؐ اور اہل عرب ان سے واقف تھے۔ پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امور غیب ہیں جن سے نہ نبی اکرم آگاہ تھے نہ ان کی قوم۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے منعارف تھے لیکن جو تفصیل قرآن کریم بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبانِ زوہد و خلایق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں قصہ قوم نوح کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے **تورات کی تفصیل** بیان کردہ قصے اور قرآن کریم کا مقابلہ کر کے دیکھیے حقیقت واضح طور پر سامنے آجائیگی کہ اس تورات میں ذہن انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے اور قرآن کریم کے بیان میں کس قدر صداقت اور پاکیزگی ہے۔ قصص قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مؤرخانہ وقائع نگاری مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصہ قوم نوح میں اہم نقاط یہ ہیں کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کو خدا سے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متہم طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گزر گیا تو وہ قوم طوفان کے ذریعے ہلاک ہو گئی۔ اب دیکھیے کہ بائبل طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں ہے۔

اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال روز بروز صرف بدی ہی ہوتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے بچھٹا یا اور نہایت دل گیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا دوں گا۔ انسان اور حیوان کو بھی۔ اور کپڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک کیونکہ میں ان کے بنانے سے بچھٹا ہوں۔ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔ (پیدائش ۵-۶)

ذرا غور فرمائیے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالقِ ارض و سموات نے بنانے کو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنانے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحہ ارض سے مٹا دوں گا۔ یہ تھا وہ "مقصدِ عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوح برپا کیا گیا۔

۳۔ کتاب پیدائش کے مذکورہ صدر بیان، نیز اس کے دیگر بیانات سے ظاہر ہے کہ تورات کی رو سے طوفانِ نوح

عالمگیر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ صفحہٴ ارض پر جس قدر فوی روح موجود ہیں وہ ان سب کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طوفان کی عالمگیریت کا نظریہ ناپہنچی تحقیقات کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ اینٹیکس کا مضمون نگار عنوان ”طوفان“ (DELUGE) کے تحت لکھتا ہے کہ

ایک عالمگیر طوفان کا عقیدہ ارباب تحقیق و خبر کے نزدیک بالکل مرفوع القلم ہے۔

اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) قرآن کریم کی رو سے یہ طوفان صرف قوم نوحؑ کے علاقے میں آیا تھا نہ کہ ساری دنیا پر اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخی شواہد اور اثری انکشافات سے ہوتی جا رہی ہے۔

۳۔ تیسرا اہم نقطہ پیر حضرت نوحؑ کا واقعہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ اس کے ”غیر صالح اعمال“ سے کس طرح لے ڈوبے اور نبی کا نسبتی تعلق بھی اسے مکافاتِ عمل سے نہ بچا سکا اور وہ ”اپنا“ ہوتے ہوئے کیسے غیر بن گیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ بائبل میں پیر نوحؑ کا واقعہ کن الفاظ میں مذکور ہے۔ کتاب پیدائش کے یوس باب میں ہے:-

اور نوحؑ کیسیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک اٹلور کا باغ لگایا۔ اور اس کی مہی کر نشے میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو شکا کیا۔ اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی۔ تب سم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کا ندھوں پر دھرا اور پچھلے پاؤں جا کے اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا۔ پران کی مٹی اس کی طرف تھی کہ انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی کو نہ دیکھا۔ جب نوحؑ اپنے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا معلوم کیا۔ تب وہ بولا کہ کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلام ہو گا۔ غلام ہو گا۔ پھر بولا خداوند سم کا خدا مبارک اور کنعان اس کا غلام ہو گا۔ خدا یافت کو پھیلانے اور وہ سم کے ڈیروں

میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔ (کتاب پیدائش ۹: ۲۴-۲۵)

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اول حام کا قصور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کا ستر دیکھ لیا۔ لیکن اس کی سزا کا کچھ ذکر نہیں دوسرے یہ کہ قصور حام کا ہے لیکن لعنت اور پھٹکار کا سزا اور اس کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے۔ اور تیسری (اور سب سے اہم) شق یہ کہ (معاذ اللہ - معاذ اللہ) خدا کے ایک برگزیدہ رسول کو ایک ایسی بیہوشی میں پیش کیا گیا ہے جس سے معیذ فطرت کا تصور بھی کاٹپ اٹھے اس کے برعکس قرآن کریم نے حضرت نوحؑ کی جس مقدس سیرت کو پیش کیا ہے اس سے ان کی رفعت مرتبت اور علو مدارج درخشندہ و تابناک صورت میں سامنے آ جاتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوحؑ خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَ نُوحَ ۖ وَ الْإِبْرَاهِيمَ ۖ وَ الْإِسْمَاعِيلَ ۖ عَلَی الْعَالَمِينَ ۝ (۲۴)

بلاشبہ (یہ واقعہ ہے کہ) اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔

وہ عہد شاکر تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۖ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝ (۷۸)

تم ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کر دیا تھا۔ اور وہ ہمارا ایسا بندہ تھا جس کی سعی و عمل حسن نتائج سے بھرپور ہوئے تھے۔

خدا کے مومنین کی جماعت میں سے تھے۔

وَلَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُوْنَ ۝..... إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۷۸-۷۹)

اور یقیناً نوحؑ نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے پکار کا جواب دینے والے ہیں۔ اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو

کربِ عظیم سے نجات دی۔ اور اس کی نسل کو باقی رہنے والوں میں رکھا۔ اور آنے والوں میں اس کا (نیک نام) باقی رکھا

نوحؑ پر اقوامِ عالم میں سلام ہو۔ اس طرح ہم مخلص بندوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ

فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ (۸۰)

اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ سو ان (کی ذریت) میں سے

ہدایت پر بھی ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔

مدا نے ان کی پکار کو سنا اور اسے شرف قبولیت سے نوازا۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ

الْعَظِيمِ ۝ (۸۱) ذ (۸۱-۸۲)

اور (اسی طرح) نوحؑ کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو ان (نبیوں) سے پیشتر کا ہے، جب اس نے ہمیں پکارا تھا (تو دیکھو)

ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے اور اس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دے دی۔

اور یہ اس لئے کہ آپ احکاماتِ الہیہ کے سچے فرمانبردار، پیکرِ تسلیم و رضا اور مظہرِ طاعت و انقیاد تھے۔ (۸۲-۸۳)

آیت (۸۳) میں وَأُصْرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے

مُسلم کے اندر بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقامِ نبوت وہ مقام ہوتا ہے جہاں خدا

کے قوانین و احکام کی کامل اطاعت ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کریم نے جس سب سے پہلے رسولؐ کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ دیکھیں گے کہ اس سلسلہ ذریعہ میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ بندے اسی گرامی مرتبہ خطاب سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیل شرف انسانیت کا راز ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوحؑ سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضورؐ منتہی مرتبت کے عہد ہمایوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا۔ گویا سلسلہ رسالت و نبوت کی داستانِ قدسی، اسلام اور امتِ مسلمہ کی ہی داستان ہے۔

لہذا، تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ بنا بریں یہ کہنا کہ قرآن میں مذکور واقعہ تورا سے اخذ کیا گیا ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

﴿

یہ ہے تذکرہ حضرت نوحؑ کا جن کی ذریت میں تمام انبیائے اہم سامیہ مبعوث ہوئے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَ مِمَّنْ
حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (۱۹)

یہ انبیاء ہیں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدمؑ کی نسل سے اور ان سے جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ رکشتی میں) سوار کیا تھا۔

یہی بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنۢ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۖ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝ (۱۶)

تم (اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل جو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوحؑ کے ساتھ رکشتی میں) سوار کرایا تھا۔ وہ ایک عبد شکور تھا۔

تاریخ کے پارہ اور منتشر اوراق اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال کا رخ اسی موسمِ اولیٰ کی طرف ہے۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہد کھن کے متعلق کیا کیا امور منصفہ شہود پر آئیں گے۔ سردست اربابِ نظر کیلئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (DELUGE) کی داستانیں دنیا کی قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر

کرتی ہے۔ یونان۔ ایران۔ ہندوستان۔ چین جتنی کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیرِ لادین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یقصہ بڑے دلچسپ انداز میں مذکور ہے۔ رست پست برہمن میں ہے کہ ایک دن منوجی کے لئے غسل کا پانی لایا گیا تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفانِ عظیم سے نجات دلا دوں گی۔ منوجی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کر کے سمندر تک پہنچا دیا۔ اور اس کی ہدایت کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منوجی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا۔ جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سورہے تھے تو ایک دیو ویدوں کو چرا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس مل کر یدراز ستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی۔ اس میں ہری جی نے ایک عظیم نشان طوفان بلا انگیز برپا کر کے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و مل میں بھی طوفان کے قصے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کیا معلوم انیوائے انکشافات، ان مختلف ممالک و متنوع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصوں کی قدر مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہر حال قرآن کریم میں جس طوفان کا قصہ مذکور ہے اُسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ ایک ”پرانا قصہ“ نہیں۔ اقوام و مل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینے میں تقدیرِ اعم کے خطوط ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔



جن افسانوں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ہمارے مناظر انہیں غیر مذاہب کے سامنے پیش کر کے ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ بھول جاتے ہیں کہ خود ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے افسانوں کی کمی نہیں۔ قرآن مجید میں کشتی حضرت نوح کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لیکن ہمارے ہاں تفسیر ابن کثیر بڑی قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ”اس کشتی کے لئے ایک سو سال لکڑیاں کاٹ کر تختے بنانے میں لگ گئے۔ پھر ایک سو سال کے عرصہ میں یہ تیار ہوئی۔“



اُس کا طول اسی (۶۰) ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ کا تھا۔ اندر باہر سے روغن کیا گیا تھا۔ بانی کاٹنے کے پُر پُر سے بھی تھے قتاوہ کا قول ہے کہ مبائی تین سو ہاتھ کی تھی۔ ابن عباس کا فرمان ہے کہ طول بارہ سو ہاتھ کا تھا اور چوڑائی چھ سو ہاتھ کی تھی۔ کہا گیا ہے کہ طول دو بارہ ہاتھ اور چوڑائی ایک سو ہاتھ کی تھی واللہ اعلم۔ اس کی اندرونی اونچائی تیس ہاتھ کی تھی۔ اس میں نین درجے

تھے ہر درجہ دس ہاتھ اونچا تھا۔ سب سے نیچے کے حصے میں چوپائے اور جنگلی جانور تھے۔ درمیان کے حصے میں انسان تھے، اوپر کے حصے میں پرندے تھے۔ دروازہ چوڑاں میں تھا اوپر سے بالکل بند تھی۔ ابن جریر نے ایک غریب از عبد اللہ بن عباس سے ذکر کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم سے درخواست کی کہ اگر آپ بحکم خدا کسی ایسے مرد سے کو جلاتے جس نے کشتی نوح دیکھی ہو تو ہمیں اس سے معلومات حاصل ہوتیں۔ آپ انہیں لے کر چلے، ایک ٹیلے پر بیٹھ کر وہاں کی مٹی اٹھائی اور فرمایا جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہی علم ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ بپٹلی ہے عام بن نوح کی۔ پھر آپ نے اپنی لکڑی اس ٹیلے پر مار کر فرمایا۔ اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑا ہو۔ اسی وقت ایک بڑھا سا آدمی اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو بڑھاپے میں مرا تھا؟ اس نے کہا نہیں مرا تو جوانی میں تھا لیکن اب دل پر دہشت ٹپٹی کہ قیامت قائم ہوگی۔ اس دہشت نے بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا! حضرت نوح کی کشتی کی بابت اپنی معلومات بیان کر دو۔ اس نے کہا کہ وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔ تین درجوں کی تھی ایک میں جانور اور چوپائے تھے، دوسرے میں انسان، تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گو بھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی موم ہلاؤ۔ اس کے ہلانے ہی اس سے خنزیر زادہ نکل آئے اور وہ میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پر انگلی لگا۔ اس سے بلی کا جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو شہروں کے غرقاب ہونے کا علم کیسے ہو گیا؟ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کوئے کو خبر لینے کے لئے بھیجا لیکن وہ ایک لاش پر بیٹھ گیا دیر تک نہ آیا آپ نے اس کے لئے ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بد دعا کی۔ اس لئے وہ گھروں سے مافوس نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چوچ میں زیتون کے درخت کا پتہ لے کر آیا اور اپنے پنجوں میں خشک مٹی لایا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ شہر ڈوب چکے ہیں۔ آپ نے اس کی گردن میں حصہ کا طوق ڈال دیا اور اس کے لئے اس دعا کی دعا کی۔ پس وہ گھروں میں رہتا سہتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ اسے رسول اللہ! آپ انہیں ہمارے ہاں لے چلئے کہ ہم میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہمیں سنائیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تمہارے ساتھ کیسے آسکتا ہے جبکہ اس کی روزی نہیں۔ پھر فرمایا اللہ کے حکم سے جیسا تھا ویسا ہی ہو جا وہ اسی وقت مٹی ہو گیا۔ (حوالہ: تفسیر ابن کثیر بارہواں پارہ۔ ص ۱۸)

کشتی میں جو مخلوق سوار ہوئی تھی، اس کے متعلق بھی تفصیل دی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:-

نوح علیہ السلام کو حکم خدا ہوا کہ اپنے ساتھ کشتی میں جاندار مخلوق کی قسم کا ایک ایک جوڑا زادہ سوار کرلو۔ کہا گیا ہے کہ غیر جاندار کے لئے بھی یہی حکم تھا۔ جیسے نباتات۔ کہا گیا ہے کہ پرندوں میں سب سے پہلے درہ کشتی میں آیا اور سب سے

آخر گدھا سوار ہونے لگا۔ ابلیس اس کی دُم میں ٹسک گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آ گئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑاٹھا ناچا پاؤں اٹھسکا کیونکہ دُم پر اس ملعون کا بوجھ تھا حضرت نوح جلدی کر رہے تھے۔ یہ ہتھیار چابوتا تھا مگر پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتے تھے۔ آخر آپ نے فرمایا آجاگو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ آیا۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ شیر کو اپنے ساتھ لے جانا مشکل ہو پڑا۔ آخر اسے بخار چڑھ آیا تب اسے سوار کر لیا۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب تمام مولیشی اپنی کشتی میں سوار کر لئے تو لوگوں نے کہا شیر کی موجودگی میں یہ مولیشی کیسے آرام سے رہ سکیں گے؟ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر بخار ڈال دیا۔ اس سے پہلے زمین پر یہ بیماری نہ تھی۔ پھر لوگوں نے چوہے کی شکایت کی کہ یہ ہمارا کھانا اور دیگر سب چیزیں خواب کر رہے ہیں تو خدا کے حکم سے شیر کی چھینک میں سے ایک بلی نکلی جس سے چوہے دب کر کونے کھدرے میں بیٹھ رہے۔ (ایضاً۔ ص ۱۱)



یہ ہے اس تحقیق کا ماحصل جسے ہمارے مفسرین نے پیش کیا ہے۔ افسوس اس کا تو نہیں کہ انہوں نے اس قسم کی افسانہ تراشیاں کیوں کیں۔ رنج اور صدمہ اس بات کا ہے کہ یہ حضرات ان چیزوں کو منسوب کر دیتے ہیں حضور نبی اکرم کی ذات گرامی کی طرف۔ اس سے دنیا کی نگاہوں میں حضور کا جس قسم کا تصور قائم ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔



سورۃ الاعراف میں جو ہمارے زیر نظر ہے آیات (۴۹-۵۹) داستان قوم نوح سے متعلق ہیں۔ یہ داستان سابقہ صفحات میں سامنے آ چکی ہے۔ بایں ہمہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ آیات اور ان کا مفہوم بھی یہاں پیش کر دیا جائے تاکہ اس تفسیر میں تسلسل قائم رہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

۴
۵۹

خدا جی کائنات پر غور و غوض کے بعد، تم تاریخی شواہد کی طرف آؤ اور دیکھو کہ خود عالم انسانیت میں ہمارا یہی قانون کس طرح کار فرما چلا آ رہا ہے۔

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف (یہی قانون دے کر) بھیجا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم خدا کے قانون کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ

روش پر قائم رہے، تو مجھے نظر آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

۴۰۔ اِمَّا قَالِ الْمَلَا مِنْ قَوْمِهِ اِنَّا لَنُرِيكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

جب اُس کی قوم کے اُن سرداروں نے جن کے ہاں فراوانی تھی، اس بات کو سنا تو انہوں نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو، ہمیں اس روش پر چلنے سے اس قدر مال و دولت اور قوت و اقتدار حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اس سے ہم پر تباہی آجائے گی!۔

۴۱۔ قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

نوحؑ نے کہا کہ میں، نہ خود غلط راستے پر ہوں، نہ ہی تمہیں غلط راستے کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں اُس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام کائنات کا نشوونما دینے والا ہے۔ (تمہیں یہ پیغام اس لئے انوکھا سا نظر آتا ہے کہ تم صرف اپنی نشوونما کی فکر کرتے ہو اور خدا کا قانونی، عالمگیر انسانیت کی نشوونما کا ذمہ دار ہے)۔

۴۲۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلَتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

یہ وہ پیغامات ہیں جو تمہیں اپنے رب کی طرف سے تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، بدخواہ نہیں ہوں۔ میں تمہارے چاک گریبان کی رفوگری کرنا چاہتا ہوں اور خدا کے عطا کردہ علم کی بنا پر تم سے وہ کچھ کہتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (تم سبھی بیٹھے ہو کہ تمہاری روش، فلاح و کامرانی کی راہ ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ یہ تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ ہے)۔

۴۳۔ اَوْ عَجِبْتُمْ اَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَاَلْتَقُوا وَلَعَلَّكُمْ تَرْحَمُوْنَ ۝

تمہیں اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ خدا اپنے پیغام کو تم تک ایک ایسے آدمی کے ذریعے کیوں پہنچا رہا ہے جو تم میں سے ہی ہے، اور تمہارے جیسا ہی ہے، تاکہ وہ تمہیں اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرے، اور تم تباہیوں سے بچ جاؤ، اور تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچ جائے۔ (تمہارے ذہن میں یہ ہے کہ خدا کے پیغامبر کو عجیب الخلقیت سا بنونا

چاہیے!)

۴۴۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَلَّذِيْنَ مَعَهُ فِي الْفُلِّ وَاَعْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عٰمِيْنَ ۝

غرضیکہ نوحؑ نے انہیں ہر ممکن طریق سے سمجھا دیا لیکن انہوں نے نوحؑ کی ہر بات کو جھٹلایا۔ آخر اللہ ہم نے اُسے، اور

اس کے سانصبیوں کو کشنی میں سوار کر کے بچایا، اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین جھٹلایا تھا، انہیں غرق کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ عقل و تدبیر کو کھوکھلا کر بالکل اندھے ہو گئے تھے۔ (ورنہ نوح ان کے سامنے کشتی بنا رہا تھا اور انہیں اسے سیلاب سے انہیں آگاہ کر رہا تھا۔ وہ ذرا بھی عقل و فکر سے کام لیتے تو اس کی بات ان کی سمجھ میں آ جاتی)۔

ۛ

اس کے بعد آیات (۴۴-۴۵) میں قوم عاد کی داستان ہے جس کی طرف حضرت ھودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس داستان کو بھی ہم اسی انداز اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں جس طرح داستان قوم نوحؑ پیش کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن کریم میں جہاں جہاں اس کا ذکر آیا ہے ان تمام مقامات کو مسلسل سامنے لایا جائے۔

قوم عاد حضرت ھودؑ

جیسا کہ سابقہ عنوان میں لکھا جا چکا ہے۔ تورات کی رو سے اقوام عالم کی تقسیم حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں (یافت۔ حام اور سام) کی نسل کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ تورات کی اس تقسیم کی تاریخی حیثیت کچھ ہی ہو، لیکن تحقیقات جدیدہ اس نتیجہ تک ضرور پہنچ چکی ہیں کہ عرب اور اس کے گرد و پیش (شام عراق وغیرہ میں) اُمم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم و مقتدر قبیلہ عاد کا تھا۔ قبیلہ کیا! یہ تو ایک عظیم انسان قوم تھی جو ایک طرف حفص موت اور میں کے علاقے سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی۔ اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر اور شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال (ق۔ م) تک ان تمام علاقوں پر اسی قوم کا تسلط و اقتدار نظر آتا ہے۔ سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ جب دو اڑھائی ہزار سال (ق۔ م) اس قوم کا ستارہ اقبال اوج پر تھا تو اس زمانہ میں قوموں کے عروج و زوال کی رفتار کے اعتبار سے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی ابتدا کب سے ہوئی ہوگی؟ یوں سمجھئے کہ قوم نوحؑ کی بربادی کے بعد جب یہ علاقہ دوبارہ آباد ہوا ہے تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی ہے۔ یہی قوم عاد ہے جسکی طرف حضرت ھودؑ مبعوث ہوئے۔ ان کا مقام بشت و بیلین اخفاف کا علاقہ تھا۔ اخفاف صحرا کو کہتے ہیں۔ جزیرہ نما عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب رُبع خالی کہا جاتا ہے، اخفاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہ تسان رست کے ٹیلے، خوف و دہشت کے بھیاں ک عفاریت کی طرح سراٹھائے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اسے اس طرح نیچے دبا لیتے

ہیں کہ پھر حکمہ آثار قدیمہ والے ہی ان کا سراغ لگائیں تو کچھ پتہ چلے۔ کیا معلوم ان ٹیلوں کے نیچے کتنی آبائیاں، قبرستانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ کم از کم ایک کا ذکر تو سن لیجئے۔ یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہودؑ کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے۔ اَلَا اُن کے جو حضرت ہودؑ کے ساتھ بچائے گئے اور جو پھر عاوانیہ کہلائے۔ کیونکہ عاوانی وہ تھے جو اپنی غلط روش زندگی کی وجہ سے تباہ ہو گئے تھے۔



قوم نوح کی جانشین | قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم کے بعد قوم عاد کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ اور انہیں دُنیا میں بڑا اقتدار و تسلط اور دوست و قوت عطا فرمائی۔

﴿۴۹﴾ **وَإِذْ كُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَضْطَةً ۖ فَادْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝**

تم سوچو کہ قوم نوحؑ کیوں تباہ ہوئی؟ اس لئے کہ اُس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے بعد خدا نے تمہیں ان کا جانشین بنایا تمہیں بڑی قوتیں اور فرخیاں عطا کیں۔ تم خدا کی ان قوتوں اور نعمتوں کو پیش نظر رکھو اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی مت کرو، تاکہ تم کامیاب ہو۔

فارغ ابال و مرقہ الحال | اب پاشی و میرابی کے لئے قدم قدم پر چشمے اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات، افراد اور مویشی کی کثرت۔ یہی کچھ اُس زمانہ میں قوت و سطوت کے حصول و استحکام کے ذرائع تھے۔ حضرت ہودؑ نے انہیں قوانین الہیہ کی دعوت دیتے ہوئے انہی انعامات خداوندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

﴿۲۶﴾ **وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْمَلُونَ ۖ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامِهِ وَبَنِينَ ۖ وَجَنَّتٍ وَ عَيُْونٍ ۝ (۱۳۲-۱۳۳)**

تم اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو جس نے، جیسا کہ تم خود جانتے ہو، تمہیں سامانِ زیست کی اس قدر فراوانیاں عطا کر رکھی ہیں۔

مالِ مویشی کی کثرت۔ قبیلے کے افراد کی بہتات۔ لہلہاتے باغات۔ ان کی میرابی کے لئے آبِ رواں کے چشمے۔ (یہ سب خدا نے دے رکھے ہیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بنیادی طور پر تمہاری پیدا کردہ ہو، لیکن تم اس سامانِ زیست سے حاصل کردہ قوت کو، دوسروں پر ظلم و استبداد کے لئے استعمال کرتے ہو۔) ﴿۲۶﴾

وہ ایسے ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ کے لئے حکومت کرنی ہے۔
وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۝ (۲۶)

اور تم ظن طرح کے ساز و سامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے رہتے ہو (اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو، بلکہ) اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ و اقتدار اور جو رواج و استبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

ستونوں والے | اسی بناء پر قرآن کریم نے انہیں ”ستونوں والے“ کہا ہے۔

الَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ إِرَامَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۚ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ
مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۚ ۝ (۸۹-۹۰)

(ان لوگوں کا انجام بھی ویسا ہی ہونے والا ہے، جیسا انجام، انہی جیسی اقوام سابقہ کا ہوا تھا مثلاً) قوم عاد کا جو ارم کی اولاد میں سے تھے۔ انہیں قابل اعتماد سامان زینت بڑی فراوانی سے حاصل تھا۔ (۱۳۳-۱۳۴)۔ وہ بڑی عمارات بناتے اور بلند یادگاریں تعمیر کرتے تھے (۱۳۵)۔ انہیں، اپنی ہم عصر اقوام میں، بے نظیر مقام حاصل تھا۔ جیسا کہ دنیا کی بڑی بڑی صاحب قوت و سطوت اقوام کا شیوہ ہوتا ہے، وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنی یادگاریں قائم کرتے تھے۔ اس قسم کی یادگاروں کی افادہ حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض اس قوم کے جذبہ تکبر و تعلیٰ کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں قرآن کریم کے الفاظ میں حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ اَتَبْنُونَ بُكُورًا ۚ اِنَّكُمْ تَعْبَثُونَ ۝ (۱۳۶) ”تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسی عمارات بطور یادگار بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں“

علم و بصیرت بھی | غرضیکہ انہیں ایسا نمک عطا ہوا تھا کہ شاید ہی کسی اور کے حصہ میں آیا ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ تمام قوت و حشمت، جہالت کو لئے ہوئے نہ تھی۔ بلکہ انہیں ذرائع علم (سماعت و بصارت قلب) بھی عطا ہوئے تھے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا اَن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً ۚ ۝ (۳۶-۳۷)

(اور، وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی جس قدر جاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار انہیں حاصل تھا، ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز، وہ غیر مبذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع — سماعت، بصارت اور قلب — حاصل تھے۔

قرآن کریم نے سمع و بصر کے الفاظ اس علم کے لئے استعمال کیے ہیں جو مظاہر فطرت پر غور و تدبر کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) جو حواس کے ذریعے مشاہدات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سمع و بصر، حواس کے ترجمان ہیں اور ان کے ساتھ تیسرا لفظ اخذ ہوتا ہے۔ اس کے معنی (MIND) کے ہیں یعنی مشاہدات فطرت سے معلومات حاصل کر لینے کے بعد قلب اور دماغ کے ذریعے استنباط نتائج کرنا۔ اسی قسم کا علم تھا جو قوم عاد کو حاصل تھا یہ سب کچھ تھا لیکن اس علم کے حاصل (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ سائنس کی ایجادات وغیرہ کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا جاتا تھا۔ قوانین خداوندی کا تقاضا ہے کہ علم کے حاصل کو نوع انسانی کی منفعت کے لئے صرف کیا جائے لیکن جو قومیں غلط روش زندگی پر چلتی ہیں وہ ان قوتوں کو باقی انسانوں کی غلامی کا ذریعہ بنا لیتی ہیں اور ان کی محنت کی کمائی کے سلب و نہب (EXPLOITATION) کو اپنی کارگیری قرار دے لیتی ہیں۔ یہی کچھ قوم عاد کو کرتی تھی۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ ہر مستبد قوم کی طرح ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جن قوموں پر ہاتھ ڈالا، آہنی شکنجے میں جکڑ لیا کہ ان کی غلامی کے جال کا کوئی حلقہ ڈھیل مانہ ہونے پائے۔

وَإِذَا بَطِشْتُمْ بَطِشْتُمْ جَبَّارِينَ ۝ (۲۶)

اور تم، کمزوروں پر اپنے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دیتے تاکہ تمہارا غلبہ و اقتدار اور جور و استبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

تکذیبِ رسول ﷺ | اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق رسول بھیجے لیکن نشہء حکومت و قوت میں بدست قومیں پیغاماتِ خداوندی پر کان کب و دھرتی ہیں؟ انہوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی اور اپنے ظلم و استبداد میں بڑھتے چلے گئے۔

كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶)

قوم عاد نے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

قوانینِ خداوندی سے بغاوت، اور اپنے سرکش و جاہلِ اباب حکومت کا اتباع۔ یہ تھا شیوہ اس قوم کا۔
وَتِلْكَ عَادُ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ (۱۱)

یہ ہے سرگزشت قوم عاد کی، جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی دعوت سے سرکشی برتی۔ اور اس کے برعکس اپنے ان سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجہ کفر کی مخالفت کرتے تھے۔

حضرت ہودؑ بالآخر جب جوہر استبداد اور سرکشی و عصیان کی انتہا ہو گئی اور سنت اللہ (قانون مکافات) مطابق ان کی غلط روش زندگی کے ظہور نتائج کا وقت قریب آ پہنچا تو آخری کوشش کے طور پر ان کی طرف اُنہی میں سے ایک رسول (حضرت ہودؑ) کو بھیجا گیا۔

﴿۴۵﴾ وَ اِلٰی عَادِ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ لِقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ ط اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۴۶) نِز (۵۰ : ۱۱۰ : ۲۶۴ : ۴۶۴)۔

اسی طرح، ہم نے قوم عاد کی طرف، ان کے بھائی بندوں میں سے ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ تم قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ کیا تم غلط روش کی تباہ کاریوں سے بچنا نہیں چاہتے؟ (نیز ۵۰ : ۱۱۰ : ۲۶۴ : ۴۶۴)۔

خدا کی حکمرانی کی طرف دعوت آپ آئے اور اس سرکش و متمرد قوم کو اسی پیغام ازلی کی دعوت دی جو ہدایت آسمانی کی اصل و اساس ہے یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کی سزا اور فقط ایک ذات باری تعالیٰ ہے۔ (۴۵ : ۵۰ : ۱۱۰ : ۴۶۴)۔

قوانین الہیہ اور دنیاوی برکات قوم کو قوت و سطوت حاصل تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ ہدایت آسمانی کے اشیاع سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم حکومت و دولت کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دیں اور زادیوں اور خالقاہوں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر ریسانیت کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ لیکن حضرت ہودؑ نے اس باب میں ایک ایسی حقیقت کو واضح کر دیا جو اتباع قوانین الہیہ کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

وَلِقَوْمٍ اسْتَغْفَرُوا رَبَّهُمْ ثُمَّ تَوَبُّوْا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلٰیكُمْ مِّدْرَارًا وَيَزِدُّكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَكَّلُوْا مُجْرِمِیْنَ ۝ (۵۳)

میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی غلط روش کی وجہ سے، آنے والی تباہی سے بچنے کے لئے قوانین خداوندی سے حفاظت طلب کرو۔ اور اپنے باطل عقائد چھوڑ کر، اس کی طرف لوٹ آؤ۔ تم اس کی شانِ ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح تمہاری خشک زمینوں کو بارش سے سیراب کرتا ہے جس سے تمہاری قوتیں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تم اُس کے قوانین کی اطاعت کر کے اپنی شکرگزاری کا ثبوت دو۔ نہ یہ کہ اُس کا ظلم و ستم پر تڑپو اور مجرمین کی طرح اُس کے قوانین سے منہ موڑ لو۔

یہ بے غلط فہمی آسمانی ہدایت اور ذہن انسانی کے پیدا کردہ تصور مذہبیت میں۔ ذہن انسانی نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ

دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور دونوں یک جا نہیں ہو سکتے۔ دنیا سے مراد ہے قوت و سلطنت، دولت و شہرت، حکومت و سلطنت کی زندگی اور دینداری سے مفہوم ہے بے کسی و بے چارگی۔ عاجزی و ناتوانی، مفلسی و ناداری کی زندگی یعنی وہ زندگی جس میں دنیا اور اس کی خوشگوار یوں سے نفرت کی جائے اور ترک لہذا اُن سے پرہیز گاری کو مقصد حیات قرار دیا جائے لیکن یہ تصور کبیر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دین کا تصور یہ ہے کہ سرکش و متمرد انسانوں سے قوت و حکومت اور رزق کے سرچشمے چھین کر جماعت مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دیدیئے جائیں جو اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال نہ کرے بلکہ قوانین خداوندی کے تحت نظم و ضبط عالم کو ترتیب دے اور تمام نعمائے دنیا کو نوع انسانی کی پرورش اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے عام کر دے (اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں بیان کی جا چکی ہے) حضرت ہوڈ نے یہی فرمایا کہ جس تعلیم کی طرف دعوت دیتا ہوں اُس کا نتیجہ کمزوری اور ناداری نہیں، بلکہ اس سے تمہاری قوتیں اور بڑھ جائیں گی۔ فقط نظام معاشرہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جس سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ اس نظام کی عملی تشکیل یوں ہوگی کہ :

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَأَطِيعُوا ۝ (۲۶-۲۷) ذ (۱۳۱)

میں تمہاری طرف، خدا کے ہاں سے، امن و سلامتی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ لہذا، تم قوانین خداوندی کی نگہداشت

کرنے کے لئے، میری اطاعت کرو۔ (نیز ۲۶/۱۳۱)

غور کیجئے۔ منصب رسالت کی صحیح حقیقت کس طرح واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ اس کے قوانین کا اتباع کرو۔ اپنی اپنی جگہ، الگ الگ، نہیں۔ بلکہ اس حکومت خداوندی کے مرکز اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کرو۔ اس اطاعت میں، میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجَبْتُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶-۲۷) ذ (۱۱)

یہ بھی سُن لو کہ میں، اس کے بدلے میں، تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ مجھے خدا کی ربوبیت عالمین کی طرف

سے مل جائے گا۔ (نیز ۱۱/۱۱)

تکذیب۔ ارباب اقتدار کی طرف سے | یہ تھا وہ معاشرہ جس کی طرف حضرت ہوڈ نے قوم کو دعوت دی۔ لیکن جابر و مستبد انسان جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگ گیا ہو، بھلا کس طرح اس نظام کو قبول کریں؟ اسکی سب سے پہلی تکذیب حسب معمول۔ قوم کے سرواڑوں کی طرف ہونی انہی سرواڑوں کی طرف سے

جن کے گھروں میں ”برتن بھرے ہوئے تھے“

۴۶ ۴۶ قَالَ الْمَلَأُوا مِمَّنْ قَوْمًا إِيَّاكَ لَنُظَنَّنَكَ مِنَ الْكَذِبِينَ ۝

(قوم نوح کی طرح) اُس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جو اس دعوت کی مخالفت کرتے تھے، کہا کہ ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل اور ہوش کھو بیٹھے ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں بنا ہیوں کی طرف لے جائے گی، اور یہ پیغام تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے، یہ جھوٹ ہے۔

۴۷ ۴۷-۴۹ قَالَ يَقَوْمِ كَيْسَ بِي سَفَاهَةً وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَبَلَّغْكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ۝ أَوْ عَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۖ وَذِكْرُكُمْ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَضْطَةً ۖ فَادْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

ہوئے ان سے کہا کہ میں عقل و ہوش نہیں کھو بیٹھا۔ (میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں)۔ میں اُس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام کائنات اور عالمگیر انسانیت کا نشوونما دینے والا ہے۔ (چونکہ یہ تصور تمہاری انفرادی مفاد پرستیوں کے خلاف جاتا ہے، اس لئے تم اس کی مخالفت کرتے ہو)۔

میں تمہاری طرف، اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات پہنچاتا ہوں۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تم کو امن و سلامتی کی راہ دکھا رہا ہوں۔

کیا تمہیں اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ خدا نے تمہاری طرف، اپنا قانون ہدایت، ایک ایسے انسان کے ذریعے کیوں بھیجا جو تمہارے جیسا ہے، اور تم میں سے ہی ایک بنے تاکہ وہ تمہیں اسکی خلافت و رزی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرے؟ (تم سمجھتے تھے کہ خدا کا پیغام کوئی عجیب الخلق انسان ہونا چاہیے!) تم سوچو کہ قوم نوح کیوں تباہ ہوئی؟ اسی لئے کہ اس نے غلط روش اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے بعد خدا نے تمہیں اُن کا جانشین بنایا۔ تمہیں بڑی قوتیں اور فرائض عطا کیں۔ تم خدا کی ان قوتوں اور نعمتوں کو پیش نظر رکھو (اور اُسکے قوانین کی خلافت و رزی مت کرو) تاکہ تم کا میاب ہو۔

ان آیات جلیلہ میں دو تین باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ نشہ حکومت و دولت میں سرمست انسان، دعوت الی الحق کو کس طرح نفرت و استہزاء سے ٹھکراتا ہے؟ اِنَّا لَنَرُكَ فِي سَفَاهَةٍ اور لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ پر غور کیجئے۔ تہرہ و سرکشی کی بدستیاں کس طرح چمکتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اس کے برعکس جواب دیکھئے! کس قدر متانت اور سنجیدگی کا مظہر ہے۔ شکن بچیں نہیں۔ کت بدباں نہیں۔ نسل برآتش نہیں۔ گالی کا جواب (معاذ اللہ) گالی نہیں۔ کوئی اوجھاپن نہیں۔ سفاہت نہیں۔ اپنے مقام بزرگ و بلند پر پہاڑ کی طرح محکم کھڑے ہیں۔ اس لئے **محکم چوں کو ہمسار**۔

کراپنی دعوت کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہے۔ قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ کی مخالفت کا اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قوم مخالف کے جدال و قتال کی نسبت ان کی طرف سے تکذیب و استہزاء کا ذکر بڑا نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ جدال و قتال بھی اپنے مقام پر آزمائش کی گھائیاں ہیں۔ لیکن ایک داعی و مصلح کی راہ میں تکذیب و تحقیر کی منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ عام انسانوں پر نگاہ ڈالئے۔ وہ بالعموم بڑی بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کر لیں گے لیکن جونہی ان پر کسی نے تنقید (CRITICISM) کی یا ان کا استہزاء (RIDICULE) کیا۔ ان کی بات کو جھوٹا بتایا۔ ان کی دعوت کا مذاق اڑایا تو وہ فوراً آپس سے باہر ہو گئے۔ اور اس کے بعد ایسی چوڑھی بھولے کہ حصول مقصد و نصب العین کے لئے ٹگ و تاز کے بجائے، اسی تنقید و تنقیص کی خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ استہزاء و تنقیص کے مرحلہ میں دامن ضبط و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، فی الواقعہ من عزم الامور ہے اور آسمانی انقلاب ربوبیت کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ سرداران قوم کی اشتغال انگیز تنقیص پر نگہ ڈالئے اور اس کے بعد حضرت ہودؑ کے متین و شدید جواب پر۔ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

دوسری چیز، وہی ذہن انسانی کی عجوبہ پسندی! یعنی قوم کو حیرت و استعجاب اس امر پر ہے کہ اُنہی جیسا ایک انسان (سَرَجُلٌ مِّنْكُمْ) اور دعوائے رسالت! قَالُوا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۱۴) (اُنہوں نے کہا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو) اور کوئی فوق الفطرت نشانی بھی تمہارے پاس نہیں۔ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (۱۵)۔ اس لئے

مَا نَحْنُ بِتَارِكِي الْبَيْتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۱)

تم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جسے ہم واقعی محکم دلیل سمجھیں۔ ہم اپنے معبودوں کو محض تمہارے کہنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لئے ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔

اس کے بعد اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ تم جو (معاذ اللہ) اس قسم کی ہلکی ہلکی باتیں کرتے ہو تو اس کی وجہ ہماری سمجھ

میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں آتی کہ تم نے جو ہمارے دیوی دیوتاؤں کی امانت کی ہے تو تم پران میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔

إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوِّهِ (۱۱)

ہمیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ تم نے جو ہمارے معبودوں کی گستاخی کی ہے تو تم پر، ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے (جو تم اس قسم کی ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ اس سے پہلے تم اچھے بھلے تھے)

یہ جگر سوز طعن و تشنیع دیکھئے اور پیغمبرانہ جواب ملاحظہ فرمائیے کہ:

قَالَ إِنِّي أَشْهَدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا إِنِّي بَرِيٌّ مِمَّا تَشْرِكُونَ ۝ (۱۲)

اس کے جواب میں ہوؤ نے صرف اتنا کہا — اور اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں سے اور کہا بھی کیا جاتا! — کہ میں اس پر خدا کو گواہ ٹھیکرتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہنا کہ تم غیر اللہ میں سے جس جس کو اس کا شریک قرار دیتے ہو، میں ان سے یکسر بیزار ہوں۔

اسلاف پرستی | یہاں تک تو نشہ قوت و دولت کی سرستوں کے مظاہرے تھے۔ اب دنیاۓ

معتقدات اور اس کی جذبات پرستی کی طرف آئیے، یعنی وہی ساز کہن کہ چونکہ تمہاری دعوت اس مسلک کے خلاف ہے جو ہم میں آباؤ اجداد سے منوارث چلا آ رہا ہے اس لئے ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں! وہی اسلاف پرستی اور وہی قدامت پسندی۔

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۚ

انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمیں یہ کہنے کے لئے آئے ہو کہ جن ریتوں اور قوتوں کو ہمارے آباؤ اجداد اپنا معبود مانتے چلے

آئے ہیں، ہم انہیں چھوڑ دیں اور صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کر لیں؟

اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے اس ادعا کے جواب میں حضرت ہوؤ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس میں ارباب فکر و نظر کے لئے حکم و بصائر اور معارف و حقائق کی ہزار داستانیں مستور ہیں۔ فرمایا۔

أَتَجَادِلُونََنِي فِيْ أَسْمَاءِ سَيِّئَاتٍ سَيِّئَاتُهَا أَنْتُمْ وَآبَاءُكُمْ مَا نَزَّلَ اللَّهُ

بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط

وہ تو تین سہیل تمہارے اسلاف نے اپنا معبود بنا رکھا تھا، ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ چند اصطلاحی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے وضع کر رکھے ہیں۔ خدا کی طرف سے، ان کے اقتدار و اختیار کی کوئی سند

تمہارے پاس نہیں۔ اُس نے ان کی معبودیت کی کوئی سند نازل ہی نہیں کی (۵۳/۲) ذ (۱۲/۲)۔

تبیان حقیقت

اس چھوٹے سے ٹکڑے پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کتنی عظیم حقیقت اس کے اندر منکس ہے۔ یہ روایتی عظمت اور موروئی تقدیس کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتدائیں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا جس کا کچھ نام رکھ لیا گیا۔ جب وہ دو چار سلیس متواتر چلا آیا، تو اُس کی کہنگی، وجہ تقدس ہو گئی اور وہ نام، دل کی گہرائیوں میں اس طرح جا گزیں ہو گیا کہ عقل و بصیرت کی کوئی دلیل اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ایک پتھر، پھاڑ کے کسی گوشے میں پڑا ہے، تو فقط پتھر ہے۔ لیکن اُسے کسی جیوتزہ پر الگ نصب کر کے اس کا کچھ نام رکھ دیجئے۔ اس نام کی ترویج دو تین نسلوں تک مسلسل ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ پتھر کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ اس کی روایتی عظمت دلوں میں اس طرح نقش ہو جاتی ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے انسانی خون کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی۔ اور اس طرح وہی پتھر جو ”گنہ گامی“ کے گوشے میں پڑا تھا، قلوب و نگاہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ حالانکہ حشمت حقیقت ہیں کے نزدیک محض نام رکھ دینے سے اس کی ماہیت اور حقیقی قدر و قیمت (INTRINSIC VALUE) میں کچھ فرق نہیں آ جاتا۔ اب اس خارجی دنیا سے ہٹ کر ذرا اپنے دماغ کے تنگہ کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ اس میں کتنے ”پتھر“ ایسے رکھے ہیں جن کی قیمت کے متعلق آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل و شہادت نہیں کہ ان کے نام کی عظمت نسلاً بعد نسل متواتر چلی آرہی ہے اور محض قدامت کی بناء پر ان ناموں میں شانِ تقدس پیدا ہو چکی ہے۔ دیکھئے کہ یہ نام آپ کے نزدیک انتقد مقدس بن چکے ہیں کہ ان کے خلاف آپ ایک لفظ تک سننا نہیں چاہتے! اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قدر و قیمت کے پرکھنے کے لئے کیا معیار مقرر فرمایا ہے۔ حضرت ہوؤ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهِمَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ یعنی ان چیزوں کی عظمت و تقدس کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی سند تمہارے پاس نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهِ۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھئے۔ یہ ”دھرم کا نسا“ جو وزن بتائے وہی درست اور صحیح ہے، خواہ آپ کا ذہن یا اسلاف پرستی کے مقصدات کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ محض اسماء کو دلیل اور حجت سمجھ لینا، حقیقت فراموشی اور خود فریبی ہے۔ دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے فقط ایک ہی ہے۔ یعنی مَا أَنْزَلَ اللَّهُ۔ ”جو اللہ نے نازل کیا ہے“



حضرت ہوؤ کی دعوت اور قوم کی طرف سے تکذیب برابر آگے بڑھتی گئی۔ طیب کی شفقت اور مریض کی ضد متوازی چلتی گئی۔ حضرت ہوؤ ان سے بار بار کہتے کہ دیکھو!

تکذیب میں شدت

قوانین اللہ سے سرکشی کا مسلک چھوڑ دو، ورنہ اس کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہو گا۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آسمان کی فضا میں کس طرح اس وبا کے جراثیم پھیلے جا رہے ہیں جو قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت تم پر عذاب بن کر مسلط ہو جائیں گے اور پھر کوئی راہ فرار باقی نہیں رہے گی۔ لیکن قوت اور دولت کا نشانہ ان باتوں کی طرف کب کان دھرنے دیتا ہے؟ سرکش و متمرد انسان دیکھتے تھے کہ بس طرف ان کا قدم اٹھتا ہے عروج اور ترقی آگے بڑھ کر رکاب چومتی ہے۔ ان بڑھتی ہوئی کامیابیوں اور چڑھتی ہوئی کامیابیوں میں ہلاکت و بربادی کا تصور تک بھی نہیں آسکتا تھا۔ لیکن وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ بادۂ رنگین کے اثرات سے جو سرخی چہرے پر نمودار ہوتی ہے، وہ خون کی تازگی اور صحت کی شگفتگی کی سرخی نہیں ہوتی بلکہ محض فریب نگاہ ہوتی ہے۔

وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّاهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝ (۲۹)

ان کے سرکش جذبات، ان کی غلط روش کو نہایت خوش نما بنا کر دکھاتے تھے، اور اس طرح انہیں صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے تھے۔ وہ لوگ، یہ کچھ برناتے جہالت نہیں کرتے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھتے سوچتے اور دیکھتے بھالتے تھے لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ جب انسان کے جذبات اس پر غالب آجائیں، تو اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ یہ صرف وحی کی حد بندیاں ہیں جو انسانی جذبات کو بے راہ رہ نہیں ہونے دیتیں۔ تنہا عقل کے بس کی یہ بات نہیں۔ کتنی قومیں ہیں جو علم و عقل کی بندھیوں پر ہونے کے باوجود، خود بھی تباہی کے جہنم کی طرف بڑھی چلی جاتی ہیں۔ اور باقی دنیا کو بھی اس میں جھونک دیتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ نیز (۴۶)۔ قرآن کریم نے علم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ حَزَّاءُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ — یعنی تنہا علم نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ہر جگہ حَزَّاءُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ کہا ہے۔ یعنی جب علم کو کام میں لایا جائے تو پھر نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ حَزَّاءُ عَمَل کی ہے، تنہا علم کی نہیں۔

وہ مستبصر بن تھے | غور فرمائیے کہ قرآن کریم کے الفاظ کس قدر جامع ہیں شیطان حق و صداقت کی راہ رو کے کھڑا تھا۔ اور جس راستہ پر وہ چل رہے تھے اُسے اُس نے جذبات کی گلا کاریوں سے ایسا فریب نظر بنا دیا تھا کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ ان حسین و دل فریب پھولوں کی کباریوں کے نیچے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے

۱۔ خود ہمارے زمانے میں ہی کچھ ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی قومیں تہذیب و تمدن اور علم و حکمت میں کس قدر آگے نکل گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے معاشرہ کو کس قدر غلط خطوط پر تشکل کر رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ خود بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں، اور ان کے ساتھ باقی دنیا بھی تباہ ہو رہی ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ یہ قومیں وحی کی روشنی سے کام نہیں لیتیں۔ ۲۔ (۲۲) - (۲۴) - (۲۵) - (۲۶)

ہونا تک غار ہیں۔ حالانکہ وہ مستبصرین تھے۔ آنکھیں رکھتے تھے۔ صاحب دانش و بینش تھے۔ قرآن کریم نے اس مقام پر عقل و بصیرت اور ”شیطنیت“ کے تقابل سے نگاہ کا رخ ایک عظیم حقیقت کی طرف پھیر دیا ہے۔ ”شیطنیت“ کے معنی ہیں ان جذبات کی غلامی جو وحی کے تابع نہ چلیں۔ اگر انسان پر یہ جذبات غالب آجائیں تو اس کی عقل اسے کبھی صحیح راستہ پر نہیں لاسکتی۔ بلکہ عقل تو ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے لئے اسباب و ذرائع بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے جوازیں و لائل بھی تراشتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ توہین جو وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں زندگی کا سفر طے نہیں کرتیں ”مستبصرین“ ہونے کے باوجود، بربادی کے جہنم میں جاگرتی ہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے قوم ہود کے ”مستبصرین“ کے انجام کو سامنے لا کر نگاہ کا رخ پھیرا ہے۔ سورۃ اعراف میں انہی ”مستبصرین“ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ مَكَنَّا لَهُمْ فِيهَا اَنْ مَّكَنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفِئْدَةً نَّصِلُ
فَمَا اَغْنٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَّ لَا اَبْصَارُهُمْ وَّ لَا اَفِئْدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوا
يَتَّخِذُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَاٰيَاتِ رُسُلِهِ كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶۱)

(اور، وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی جس قدر جاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار انہیں حاصل تھا، ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز، وہ غیر مذنب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع — سماعت، بصارت اور قلب حاصل تھے۔ لیکن چونکہ ان پر مفاہ پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے وہ قوانین خداوندی کی مخالفت کرتے تھے، اس لئے ان کی عقل و دانش اور فہم فراست، ان کے کسی کام نہ آئے (۲۶۱)۔ اور جن نتائج کی وہ منہسی اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ (جب عقل انسانی، وحی کی روشنی میں کام کرے، تو اس کے نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے، تو وہ اندھا ہوتا ہے اور اس کی عقل و دانش ماؤت ہو جاتی ہے، جس طرح نشتے کی حالت میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے)۔

غور کیجئے۔ سمع و بصر و قلب علم و عقل کے ذرائع سب موجود ہیں لیکن وحی کی روشنی سے منہ موڑنے کی وجہ سے وہی کیفیت ہو چکی ہے جو آج مستبصرین مغرب کی ہے، جن کی دور بینیں مرتجح نامک کے احوال و کیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں اور چاند پر اتر کر اس کا عینی مشاہدہ کر لیتی ہیں لیکن بسا ہی و بربادی کا جو سیلاب ان کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہوتا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا اور جب کوئی ”دیدہ ور“ ان سے کہتا ہے کہ

خبر ملی ہے خدایان بحر و بر سے مجھے

فرنگ رکھ کر سیل بے پناہ میں ہے

(اقبال)

تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اس روشنی کے زمانہ میں یہ ”دقیقاً نوسہ خیالات“ کا پیامبر کہاں سے آگیا؟ جب حضرت ہوئے ان کذبین سے کہا کہ:

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۲۴/۱۳۵)

مجھے ڈر ہے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

تو اس کا جواب کیا ملا؟

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَضْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ ۝ إِنَّ هَذَا إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ ۝ (۲۴/۱۳۸-۱۳۶)

اُنہوں نے یہ سب کچھ سنا، اور نہایت طنز و حقارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا بایہ کرنا، برابر ہے۔

”خدا، اُس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے دھمکاتے ہو۔ یہ سب پرانے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ (نیز ۲۴/۱۳۷)

(آپ ہمارے غم میں یونہی بیکار نہ گھلے جائیے) مطمئن رہیے کہ ہم پر کوئی تباہی نہیں آئے گی۔

تذکرہ وہ بار بار ایک ناصح امین کی طرح انہیں ان کے اعمال کے عواقب و انجام سے آگاہ کرتے لیکن وہ ہر بار یہی کہتے کہ:

فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (نیز ۲۴/۱۳۹)

(تم کہتے ہو کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم پر تباہی کا عذاب آجائے گا)۔ سو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس تباہی کو لا کر دکھاؤ۔

اس کے جواب میں حضرت ہوئے فرماتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں ع

حقیقت ہے، نہیں میرے نخیل کی یہ غلاقی

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَ غَضَبٌ ۝

اُس نے کہا تم اس تباہی کا انتظار کر رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ تباہی تمہارے سروں پر منڈلا رہی ہے (تمہاری

آنکھیں کھلی ہوئیں تو اس کے آثار سامنے نظر آجائے) جس اضطراب اور ہیجان میں تم مبتلا ہو، یہ خدا کے عذاب کی

علامات نہیں تو اور کیا ہیں؟

وہ پوچھتے کہ یہ عذاب کب آئے گا؟ ارشاد ہوتا کہ:

قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي أَرِكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۝ (۴۶)

اس کا علم میرے خدا ہی کو ہے کہ وہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا۔ میرا فریضہ تو اتنا ہی ہے کہ مجھے، جو پیغامات دے کر تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، انہیں تم تک پہنچا دوں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم بڑی احمق قوم ہو (کہ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں، تم اس پر غور و فکر کرتے نہیں۔ اور اس پر اصرار کئے جا رہے ہو کہ جس تباہی سے تمہیں آگاہ کیا جاتا ہے، وہ جلدی کیوں نہیں آتی)۔

اوپرچھے ہتھیار | جب مجادلہ و مباحثہ سے کام نہ چلا تو قوم ان حربوں کو لے کر مقابلہ میں آگئی جو ارباب قوت و استبداد کا آخری جواب ہوتا ہے۔ لیکن جو پیغامات الہیہ کا پیامبر اور حقیقت کا مبصر ہو، وہ بھلا اس تحریف و ترمیم سے کس طرح گھبرا جائے؟ حضرت ہوؤ نے فرمایا:

مِنْ دُونِهِ فَيَكِيدُ فَنِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنْظَرُ ۝ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيفٌ ۝ (۵۵-۵۷)

تم جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے ہو، سب کے سب ناکام ہو کر لو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو اور اس کے بعد دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے!۔

میرا بھروسہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے جو بڑا ہی محکم گیر اور قابلِ اعتماد ہے۔ اُس خدا کا قانون جو میرا اور تمہارا سب کا نشوونما دینے والا ہے۔ تم تو ایک طرف رہے، کائنات میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جو اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے باہر ہو۔ میرا خدا، (حق و عدل کی) سیدھی اور توازن بدویش راہ پر ہے۔ (لہذا، تم بھی اُس کے پیچھے

پیچھے، اسی راہ پر چلو) (۱/۵) ذ (۶/۱۵۳-۱۵۴) ذ (۲۲/۵۳)

اگر تم اس سے روگردانی کرو گے تو اس کے نتائج کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوگی۔ میرے ذمے فقط اتنا تھا کہ میں تم تک خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ سودہ میں نے پہنچا دیا۔ اب تم دیکھ لو گے کہ خدا کا قانونِ مکافات (تمہیں کس طرح تباہ و برباد کرے) تمہاری جگہ ایسی قوم کو لے آتا ہے جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی (۹/۳۸-۳۹) ذ (۲۲/۵۳-۵۴)۔

تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز کا نگران ہے۔

ظہورِ نتائج کا وقت | حجت کا اتمام ہو گیا۔ قانونِ مکافات کے مطابق وہ وقت آپہنچا جب اعمال کی کیفیت یک جاتی اور اس کے نتائج نمودار ہو جاتے ہیں۔

فَلَمَّا سَآوَهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أُوْدِيَّتِهِمْ..... كَذَلِكَ نُجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ

(۲۶۵-۲۶۴) (۱۵-۱۶)

اُس وقت طویل خشک سالی کی وجہ سے انہیں بارش کی بہت ضرورت تھی، انہوں نے دیکھا کہ کالی گھٹا اُٹھی ہے جہاں کی وادیوں کی طرف بڑھے چلی آرہی ہے۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ گھٹا ایسی بارش برسائے گی جس سے ہماری زمینیں سیراب ہو جائیں گی۔ لیکن وہ بارش برسانے والا بادل نہیں تھا۔ وہ اس آندھی کا جھکڑ تھا جو انکی اس تباہی کے لئے بڑھے چلے آ رہا تھا جس کے لئے وہ جلدی مچانے لگے [جب کوئی قوم اقدارِ خداوندی کو پامال کر دیتی ہے تو وہ حوادثِ فطرت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ یہ ہوتا ہے تعلقِ اخلاقی بدکرداری اور حوادثِ ارضی و سماوی کے ذریعے تباہی (عذاب) آنے میں۔ نیز انسان تنہا عقل کی رو سے خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ (۲۱۶-۲)] چنانچہ وہ جھکڑ آیا اور اُس نے قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر شے اُکھاڑ پھینکی، اور چاروں طرف تباہی مچا دی۔ اس سے اُس بستی کی حالت یہ ہو گئی کہ اُس کے مکانوں کے کھنڈرات باقی رہ گئے، اور مکین سب ہلاک ہو گئے۔ اس طرح ہم مجرمین کو ان کے غلط اعمال کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے بھی اپنی غلط روش

کو نہ چھوڑا، تو تمہارا انجام بھی وہی ہو گا)۔ (۲۶۵-۲۶۴) (نیز ۱۵-۱۶)

بربادی | وہی بازند و تیز داندھی اور جھکڑ جس سے ریت کے تودے بستیوں اور آبادیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتے ہیں، اسی کو دوسری جگہ الرِّيحُ الْعَقِيبُ کہا گیا ہے۔ (۲۶۵-۲۶۴)

آندھی کا یہ طوفان مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک جاری رہا۔ (۲۶۹-۲۶۸)۔ اور اس طرح وہ قوم، جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر نشانات نصب کرتی، بڑے بڑے ستونوں پر عمارت تعمیر کرتی اور اپنے سے بڑھ کر کسی کو طاقتور نہ سمجھتی تھی۔ ایک جھکڑ کا مقابلہ نہ کر سکی اور ہلاک ہو گئی۔ (۲۶۹-۲۶۸)۔ اس طرح ہلاک کہان کی جڑ تک کٹ گئی۔

وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَبُوا بَايَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝

۷۲

(سو جب ظہورِ نتائج کا وقت آیا، تو ہم نے ہمو اور اُس کے رُفقاؤ کو (۱۱۸-۱۱۷) تباہی سے بچایا اور، جن لوگوں

ہمارے قوانین کو تسلیم نہیں کیا تھا اور انہیں جھٹلایا تھا، اُن کی جڑ کاٹ ڈالی۔

وہ حال اور مستقبل دونوں میں زندگی کی خوشگوازیوں سے محروم ہو گئے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَعَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ حَبَّارٍ عَنِيدٍ
وَأَتَّبَعُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ ۖ إِلَّا عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۖ إِلَّا
بَعْدًا لِعَادٍ قَوْمٍ هُوْدٍ ۝ (۵۹-۶۰)

یہ ہے سرگزشت قوم عاد کی جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس کے رسولوں (کی دعوت) سے سرکشی برتی۔ اور اپنے اُن سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے تھے۔ (۵۹)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ، حال اور مستقبل، دونوں کی زندگی میں، نوازشاتِ خداوندی سے محروم رہ گئے۔
یاد رکھو! یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین سے انکار کیا تھا۔
دیکھو! قوم عاد کس طرح زندگی کی خوشگوازیوں سے محروم رہ گئی! (۶۰)

یہ قوم دنیا سے نیست و نابود ہو گئی، اور حسبِ طرح حضرت ہودؑ نے انہیں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا، اُن کی جگہ دوسری قوم نے لے لی کہ مکاناتِ عمل کی رو سے استبدال و استخلاف قومی (ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا) خدا کا اہل قانون ہے۔ (۶۱)

حضرت ہودؑ کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا علم دیدیا تھا جس طرح حضرت نوحؑ کو طوفان کا پیشتر علم دیدیا گیا تھا) اور وہ اس سے بار بار قوم کو آگاہ کرتے تھے لیکن انہوں نے توفیقِ جماعتِ مومنین بچالی گئی

ہی بیکر رکھا تھا کہ جو کچھ حضرت ہودؑ کہیں اسے جھوٹا سمجھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا یقین نہ کیا اور تباہ و برباد ہو گئے۔ اور حضرت ہودؑ اور اُن کے متبعین اس تباہی سے محفوظ رہے۔ (۶۲)

نیز (۶۳)۔ ان باقیاتِ صالحات سے جو قوم آگے بڑھی اسے عاثرانیہ کہا گیا ہے اور جو تباہ ہو گئی اسے عادِ اولیٰ۔

وَإِنَّهُ أَهْلَكَ عَادَ الْأُولَىٰ ۖ (۵۳)

اور (دیکھو) بلاشبہ (تمہارا پروردگار) وہی تو ہے جسکے قانونِ مکانات کے مطابق عادِ اولیٰ ہلاک ہو گئے۔

ننگہ باز گشت

قوم عاد کے اس سانحہ عبرت آموز پرنگہ باز گشت ڈالئے اور دیکھئے کہ اس میں بعض خصوصیتیں کس قدر نمایاں طور پر ابھر کر سطح پر نظر آرہی ہیں۔ قوم، قوت و دولت اور حکومت و سلطنت کی مالک ہے اور اسے اللہ کا فضل و احسان قرار دیا گیا ہے۔ وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر سرکشی و تمرد پر اتر آتی ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو! اس روش کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں۔ لیکن اگر تم اپنی روش کی اصلاح کر لو اور اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے تابع لے آؤ تو وہ تمہاری قوتوں کو اور بڑھاتا جائے گا۔ (يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ ۝۱۱) وہ نہیں مانتی تو وہ ایک رسوا کن عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ (لَنْ يَنْقُصَهُمْ عَذَابُ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى لِّمْ) اس سے ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے تحت عزت و شوکت حکومت و سطوت، قوت و ثروت اللہ کے انعامات ہیں اور ذلت و رسوائی کی زندگی عذاب محکومی و رسوائی خدا کا عذاب ہے۔

پھر اس قوم کو یہ احسان بھی یاد دلایا گیا کہ اسے قوم نوح کا جانشین بنایا گیا تھا۔ (۶۹)۔ اور جب اس نے پیغام خداوندی سے سرکشی اختیار کی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو، اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا۔ (۷۲)۔ لہذا ظاہر ہے کہ یہ بھی اللہ کا عذاب ہے کہ کسی قوم کی شوکت و حشمت کی وارث کسی دوسری قوم کو بنا دیا جائے۔



سعد و نحس | قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ دن بڑا منحوس "تَحَاجِبُ اَنْ يُّرَ الْاَلْبَابُ عَذَابُ طَارِي هُوَا۔ فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْجًا صَرِيْحًا فِيْ اَيَّامٍ تَحْسَبُ لِنْتُنَّ يُقَهَّمُ عَذَابُ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يَنْصُرُوْنَ ۝

(۴۱) نیز (۵۴)

سوجب ان کی تباہی کا وقت آیا۔ جو ظاہر ہے کہ ان کے لئے بڑا ہی نامبارک تھا۔ تو ہم نے ان پر ایسے زور کی آندھی چلائی جس نے انہیں آتش خاموش کی طرح ختم کر کے رکھ دیا (۵۴)۔ اس طرح انہیں اس دنیا کی زندگی ہی میں ذلت آمیز عذاب مل گیا۔ اور آخرت کی زندگی کا عذاب اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہو گا۔ انہیں اس عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ (نیز ۵۴)

اسے قرآن کریم نے ایک "عظیم یوم" (عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ) بھی کہا ہے۔ (۴۱ و ۲۶)۔ اس سے معلوم ہوا کہ سعد و نحس کا تعلق آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے غلط اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجائے تو

وہ گھڑی اس کے لئے منحس ہے۔ لہذا سعادت و نحوست خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے۔ ستاروں کی گردش کا نام نہیں۔ ستارے تو انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں ۲۵ سو جو خود محکوم و مسخر ہو وہ دوسرے کے تقدیر کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

یہ ہے اس قوم عاد کی عبرت انگیز داستان جس کے متعلق کہا کہ جاؤ دیکھو۔ ان کے اُجڑے ہوئے کاشانوں میں

تمہارے لئے کون کون سے سامانِ موعظت مدفون ہیں۔

وَ عَادًا وَ ثَمُودًا وَ قَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسَاكِينِهِمْ (۲۹)

اسی طرح عاد و ثمود کے ساتھ بھی ہوا جن کی داستانیں ان کے مکانات کے کھنڈرات سے ظاہر ہیں۔

جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، اثری انکشافات ان زمین دوز بستیوں سے نقاب اٹھاتے چلے جا رہے ہیں جن کے نیچے سے مٹی ہوئی عظمتوں اور لٹی ہوئی سلطنتوں کے نقوش یوں نمودار ہو رہے ہیں جیسے کوئی آنکھیں ملتا ہوا نیند سے اٹھ بیٹھے۔ جس قوم کے سینے میں دل اور نگاہوں میں بصیرت ہے اس کے لئے ان ویرانوں کی ٹھیکریاں، عروج و زوالِ اُمم کی ہزاروں خاموش داستانیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ فَهَلْ مِّنْ مُّذَكِّرٍ اُ کوئی ہے جو ان عبرت حاصل کرے۔

﴿

سورۃ الاعراف میں قوم ثمود کا بھی ذکر آتا ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اس سورت میں ان سے متعلق چند ایک آیات (۷۹-۷۳) آئی ہیں لیکن ان کی داستانِ قرآن مجید کے متفرق اوراق میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے ہم حسبِ سابق مسلسل انداز سے پیش کرتے ہیں۔ اس قوم کا جرمِ عظیم ایسا تھا جس کا تعلق براہِ راست ہمارے زمانے سے ہے جسے عہدِ اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہا جاتا ہے۔ اس میں قرآن کریم کے معاشی نظام کا اساسی نکتہ سامنے آتا ہے (اس معاشی نظام کی تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہیں۔ جن کی نشاندہی انڈکس کرتا ہے)۔

۱۔ انڈکس میں تقدیر کا عنوان دیکھیے۔

قوم ثمود حضرت صالحؑ

اہم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرون عرب حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے زیادہ مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کے عروج کا زمانہ عداوئی کے بعد کا ہے۔ یہ قوم، عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادی قریٰ کہتے تھے۔ حبران کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادی قریٰ کے گرد و پیش کا میدان سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز۔ قرآن کریم نے اس قوم کو عاد کا جانشین بتایا ہے۔

وَ اذْكُرُواْ اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَ بَوَّأَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ
مِنْ سُهْلِهَا قُصُوْرًا وَ تَتَّخِذُوْنَ الْجِبَالَ مِیْوَاتٍ فَ اذْكُرُواْ الْاٰیَةَ اللّٰهِ وَ لَا
تَعْتَوْاْ فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝

تم قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کا نتیجہ دیکھ چکے ہو۔ تم سے پہلے، قوم عاد نے ان قوانین سے سرکشی برتی تو وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ تم اسی قوم کے جانشین ہو۔ ان کے بعد، خدا نے تمہیں اس ملک میں اس طرح متمکن کر دیا کہ تم اس کے میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو، اور پہاڑوں کو تراش تراش کر، ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں اور اس کے قانون کی قوتوں کو اپنے پیش نظر رکھو، اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے پہلے ان کی تباہی ہو چکی تھی کیونکہ دربار فرعون کا مرد مومن اپنی قوم سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بدکرداریوں سے باز نہ آئے تو تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو قوم نوحؑ و عاد و ثمود کا ہوا تھا۔ (۷۷-۷۸) اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار ق۔ م سے لے کر (۱۶۰۰) ق۔ م تک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنی نوازشات کی گہر باری فرما رکھی تھی۔ انہیں متمکن فی الارض کیا تھا۔ (۷۷)۔ قوم عاد کی طرح یہ بھی میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (۷۷-۷۸)۔ پرفضا باغات۔ لہلہاتی کھیتیاں۔ صاف و شفاف ابلتے ہوئے چشمے۔ (۷۷-۷۸)۔

دولت و سطوت | وادی قریٰ میں سنگین عمارات۔

وَ ثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ (۷۹)

اور قوم ثمود کا (انجام)، جو پہاڑوں کے دامن میں مستحکم قلعے بناتی تھی (نیز ۷۳/۷۲ و ۷۳/۷۱) اور جنود و عساکر کی اکثریت۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ۝ فِرْعَوْنٌ وَ ثَمُودُ ۝ (۷۳/۷۵) (۷۳/۷۴-۷۳/۷۵)
 اُسی کا قانون انسانی و نیاس، مکاناتِ عمل کی شکل میں کار فرما ہے۔ اس کی شہادت کے لئے قرآن میں ان لوگوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں جو بڑے بڑے شکروں کے ساتھ، قوانینِ خداوندی کی مخالفت کے لئے ہجوم کر کے آئے تھے۔

یعنی قوم فرعون، اور قوم ثمود کے لوگ۔ (ان کا جو انجلم ہوا وہ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے)۔
 یہ تھی وہ قوم جن کی طرف خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنی دولت و حشمت حکومت و قوت کے نشے میں قوانینِ الہیہ کی تکذیب کی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحَجَرِ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۷۳/۷۶)

اور (دیکھو) حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔

یہاں ان کے دار الحکومت کی نسبت سے انہیں اصحابِ الحجر کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ان کا نام مذکور ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۷۳/۷۶) (نیز ۷۳/۷۷)

اور (دیکھو) قوم ثمود نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔

بعثت حضرت صالحؑ | تا آنکہ جب ان کی سرکشی و عداوت حد سے بڑھ گئی اور قانونِ مشیت کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہونے کو آیا تو ان کی طرف، اسی قبیلہ سے

حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے۔

وَ اِلٰی ثَمُودَ اٰخَاهُمْ صَالِحًا ۝ (۷۳/۷۷) (نیز ۷۳/۷۸ و ۷۳/۷۹) (۷۳/۷۸-۷۳/۷۹)

اور (دیکھو) ہم نے قوم ثمود کی طرف انہی کے بھائی بند صالحؑ کو مبعوث کیا۔

اس وقت ہر جابر و مستبد قوم کی طرح، اس قوم کی بھی یہ حالت ہو چکی تھی کہ وہ ملک میں فساد برپا کرتے تھے اس لئے

لع فساد برپا کرنے سے ہمارا ذہن ڈاکہ زنی۔ قزاقی۔ بد امنی وغیرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لیکن فساد کا قرآنی مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ نظام جو غیر خداوندی قوانین پر مشتمل ہو، فساد ہے، (خواہ اس میں بظاہر کسبیا ہی امن کیوں نہ ہو) اور اس کے مقابلہ میں اصلاح صرف اس نظام کا نام ہے جو قوانینِ خداوندی پر قائم ہو۔ اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے فساد اور مفسد کی قرآنی اصطلاحات کے صحیح معنی سمجھ میں آسکیں گے۔ (مزید تفصیل کے لئے انڈکس دیکھیے)۔ (نیز ۷۳/۷۸، ۷۳/۷۹)

ان سے کہا گیا کہ:

﴿ ۷۴ ۷۳ ۷۲ ۷۱ ۷۰ ۶۹ ۶۸ ۶۷ ۶۶ ۶۵ ۶۴ ۶۳ ۶۲ ۶۱ ۶۰ ۵۹ ۵۸ ۵۷ ۵۶ ۵۵ ۵۴ ۵۳ ۵۲ ۵۱ ۵۰ ۴۹ ۴۸ ۴۷ ۴۶ ۴۵ ۴۴ ۴۳ ۴۲ ۴۱ ۴۰ ۳۹ ۳۸ ۳۷ ۳۶ ۳۵ ۳۴ ۳۳ ۳۲ ۳۱ ۳۰ ۲۹ ۲۸ ۲۷ ۲۶ ۲۵ ۲۴ ۲۳ ۲۲ ۲۱ ۲۰ ۱۹ ۱۸ ۱۷ ۱۶ ۱۵ ۱۴ ۱۳ ۱۲ ۱۱ ۱۰ ۹ ۸ ۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱ ﴾

(تم خدا کی نعمتوں اور اس کے قانون کی قوتوں کو اپنے پیش نظر رکھو) اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔

مفسدین کی قوم | وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۴-۱۵۲)

اور اپنے ان لیڈروں کا کہا مت مانو جو عدل و انصاف کی حدود سے تجاوز کر کے، ملک میں ناہمواریاں پھیلاتے ہیں اور کبھی اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔

جب رزق کی تقسیم قوانین خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی تو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کو فساد فی الارض کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں۔ جب یہ ناہمواریاں (قوانین خداوندی کے مطابق) ہمواریوں میں بدل جاتی ہیں تو اسے اصلاح کہا جاتا ہے۔ قوم نمود کے معاشرہ میں اسی قسم کی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دار الحکومت میں فسادات کی صورت میں جو امور تھے جن کے سپرد علاقہ کا انتظام تھا۔ اور چونکہ پورے کا پورا نظام حکومت بگاڑ چکا تھا اس لئے یہ سب کے سب مفسد و مستبد تھے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۶)

اس قوم کے دارالسلطنت میں نو بڑے بڑے منتخب سردار تھے جن کے دستے معاشرے کا نظم و نسق تھا۔ وہی ان تمام

فسادات کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے، اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف آنے نہیں دیتے

تھے (حقیقت یہ ہے کہ قوم کا دار و مدار ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار اور نظم و نسق ہو۔ وہی

قوم کو بگاڑتے ہیں اور انہی کے سنوارنے سے معاشرہ سنوارتا ہے)

ان کا سرغنہ ان سب سے بڑھ کر شقی و بد بخت تھا۔

إِذْ أُنْبِئَتْ أَشْقَاهَا ۖ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ (۱۳۷-۱۳۸)

(اور یاد کرو) جب اُس (قوم) کا بد بخت ترین شخص اٹھا تو اللہ کے رسول (صالح) نے ان لوگوں سے کہا.....

ان حالات کے ماتحت بھلا احکام الہیہ کی طرف کون توجہ دیتا؟

وَ اتَّيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ (۱۳۸)

انہیں ہم نے واضح قوانین دیئے تھے، لیکن وہ ان سے روگرداں رہے۔

اگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک نکتہ پر غور کیجئے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس قوم میں فساد عام ہو چکا تھا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ان کے مرکزی مقام (دار الحکومت) میں نو سربراہ اور وہ ایسے تھے جو درحقیقت اس فساد کے حشرِ تھے۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قوموں میں فساد کا ذمہ دار دراصل اوپر کا طبقہ ہی ہوتا ہے۔

اوپر کا طبقہ عوام تو ان کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ جس قسم کا اوپر کا طبقہ اسی قسم کے عوام۔ اگر اوپر کے طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو قوم خود بخود اصلاح یافتہ ہو جاتی ہے۔



وہی دعوت انقلاب یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت صالح کی بعثت ہوئی۔ آپ تشریف لائے اور قوم کو اسی اساسی اور اصولی پیغام خداوندی کی طرف دعوت دی جو آسمانی

سلسلہ رشد و ہدایت کی اولین کڑی ہے۔ فرمایا:

قَالَ لِقَوْمٍ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ۖ (نیز ۲۶ ذ ۱۳۷)

(اس طرح ہم نے قوم ثمود کی طرف، اُن کے بھائی بندوں میں سے صالح کو بھیجا)۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم

صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرو۔ اُس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔

حکومت صرف ایک خدا کی۔ کسی انسان کی نہیں۔ اور اس حکومت کی عملی تشکیل اس طرح کہ دلوں میں تقویٰ اور مرکز کی اطاعت۔

إِذْ قَالَ لَهُمُ أَخُوهُمْ ضَلَمٌ ۖ إِلَّا تَتَّقُونَ ۚ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۖ فَاتَّقُوا

اللَّهِ وَ أَطِيعُوا ۖ (۱۳۷-۱۳۸)

(آخر کار) اُن کے بھائی بندوں میں سے صالح اُن کی طرف آیا اور اُن سے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنی غلط روش کی تباہیوں سے

بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟

اگر بچنا چاہتے ہو تو اُن لوگوں میں تمہاری طرف خدا کے ہاں سے امن و سلامتی کا پیغام لے کر آگیا ہوں۔

اس لئے تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ جو نظام میں متشکل کرتا ہوں اس کی اطاعت کرو۔

یعنی مفسدین کی حکومت کی اطاعت مت کرو۔ بلکہ اطاعت فقط حکومتِ خداوندی کی کرو۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَآطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۱۵۲-۱۵۳)

مگر تم تباہیوں سے بچنا چاہتے ہو تو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے لئے میری اطاعت کرو۔

اور اپنے ان لیڈروں کا کبامت مانو جو عدل و انصاف کی رو سے تجاوز کر کے، ملک میں ناہمواریاں پھیلاتے ہیں اور کبھی اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے۔

کثرتاً اعلانِ بقاوت اور کیسا نعرۂ انقلاب ہے! حقیقت یہ ہے علمبردارانِ حکومتِ خداوندی دنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کرنے کے لئے آئے ہیں۔ دوسرے انقلابات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک انسان کی حکومت کی جگہ کسی دوسرے کی حکومت قائم کر دی جائے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حکومت و اقتدار کی کنجیاں انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر اقتدار و اختیار کے حقیقی مالک - خدائے ارض و سموات کے سپرد کر دی جائیں۔ اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا ہے جس میں کسی انسان کو کسی شکل میں، دوسرے انسان پر، حکومت کا حق ہی حاصل نہ ہو۔ اور رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی کا محتاج نہ ہو۔ سب انسان برابر اور ایک خدا کے قانون کے محکوم جو رب العلیین ہے۔ جس کی حکومت میں ظلم و استبداد و سلب و نہب اور غصبِ حقوق کا امکان ہی نہیں۔ یہ تھی وہ حکومت جو حضرت صلح قائم کرنا چاہتے تھے اور اباب قوت و سلطنت جن کے چہرے کی سُرخیوں اور حریم ناز کی رنگینیاں انسانی خون کی رہیں منت تھیں، کس طرح اپنے اقتدار و اختیار سے دستکش ہو کر مخلوقِ خدا کے خدام کی صف میں کھڑے ہو جاتے؟

اربابِ قوت کی طرف سے مخالفت

لہذا وہی ہو جو ہوتا چلا آیا ہے اور جو ہوتا چلا جائے گا

مکرور و ناتواں اور مظلوم و مقہور انسانوں نے جو انسانی چہرہ دستیوں سے تنگ آپکے تھے، اس دعوتِ ربانی پر آگے بڑھ کر بیٹک کہا۔ اور اربابِ دولت و قوت اس کی مخالفت میں صف آرا ہو گئے!

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتَضَعُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ اَنَّ طُلِحًا مَّرْسَلٌ مِّنْ رَبِّهِ ط قَالُوا اِنَّا بِمَا اُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۝ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اِنَّا بِالَّذِي اٰمَنْتُمْ بِهِ كَفَرُونَ ۝

اس پر اہلس قوم کے سرکش اکابرین نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدست کر رکھا تھا جماعتِ مومنین

کہا۔۔۔۔۔ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین اُن کے افلاس وغیرہ کی وجہ سے، بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے۔
 کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے ؟
 اُنہوں نے کہا کہ اس میں کیا شک ہے ؟ جو بیگیاں اسے خدا کی طرف سے دیئے جاتے ہیں، ہم ان پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔

(یہ حقیقت غور طلب ہے کہ نظام خداوندی کی مخالفت، بالعموم، ارباب قوت و دولت کی طرف سے ہوتی اور قوم کے مظلوم اور کمزور طبقہ نے اس پر لبیک کہا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس انقلاب کی غرض و غایت کیا ہوتی تھی)۔

ان سرکش اور منکبر سرداران قوم نے کہا کہ تم جس بات کو سچا مانتے ہو، ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔
 وہ آمادہ پیکار تھے۔ لیکن حضرت صالحؑ ایک ناصح مشفق کی طرح انہیں برابر سمجھاتے چلے جاتے تھے کہ اپنے ہاتھ سے اپنی قبریں نہ کھودو۔ لیکن نشر حکومت میں ان نصاب کو سننا کون ہے ؟

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُونَ اللّٰهَ
 لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ قَالُوا اَطِئْنَا بَكَ وَ يَمِّنُ مَعَكَ ۖ قَالَ طِئِرْكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
 بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُونَ ۝ (۷۶-۷۷)

صالحؑ نے انہیں بتایا لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ تم جس تباہی کی دھمکی دیتے ہو، اسے بے کیوں نہیں آتے ؟۔ اس پر صالحؑ اُن سے کہتا کہ تم کس قدر اپنے آپ سے دشمنی کر رہے ہو کہ زندگی کی خوشگاریوں سے پہلے ہی، تباہیوں اور بربادیوں کے لئے جلدی مچا رہے ہو ! تم ان تباہیوں کو آوازیں دے دے کر بلانے کی بجائے خدا سے ان سے محفوظ رہنے کا سامان کیوں نہیں طلب کرتے ! اس سے، نہ صرف یہ کہ تم ان تباہیوں سے محفوظ رہ جاؤ گے بلکہ تمہیں نشوونما کا سامان بھی بافراط مل جائے گا۔

اس کے جواب میں وہ کہتے کہ جب سے تم اور تمہارے ساتھی نمودار ہوئے ہیں، ہمارے کانوں میں مسلسل تباہی اور بربادی کی آوازیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے ہم ان الفاظ سے نا آشنا تھے حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ بڑے منحوس ہو۔

اس پر صالحؑ اُن سے کہتے کہ تم پر یہ "نحوس" (تباہی اور بربادی) ہماری وجہ سے نہیں آ رہی۔ یہ تو تمہارا اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو خدا کے قانون مکافات کے مطابق مرتب ہو رہا ہے۔ (لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ

باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی جب تک تمہیں عذاب کی کٹھالی میں تپایا نہیں جائے گا۔
وہی دیوانگی کی تہمت
 یہ انہیں تناسخ و عواقب سے آگاہ کرتے، اور وہ (معاذ اللہ) ان کا مذاق اڑاتے۔
 وہ کہتے کہ (خاکم بدن) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی ہلکی ہلکی باتیں
 کرتے ہو۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ (۲۶/۱۵۳)

انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور اس کے بعد نہایت حقارت سے کہا کہ ہمیں اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ تو
 بھی ان لوگوں میں سے ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے اور ہمیں دُنیا
 کی اصلاح کے لئے مامور کرتا ہے!۔

انہیں تعجب اس بات پر تھا کہ یہ ہمارے ہی جیسا انسان دعوتِ رسالت میں سچا کیسے ہو سکتا ہے؟
 مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (۲۶/۱۵۴)
 تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اس لئے تم خدا کے رسول کس طرح ہو سکتے ہو؟) بہر حال، اگر تم اپنے
 اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم پر تباہی آنے والی ہے، تو اس کے لئے کوئی نشانی پیش کرو۔

ایک انسان رسول!
 اُسی ساز کہن کی مدائے باز گشت جسے ہم اُمم سابقہ کے احوال و کیفیات میں
 دیکھ چکے ہیں۔ یعنی ان سے کہا جاتا تھا کہ میں جس نظام کی طرف دعوت دیتا ہوں
 اسے عقل اور فکر کے معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ اس میں بھلائی یا ہی بھلائی نظر آتی ہیں یا نہیں۔ اور وہ اس کے جواب
 میں کہتے کہ ہم بھلا اپنے جیسے انسان کو خدا کا رسول کیسے مان لیں۔ اگر تم خدا کے رسول ہو تو ہمیں کوئی محیر العقول بات
 کر کے دکھاؤ۔

فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّثَّنَا وَاحِدًا مِّنْ آبْنِ آدَمَ إِذَا لَفِيَ ضَلَالٍ وَسُعِيرٍ ۝ (۲۶/۱۵۵)

اور کہا کہ کیا ہم ایسے آدمی کے پیچھے لگ جائیں جو بالکل تنہا ہے اور کوئی جتنہ اس کے ساتھ نہیں؟ اگر ہم نے ایسا کیا
 (اور اپنا جتنہ چھوڑ کر اس کے پیچھے لگ گئے تو یہ خواہ مخواہ تباہی اور بربادی کا مول لینا ہوگا) ایسا کچھ تو وہی کریگا
 جسے سلامتی کی کوئی راہ سمجھائی نہ دیتی ہو اور وہ اندھا بن کر کنوئیں میں جا گرے۔ یا وہ بالکل پاگل ہو، اور اپنا نفع
 نقصان ہی نہ پہچانے!

بشر کے ساتھ واحد کے ٹکڑے پر بھی غور کیجئے۔ چونکہ وہ نشہ قوت میں بدست تھے اس لئے یہ کہتے تھے کہ اگر

کوئی ایسا شخص ہوتا جس کے ساتھ کوئی بہت بڑی جماعت ہوتی تو اس جماعت کی قوت سے دب کر ہم اس کی بات مان بھی لیتے۔ لیکن اب ہم اس کی بات کیوں مانیں جب یہ بالکل اکیلا ہے۔ اور پھر جیسا کہ شریر النفس لوگوں کی افتاد طبع ہے، وہ اصول سے ہٹ کر ذاتیات پر اتر آتے اور حق و صداقت کی دعوت کا جواب گالیوں سے دیتے۔

عَالِقُ الذِّكْرِ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرُّ ۝ (۵۴)

بھلا سوچو، کہ ہم سب، اتنے اتنے بڑے آدمی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور خدا نے اپنی وحی کے لئے اسے حضرت صالحؑ کو چن لیا یہ تو ہمیں بالکل جھوٹا اور خود پسند نظر آتا ہے (جو بڑا بننے کے لئے، اپنے آپ کو، خدا کا رسول کہتا ہے)

اُدھر سے یہ وریدہ دہنی اور ادھر سے فقط اتنا جواب کہ:

سَيَعْلَمُونَ غَدًا مِّنَ الْكَذَّابِ الْأَشِرِّ ۝ (۵۴)

ہم نے صالحؑ سے کہا کہ تو ان کی جگہ پاش باتوں سے افسردہ خاطر نہ ہو، کل ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا اور خود پسند کون ہے!

یہ ارباب قوت و ثروت کا رویہ تھا۔ ان کے ساتھ مذہبی پیشوا آگے بڑھے اور انہوں نے یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا کہ یہ شخص تمہیں تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔

قَالُوا لِيُطْلِمَ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝ (۵۵)

انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ (کہ تم اپنے بزرگوں کے سچے جانشین بنو گے، ہمارے مہبودوں کا بول بالا کرو گے۔ اور اپنی قابلیت سے اس مذہب کو دور دور تک پھیلاؤ گے۔ لیکن تم نے اب ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے ہماری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تم ذرا سوچو تو یہی کہ تم ہم سے کیا کہہ رہے ہو؟) تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ ہم انہیں اپنا مہبود ماننا چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباء و اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ جس بات کی طرف تم ہمیں بلا تے ہو، ہمیں تو اس کی صداقت میں بڑا ہی شک ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہمارے دل میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے (کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے

مسلم کے خلاف ہے۔

اس کے جواب میں حضرت صالحؑ نے کیا ارشاد فرمایا؟ وہی جو کورانہ تقلید کے مسلک کے پیروں کیلئے صحیح جواب ہو سکتا ہے!

قَالَ يَقَوْمِ اَرَايْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلَىٰ يَدَيْنِي مِّنْ رَّبِّي وَ اٰتٰنِي مِنْهُ رَحْمَةً فَسَنُيَنْصِرُنِي مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهُ قَفَا تَزِيدُوْنِي غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ (۱۱۱)

اس پر (حضرت) صالحؑ نے کہا کہ اے میری قوم! کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خدا نے مجھے وحی جیسی نعمت

گہری سے نوازا ہے، اور اس کی بنا پر میں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی دینے والی روشن قندیل لئے کھڑا ہوں۔ اگر

اس کے باوجود میں اس کے احکام سے سرکشی اختیار کروں تو مجھے اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے کون بچا

لے گا؟ تم جو کچھ مجھ سے چاہتے ہو، اس سے تم میرے پہلے کی بات نہیں کرتے، بلکہ سراسر تباہی کی طرف لے جاتے ہو۔

یعنی تم اپنے مسلک کی صداقت کے ثبوت میں یہ دلیل رکھتے ہو کہ یہ تمہارے آباء و اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے

اور میرے پاس میرے اللہ کی عطا فرمودہ وہ قندیل فروزاں ہے جس کی روشنی میں حق و باطل الگ الگ دکھائی دیتے

ہیں۔ پھر کیسے کہ میں ایسی شمع نورانی کو چھوڑ کر اندھوں کی لاٹھی کے پیچھے کس طرح چل پڑوں؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ایک پیغمبر بھی اپنے آپ کو قوانینِ الہیہ کی معصیت کے انجام سے محفوظ خیال نہیں کرتا! اور قانونِ

مکافات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ ہے وہ ایمان جس پر نظامِ خداوندی کی تریا بوسِ عمارت مستحکم ہوتی ہے یعنی اس

نظام میں سب سے برگزیدہ و بلند ترین ہستی بھی اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کا مطیع و فرمانبردار سمجھتی اور اس کی تلا و رزی

سے خوف کھاتی ہے۔ (اپنے مقام پر حقیقت سامنے آئے گی کہ حضور نبی اکرمؐ نے بھی یہی فرمایا تھا)۔ (۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹)

✽

خفیہ سازشیں | ادھر سے تذکیر و معظمت اور ادھر سے تکذیب و تہدید ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی خفیہ سازشیں بھی، کہ اربابِ قوت و استبداد کے یہی حربے ہیں جو حق و صداقت کا

گلا گھونٹنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةٌ رَّهْطٌ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا

تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَ اَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَرْهِيْلَكَ

اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (۲۰-۲۱)

(جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) اس قوم کے دارالسلطنت میں نو بڑے بڑے منتخب سردار تھے جن کے ذمے معاشرے کا

نظم و نسق تھا۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف آنے نہیں دیتے تھے۔

دچوہ بن نظام عدل کی طرف صالحؑ دعوت دیتے تھے اس سے اُن ارباب اقتدار کی مفاد پرستیوں پر زور پڑتی تھی، اس لئے وہی سب سے زیادہ اُس کی مخالفت کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور آپس میں کہا کہ تم اللہ کی قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کریں گے۔ اور ہم مقتولین کے دُشمن کے سامنے صاف کر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے اُنہیں ہلاک ہونے دیکھا تک نہیں، اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔

ایک اہم نکتہ | اس مقام پر ذرا رکھئے اور ایک اہم حقیقت پر غور کیجئے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ ”نعم اللہ کی قسم اٹھاؤ“ اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے تو انہیں اللہ پر ایمان لانے کی دعوت کیوں دی جاتی تھی۔ اس کی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔ یہاں مختصر اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دین جب بگڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں خدا پر ایمان تو ہوتا ہے لیکن اس خدا کا تصور وہ نہیں رہتا جو دین نے عطا کیا تھا۔ ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، لیکن رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لئے ہوئے تھے حضرت صالحؑ انہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتے تھے تو اس سے مراد یہ تھی کہ اُن کا اپنے تصور کے مطابق خدا پر ایمان، ایمان نہیں تھا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ تھے کہ حکومت صرف اس کے قوانین کی ہو۔ اور رزق کے سرچشموں کا مالک بھی اُسی کو سمجھا جائے۔ یہ ہے فرق ”مذہب“ میں خدا پر ایمان، اور دین، میں خدا پر ایمان میں! یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اہل کتاب کو بھی اللہ پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے۔ (۲/۱۳۶)؛ حتیٰ کہ مسلمانوں کو بھی (۲/۹۲؛ ۴/۱۳۶؛ ۵/۶۹؛ ۵۷/۲۸) [تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے]

اب آگے بڑھئے۔ اس قوم کے مفسدین خفیہ سازش کر رہے تھے کہ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کو چپکے سے قتل کر دیا جائے۔ ان خفیہ تدابیر کا جواب لوح مکافات کی پیشانی پر ایک ہلکے سے تبسم کے سوا کیا ہو سکتا تھا حضرت صالحؑ نے انہیں بار بار آگاہ کیا لیکن انہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے، جو آنکھیں بند کئے ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف بڑھے جا رہے تھے، علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ جاؤ! تم اس عذاب کو لے آؤ جس کی یوں دھکی دیتے چلے آ رہے ہو!

۷۲ وَ قَالُوا يٰطٰه اِنَّا نَبَا تَعْدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

اور صالحؑ سے کہا کہ اگر تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو تو جس عذاب کی تم دھکی دیتے تھے، اسے لا کر دکھاؤ۔



ناقہ صالحؑ

انسان بھی کس قدر خود شکن واقع ہو سیکے! اپنی ہلاکت کو بلبلہ کر گھرو کھاتا ہے۔ ان کی پاداش عمل کا وقت آپہنچا تھا۔ مہلت کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ لیکن آخری حجت کے طور پر حضرت صالحؑ نے کہا کہ دیکھو یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ تم احکام خداوندی کا احترام کرنا چاہتے ہو یا نہیں، ایک محسوس چیز تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں کھول کر بات نہیں بتائی گئی۔

حضرت صالحؑ نے جس محسوس شے کو بطور فیصلہ پیش کیا اس تک آنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ ماہہ النزاع بات کیا تھی۔ اس زمانہ میں مویشی اور چراگا ہیں۔ چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے۔ ارباب اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگا ہوں اور چشمیوں کو اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے تھے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکے پیاسے مرجاتے تھے۔ حضرت صالحؑ کا پیغام یہ تھا کہ یہ چشمے اور چراگا ہیں ربوبیت عامہ کے لئے خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتی ہیں اس لئے انہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ہزار روکد کے بعد انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ہم سب کے جانوروں کو یکساں طور پر چراگا ہوں میں چرنے اور چشموں سے پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں باریاں باندھ دی جائیں تاکہ نہ کسی پر زیادتی ہو نہ کسی کے حقوق میں کمی۔ انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے کہا کہ اس بات کا عملی ثبوت رک تم اس معاہدہ کا احترام کرتے ہو یا نہیں، یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑنا ہوں۔ اگر تم نے اسے آزاد چرنے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تمہارے قلوب، قانون خداوندی کے احترام کی طرف مائل ہیں۔ اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو وہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روش پر قائم ہو۔ فرمایا۔

۷۳ هٰذِهِ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةٌ فَاِذَا رَوْهَا تَاْكُلْ فِىْ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمْسُوْهَا

بِسُوْرٍ فَيَاْخُذْكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (نیز ۷۴)

۷۴ ”خدا کی اونٹنی اور خدا کی زمین“ بس یہ ہے دین کے معاشی نظام کا نقطہ ماسکہ۔ نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق

”اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے“ (ابوداؤد)

یہ ایک اونٹنی ہے۔ تم اس کے متعلق یہ نہ دیکھو کہ یہ کس کی اونٹنی ہے۔ کسی سردار کی ہے یا غریب آدمی کی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اور یہ اُسی کی اونٹنی ہے۔ دوسری طرف یہ زمین ہے جسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

میں اس اللہ کی اونٹنی کو، اللہ کی زمین میں رکھنے چھوڑتا ہوں تاکہ یہ اس میں چرے چُکے اور اپنی باری پر پانی پیئے (۹۱)۔ اگر تم نے اسے اس طرح چرنے چُکنے دیا تو یہ اس امر کی علامت ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز آجائے۔ ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن اگر تم نے اسے نقصان پہنچا یا تو اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ تم اپنی غلط روش کو چھوڑنے والے نہیں۔ اس کے بعد، تم پر تباہی کا وہ عذاب آجائے گا جس کے ظہور کا وقت کچھ دور نہیں۔ میری آنکھیں اسے بہت قریب دیکھ رہی ہیں۔

اس واقعہ کے لئے پانی پینے کی باری ٹھہرا دی۔

قَالَ هَذِهِ نَاقَةُ لِّهَآ شِرْبٌ وَ لَكُمْ شِرْبٌ يَوْمَ مَعْلُومٍ ۚ وَلَا تَمَسُّوهَا
بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (۱۵۶-۱۵۵)

ہم باریان مقرر کر رہے ہیں اور اس کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہ اونٹنی اپنی باری پر پانی پیا کرے گی اور تمہاری اونٹنیاں اپنی باری پر۔ اگر تم نے اس کی باری کے دن، اسے پانی پینے سے روکا اور کوئی اذیت پہنچائی تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز نہیں آنا چاہتے۔ اور تمہاری یہ روش ایسی ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

ان تمام حدود و شرائط سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ وہ احکام الہیہ کے احترام کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں یا نہیں۔ اِنَا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَبِعْهُمْ وَأَصْطَبِرْ ۚ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُحْتَضَرٌ ۝ (۲۸-۲۷)

اور دیکھو۔ صلح! فوراً امت سے کام لو، اور تھوڑا سا انتظار کرو۔ یہ اونٹنی جس کے متعلق انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اسے اپنی باری پر پانی پینے اور چراگاہ میں چرنے دینگے، اُن کا جھوٹ اور سچ نکھار کر رکھ دے گی، اور جب یہ عہد شکنی کریں گے تو وہ ان کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔

تم انہیں واضح طور پر بتا دو کہ اس معاہدہ کی رو سے طے یہ پایا ہے کہ ہر ایک کے مویشی اپنی اپنی باری پر پانی پیا کریں گے۔ اور اس طرح یہ اونٹنی بھی اپنی باری پر گھاٹ پر آیا کرے گی۔

اسی لئے اس اونٹنی کو ایک ”واضح نشانی“ کہا گیا ہے کہ اس سے ان کی قلبی کیفیات و رجحانات محسوس و مشہود طریق سے بے نقاب ہو سکتے تھے یعنی اس سے معاملہ محض نظری نہیں رہا تھا، عملی ہو گیا تھا۔

وَ اتَيْنَا ثَمُودَ الشَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَلَمَّوْا بِهَا وَمَا تُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا (۱۶)
 ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ اگر ان پر نباہی آنے والی ہے تو اُس کی کوئی محسوس نشانی اُن کے سامنے آئی چاہیے۔
 ان سے کہو کہ ہمارے لئے اس قسم کی نشانیاں بھیجنا کچھ مشکل نہیں۔ ہم اقوام سابقہ کی طرف بھی ایسی نشانیاں بھیجا کرتے تھے۔ جو ان کے لئے ظہور عذاب کی پیش خبری بن جائیں۔ اسی طرح قوم ثمود کی طرف اونٹنی کو، اس قسم کی نشانی بنا کر بھیجا۔ یعنی اُن سے کہدیا کہ اگر انہوں نے اُس اونٹنی کو اُس کی باری پر پانی نہ چلنے دیا تو اس امر کی نشانی ہوگی کہ وہ قانونِ خداوندی کی پاسداری نہیں کرنا چاہتے۔

کھلی ہوئی سرکشی | کرنے کو تو ان لوگوں نے معاہدہ کر لیا لیکن سرمایہ پرستی، اور افتداز خواہی کی لذت اتنی آسانی سے چھوٹا نہیں کرتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے قول و اقرار کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

فَعَقَرُوا الشَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يُطْلِمُ اٰتَيْنَا بِمَا تَعِدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۷۷)

انہوں نے اُس اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اس طرح اس بات کا ثبوت دے دیا کہ وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنے سے باز نہیں آنا چاہتے اور صالح سے کہا کہ اگر تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو تو جس عذاب کی تم دھکی دیتے تھے اسے لا کر دکھاؤ۔

اونٹنی کو کسی نے یونہی اتفاقیہ ہلاک نہیں کیا۔ ان سرکشی کرنے والوں نے خاص اہتمام سے اپنے سرغنہ کو بلایا اور اُس نے بھرپور ہاتھ مار کر اُسے ہلاک کیا۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۝ (۷۸)

انہوں نے جا کر اپنے رفیق (قبیلہ کے سردار) کو ماجر اُٹایا۔ وہ سخت غصے میں آگیا اور کہا کہ میں! اُس کی اونٹنی، ہمارے موشیوں کے برابر ہو گئی ہے! اُس نے بڑی جسارت سے اپنا ہاتھ بڑھایا، اور اُس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

ہلاک کرنے کو تو کر گئے۔ لیکن جب اس کا احساس پیدا ہوا کہ ہم نے کس قدر نچتہ عہد کیا تھا اور اب اس سے کس طرح بیداری سے پھر گئے ہیں، تو دل میں کھٹک پیدا ہوئی۔

فَعَقَرُوهَا فَاصْبَحُوا سَادِمِينَ ۝ (۲۶/۱۵۴)

انہوں نے اس اونٹنی کو مارنے کو تومار ڈالا، لیکن بعد میں سخت پشیمان ہوئے کہ اگر صالحؑ کی بات سچی نکلی تو پھر کیا ہو گا؟

چنانچہ وقت گزرتا گیا اور اس قوم کی سرکشی بڑھتی چلی گئی ان کا معمول یہ ہو گیا کہ حضرت صالحؑ نے جو کچھ کہا انہوں نے اس کی تکذیب کی اور ہر طرح سے اس کی خلاف ورزی کی۔ حضرت صالحؑ نے آخر میں کہا کہ آنش فشاں پہاڑ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ یہ پھٹا چاہتا ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا سامان کرو۔ لیکن انہوں نے حسب معمول اس کا بھی مذاق اڑایا۔

فَقَالَ تَمْنَعُونَ فِي ذَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ وَعَدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ۝ (۲۶/۱۵۵)

صالحؑ نے ان سے کہا کہ تم اپنے گھروں میں تین دن تک اور بس لو، اس کے بعد تم پر تباہی آجائے گی۔ یہ ایسا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہو گا۔ (چونکہ وہ صالحؑ کی کسی بات کو سچا نہیں مانتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے بھی دھکی ہی سمجھا)۔

غور کیجئے۔ انہیں تین دن پہلے بتایا جاتا ہے کہ اب تمہاری تباہی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ ان کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے اس لئے انہوں نے اس وعید کا بھی مذاق اڑایا۔ اور آنے والی تباہی کی کوئی پروا نہ کی۔

اس کے بعد؛

ہلاکت انگیز عذاب! | اس کے بعد وہ کچھ ہوا جس کے تصور سے آج بھی ہر قلب سلیم سینے میں دھڑکنے لگ جاتے اور ہر دیدہ عبرت چشم حیراں بن جاتے۔ اُن آگ سے بھرے ہوئے (آتش فشاں) پہاڑوں میں ایک دھماکا ہوا جس سے ایک چیخ، ایک گرج، ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قومِ ثمود کی بستیاں راکھ کا

۱۔ جیسا کہ ہم تذکرہ حضرت نوحؑ کے ضمن میں بھی لکھ چکے ہیں کہ ان حوادث کے متعلق حضراتِ انبیاءؑ نے کرام کو قبل از وقت معلوم ہو جانا تھا۔ (خواہ فراست کی بنا پر، یا وحی خداوندی کی رُوسے) وہ اپنے اس علم کو چھپا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کا اعلان کر دیتے تھے لیکن چونکہ قوم ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی اس لئے ان کے اس اعلان کو بھی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) نہیں لیتی تھی اور اپنی حفاظت کا سامان نہیں کرتی تھی۔ اس لئے تباہ ہو جاتی تھی۔

ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَثِمِينَ ۝
 سو ایک لرزادینے والی تباہی (شدید زلزلہ ۱۱) نے انہیں گھیر لیا اور وہ اپنے مکانوں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے۔

یہاں اس عذاب کو ”لرزہ انگیز دہشت“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے زور کی کڑک سے موسوم کیا گیا ہے۔
 وَاَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَاَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَثِمِينَ ۝ كَانُوا لَمْ يَغْنَوْ فِيهَا
 اَلَا اِنَّ تَمُودًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۚ اَلَا بَعْدًا لِّشَمُوذَ ۙ (۱۱-۶۷) نیز (۱۵-۸۳) (۱۲-۵۴) نیز (۳۱-۲۹)

اور ان سرکش لوگوں کو ایک زور کی کڑک نے آیا اور اپنے گھروں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے۔ (نیز

۱۵-۸۳، ۱۲-۵۴، ۳۱-۲۹، ۱۲-۴۱)۔

اور وہ گھر اس طرح ویران ہو گئے گویا یہ لوگ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ یاد رکھو! ثمود نے قوانین خداوندی سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ گئے۔

اللہ کی تدبیر | قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف ایک خفیہ تدبیر کی تھی وہ تو نا کام و نامراد رہی اور قانونِ مکافات کی وہ تدبیر جویوں ان کے پاؤں کے نیچے پٹنگی کو پہنچ رہی تھی اس طرح ابھری کہ کوئی ابھرنے والا

سامنے نہ رہا۔

وَمَكْرُؤٌ مَّكْرًا وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
 مَكْرِهِمْ ۚ اِنَّا دَمَرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِينَ ۝ قُلْ لَّكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا
 ظَلَمُوا ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۵۲-۲۷)

وہ ادھر یہ تدبیر سوچ رہے تھے، اور ہم اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ایک اور تدبیر کر رہے تھے جس کا انہیں شعور و احساس تک نہ تھا۔

سو تم دیکھو کہ ان کی تدبیر کا انجام کیا ہوا اور خدا کی تدبیر نے کیا کیا؟ (صالحؑ اور اس کی جماعت تو صبیح و سلامت رہی) اور وہ مفسدین، اور ان کی قوم، سب تباہ و برباد ہو گئے۔

یہ ہیں ان کی بستیاں جو آج تک ویران پڑی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے

اس مرکزِ شست میں اُن لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ وہ اس ہلاکت و تباہی کے خوفناک طوفانِ آتشیں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اتنے عاجز و بے بس تھے کہ اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ کر سکے اور اس آفتِ جہاں سوز سے رکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ۖ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذْنَا هُمْ الصَّيْقَةَ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۖ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَ مَا كَانُوا مُتَعَصِرِينَ ۖ (۵۱-۵۴)

اور قومِ ثمود کے واقعہ میں بھی (اسی طرح ہمارے قانونِ مکانات کی نشانیاں ہیں) ہم نے انہیں مہلت دی اور کہا کہ اس مدت میں وہ سامانِ زیست سے اچھی طرح فائدہ اٹھالیں۔

لیکن انہوں نے مہلت کے اس وقفے سے فائدہ نہ اٹھایا اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی۔ چنانچہ (ظہورِ نتائج کا وقت آیا تو) دیکھتے ہی دیکھتے، انہیں ایک ہولناک زلزلہ نے آپکڑا۔ ان کے منکبرانہ دعوے سب خاک میں مل گئے) اور ان میں اتنی سخت بھی نہ رہی کہ گرنے کے بعد، ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوتے۔
یا اپنی مدد کے لئے کسی کو بل سکتے۔ خدا کے قانونِ مکانات کے خلاف مدد کون دے سکتا ہے؟

ہلاکت اور ایسی ہلاکت! تباہی اور اس قدر تباہی!!

وَعَادًا وَ ثَمُودَ اَوْ اَصْحَابِ الرَّسِّ وَ قُرُونًا بَيِّنَ ذَلِكَ كَثِيرًا ۖ وَ كَلَّا ضَرْبًا لِّهَ الْأَمْثَالِ وَ كَلَّا تَبَرَّأْنَا تَتَبِيرًا ۖ (۳۸-۴۹) - نیز (۵۱-۵۳) (۶۹)

اور اسی طرح، قومِ عاد اور ثمود اور اصحابِ الرس کا انجام بھی ایسا ہی ہوا۔ اور دیگر بہت سی اقوام کا بھی، جو اُن کے درمیان ہو گزریں۔

ان تمام اقوام کے سامنے ہم، تاریخی شواہد پیش کر کے، بتاتے رہے (کہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے کا انجام کیا ہوتا ہے، لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی غلط روش پر اڑے رہے اور آخر الامر) ہمارے قانونِ مکانات کی رُو سے تباہ اور برباد ہو گئے۔ (نیز ۵۱-۵۳) (۶۹)۔

لہ ظاہر ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے انہیں قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا تو اگر وہ ان کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھتے اور وہاں سے نکل جاتے تو اس تباہی سے محفوظ رہتے۔ حضرت صالحؑ اور ان کی جماعت اسی طرح اس تباہی سے محفوظ رہی تھی کہ وہ قبل از وقت وہاں سے نکل مکانی نہ کر گئے تھے۔

وہ تباہی جو آج بھی ہر سننے والے کے لئے وجہ ہزار عبرت و موعظت ہے۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهٗوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (۲۶-۱۵۹)

اور صاعِ نکلی بات سبھی نکلی — اسے سچا رکھنا ہی تھا — چنانچہ ان پر تباہی آگئی۔ رجو قوم بھی دوسروں کو خدا کے دیئے ہوئے سامانِ زینت سے محروم رکھے گی، اس پر تباہی آجائے گی۔ اس واقعہ میں بھی غور و فکر کرنیوالوں کے لئے ہزار سامانِ عبرت و موعظت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے اکثر، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں لائیں گے۔

لیکن اس سے خدا کا کیا بگڑے گا؟ اس کا قانونِ بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ان پر غالب آکر رہے گا، اور ایسا نظام قائم ہوگا جس میں خدا کا عطا کردہ سامانِ رزق تمام مخلوق کی نشوونما کے لئے عام ہو۔ قانونِ خداوندی عزیز ہے ظالموں کے لئے، رحیم ہے مخلوقِ خدا کے لئے نیز (۶-۴)

یہاں آیت کے اخیر میں، خدا کے ”عزیز و رحیم“ ہونے کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ عزیز تو صاحبِ غلبہ کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بڑھ کر غلبہ و اقتدار کس کا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ایسا کرنا خدا کی صفتِ رحیمیت کا بھی تقاضا تھا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے، ان کی ہلاکت، رحمتِ خداوندی کا تقاضا اس لئے تھی کہ خدا نے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے سامانِ رزق کو سطحِ ارض پر بکھیر رکھا ہے۔ لیکن مستبد قوتیں انہیں اپنے قبضے میں لے لیتی ہیں اور مخلوقِ خدا بھوکوں مرقی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہزار سمجھایا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کریں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اب اس کے بعد وہی صورتیں باقی بھقیں۔ یا تو ان لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا اور باقی انسانوں کو بھوکوں مرنے دیا جاتا۔ اور یا ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر، عام انسانوں کو رزق کے سرچشموں تک پہنچنے دیا جاتا۔ رحمتِ خداوندی (خدا کی ربوبیتِ عامہ کی اسکیم) کا تقاضا یہی تھا کہ ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا کر رزق کو عام کر دیا جائے۔

سورۃ الشمس میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطُغُوٰهَا ۚ اِذَا نُبِعْتُ اَشْقٰهَا ۚ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نٰاقَةٌ ۚ اللّٰهُ وَاسْقٰهَا ۚ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۚ فَدُمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا ۚ وَلَا يَخَافُ عَقِبَهَا ۚ (۹۱-۱۵)

(اس حقیقت پر تاریخی واقعات بھی شاہد ہیں۔ مثلاً) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے اس قانون کو جھٹلایا۔ اور اسکی مخالفت کے لئے وہ شخص، اُن کے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا، جہاں ہر سب سے شقی القلب اور بد نعت اُن کے رسول نے اُن سے کہا تھا کہ خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو، ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رہنے دو۔۔۔۔۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس اونٹنی کو جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی فرد کی اونٹنی نہیں، کہ اس کے مالک کی حیثیت کی نسبت سے اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔ یہ۔۔۔۔۔ ”خدا کی زمین پر خدا کی اونٹنی ہے“ اسے اس کی باری پر پانی پینے دو۔ (نیز ۲۶ ذ ۳۷)

انہوں نے اس بات کا وعدہ تو کر لیا لیکن پھر اپنے قول و اقرار سے پھر گئے، اور اُس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔ (اور یوں ثابت کر دیا کہ وہ خدا کے نظام ربوبیت کی مخالفت سے باز نہیں آئیں گے)۔
تو ان کی اس روش کے نتیجے میں، خدا کے قانون مکافات کا دمدمہ آیا اور انہیں تیس تیس کر کے زمین کے ساتھ بھوار کر کے رکھ دیا۔ (انہیں پس کر خاک راہ گزر بنا دیا)۔

اور ایسا کرتے وقت وہ (خدا) اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبرا یا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟
اس لئے کہ یہ بات ظلم اور نا انصافی کی نہیں تھی، بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو ان کے سامنے آگیا۔ (لہذا قانون خداوندی کے لئے اس میں تذبذب، پشیمانی، اضطراب یا تاسف کی کوئی بات نہیں تھی۔ قانونِ عدل اس قسم کے جذبات سے بلند ہوتا ہے)۔

قانون مکافات کی ہمہ گیری | آپ آخری آیت پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ اس میں خدائے کائنات کی سطوت و جبروت اور اس کے قانون کی ہمہ گیری و نفاذ پذیری کس شوکت و اجلال سے ہیبت نگیں اور لرزہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی پندِ جہلۃ کا ٹکڑا ابھرا بھر کر گواہی دے رہا ہے کہ یہ شانِ جبروت و کبریا (معاذ اللہ) ایک مستبد و مطلق العنان بادشاہ کی لا پر واہی اور بدستنی کی مظہر نہیں بلکہ اس قوت و اقتدار کی آئینہ دار ہے جس کی رو سے نظام کائنات اس نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے چل رہا ہے۔ جس میں ایک ذرہ بے مقدار سے لے کر عظیم الشان کائنات تک ذرا سی خلاف ورزی احکام کی مجال نہیں رکھتے۔ اور جب خارجی کائنات میں اس کے نظامِ عدل کی یہ کیفیت ہے تو انسانی اعمال، قانونِ جزا و سزا کی گرفت سے کیسے باہر جاسکتے ہیں؟ اور جب اس قانون کے تحت اس کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو کس کسی قسم کے جذبات اثر انداز نہیں ہو سکتے کہ وہ جہاں رحمن و رحیم ہے وہاں ملوکِ یومر الدین

بھی ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذرا اس پردہ ساز کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا اہلکِ یَوْمِ الدِّینِ (قانونِ مکافاتِ عمل کا حاکمِ مطلق) ہونا بھی دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک گوشہ ہے کہ اگر قانونِ مکافات اس طرح بے لوث طریق پر نافذ العمل نہ ہو تو کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔ لہذا وَلَا یَخَافُ عِقَابَہَا وہ محورِ عظیم ہے جس کے گرد تمام نظامِ کائنات گردش کر رہا ہے۔ خارجی کائنات بھی اور خود انسانوں کا معاشرتی اور اجتماعی نظام بھی جس کا فیصلہ عدل اور رحمتِ عامہ کے تقاضوں کے مطابق ہو، اسے اپنے فیصلے کے عواقب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی قانون بنانے والے اور قانون کو نافذ کرنے والے کے لئے ہونا ہی ایسا چاہیئے کہ وہ جذبات سے متاثر نہ ہو۔



جماعتِ مومنین کو بچا لیا گیا | پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان لوگوں سے تین دن پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ ہلاکت بہت قریب آرہی ہے یعنی حضرت صالحؑ کو اس آنے والے

حادثہ کا علم پہلے سے دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ اپنی جماعتِ مومنین کو ساتھ لے کر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے۔

فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰ قَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحٰتِ ۝

اس قوم پر یہ تباہی اس وقت آئی، جب صالحؑ ان سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ جاتے وقت اُس نے ان سے کہا تھا کہ اے میری قوم! میں نے اپنے نشوونما دینے والے کا پیغام تم تک پہنچایا، اور چاہا کہ تم کسی طرح تباہی سے بچ جاؤ۔ لیکن تمہیں میری خیر خواہی خوش نہ آئی۔ سو تم اپنی سرکشی کے نتائج بھگتو۔ میں بصدنا سفت تم سے الگ ہو رہا ہوں۔

دوسرے مقام پر ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خٰزِرٍ يَوْمَئِذٍ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ (۱۱۶)۔ نیز (۲۶/۱۸)۔

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے صالحؑ کو اور اُس کے اُن ساتھیوں کو جو صاحبِ ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اُس رسوا کُن عذاب سے بچا لیا۔ یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقتور اور غالب رہنے والا ہے۔

نیز آیات ۲۶/۱۸۔

ان بقایائے ثمود سے جو نسل آگے بڑھی انہیں ثمود ثانیہ کہا جاتا ہے۔

✽

یہ ہے قوم ثمود کی داستان عبرت انگیز جو ہر صاحب علم و بصیرت کے لئے اپنے اندر سامان بصیرت رکھتی ہے اور جن کی اُجڑی ہوئی بستیاں ہر رہ گزر سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ دیکھو، ہمیں جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو!

فَبَلَغَ بَيُوتَهُمْ حَاوِيَةً يَمَّا ظَلَمُوا ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۲۶)

یہ ہیں ان کی بستیاں جو آج تک ویران پڑی ہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے تھے۔ اس

سرگزشت میں ان لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے جو علم و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

اسی داستان کو قرآن کریم نے بغیر نام لئے سورۃ المؤمنون کی چند آیات میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ قوم نوح کی غرقابی کے بعد ارشاد ہے۔

ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝ ثُمَّ أَنْشَأْنَا مِنْ

بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ۝ (۲۳-۳۱)

قوم نوح کے بعد ہم نے قوموں کا ایک اور دور شروع کر دیا۔

چنانچہ اس کے بعد آنے والی قوم میں بھی ہم نے اپنا رسول بھیجا، جس نے اسی پیغام کو دہرایا یعنی یہ کہ تم صرف خدا کی اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے ہر قسم کا اقتدار صرف خدا کو حاصل ہے۔ سو تم بناؤ کہ تم اس کے قوانین کی نگہداشت کر لے کے لئے تیار ہو یا نہیں۔ و اگر تم نے ایسا کر لیا تو اپنی موجودہ غلط روش کی تباہیوں سے بچ جاؤ گے۔

اس کی قوم کے اُن اکابرین نے جنہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، جو خدا کے قانونِ مکافات اور مستقبل کی زندگی کے قائل نہیں تھے، اور جنہیں سامانِ زندگی کی فراوانیاں حاصل تھیں (اور وہ دیکھتے تھے کہ نظامِ خداوندی کی زدن کے ذاتی مفادات پر پڑے گی، مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے) اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص (جو خدا کا پیغامبر ہونے کا مدعی ہے) تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ یہ بھی وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو، وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ (یہ تم سے، کس حیثیت سے ممتاز ہے جو تم اس کی بات مانو!)

اگر تم نے اس، اپنے ہی جیسے انسان، کی اطاعت اختیار کر لی، تو سمجھ لو کہ تم تباہ ہو گئے۔ (اطاعت اُس کی اختیار کرنی چاہیے جو فوق البشر خصوصیات کا حامل ہو۔ اُسے ایشور کا اوتار، یا ظل اللہ علی الارض ہونا چاہیے۔ ایک عام انسان کی اطاعت کے کیا معنی؟ پھر جس نظام کی طرف یہ دعوت دیتا ہے۔ یعنی انسانی تکریم و مساوات کا نظام۔ اس میں سراسر تمہارا نقصان ہے)۔

رودولت تمہارے پاس۔ اقتدار تمہارے پاس۔ تم جو چاہو سو کرو۔ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ نہیں! خدا کا قانونِ مکافات ایسا ہے جس کی گرفت سے تم بچ نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتے۔ اسی لئے یہ تمہیں دھمکیاں دیتا رہتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیوں کا ڈھیر رہ جاؤ گے، تو تم پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے (تاکہ جو ظلم اور زیادتی تم دنیا میں کرتے رہے ہو، اس کی تمہیں سزا ملے)۔

ذرا سوچو کہ یہ کیسی اُنہونی بات ہے! کیسی عقل سے دُور اور قیاس سے بعید بات جس سے یہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔

(مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا کیسا؟) زندگی، بس اسی دنیا کی زندگی ہے (ہماری آنکھوں کے سامنے ہر روز) لوگ مرتے رہتے ہیں اور نئے پتے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ (یہ سب اسی دنیا میں ہوتا ہے۔ لہذا یہ غلط ہے کہ) ہم مرنے کے بعد پھر اٹھائے جائیں گے۔
یہ شخص، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طرف سے جھوٹی باتیں بناتا ہے اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے ہم اس کی بات کبھی نہیں ماننے کے۔

اُس رسولؐ نے خدا سے کہا کہ اے میرے پروردگار! یہ لوگ میری بات سُنتے ہی نہیں، اور اندھا دھند تکذیب کے جارہے ہیں۔ تو اُن کے خلاف میری مدد کر۔

خدا نے کہا کہ (اُن کی مہلت کا وقفہ ختم ہونے کو ہے)۔ عنقریب اُن کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے آجائیں گے، اور یہ اپنی ان باتوں پر خود ہی پشیمان ہونگے۔

لے مادی تصور حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کچھ ہمارے ہی

دور کی اختراع نہیں۔ یہ تصور بہت پرانا ہے۔

(چنانچہ زیادہ وقت گزرنے نہ پایا تھا کہ) ایک ہولناک آواز کے عذاب نے انہیں آپکڑا۔ اور ہم نے انہیں خس و خاشاک کی طرح پامال کر دیا۔ (کیونکہ وہ ہمارے تعمیری نتائج پیدا کرنے والے پروگرام کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل تھے) (۱۱/۶۸)۔

سو دیکھو کہ جو لوگ ظلم و استبداد کی روش اختیار کرتے ہیں، وہ کس طرح زندگی کی کامرانیوں اور خوشگوازیوں سے محروم رہ جاتے ہیں (یہ ہمارا اٹل قانون ہے جو شروع سے ایسا ہی چلا آ رہا ہے۔ اور حق و انصاف پر مبنی ہے)۔ پھر ان کے بعد، ہم نے اور قوموں کا دور شروع کیا۔

اور اس کے بعد وہ نقطہ ماسکہ جو قوموں کی موت و حیات کے لئے ایک اٹل قانون کی حیثیت لئے ہوئے ہے یعنی :

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝ (۲۳/۴۳)

(وہ بھی اسی طرح اپنی غلط روش کے نتائج کی وجہ سے تباہ ہو گئیں۔ یاد رکھو! ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے) نہ تو کوئی قوم ظہورِ نتائج سے پہلے تباہ ہوتی ہے، نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ظہورِ نتائج کے بعد زندہ رہ سکے

اس میں کمی بیشی ہو نہیں سکتی۔ (۴/۴۴ ; ۱۳/۴۵ ; ۱۵/۴۶)

یہ وقتِ معین (اجل) کسی قوم کے اجتماعی اعمال کے ظہورِ نتائج کا نام ہوتا ہے (اس کی تفصیل سابقہ جلد میں گزری چکی ہے دیکھئے انڈکس)۔

سورۃ مومنون (۲۳) کی مندرجہ صد آیات کو ایک بار پھر سامنے لائیے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم صرف اس زندگی کو آخری زندگی سمجھے وہ کبھی اپنی عیش سامانیوں کو چھوڑ کر نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تو صرف وہی آمادہ ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ زندگی کو مسلسل آگے چلنا ہے اور اگلی زندگی میں خوشگوازیوں کا معیار یہ ہے کہ اس نے اس زندگی میں دوسروں کی پرورش کے لئے کیا کیا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ قرآن سرایہ پرستی کے خون آشام نظام کو مٹانے کے لئے ایمان بالآخرۃ کو بنیادی تصور قرار دیتا ہے۔ (تفصیل قرآن کے معاشی نظام کے عنوان کے تابع سابقہ جلدوں میں ملے گی)۔

﴿﴾

رسولِ اجر رسالت نہیں مانگتا | قومِ ثمود کا قصہ یہیں تک ہے۔ لیکن دو ایک مقامات ایسے ہیں جن پر آگے بڑھنے سے پیشتر مزید غور و تفکر کی ضرورت ہے۔

آپ نے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کے تذکرہ میں دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم نے ان حضرات کا یہ قول خصوصیت سے درج کیا ہے کہ ”میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے ہاں ہے“ حضرت صالحؑ کے تذکرہ میں بھی اس چیز کو دہرایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجِرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶)

اور دیکھو! میں اس بات کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ خدا کی ربوبیت عالمین کے ذمے ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا قرآن کریم نے یوں تکرار ذکر کیا ہے۔ ایک داعی الی الحق کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوتِ رشد و ہدایت کا معاوضہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک تبلیغِ پیامِ اللہ اور قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے جد و جہد ایک اہم فریضہ ہے جس کی ادائیگی اس پر لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ انسانوں سے اس کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا۔ اور یہ اس داعی الی الحق کے عظیم النظر کیرکٹر کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ تفصیل اس کی سابقہ باب (سورة الانعام) میں گزر چکی ہے۔



دوسری چیز یہ کہ اس اونٹنی کو جس کا ذکر قصہ حضرت صالحؑ میں آیا ہے ناقۃ اللہ سے موسوم اور ”آیت“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۲۳)

صالحؑ نے ان سے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔ میں اسے کھلا چھوڑتا ہوں کہ یہ چراگاہ میں آزادانہ چرے۔ اگر تم اسے آذالہ چرنے دیا تو یہ اس بات کی نشانی ہوگی کہ تم اپنے عہد پر پابند ہو۔ اگر تم نے اسے کوئی گزند پہنچائی تو اسے واضح ہو جائے گا کہ تم اپنی سابقہ روش سے باز نہیں آئے۔ اس کا نتیجہ تمہارے لئے الم انگیز تباہی ہوگا۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس اونٹنی کو ناقۃ اللہ کیوں کہا گیا تھا اور وہ کس بات کی نشانی تھی۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اونٹنی، عام اونٹنیوں جیسی اونٹنی تھی۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کی تخلیق غیر معمولی انداز سے بطور خرقِ عادت ہوئی تھی۔ محض آیت کے لفظ سے یہ کہنا کہ اس کی پیدائش معجزانہ طور پر ہوئی

تھی، قرآن کے اسلوب بیان اور حقیقی تعلیم سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ قرآن نے کشتی حضرت نوحؑ کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ آیت (نشانی) تھی۔

فَأَنجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ۝ (۲۹)
مخالفین غرق ہو گئے۔ اور نوحؑ اور اس کے ساتھیوں کو، جو کشتی میں سوار ہو گئے تھے، ہم نے اس تباہی سے محفوظ رکھا۔

اس واقعہ میں اقوام عالم کے لئے ہمارے قانون مکافات کی صداقت کی نشانی ہے (جوابہ باقی ہے کہ سرکش اور ظالم اقوام کا حشر کیا ہوا کرتا ہے۔)

حالانکہ وہ عام طریقہ کے مطابق ہی تیار ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ
فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ (۳۶)
اس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

کعبہ بھی آیت ہے اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خدا کے اس گھر کی تعمیر میں بھی کسی خرقِ عادت واقعہ کا دخل نہ تھا۔ معارضِ حرم (علیہ السلام) نے اس کی تعمیر اسی طرح کی تھی جس طرح اور مکانوں کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ملتِ حنیفہ کے لئے مرکزِ محسوس اور ان کی موت و حیات کے پرکھنے کی ایک کھلی ہوئی علامت (آیت) ہے جس طرح قومِ ثمود سے کہا گیا تھا کہ یہ ناقۃ اللہ تمہارے کفر و ایمان پرکھنے کی ایک نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو یہ تمہاری اِنَابَتِ اِلٰی اللہ کی نشانی ہوگی اور اگر اسے ضرر پہنچایا تو اس سے تمہارا انکار و وجود واضح ہو جائے گا۔ اسی طرح ملتِ اسلامیہ کی ایمانی قوت و ضعف کے پرکھنے کا معیار بیت اللہ ہے۔ اگر ان میں بیت اللہ کی حفاظت کی ہمت رہی (یعنی اس نظام کی حفاظت جس کا مرکز محسوس کعبہ ہے) تو یہ ان کی ملی زندگی اور حرارتِ ایمانی کی دلیل ہوگی۔ اور اگر اس پر دوسروں کا اثر غالب آگیا تو یہ ان کی اسلامی موت کی نشانی (آیت) ہوگی۔ قومِ ثمود نے ناقۃ اللہ کی حفاظت نہ کی اور اللہ کے رسوا کن عذاب میں گرفتار ہو گئی۔

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا فُجِّينَا صَلْحًا ۖ وَلِلَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِنْ خِزْيِ
يَوْمٍ مُّذِ ۖ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ۝ (۱۱۶)

لہ کعبہ کے متعلق تفصیل "کعبہ"۔ ابراہیم۔ "جج" کے عنوانات دیکھیے۔

چنانچہ جب ظہورِ تناسخ کا وقت آگیا تو ہم نے صالح کو اور اس کے اُن ساتھیوں کو جو صاحبِ ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اس رسوا کن عذاب سے بچا لیا۔ یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقتور اور غالب رہنے والا ہے۔

اور ہم بیت اللہ کی حفاظت کے قابل نہ رہے تو ذلت و رسوائی کا عبرت انگیز عذاب ہم پر مسلط ہو گیا۔ اور قومِ ثمود کی طرح اُس نژاد کو ”ہجومِ مومنین“ کی یہ حالت ہو گئی کہ

فَاَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جُثَثَيْنِ ۚ كَانَ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا (۱۱۷-۱۱۸)

جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے۔ گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

ہم اپنے دیار و امصار میں یوں مُردوں کی طرح اوندھے پڑے ہیں گویا ان میں کبھی زندوں کی طرح بسے ہی نہ تھے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً (۱۱۹)

یقیناً اس میں ایک عظیم نشانی ہے۔

وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ ۚ (۱۲۰)

اور (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم میں سے اکثر ان حقانی و عجز پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ نہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ خود ہماری ہی عبرتناک داستان ہے۔ کسی اور کا قصہ نہیں۔

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس چیز کی نسبت خدا اپنی طرف کرنا ہے اس سے بالتفصیل یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کے مشترک فائدے کے لئے ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قومِ ثمود کے اکابر مویشیوں کی نسبت امیروں اور غریبوں کی طرف کر کے، غریبوں کے مویشیوں کو چشموں کے قریب نہیں آنے دیتے تھے جب ان سے اس بات پر معاہدہ ہوا کہ یہ چشمے اور چراگا ہیں سب کے مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے تو اس کیلئے بطور نشان یہ کہا گیا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی امیر آدمی کی ہے۔ نہ غریب کی۔ یہ خدا کی مخلوق ہے اس لئے اسے خدا کی زمین میں چرنے کا حق ہے۔ نافِ خدا اور اَرْضِ اللہ میں یہی خصوصیت مضمحل ہے۔ اُسی طرح، جیسے خدا نے کعبہ کو بیستی (میرا گھر) کہا کہ یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام نوعِ انسانی کے مفاد کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے گا۔

واضح رہے کہ اَرْضِ کو اسی لئے اَرْضِ اللہ کہا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رہنا چاہیے۔ (تفصیل اس کی قرآن کے معاشی نظام کے عنوان میں ملے گی)۔

قوم (حضرت) لوطؑ

ازال بعد، سورۃ الاعراف کی آیات (۸۰ - ۸۰) میں داستانِ حضرت لوطؑ مذکور ہے۔ انہی کی نسبت سے اس قوم کو جس میں وہ مبعوث ہوئے تھے، قوم لوطؑ کہا جاتا ہے۔

مطالب الفرقان (جلد سوم) میں حضرت ابراہیمؑ کا تذکارِ جلیلہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔ انہوں نے جب اپنے وطن میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو خالصاً لوطؑ کے لئے لوطؑ (۲۹)۔ ”ان کا برادرِ زادہ، لوطؑ ان پر ایمان لایا“ اور ہجرت ابراہیمی میں وہ ان کے ساتھ تھے۔ (۲۱)۔ حضرت ابراہیمؑ تو ارضِ فلسطین میں منکمن ہو گئے لیکن حضرت لوطؑ، سدوم کی طرف تشریف لے گئے۔

یمن سے بحرِ احمر (RED SEA) کے کنارے کنارے ایک قدیمی تجارتی قافلوں کی سڑک حجاز و یمن سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی (قرآن کریم نے اس شاہراہ کو اَمَّاوَرُ حُصْبِیٰ کہا ہے۔ (۱۵/۲۹) قیاس یہ ہے کہ یہ علاقہ بحرِ میت (DEAD SEA) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت ساحہٴ سمندر کے نیچے آ گیا۔ حضرت لوطؑ کو اسی علاقہ میں بسنے والی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ وَرَآنَ لُوطًا لِّمَنِ الْمُرْسَلِیْنَ (۲۴/۱۳۳) ”اور بلاشبہ لوطؑ (ہمارے) پیغمبروں میں سے تھا“ انہوں نے آکر اصولی طور پر اسی پیغامِ خداوندی کی طرف دعوت دی جس کی طرف اس سے پیشتر حضراتِ انبیاء کرامؑ دعوت دیتے چلے آ رہے تھے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِیْنَ ۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ اٰخُوهُمْ لُوطُ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۚ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اٰمِیْنٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اَطِیْعُوْا ۝ (۲۴/۱۴۳-۱۴۰)

اسی طرح قوم لوطؑ نے بھی پیغامبرانِ خداوندی کی تکذیب کی۔ (۱۵/۲۹ - ۲۸ - ۲۷) ۚ ۴/۸ ۚ ۲۱/۴۴

آخر الامر، ان کی طرف ان کے بھائی بندوں میں سے، لوطؑ آیا۔ اور اس نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ تم اپنی غلط روش

کے تباہ کن نتائج سے کچنچا پیتے ہو یا نہیں؟

میں تمہاری طرف، خدا کے وہ قوانین لایا ہوں جو تمہارے امن و سلامتی کے ضامن ہیں۔

لہذا ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو، اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو۔

دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت لوطؑ اس قوم میں پہلے رسول نہ تھے بلکہ یہ قوم آپ سے پیشتر اور رسولوں کی بھی تکذیب کر چکی تھی۔ اسی لئے کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿۸۰﴾ فرمایا۔ دوسرے یہ کہ حضرت لوطؑ کو اس قوم کا بھائی (أَخُوهُمْ) کہا گیا ہے۔ اسی سورۃ میں حضرت نوحؑ ہو اور صالحؑ (سَلِيمٌ هَذَا السَّلَامُ) کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ چونکہ انہی قبائل میں سے تھے جن کی طرف وہ مبعوث کئے گئے تھے اس لئے قبیلہ کی نسبت سے ان کے بھائی کہلا سکتے تھے۔ لیکن حضرت لوطؑ تو باہر سے تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے قوم سدوم سے کسی قبائلی نسبت کی بنا پر ان کا رشتہ اخوت نہ تھا۔ انہیں ایسا ان میں رہنے سہنے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔

انہوں نے اللہ کی طرف دعوت دی اور ساتھ ہی وہ عظیم نشان اعلان بھی فرما دیا جو داعیان الی الحق کا امتیازی وصف چلا آ رہا ہے۔ یعنی

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجَرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۸۱﴾

میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے ذمے ہے۔

❦

یوں تو حضرات انبیائے کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے وہ قوم بالعموم کفر و شرک، فسق و فجور، معصیت کوشی اور بدکرداری، سرکشی و تمرد اور سلب و نہب کی لعنتوں میں گرفتار ہوتی تھی اور ان حضرات کی بعثت کی غرض ہی تھی کہ وہ ان راہ گم کردہ لوگوں کو ان کے اعمال کے ہلاکت انگیز نتائج سے آگاہ کریں۔ لیکن قوم سدوم جس شرمناک شرمناک فحاشی اور جاسوز فحاشی میں مبتلا تھی وہ دنیا جہان سے زالی تھی۔ یہ بد بخت، اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس فعل شنیع کی ابتدا بھی اسی قوم سے ہوئی۔ لفظ لواطت (لُوطٌ) خود اس پر شاہد ہے کہ اس کی نسبت قوم لوط سے ہے۔ انگریزی میں (SODOMY) سدوم (SODOM) کی نسبت سے ہے۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّا نَوْنُ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿۸۲﴾ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ﴿۸۳﴾ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿۸۴﴾

۸۰-۸۱

اور اسی طرح ہم نے لوطؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اُس نے ان سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کے کام کرتے ہو جو تم سے پہلی قوموں میں کسی نے نہیں کئے۔

تم، عورتوں کو چھوڑ کر، شہوت رانی کے لئے، مردوں کی طرف آتے ہو، اور اس طرح، افزائش نسل کے مادہ کو بے محل صرف کر کے ضائع کرتے ہو، اور ان حدود سے تجاوز کرتے ہو جو قانونِ فطرت نے اس باب میں مقرر کی ہیں۔

سورۃ اعراف میں مُسْرِفُونَ ۸۱ اور سورۃ شعراء میں عُدُونَ ۲۶ کی جامعیت پر غور فرمائیے! حدودِ فطرت سے تجاوز کی طرف کس بلیغ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۃ نمل میں فرمایا۔

وَلَوْ طَا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ۝ أَيْنَكُمْ لَتَأْتُونَ
الزَّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّجْهَلُونَ ۝ (۷۵-۷۴)

اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت سے جس نے اپنی قوم سے کیا کہ تم سب کچھ دیکھنے بھالتے، سمجھتے سوچتے، اس قدر کھلی ہوئی بے حیائی کا کام کرتے ہو!

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم، جنہی خواہش کی تسکین کے لئے، عورتوں کو چھوڑ کر، مردوں کی طرف آتے ہو۔ یہ کتنی بڑی جہالت کی بات ہے۔

وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ۔ یعنی دیدہ و دانستہ، جانتے بوجھتے، اس جیسا سو زہلِ قہر کے مرکب ہوتے ہو۔ اس بڑی جہالت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ (اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّجْهَلُونَ) سورۃ عنکبوت میں ہے کہ وہ لوگ اس درجہ بے غیرت اور آبرو باختہ ہو چکے تھے کہ کھلی مجالس میں بے حیائی کی باتیں کیا کرتے اور اس سے ذرا شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان جیسا سو زخمائوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی کھٹک تک بھی پیدا نہیں ہوتی تھی (۲۹)۔

رہزنی بھی | حقیقت یہ ہے کہ جب انسان ایسی کھلی ہوئی معصیت کو شہی کی زندگی پر اترا آئے تو پھر نرم جیہ باقی نہیں رہتی! آج بھی دنیا کی ان اقوام پر نگاہ ڈالئے جو جذبات پرستی اور فحش کاری کے سیلاب

سہہ بُصِرُونَ اور مُجْهَلُونَ کے تقابل پر غور فرمائیے۔ یعنی وہ لوگ فہم و بصیرت رکھتے ہوئے بدترین جہالت میں مبتلا تھے۔ لہذا وہ علم جو میرت انسانی کی سمجھ تشکیلی یعنی افکار و اعمال کی تطہیر نہیں کر سکتا۔ علم نہیں جہالت ہے۔ روشنی نہیں تاریکی ہے۔ آج سے چار ہزار سال پیشتر بھی اور آج بھی۔

میں ہے جاری ہیں۔ ان میں غیرت اور جیا کہیں نام کو نہیں ہوتی۔ اس بے غیرتی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یوں تو انگلستان (بلکہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی) غلام کی لعنت (SODOMY) ایک عرصہ سے چلی آرہی تھی، لیکن (۱۹۶۷ء میں) اسے انگلستان میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا! سچ کہا تھا قرآن نے کہ جب انسان پستی کی طرف گزرتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ہم جنس سے جنسی اختلاط را غلام، حیوانات کے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

قوم لوطؑ، رہزنی بھی کرتی تھی۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَأَتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ۚ إِنَّكُمْ لَأَتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۚ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيَكُمُ الْمُنْكَرَ

(۲۹-۲۸)

اور اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے۔ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایک ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو جسے، اس سے پہلے، دنیا جہاں میں کسی نے اختیار نہیں کیا تھا۔

تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے، عورتوں کو چھوڑ کر، مردوں کے پاس جاتے ہو۔ (۸۱-۸۰)

اپنی مجلسوں میں نازیبا حرکتیں کرتے ہو۔

تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اس طرح (عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی عزت مائل ہونے سے) اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل انسانی کے لئے وضع کیا ہے۔

✽

تذکیر موعظت کا جواب | یہ بھی وہ قوم جس کی طرف حضرت لوطؑ مبعوث ہوئے۔ جب آپ نے انہیں ان کی بدکرداریوں سے منع کیا تو ان کی طرف سے جو جواب ملا

وہ ان کی فطرتِ خبیثہ کا صحیح آئینہ دار ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ

۷
۸۶

۷ قطع السبیل کے معنی رہزنی بھی ہیں۔

يَتَطَهَّرُونَ ۝

لوٹا کی قوم کے پاس اگر اس کا کچھ جواب تھا تو یہ کہ آپس میں کہنے لگے۔ ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بننا چاہتے ہیں۔

ابلیسی ذنیت کی کیسی صحیح تصویر ہے، آج بھی کسی بدکردار کو اس کی جاسوز حرکات سے منہ کرنے کی کوشش کیجئے تو یہی جواب ملے گا۔ جب آپ نے زیادہ زور دیا تو یہ لوگ اس حربے پر اُتر آئے جو نشہ قوت کی بدمستی کا خاصہ ہوتا ہے۔

قَالُوا الَّذِينَ لَمْ تُنَلِّسُوا يَلُوطُ لَتَكُلُّنَا مِنَ الْمُخْرَجِينَ ۝ (۲۶)

تو وہ کہنے لگے۔ اے لوٹا! اگر تو باوجود کیا تو یاد رکھ تو لا محالہ رہاں سے نکال دیا جائے گا۔

انہوں نے یہ دھمکی دی اور آپ نے نہایت سکوت و سکون سے یہ جواب دے دیا کہ ان دھمکیوں سے تمہارے اعمال کے خلاف میرے دل کی نفرت کم تھوڑی ہو جائے گی؟

قَالَ إِنِّي لَعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِينَ ۝ (۲۷)

لوٹا نے کہا زتم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، میرے خلاف کر لو، لیکن میں تمہاری ان حرکات کے خلاف لب کشائی سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ یہ ایسا مذموم فعل ہے جسے دیکھ کر میرا دل جل جاتا ہے۔ (میرے سینے میں، جذبات نفرت کا سیلاب اُمنڈا آتا ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ جس فعل کو میں اس قدر شنیع سمجھوں، اس کے خلاف کچھ نہ کہوں۔ لہذا، میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں، اس سے باز نہیں آ سکتا۔)

یہ سلسلہ جاری رہا۔ ادھر سے تذکیر و تنذیر اور ادھر سے خدا اور انکار برابر بڑھتا گیا۔ جب حضرت لوطؑ ان سے کہتے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اس نے جو تمہیں ہمت دے رکھی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ، تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جاؤ! وہ عذاب بے آؤ جس کی یوں دھمکی دے رہے ہو۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۲۸)

اُس قوم کے پاس، اس کی ان باتوں کا جواب کچھ نہیں تھا، بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو (کہ ہماری اس روش سے خدا کا عذاب آجائے گا) تو اس عذاب کو لا کر دکھاؤ۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝ (۵۴)

لوٹا نے اپنی قوم کو بار بار تنبیہ کی تھی کہ خدا کے قانون مکافات کی گرفت سے ڈرو۔ لیکن انہوں نے اس کی پرواہ

نہ کی اور سمجھے کہ وہ یونہی خالی دھکیاں دیتا ہے، اس لئے اُس سے اُٹا جھگڑنے لگے۔
جب حضرت لوطؑ ان راہ گم کردہ بد بختوں کے انکار وجود اور سرکشی و تمرد کی ان حدود فراموشیوں کو دیکھنے تو اللہ سے
دعائیں مانگتے کہ وہ انہیں اور ان کے متبعین کو اس انسانیت فروش قوم کے اعمالِ بد کے تباہ کن نتائج سے محفوظ
رکھے۔ اور اُن پر غلبہ و نصرت عطا فرمائے۔

رَبِّ نَجِّنِيْ وَ اَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۶)

اُس نے اُن لوگوں سے یہ کہا، اور پھر اپنے نشوونادینے والے سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھے
اور میرے رفقاء کو، اس تباہی سے بچالے جو ان لوگوں پر ان کے اعمالِ بد کے نتیجے میں آنے والی ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنْصُرْنِيْ عَلٰى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۷)

اس پر لوطؑ نے اپنے رب سے عرض کیا کہ بارالہا! مفسدین کی اس قوم کا مقابلہ کرنے میں، تو میری مدد فرما۔
یہ مہلت کا عرصہ یونہی گزرتا گیا حتیٰ کہ وہ وقت آ پہنچا جب قانون مکافات کے مطابق اُن کے اعمال کی کھینٹی پک گئی
اور ظہورِ نتائج کا زمانہ آگیا۔ خدا کے فرستادہ اس قوم کی طرف آئے تاکہ آخری حجت کا بھی اتمام ہو جائے۔ یہ راستے
میں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاں گئے اور انہیں حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی

ظہورِ نتائج کا وقت

ر تفصیل سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے) جب حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہوا کہ قوم
لوطؑ پر تباہی اور بربادی کا عذاب آنے والا ہے تو اُن کی رفیقِ قلبی نے بہت چاہا کہ کسی طرح انہیں مہلت کا مزید
موقعہ مل جائے جس سے وہ شاید اپنی حرکاتِ قبیحہ سے باز آجائیں۔ (۲۷-۲۸) ذ (۲۹-۳۰) ذ (۳۱-۳۲) ذ
لیکن مشیتِ ایزدی کے علم میں تھا کہ وہ قوم رجعت و نابت کی حد سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ ان کی باز آفرینی
کی کوئی صورت باقی نہیں۔ ان کے اعمال کے ہلاکت آمیز نتائج مرتب ہو چکے ہیں۔ سورہ ہود میں ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرُّوْعُ وَ جَاءَتْهُ الْبُشْرٰى يُبٰدِلُنَا فِىْ قَوْمٍ لُّوْطُ ۝
اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَخَلِيْمٌ ۝ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰ اِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۝ اِنَّكَ قَدْ
جَاءَ اَمْرٌ رَبِّكَ ۝ وَ اِنَّهُمْ لَئِيْهُمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝ (۳۱-۳۴)

جب ابراہیمؑ کے دل سے، ان کی طرف سے پیدائندہ گھبراہٹ دور ہو گئی اور بیٹے کی خوشخبری سے اور بھی
اطمینان حاصل ہوا، تو قوم لوطؑ کے متعلق اُن سے سوال و جواب کرنے لگا۔ کہ انہیں کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے۔
ہمیں شبہ نہیں کہ ابراہیمؑ بڑا تحمل مزاج تھا، اس لئے وہ ذرا سی بات پر یونہی بھڑک نہیں

اٹھتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سینے میں بڑا درد مند دل رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی مصیبت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قوم لوط کی تباہی کی خبر کو اس نے اس طرح محسوس کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی، اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر معاملہ کے فیصلے کے لئے ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ اس لئے اس کی قیق القلبی، اتباع قوانین پر غالب نہیں آتی تھی۔

انہوں نے کہا۔ اسے ابراہیمؑ تو اس کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے) حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق، اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ اب ان پر وہ تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔

خدا کے فرستادہ | اس کے بعد وہ حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کا ذکر کئی ایک مقام پر کیا ہے اس لئے کہ یہ اس قوم کی بد اعمالیوں کا نقطہ آخری (CLIMAX) تھا۔ خدا

کے یہ برگزیدہ بندے، حضرت لوطؑ جیسے پاکباز انسان کے ہاں، مہمان آتے ہیں اور یہ بد بخت ان پر پل پڑتے ہیں۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئَئًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذُرْعًا وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۝ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ قَالَ يَقُومُ هَؤُلَاءِ بِثَانِيٍّ هُمْ أَطَهَرُكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ ۝ قَالُوا الْقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بُنْتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ۝ (۹-۱۱)

چنانچہ جب ہمارے فرستادگان ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر لوطؑ کے پاس پہنچے، تو وہ ان کی وجہ سے پریشان ہو گیا، اور اپنی بے بسی کے احساس سے، دل میں کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے! اس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ وہاں کے لوگ، نووارد و اجنبیوں سے کس قسم کا سلوک کیا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ نووارد، آکر ٹھہرے بھی لوطؑ کے پاس تھے، اس لئے وہ اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا۔

اس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر، بدستی میں دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ پہلے ہی سے اس روشِ بد کے خوگر تھے۔ لوطؑ نے انہیں (انگ) لے جا کر کہا کہ فوراً سوچو تو سہی کہ تم کیا کر رہے ہو! یہ ہماری عیریاں جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائز اور مناسب ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو (یہ بڑی شرم کی بات ہے)۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو شرافت سے کام لے اور عقل و ہوش کو نہ تیاگ دے؟

(۱۵ - ۲۹ - ۲۸ - ۲۹ - ۱۵ - ۵۱ - ۳۵ - ۲۱ - ۷۰ - ۷۰ - ۲۴ - ۲۴)

انہوں نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ہمیں عورتوں سے جنہیں تو اپنی بیٹیاں کہتا ہے، کچھ دلچسپی نہیں راہ اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ارادہ کیا ہے۔

اس واقعہ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے۔ (۱۵ - ۲۹ - ۲۸ - ۲۹ - ۱۵ - ۵۱ - ۳۵ - ۲۱ - ۷۰ - ۷۰ - ۲۴ - ۲۴)

حضرت لوط کا اضطراب
غرضیکہ دھڑکشی و فز و قوت و استیلاء کے اندھے نشے کا پھیرا ہوا طوفان تھا جو چاروں طرف سے دیوار و در کی تیز فراموش کئے، محیط تھا اور دھڑکا کا ایک تنہا بندہ ان نووارد مسافروں کی حفاظت کے لئے سینہ سپر کھڑا تھا۔ پریشانی تھی تو صرف ان مہانوں کے لئے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اَوْىٰ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (۱۱)

لوٹنے کہا کہ اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلہ کی خود طاقت ہوتی، یا کوئی قوی سہارا ہوتا جس کی مدد سے میں تمہیں ان حرکات سے باز رکھ سکتا۔

جب مہانوں نے حضرت لوط کی اس گھبراہٹ کو دیکھا تو انہیں تسلی دی کہ مت گھبراؤ! یہ ہم تک دست درازی نہیں کر سکتے۔
قَالُوْا يٰلُوطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يُّصْلَحَ اِلَيْكَ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ط
اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝ (۱۱)

لوٹ کے مہانوں نے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں (اور اہتمام محبت کے لئے ان کی طرف آئے ہیں)۔ یہ لوگ تجھ پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ تو ان کی دست درازیوں سے محفوظ رہے گا۔ بول کر وہ جب رات کا محفوظ ساحل گزر جائے تو اپنے رفقاء کو لے کر یہاں سے نکلی جاؤ، اور اس سرزمین سے یوں دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہو کہ پھر اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھو۔ تمہارے سب رفیق تمہارے ساتھ چلے جائیں گے لیکن تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ (یہ دوسری پارٹی سے تعلق رکھتی ہے اس لئے) اے وہی کچھ پیش آئے گا جو دوسروں کو پیش آنے والا ہے۔ ان کی تباہی کے لئے صبح کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ اور صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔

نیز دیکھئے۔ (۱۵ - ۲۹ - ۲۸ - ۲۹ - ۱۵ - ۵۱ - ۳۵ - ۲۱ - ۷۰ - ۷۰ - ۲۴ - ۲۴)

عذاب کی نوعیت
قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا۔

آتش فشاں پہاڑوں کا اشتقاق بڑا ہلکتا انگیز عذاب ہوتا ہے۔ کبھی تو آتش فشاں سیال مادہ (لاوا) کی شکل میں ایک بہتا ہوا جہنم بن کر گرد و پیش کے علاقوں کو دھکتے ہوئے انگاروں کی بھٹی بنا دیتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑ کے وہاں سے رکھ اور پتھروں کا مینہ برستا ہے جس کی بوچھاڑ دُور دُور تک جاتی ہے۔ پیمپائی کی تباہی اسی قسم کی "بارش" سے ہوئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان پتھروں کی رو سینکڑوں میل تک تھی۔ قوم لوط کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھاک کی کانوں میں اُگ بھر کُ اٹھی اور پھر ایسے زلزلے آئے کہ زمین نیچے دھنس گئی اور حِجیل (DEAD SEA) کا پانی اوپر آگیا۔ یہ علاقہ آج بھی بالکل کھینگر ہے، اور بحیریت کے پانی میں اس قدر تیزابی مادوں کی آمیزش ہے کہ وہ خود ایک آتش سیال ہے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا ہے۔ سورۃ اعراف میں فقط اتنا کہا ہے کہ:

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ط فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝

اور ہم نے (اُس قوم پر) پتھروں کی بارش کی (جو آتش فشاں پہاڑ سے اُڑا کر آ رہے تھے)، سو تم دیکھو کہ ان مجرمین کا انجام کیا ہوا۔

یہ مینہ، جلے ہوئے پتھروں (کھینگر) کا تھا۔

فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۚ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَادَةً مِّنْ سِجِّيلٍ ط مَنصُودٍ ۝
مَسْوْمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ط وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ۝ (۸۶-۸۷)

چنانچہ جب اس تباہی کا وقت آگیا تو اس سستی کی تمام بلند عمارتیں نیچے کر کر پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ آتش فشاں پہاڑ کے ایک جھٹکے نے اسے تہ و بالا کر دیا اور اس کے بڑے بڑے کھنگران پر بارش کی طرح برسے لگے (۸۶)۔
پہیم اور مسلسل بارش کی طرح۔

وہ پتھر، خدا کے ہاں سے موت کا پیغام بن کر ان پر نازل ہونے شروع ہو گئے۔ اس نے کتنا لوں مکانات کی رُوس سے، تباہی کا عذاب، ظالمین سے کچھ دُور نہیں ہوتا کہ اسے وہاں تک پہنچنے میں دیر لگے اور وہ اتنے میں اپنی حفاظت کا سامان کر لیں۔

یہاں پتھروں کی بارش کی تصریح کے ساتھ زلزلہ کا عبرت انگیز منظر بھی بیان کر دیا، جس سے بڑی بڑی بلند عمارات پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بلکہ وہ اتنا نیچے دھنس گئیں کہ پانی سطح ارض کے اوپر چڑھ آیا۔ (دوسری جگہ انہی کو مَوْ تَفْکِت ہے وہ جن کی بستی ان کے دی گئی تھیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دیکھئے ۹ (۶۹)۔ سورۃ حجر میں ان دونوں چیزوں

ساتھ صَیْحَةً۔ ایک ہونک آواز کا اضافہ کیا گیا، جس سے اس واقعہ کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ (دیکھئے ۱۵-۷۴)۔ آیت (۱۵-۷۴) میں قوم سدوم کے ساتھ اے صاحب الایکھ کا بھی ذکر آگیا ہے کیونکہ ان کا علاقہ ان سے ملحق تھا۔ اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ یہاں یہ چیز مزید غور طلب ہے کہ قوم سدوم کے اس تباہ شدہ علاقہ کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی شاہراہ (إِصْطَرَاءُ مُبِیْنٌ) پر واقع ہے جو نزول قرآن تک قائم رہے (سبیل مقیم) تھی یہ وہی تجارتی سڑک ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ قریش کے قافلے اس سڑک پر سے گزرتے تو ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے [اسی لئے (۱۱-۷۴) میں کہا گیا ہے کہ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ۔ یہ علاقہ ان ظالمین سے کہیں دور نہیں]۔ اس پر تو یہ اکثر گزرتے رہتے ہیں]۔ اس کے باوجود ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکذیب و انکار کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔

سورہ شعراء میں اس عذاب کے متعلق کہا کہ حضرت لوطؑ اور ان کے متبعین کو تو بچا لیا گیا اور دوسروں کو تباہ کر دیا۔ ثُمَّ دَمَرْنَا الْآخَرِیْنَ ۝ وَاصْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۖ فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ۝

(۲۶-۷۴) نیز (۳۴-۱۳۶)

چنانچہ ہم نے ان سب کو جو اس طرح پیچھے رہ گئے تھے تباہ کر دیا۔

اور یہ تباہی ان پیچھروں سے ہوئی جو کہ آتش فشاں نے ان پر برسائے تھے کیسی تباہ کن تھی یہ بارش جو ان لوگوں

ہوئی جنہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا، کہ اگر تم نے لوطؑ کی بات نہ مانی تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ (نیز ۳۴-۱۳۶)

نیز دیکھئے۔ (۲۶-۷۴) (۵۱-۳۳) ذ ۵۲-۳۳ ذ ۵۲-۳۸

✽

اہل سے مراد! گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قوم لوطؑ کی تباہی کے ضمن میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ حضرت لوطؑ اور ان کے اہل اور آل کو بچا لیا گیا۔ البتہ ان کی بیوی ان میں شامل نہیں تھی۔ اہل اور آل سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفسیر سورہ ذریت میں ان الفاظ میں فرمادی۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (۵۱-۳۳)

(چنانچہ وہ ابراہیمؑ سے رحمت ہو کر، قوم لوطؑ کی طرف گئے) وہاں لوطؑ کے گھر کے سوا، کوئی گھر نہ ایسا نہ تھا جسے قوانین خداوندی کے سامنے تسلیم خم کیا ہو۔ ہماری ہدایت کے مطابق اس گھر نے کے اخراج (سوائے لوطؑ کی بیوی کے)

وہاں سے نکل کر حفاظت دوسری جگہ منتقل ہو گئے اور باقی سب تباہ ہو گئے۔

یعنی حضرت لوطؑ کے اہل سے مراد ”گھرو لے“ اور آل سے مفہوم ”ان کی اولاد“ نہ تھی بلکہ اس سے مراد جماعت مومنین تھی۔ معیار خداوندی کے مطابق ”اپنوں اور بیگانوں“ کی تمیز و تفریق کے متعلق سابقہ عنوانات میں کئی ایک جگہ ذکر آچکا ہے بالخصوص تذکرہ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ میں۔ اسی سلسلہ میں اس کڑی کو بھی شامل کر لیجئے۔ قرآن کریم کی رو سے اپنے ”اہل اور آل“ وہ ہیں جو ایمان کے رشتہ سے منسلک ہیں۔ جو اس رشتہ سے مربوط نہیں وہ بیٹا ہو یا باپ، بیوی ہو یا بھائی ”اپنوں“ میں سے نہیں ہو سکتا۔ ان تمام رشتوں میں بیوی اور خاوند کا رشتہ، چولی اور دامن کا رشتہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کے لباس سے تشبیہ دی ہے۔

مَنْ لِبَاسٍ لِّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۸۷)

و تمہارے لئے لباس اور تم ان کے لئے لباس ہو!

لیکن ایمان کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ وہ چولی کو دامن سے اور لباس کو جسم سے الگ کر دیتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے دو مثالیں بیان کی ہیں۔ سورہ تحریم میں ہے۔

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوْحٍ وَ امْرَأَتَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ مَرَّ ذٰلَقَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِى الْجَنَّةِ وَ رَجِّعْنِىْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِہٖ ۝ وَ رَجِّعْنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظَّٰلِمِيْنَ ۝ (۸۸)

رقانون مکافات کے اہل ہونے کے سلسلے میں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے جو ان قوانین سے انکار کرتے ہیں، نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے نہایت صالح بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انہوں نے ان سے خیانت کی (یعنی ایمان میں ان کا ساتھ نہ دیا، تو ان کے شوہر خدا کے قانون مکافات کے مقابلہ میں ان کے کسی کام نہ آ سکے، اور وہ عورتیں تباہ ہونے والوں کے ساتھ تباہ ہو گئیں۔) یعنی خاوند کا حسن عمل، بیویوں کے بھی کام نہ آ سکا حالانکہ ان دونوں کا رشتہ بڑا ہی پیوستہ تھا۔

ان کے برعکس، اللہ مومنین کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہود غلامانگہ کرتی تھی کہ اے میرے نشوونما دینے والے! تو اپنی طرف سے میرے لئے عینت میں گھونٹا دے، اور مجھے فرعون اور اسکے

غلط اعمال سے نجات دے۔ بلکہ اس پوری کی پوری قوم سے جس نے اس طرح ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔
 (اس مثال میں خداوند کے برے اعمال بیوی کے ایمان پر اثر انداز نہیں ہوئے)۔
 اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار کیا ہے۔ یہی معیار ”دو قومی نظریہ“ کی بنیاد ہے۔

❦

داستانِ عبرت | یہ ہے قومِ لوط کا واقعہ اور ان کا ایسا انجام جس میں ہر صاحب عقل و بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈر اپنی ٹہنی ہوئی عظمتوں اور چھنی ہوئی ثروتوں کے زندہ مریضے ہیں۔ لیکن صرف ان کے لئے جو جہاتِ آخرت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) پر ایمان رکھیں۔ ورنہ مٹی کے ڈھیر ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ علمائے آثار و حضرات کی دلچسپیوں کا مرکز۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو سورہٴ فرقان میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ آتَوْنَا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمِطِرَتْ مَطَرُ السَّوءِ ۖ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنها ۚ
 بَلْ كَانُوا لَا يَتَذَكَّرُونَ ۝ (۲۵)

ان قوموں کی داستانیں تو میرا بھر بھی ان مخاطبین — عربوں — کے لئے ذرا دور کی باتیں ہیں، اس قومِ لوط کی بستی کے کھنڈرات پر سے تو ان کا گزرا کثرت ہوتا رہتا ہے جسے کوہِ آتشِ فشاں کے پتھروں کی بارش نے تباہ کر دیا تھا۔ کیا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ اُس قوم کا انجام کیا ہوا تھا؟ روکھتے تو ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ قانونِ مکافاتِ عمل اور تسلسلِ حیات پر یقین نہیں رکھتے اس لئے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دے لیتے ہیں کہ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا جو ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔
 چونکہ ان لوگوں کا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں، اس لئے ان اہم گوشہ کے یہ نشانات ان کے لئے عبرت کا موجب نہیں بنتے۔

وَإِذْ أَرَأَوْكَ إِن يَتَجَدَّدُونَكَ ۚ لَا هُزُوًا ۚ هَذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ۚ إِن كَادَ لَيُفْسِدُنَا عَنْهُ الْبَشَرُ لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ (۲۶)

یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جب تجھے دیکھتے ہیں تو مذاق کرتے ہیں اور (ایک ایسے انداز سے جس میں استہزاء و استخفاف کے نثر پوشیدہ ہوں) کہتے ہیں کہ ”اچھا! یہ ہے وہ جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے! اگر ہم اپنے مسلک پر ثابت قدم نہ رہتے تو اس نے ہمیں ہمارے معبودوں سے ہٹا ہی دیا تھا۔

اس کے بعد فرمایا :

وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرُونِ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلَّ سَبِيلًا ۝ (۲۵)

جب ان کے سامنے عذاب آجائے گا تو اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کون ہے جو صحیح راستہ چھوڑ کر، غلط راہ پر چل رہا ہے۔

دیکھتے بوجھتے آنکھوں پر پردے اس لئے پڑ جاتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کا محکوم و پرستار بن جاتا ہے۔

أَرَعَيْتَ مَنْ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ ۚ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ۝ (۲۵)

(حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خواہشات اور جذبات ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے)۔ سو جو شخص اپنی خواہشات

ہی کا غلام اور پرستار بن جائے، اسے کون راہ راست پر لاسکتا ہے؟ (ایسا شخص علم و عقل رکھنے کے باوجود

غلط راہ پر چلتا رہتا ہے۔ ۲۵)۔ اسے رسول! کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ تو اس قسم کے آدمی کی اس طرح

نگہبانی کر سکے کہ وہ تباہی کے جہنم میں نہ گرے؟ تو، ایسے شخص کا، فتنہ کبھی نہیں لے سکتا!

اور یہاں پہنچ کر اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ فہم و بصیرت کی استعداد اور سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت رکھنے

کے باوجود اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے اور یوں ثنوت انسانیت کھو کر حیوان بلکہ ان سے بھی گیا گزرا!

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ

أَضَلَّ سَبِيلًا ۝ (۲۵)

کیا تو سمجھتا ہے کہ اس قسم کے لوگ، دلائل و براہین پر کان دھرتے، اور عقل و خرد سے کام لیتے ہیں؟ (بالکل

نہیں۔ جو شخص اپنے جذبات کے پیچھے ہی چلتا رہے، وہ عقل و خرد سے کیسے کام لے سکتا ہے؟) یہ لوگ

انسانی سطح زندگی تک پہنچے ہی نہیں، محض حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ غلط

راہ پر چلتے ہیں۔ (اس لئے کہ حیوانات کم از کم، اپنے جبلی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں، اور اس راہ سے

کبھی ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ ان کے برعکس، جذبات کے تابع چلنے والا انسان لمحہ بہ لمحہ اپنی روشنی بدلتا

رہتا ہے۔ (۲۶) ذ (۲۷)۔

سورہ شعراء میں قوم لوطؑ کی تباہی اور ہلاکت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (۲۶)

اس واقعہ میں بھی، ارباب بصیرت کے لئے مسلمان صدمہ و غمت ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ان لوگوں میں سے

اکثر خدا کے قانون مکافات پر ایمان نہیں لائیں گے۔

وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِينَ نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ قصص و وقائع ان لوگوں کے لئے اس لئے آ
عبرت نہیں بنتے کہ یہ لوگ خدا کے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے اور عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔

وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (۲۹)

(چنانچہ وہ قوم تباہ ہو گئی)۔ ان کی داستان میں بھی ہم نے عقل و فکر سے کام لینے والوں کے لئے قانون مکافات
عمل کی صداقت اور محکمیت کی واضح نشانی رکھی ہے۔

اور اللہ کی ان نشانیوں سے آنکھیں بند کئے گزر جاتے ہیں۔

وَإِلَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصِيبَاتٌ ۖ وَبِالْآيَاتِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۳۰)

تم صبح شام ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہو۔ کیا تم اس پر بھی عقل و فکر سے کام
نہیں لیتے اور نہیں سوچتے کہ قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے؟

اور قانون مکافات کی محکم گرفت سے نہیں ڈرتے۔

وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝ (۳۱)

اس واقعہ میں جو اس بستی کے کھنڈرات پر مفتوح چلا آ رہا ہے، ان لوگوں کے لئے عبرت و وعظمت کا سامان ہے جو
غلط روش زندگی کے الم انگیز انجام سے ڈرتے ہیں۔

یعنی صحیح علم و بصیرت اور عقل و فکر کا یہ تقاضا ہے کہ ان واقعات سے استغراقی طور پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ ان اقوام گزشتہ
نے یہ کچھ کیا تو ان کا انجام یہ ہوا۔ اگر ہم بھی وہی کچھ کریں گے تو ہمارا بھی انجام ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ جس طرح فطرت کے
اُپل قوانین خارجی کائنات میں کار فرما ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی قوانین خداوندی جاری و سار
ہیں۔ اگر پانی آج بھی اسی طرح نشیب کی طرف بہتا ہے جس طرح قوم لوط و عاد و ثمود کے زمانہ میں بہتا تھا تو غلط روش کے نتائج
آج بھی وہی ہونگے جو اُس زمانہ میں ہوتے تھے۔ وَلَئِنْ تَجِدُ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا فَلْيَقُلْ قَوْلِي الْبَيِّنَاتِ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔
یہ ایک عام حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ اور ارسطو کے ذہن کی ضرورت نہیں۔ کتاب
فطرت ایک واضح صحیفہ ہے جو ہر سلیم الطبع انسان کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اسی لئے سورہ قمر میں اہم گزشتہ کے احوال
و ظروف اور ان کے اعمال کے نتائج و عواقب بیان کرتے ہوئے ہر کڑی کے بعد فرمایا کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَكِّرٍ ۝ (۳۲)

”ہم نے ان واقعات کو قرآن میں بیان کر کے بات کا سمجھنا بہت آسان کر دیا ہے۔ تو کیا کوئی ہے جو اس پر غور و فکر کر کے نصیحت حاصل کرے؟“

❦

یہ ہے تذکرہ جلیلہ حضرت لوطؑ کا جنہیں اللہ نے حکم و علم عطا فرمایا۔
وَلَوْطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرِيْبَةِ اَلَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبٰثٰتِ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا سُوْٓءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ (۲۱) ذ (۲۷)

(ابراہیمؑ کے ساتھ لوطؑ نے بھی ہجرت کی تھی۔ اُس وقت اُن کا شمار عام مومنین کی صف میں تھا۔ لیکن بعد میں) ہم نے اسے نبوت کا علم، اور اس کے مطابق لوگوں کے معاملات میں فیصلے کرنے کا منصب عطا کیا۔ اُس کی بستی کے لوگ بڑی ناشائستہ حرکات کیا کرتے تھے۔ وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر بڑی خراب راہوں پر چل رہے تھے۔ ہم نے اُس بستی کو تباہ کر دیا اور لوطؑ کو وہاں سے محفوظ نکال کر دوسری جگہ لے گئے۔

لیکن اس کے برعکس ذرا تورات کو اٹھا کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ کے ان برگزیدہ رسولوں کی سیرت کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش۔ باب ۱۷ آیت ۱۷ میں حضرت لوطؑ کو نیکو کار کہا گیا ہے۔ لیکن جاہلی قدم آگے چل کر یہ قسم بھی مذکور ہے جسے ہم سینے پر پتھر رکھ کر نقل کرتے ہیں۔

تورات کا بیان

اور لوطؑ صغیر سے اپنی دو بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا۔ کیونکہ صغیر میں رہنے سے اسے وحشت ہوئی اور وہ اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگیں۔ تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو کام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس اندرائے۔ اوہم اپنے باپ کو مٹے پلاٹیں اور اس سے ہم بستر ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اپنے باپ کو مٹے پلاٹی اور پلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ پر اُس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ اور دوسرے روز ایسا ہوا کہ پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم بستر ہوئی۔ آج رات بھی اس کو مٹے پلاٹیں اور تو بھی جا کے اس سے ہم بستر ہو کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات کو بھی انہوں نے اپنے باپ کو مٹے پلاٹی۔ اور چھوٹی اٹھ کے اس سے ہم بستر ہوئی اور اس نے اس کے لیٹتے اور اٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ سو لوطؑ کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ اور بڑی ایک بیٹا جنی اس کا نام مواب رکھا اور وہ موابیوں کا اب تک ہیں۔

ہوا۔ اور چھوٹی بھی ایک بیٹا جنی اور اس کا نام بن عتی رکھا۔ وہ بنی عتوں کا جڑ اب تک ہیں۔ (پیدائش ۱۹) (۳۸-۳۹)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خرافات کا نقل کرنا بھی تاریخین کے ذوقِ سلیم کے منافی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لظافات بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن رنگار ہے آئینہٴ باد بہ ساری کا
اس قسم کے تعاقب کے بغیر حقیقت اجاگر ہو نہیں سکتی کہ سابقہ ”کتبِ آسمانی“ کی موجودگی میں خدا کی طرف سے ایک ”نئی کتاب“ (قرآن کریم) کی کیا ضرورت تھی؟ سابقہ ”کتبِ آسمانی“ کے ان بیانات سے محرف اور خالص پیغامِ خداوندی کا فرق نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے۔

﴿

بیٹیوں سے مراد | قرآن کریم میں قومِ لوط کی عبرت انگیز داستان اتنی ہی مذکور ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر دو ایک مقامات پر غور کرنا ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بستی کے لوگوں نے ضیوتِ حضرت لوطؑ کو آن گھیرا ہے تو حضرت لوطؑ نے ان سے کہا کہ

لِقَوْمٍ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تَفْزَوْا فِي ضَيْفِي ط أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ زَانِيًا ۝ (۱۷-۱۸)

اُس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر، بدستی میں دوڑنے ہوئے آئے۔ وہ پہلے ہی سے اس روشِ بد کے خوگر تھے۔ لوطؑ نے انہیں (الگ لے جا کر کہا کہ) ذرا سوچو تو سہی تم کیا کر رہے ہو! یہ تمہاری بیویاں، جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائزہ اور مناسب ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رُسوا نہ کرو۔ (یہ بڑی شرم کی بات ہے)۔ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو سرافت سے کام لے اور عقلِ ہوش کو ہاتھ سے نہ جانے

دے۔ (۱۵/۲۸-۲۹، ۱۵/۶۱، ۵۱/۳۵، ۲۱/۷۴، ۷/۸۰، ۲۶/۱۶۵، ۲۴/۵۴)

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ نے انہیں ”اپنی بیٹیوں کی طرف کیوں متوجہ کیا؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ رکھا تھا۔

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَرْوَاحِكُمْ (۲۶/۱۶۶ نیز ۷/۸۱، ۲۴/۵۵)

تم عورتوں کو چھوڑ کر جنہیں تمہارے نشوونما دینے والے نے اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان سے فرائض

نسل ہوں مردوں کے پاس جاتے ہو۔ (تم تو بالکل حد سے گزر گئے)۔

اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے مردوں کی طرف رجوع کرتے تھے حضرت لوطؑ انہیں اس خلافتِ فطرتِ نبیؐ سے روکتے تھے اور فطرت کی صحیح راہوں کی طرف ان کی توجہ ملتفت کرتے تھے۔ اس خاص مقام پر بھی آپ نے اپنی دعوت کو دہرایا اور ان سے کہا کہ اس حماقت سے کیا حاصل! تمہارے لئے تمہاری بیویاں (بستی کی عورتیں) پاک و صاف موجود ہیں۔ ان کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟

”بستی کی عورتوں کو آپ نے بیٹیاں کہا۔ ایک مرد بزرگ و پاکباز کے نزدیک بستی کی عورتیں بمنزلہ بیٹیوں کے ہوتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ باوجودیکہ حضرت لوطؑ اس قوم میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے تھے قرآن کریم نے انہیں قوم لوطؑ کا بھائی [اَخُوهُمْ = اُن کا بھائی ۲۶] کہا ہے اور اس برباد ہونے والی قوم کو [اِخْوَانِ لُوطٍ ۵] کہہ کر پکارا ہے۔ اسی نسبت سے حضرت لوطؑ نے بستی کی عورتوں کو جنہیں ان بد بختوں نے چھوڑ رکھا تھا، اپنی بیٹیاں کہہ کر پکارا حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کے نزدیک (اپنی بیوی کو چھوڑ کر) دنیا کی تمام عورتیں بمنزلہ اپنی بیٹیوں بہنوں اور ماؤں کے ہوتی ہیں۔

❦

یہ مہمان کون تھے؟ | دوسرا غور طلب مقام یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کے مہمان رملکیوں کیسے کہ فیوضِ ابراہیمیؑ کون تھے؟ قرآن کریم نے انہیں اللہ کے فرستادہ (مرسلین) کہہ کر پکارا ہے اور اس کی کہیں تصریح نہیں کہ وہ فرشتے تھے۔ لیکن جس انداز سے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ مثلاً سورہ ہود میں کہا کہ

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهٖمَ بِالْبُشْرٰی (۱۱)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے (قاصد) ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری لے کر آئے تھے۔

یہی کچھ سورہ عنکبوت (۲۹) میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے فرستادہ تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے پاس بیٹے کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے تھے۔ سورہ ہود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کو ہم نے خوشخبری دی۔

وَاَمْرَاۗتُہٗ قَائِمٰۃٌ فَضَحِكْتُ فَبَشِّرْنٰہَا بِاسْحٰقَ ۚ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْمٰقَ یَعْقُوْبٌ ۝

(۱۱)

ابراہیم کی بیوی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اسے یہ سن کر اطمینان ہوا اور وہ جی میں خوش ہوئی کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں
 عین اسی وقت ہم نے اسے اسحقؑ کی پیدائش کی خوشخبری دی۔ اور یہ بھی کہ اسحقؑ کے بعد ان کے ہاں ان کا پوتا یعقوبؑ
 پیدا ہوگا، اور اس طرح اس سرزمین پر (قوم لوط کی تباہی کے بعد) ان کی نسل پھیل جائے گی۔

اور دوسرے مقامات پر ہے کہ ان فرستادگانِ بارگاہِ ایزدی نے کہا کہ ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں۔

قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ وَبَشِّرُوهُ بِنِعْمَةٍ عَلَيْنَا ۝ (۵۱)

(اس پر بھی وہ کھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے تو ابراہیمؑ کو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی) اس پر انہوں نے کہا کہ گھبراؤ نہیں
 ہم سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ (ہم دشمن نہیں، دوست ہیں۔ ہم خدا کے رسول ہیں، اور اس کی طرف سے تمہیں
 ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو بڑا صاحبِ علم ہوگا۔

ان مقامات میں تطبیق مشکل نہیں۔ بشارت ان فرستادگان کی زبان سے دی گئی تھی اس لئے اسے ان کی طرف منسوب کیا
 گیا۔ لیکن چونکہ یہ بشارت ان کی اپنی طرف سے نہیں تھی بلکہ یہ صرف اس کے پہنچانے والے تھے اس لئے (۱۱/۲) میں
 اس بشارت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

اسی طرح قوم لوط پر عذابِ خداوندی کے متعلق بھی دونوں نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ سورہ حجر میں ہے کہ انہوں
 نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا۔

قَالُوا إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ قَوْمِ ثَمُودَ مُجْرِمِينَ ۖ إِلَّا آلَ لُوطٍ ؕ إِنَّا لَمَجُودُهُمْ أَجْمَعِينَ ۖ إِلَّا
 مُرَاَدَهُ قَدْ دُنَا ۖ إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ ۝ (۵۸-۵۷)

انہوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں، یعنی قوم لوط کی طرف۔ وہ قوم تباہ ہو جائے گی،
 بجز لوط کی اپنی جماعت کے لوگوں کے۔ انہیں بچا لیا جائے گا۔ حتیٰ کہ لوط کے اپنے گھرانے کے لوگوں میں سے
 اس کی بیوی بھی تباہ ہو جائے گی۔ قرائن سے مترشح ہے کہ وہ لوط کے ساتھ نہیں جائے گی۔ قوم مخالفت کے ساتھ
 پیچھے رہ جائے گی۔

پہلی آیت میں ہے کہ ”ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں“ اس سے آگے بے کہ ”ہم آل لوط کو نجات دیں گے“
 اس سے اگلی آیت میں ہے کہ ”یہ ہمارا اندازہ ہے کہ حضرت لوط کی بیوی تباہ ہونے والوں میں سے ہوگی“ اسی طرح
 دیگر مقامات میں ہے (دیکھئے) ۵۱-۳۳-۳۲-۳۱-۲۹-۲۸-۲۷-۲۶-۲۵-۲۴-۲۳-۲۲-۲۱-۲۰-۱۹-۱۸-۱۷-۱۶-۱۵-۱۴-۱۳-۱۲-۱۱-۱۰-۹-۸-۷-۶-۵-۴-۳-۲-۱ ان تمام مقامات
 میں قوم لوط پر عذاب نازل کرنے، اور متبعین حضرت لوطؑ کو نجات دینے کی نسبت ان فرستادگان کی طرف

کی گئی۔ لیکن دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

مثلاً سورۃ اعراف میں فرمایا:-

﴿۸۴﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا طَفَا نَظْرُ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝

ہم نے ان پر پتھروں کا مینہ برسایا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ نیز (۱۱۰/۵۴)

ان مقامات میں بھی کوئی الجھاؤ نہیں۔ قوم لوط پر عذاب اور جماعت مومنین کی اس سے رنگاری۔ دونوں خدا کے قانونِ مکافات کے تابع تھے۔ لیکن یہ فرستادگان چونکہ اس مقصد کے لئے مامور تھے کہ ان کے ذریعے اس سرکش قوم پر تمام حجت ہو اور متبعین حضرت لوطؑ اس عذاب سے محفوظ رکھے جائیں۔ اس لئے انہوں نے ان امور کو اپنی طرف منسوب کیا۔ جیسے، جب کوئی مامور میں اللہ (رسول) اپنی قوم سے کہتا ہے کہ ”میری بات سنو“ تو اس سے مقصود پیغام خداوندی ہوتا ہے۔ یادہ کہتا ہے کہ ”میری اطاعت کرو“ تو اس سے مفہوم اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سورۃ ہود کی ان آیات پر بھی غور کیجئے جن میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ان فرستادگان سے سنا کہ وہ قوم لوط کی تباہی کے لئے مامور ہو کر جا رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ کسی طرح اس قوم پر سے عذاب ہٹل جائے اور انہیں مزید مہلت مل جائے تاکہ (شاید) وہ اس دوران میں اپنی اصلاح کر سکیں۔ یہ سب باتیں فرستادگان سے ہو رہی تھیں۔ اور انہوں نے بھی جواب میں کہا تھا کہ

يَا اِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۖ اِنَّكَ قَدْ جِآءَ اٰمُرٌ بَلٰغٌ (۱۱۱)

انہوں نے کہا کہ اے ابراہیمؑ! تو اس بات کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے) حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق، اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ اب

ان پر تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔ (۱۱۲)

لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست کے متعلق کہا ہے کہ

يٰمُجَادِلُنَا فِى قَوْمٍ لُّوطٍ (۱۱۳)

اس نے قوم لوط کے بارے میں ہم سے سوال و جواب شروع کئے۔

اس لئے کہ کسی پیغامبر سے پیغام کے متعلق کچھ کہنا، دراصل صاحب پیغام سے کہنے کے مرادف ہوتا ہے۔ پیغامبر تو کسی کا پیغام پہنچانے والا ہوتا ہے۔ پیغام کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ صاحب پیغام (جس کی طرف سے پیغام آیا ہے) سے ہی متعلق ہوگا۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے اس باہمی تعلق کو پیش نظر رکھنے سے انسان بہت سی غلط فہمیوں سے بچ سکتا ہے۔

یہ بحث کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے امور کو انسانوں کی طرف اور انسانوں کے ہاتھوں میں انجام دے گئے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے پہلے گزر چکی ہے۔ (انڈکس میں دیکھئے)

یہ بھی واضح رہے کہ یہ فرستادگان "ملائکہ نہیں تھے کیونکہ جیسا کہ مطالب الفرقان جلد دوم ص ۶۹ پر بتایا گیا ہے، ملائکہ انسانوں کو نظر نہیں آتا کرتے چہ جائیکہ وہ انسانی پیکروں میں سامنے آئیں؟

—:—

قوم مدین ————— حضرت شعیبؑ

اس بعد سورۃ الاعراف کی آیات (۸۴-۸۵) میں قوم مدین کا ذکر ہے جس کی طرف حضرت شعیبؑ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ان کا تذکرہ بھی حسب سابق مسلسل پیش خدمت ہے۔ ان کی انقلابی دعوت کا مرکزی نقطہ بھی حضرت صالحؑ کی طرح معاشیات سے متعلق تھا، اس فرق کے ساتھ کہ حضرت صالحؑ کا زمانہ زرعی معیشت کا تھا، ریایوں کے ان کی قوم کی معیشت زرعی تھی، اور حضرت شعیبؑ کی قوم کی معیشت کا رو باری تھی۔

مطالب الفرقان (جلد سوم ص ۳ پر) ذریت حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں دیکھا جا چکا ہے کہ آپ کی بیوی (قطورا) کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی، ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ حضرت اسمعیلؑ ارض حجاز میں متمکن ہوئے اور حضرت اسحقؑ فلسطین میں، مدین، حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا اور اس کی نسل، تائیرنج کے صفحات پر قوم مدین کے نام سے منعارف ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۱۲۰۰ یا ۱۲۵۰ ق م ہے۔ اس لئے قوم مدین کے آغاز کا زمانہ ۱۲۰۰ ق م تصور کرنا چاہیئے۔ جو قافلہ حضرت یوسفؑ کو چاہ کنعان سے بازار مصر میں لے گیا تھا کہا جاتا ہے کہ وہ انہی مدینیوں کا تھا۔ یہ قوم اس علاقہ میں بڑھی۔ پھولی پھلی۔ قریب چار سو سال تک یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی جب حضرت موسیٰؑ (قبل از نبوت) مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ قرآن کریم میں قوم مدین ہے کہ انہوں نے یہاں پہنچ کر ایک کبیر سن بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کر لی۔ اور گائے بانی کی خدمت میں فعال لی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کر دیا۔ (ملاحظہ ہو ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷

کون تھے لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ تورات میں ان کا نام کہیں رعوہل کہیں یثرو اور کہیں حوآب لکھا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوآب ہی تھا جیسا کہ کتاب گنتی (۲۴) میں مذکور ہے، باقی نام واصل القاب تھے اور یہی حوآب ہیں جو قرآن کریم میں شعیبؑ کے نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے یعنی سبیلہ (ق۔ م)۔

اصحاب الایکہ | تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا۔ اس کا بیٹا وہاں اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا۔ یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے پٹا ہوا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کے علاوہ 'اصحاب الایکہ' کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ بنو وہان ہی تھے۔ ایک کے معنی ہیں جنگل۔ ان کی نئی نئی متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ اسی شاہراہ (مام میں) پر واقع تھی جو حجاز سے شام کی طرف جاتی ہے اور خیں کا ذکر قوم لوط کی مرکز شت میں آچکا ہے۔

وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَطَالِبِينَ ۖ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۖ وَإِنَّهُمَا بِلِأَمَامٍ مُّسِينٍ (۸۵-۸۶)

اور اس طرح اصحاب الایکہ (گھنے جنگل کے رہنے والے) ————— بھی بڑے سرکش تھے۔

سوم نے انہیں بھی 'ان کی سرکشی کی سزا دی' — اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قوم لوط اور قوم مدین کے شہر) عام شاہراہ پر واقع ہیں۔

یہ تھے وہ قبائل جن کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ (نسی طور پر آپ مدین کے قبیلہ سے متعلق تھے)۔
وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۖ قَالَ يَبْنَؤُا بَعْدُ ۖ وَاللَّهُ مَالِكُ مَنَ إِلَٰهِ غَيْرُكَ ۖ قَدْ جَاءَ تَحَكُّمٌ مِّنَ رَبِّكُمْ ۖ فَاؤْفُوا ۖ الْكَيْلَ وَالْبِيزَانَ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ ۖ وَلَا تَفْسُدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۖ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ (نیز ۸۶)

اور اہل مدین کی طرف ہم نے، ان کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے بھی ان سے یہی کہا کہ تو انہیں خداوندی کی اطاعت کرو۔ اس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی حکومت اختیار کی جائے۔ تمہارے پاس تمہارے نشوونما کرنے والے کی طرف سے واضح تعلیم آچکی ہے تمہیں چاہیے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول تو پورا رکھو لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ (۸۳-۸۴)۔ اور معاشرہ میں، ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد، ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی بھلے کے لئے ہے اگر تم اس پر یقین رکھو۔ (نیز ۸۶)

آپ ان قبائل کی طرف سب سے پہلے رسولؐ نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے اور رسولؐ بھی آچکے تھے جن کی تکذیب کی گئی تھی۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶/۱۴۶)

اسی طرح اہل مدین نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی۔

انہی کو حضرت شعیبؑ نے مخاطب کیا تھا۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ (۲۶/۱۴۸-۱۴۷)

آخرا امران کی طرف شعیبؑ آیا، اور ان سے کہا کہ کیا تم اپنی روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا نہیں چاہتے ؟

(۲۶/۸۵-۸۴) ف (۱۱/۸۴) ذ (۱۱/۸۵) اور (۸۳/۱-۴)

میں تمہاری طرف خدا کے ہاں سے، ایسا ضابطہ قوانین لے کر آیا ہوں جو امن و سلامتی کا ضامن ہے۔



دولت کے نشہ میں مست

ایک تو علاقہ سرسبز و شاداب۔ اس پر دور دور تک کی تجارت اہل مدین دولت کے نشہ میں مست تھے۔ دولت کے ساتھ کثرت افراد

بھی شامل تھی جو قبائلی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس لئے دولت و قوت کی فراوانی سے یہ قوم طاعونی

سرکشیوں کا آتشیں پیکر بن چکی تھی۔ جب سرمایہ داری اور تجارت ایک خدا فراموش قوم کے ہاتھ میں ہوں، تو وہ لوگ جن

ابلیسی حربوں سے لوگوں کا گلا گھونٹتے ہیں وہ محتاج تشریح نہیں۔ اس قوم میں یہ سب خرابیاں ایک ایک کر کے آ

چکی تھیں۔ اس تاجرانہ "جیب تراشی" کے علاوہ، یہ لوگ اپنی قوت و کثرت کے بل بوتے پر رہزنی سے بھی نہیں چو

تھے۔ یہ ان کی عام حالت تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ نے (بعد از نبوت) بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے ہجرت کی ہے

تو انہی علاقوں میں خیمہ زن ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں انہی لوگوں سے خریدتے تھے۔

یہ انہیں یوں بھی لوٹتے تھے اور پھر ہر قسم کا فتنہ و فساد بھی برپا کرتے تھے۔ تو رات (سفر القضاۃ اور سفر اعداد) میں

دیکھئے، کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے خلاف کس کس قسم کی ننگ انسانیت حرکتیں کیں۔ ان کی عورتوں نے بنی اسرائیل

کے نوجوانوں کو (جو درحقیقت ان کی سپاہ تھی) اپنے دام فریب میں پھنسا کر بد اخلاقی کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہیں،

آہستہ آہستہ، ان کے سرداروں سے باغی کر دیا۔ ارد گرد کے قبائل کے ساتھ سازشیں

فتنہ و فساد

شروع کر دیں کہ بنی اسرائیل کو ان علاقوں سے نکال دیا جائے۔ غرضیکہ جس طرح ہر مستبد قوم کا شیوہ

ہے انہوں نے اس قسم کے ابد فریب حربوں سے بنی اسرائیل کے جواہر ملی کو ایک ایک کر کے چھین بیٹھا چاہا۔ یہ تھا وہ وقت

جب حضرت شعیبؑ نے انہیں لٹکارا اور کہا کہ وہ اس قسم کے انسانیت سوز جرائم سے کیوں غضب الہی کو دعوت دے رہے ہیں ؟ سورۃ الاعراف میں ہے ۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۖ قَالَ يَبْنَؤُا لِقَوْمٍ اَعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَ تِلْكَ مِن رَّبِّكُمْ بَيِّنَةٌ ۚ وَأَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۚ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۚ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنُ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَرَكُمْ ۚ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝

اور ایل مدین کی طرف ہم نے، اُن کے بھائی بندوں میں سے شعیبؑ کو بھیجا۔ اُس نے بھی ان سے یہی کہا کہ تو انہیں خداوندی کی اطاعت کرو، اُس کے سوا کوئی ایسی قوت نہیں جس کی حکومت اختیار کی جائے۔ تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح تعلیم آپکی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے واجبات میں کمی نہ کیا کرو۔ (۸۳)۔ اور معاشرہ میں، امورایاں پیدا ہوجانے کے بعد، ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی بھلے کے لئے ہے اگر تم اس پر نفیق رکھو۔

دیکھو! ایسا نہ کرو حق و صداقت کی طرف سے جانے والے راستوں پر راہزنوں کی طرح بیٹھ جاؤ۔ جو لوگ صحیح نظام خداوندی قائم کرنے کے لئے اُٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دے کر، اس راستے سے روکو اور انسانیت کی راہ میں بیچ و خم پیدا کر کے درپے رہو۔ تم اپنی اُس حالت کو یاد کرو جب تم تعدا میں بہت کم تھے (اور بے مروتی بھی) سو خدا نے (اسن و عافیت دے کر) تمہاری تعدا بھی بڑھا دی اور تمہیں ویسے بھی بہت کچھ دیا۔ (اب تم معاشرہ میں فساد برپا کرتے ہو) لیکن اسے تو سوچ لو کہ معاشرہ میں فساد برپا کرنے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟ غور کیجئے۔ وہ تمام عیوب و جرائم جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کس طرح ایک ایک کر کے بیان کئے گئے ہیں۔ سورۃ ہود میں ارشاد ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۖ قَالَ يَبْنَؤُا لِقَوْمٍ اَعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّجِيطٍ ۝ وَيَقَوْمٍ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ

وَلَا تَعْوَفُ فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا
أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝ (۸۶-۸۵)

اور اس طرح ہم نے قوم مدین کی طرف ان کے بھائی بند، شعیب کو بھیجا۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم صرف خدا کی
محکومیت اختیار کرو۔ اُس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے
خوشحال ہو، لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اور اپنے،
ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اُس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم
ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد، عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ
کرو۔ ایسا کر دگے تو ملک میں سخت ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔
یاد رکھو! جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے جمع کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت
کچھ نظر آتا ہے، لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا، ثبات و دوام صرف اُن مفادات کیلئے
ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اسے
حاصل ہو سکتا ہے جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ (۱۳۱)۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اسی صورت
میں آسکے گی کہ تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ (اگر تم اس پر یقین نہیں رکھتے تو اسے تم سے جبراً
نہیں منوا یا جاسکتا اس لئے کہ) میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا (۱۱۶-۱۱۷)۔

دعوتِ شعیبی | بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ کے ٹکڑے پر غور فرمائیے۔ دینائے معاملات کا کون سا
گوشہ ہے جو اس احاطہ کے اندر نہیں آجاتا۔ تم پوری پوری محنت کرو اور پھر اس محنت کے
ماحصل کو خدا کے اس نظام کے تاج رکھو جو ربوبیتِ عامہ کے لئے مشکل ہوا ہے۔ وہاں سے اس رزق کی تقسیم قانون
خداوندی کی رو سے اس طرح ہوگی کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت رُک کر نہیں رہے گی۔ جو کچھ اس طرح سے حاصل ہو،
حقیقی خوشگواریاں اور رفرازیاں اس سے ملتی ہیں۔ اسی سے تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما اور انسانیت کی پرورش
ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آیات (۱۴۹-۱۵۶) دیکھئے۔

دعوت کا جواب | قوم کی حالت اور حضرت شعیب کی دعوت ہمارے سامنے آچکی ہے۔ اس دعوت کا
بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پیشتر کی اقوام میں ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس سے عبرت حاصل کی۔

لیکن باقی اپنی سرکشی میں بدست رہے۔ (۸۶)۔

قوم کی بدعنوانیاں اور حضرت شعیبؑ کی اصلاح کی کوششیں دوش بدوش آگے بڑھتی گئیں۔ حتیٰ کہ وہ قوم ان اوجھے ہتھیاروں پر اتر آئی جو اندھی قوت کے آخری حربے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے قوم اور حضرت شعیبؑ کے مکالمات کو اپنے خاص انداز میں بیان فرمایا ہے جسے اسی ترتیب و اسلوب سے درج کیا جاتا ہے۔ سورة اعراف میں ہے۔

نواں پارہ شروع

﴿۸۸﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِيبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَنَعُودَنَّ فِيْ مِلَّتِنَا

اس پر اُن اکابرین نے، جو قوت اور دولت کے نشے سے بدست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شعیبؑ! دو باتوں میں ایک بات ضرور ہوگی۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی سابقہ مسلک اختیار کرنا ہوگا، جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہوئے ہیں۔ ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ تم خود سوچ لو کہ تم کیا چاہتے ہو؟

تخویف و ترہیب | دیکھئے جب دانش و بصیرت پر مبنی کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو مستبد قوتیں کن دھمکیوں پر اتر آتی ہیں۔ یا تو اس انقلاب انگیز مسلک سے باز آجاؤ۔ ورنہ ملک بد کر دیئے جاؤ گے! لیکن جن کی آنکھیں حقیقت کو بے نقاب دیکھ چکی ہوں ان پر ان دھمکیوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ قَالَ أَوْ لَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ۝ (۸۸) خواہ ہم اس مسلک کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتے ہوں! پھر بھی اسے اختیار کر لیں؟ غور کیجئے! استبداد کے مطالبات کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مستبد قوتیں اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ جسے آپ کی بصیرت درست سمجھے اسے اختیار کر لینے کا آپ کو حق حاصل ہو۔ آپ کو وہ مسلک اختیار کرنا ہوگا جسے ان کی مصالحتیں اپنے مفید مطلب سمجھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ کا بندہ علیٰ وجہ البصیرت ان گمراہ کن راستوں کو چھوڑ چکا ہو، وہ محض استبداد کے ڈر سے ان راہوں کو کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

﴿۸۹﴾ قَالَ أَوْ لَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ۝ قَدْ اخْتَرَيْنَا عَلَىٰ اٰللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ

بَعْدَ إِذْ جَعَلْنَا اللَّهُ مِنْهَا مَآيَ يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا
وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا رَبُّنَا أَفْتَمُ يَبِينُ قَوْمًا بِالْحَقِّ
وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۝ (۸۸-۸۹)

اس شعیبؑ نے اُن سے کہا کہ خواہ تمہارے مسلک و مشرب کو ہم ناپسند ہی کیوں نہ کریں، پھر بھی ہمیں، تمہارے
ڈر کی وجہ سے، اُسے زبردستی اختیار نہ کرنا پڑے گا۔

اگر ہم تمہارے مسلک کو اختیار کریں، حالانکہ (خدا نے اپنی وحی کی روشنی عطا کر کے) ہمیں اس باطل مسلک
سے نجات دلائی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہمیں خدا نے سیدھا راستہ دکھا دیا
ہے، تو یہ سب افترا اور خدا پر بہتان ہی ہے۔ تم کان کھول کر سن لو کہ ہم، تمہارے مسلک کی طرف لوٹ کر نہیں آسکتے
ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم نے یہ دین، اُس خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہنمائی کی بنا پر اختیار کیا ہے جس کا علم
تمام چیزوں کو محیط ہے۔ باقی رہیں تمہاری دھمکیاں، سو ہم ان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ ہمارا بھروسہ قانونی خداوند
کی محکمیت پر ہے۔

شعیبؑ نے پوری جرات اور انتقامت سے اُن اکابرین کو یہ جواب دیا اور پھر کہا کہ اے ہمارے نشوونما
دینے والے! تو اپنے قانونِ مکافات کی رو سے، ہم ہیں اور ہماری قوم میں، کھلا کھلا اور آخری فیصلہ کر دے۔
تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (کیونکہ تیرا فیصلہ قانون اور عدل پر مبنی ہوتا ہے)۔ اس میں نہ کسی کی رعایت
ہوتی ہے، نہ کسی کے خلاف تعصب اور انتقام کا جذبہ کارفرما۔

جب حضرت شعیبؑ کی محکم خودی کے سامنے ان لوگوں کی کوئی پیش نہ چلی تو عوام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ خردوار ہجو
شخص اس کے پیچھے چلے گا سمیت عذاب میں ماخوذ کر دیا جائے گا۔

۹۰. وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِيُنْزِلَ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذَا
الْعُسْرُ ۝

۱۔ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا کے یہی معنی ہیں جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اسلوبِ قرآنِ کریم میں استثنا
بالمشیت، ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا يَشَاءُ اللَّهُ وغیرہ ہو تو اُس کا مطلب ہوتا
ہے کہ جو کچھ کہا ہے، اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا (ملاحظہ ہو لغات القرآن جلد چہارم ص ۱۶۱۔ عنوان ن۔ م۔ ی۔)

اب اُس قوم کے اکابرین نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔ انہوں نے شعیبؑ سے مزید بات کرنے کے بجائے اُس کے متبعین کو دھمکانا شروع کیا کہ اگر تم شعیبؑ کا اتباع کرتے رہے، تو یاد رکھو کہ تم سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ غور کیجئے! دعوتِ حق و صداقت کو کس طرح دبایا جاتا ہے! دنیا میں کوئی طاغوتی قوت ایسی نہیں جو دعوتِ الی اللہ کی عام تبلیغ اور اس کی اتباع و اطاعت کی اجازت دیدے۔ ابد سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور ازل تک یہی ہوتا چلا جائے گا۔ آپؐ نے نہیں دیکھا کہ ابلیس، آدم کے ساتھ اس ایسیج پر کن دعاوی کو ساندھے کر آیا ہے؟ لہذا اگر طاغوتی قوتوں کی طرف سے کسی دعوت کی مخالفت نہیں ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ دعوتِ حق و صداقت کی دعوت نہیں خواہ اس پر خدا پرستی کے کیسے ہی جاؤں نگاہ اور نظر فریب پر ہے کیوں نہ ڈال دیئے گئے ہوں۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی (خواہ ان کی شکل کچھ اور نام کوئی سا کیوں نہ ہو) ان کی مفاد پرستیوں پر مبنی ہوتے ہیں اور نظامِ خداوندی فروعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مفاد پرستیوں اور عیشِ سامانیوں پر سخت زور پڑتی ہے۔ لہذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت فطری چیز ہے۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نظام صحیح معنوں میں نظامِ خداوندی نہیں۔ حق و صداقت اور باطل و ضلالت کی دعوتیں پر کھنے کا یہ ایک ایسا کھلا ہوا معیار ہے جس میں کبھی کہیں کوئی استثنا نظر نہیں آئے گا۔ لہذا حضرت شعیبؑ کے ساتھ یہی کچھ کیوں نہ ہوتا؟

سورہ ہود میں قوم کی طرف سے ایک ایسے اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے جو اسلام کی ایک بہت بڑی اصولی حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ انہوں نے کہا۔

قَالُوا لَشُعَيْبُ أَصْلٰوَتُكَ تَأْمُرُكَ اَنْ تَتْرَكَ اٰبَاؤَنَا اَوْ اَنْ تَفْعَلَ فِىْ اَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ اِنَّكَ لَآَنْتَ اِلٰهِنَا لَئِنْ لَّمْ يَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِِدَةٌ كُنَّ مِنْ اٰمِ الْغٰلِبِيْنَ ۝ (۱۱۰)

انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! (تم جو کچھ کہتے تھے اس سے ہم نے سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ سے کہ آئے ہو۔ اس لئے ہم نے اس سے کچھ تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے طریقے پر پوجا پاٹ کرنے رہیں گے۔ تم اپنے طریقے پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا ہی نہیں۔ نیری صلوٰۃ پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں بھی دخل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں)۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ کہ ہم جسطرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں۔ اور نہ ہی جسطرح

جی چاہیے اُسے خرچ کریں؟ چہ خوب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آباء و اجداد جن سے یہ موجودہ نظام منسلک ہو کر چلا آ رہا ہے، سب ظالم اور جاہل تھے۔ اور عقل و فہم اور تحمل و بردباری، غریبوں کی ہمدردی اور غنچا جی، سب تمہارے حصے میں آ گئی ہے!

مذہب کے متعلق یہ ایک عام خیال ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق کا نام ہے اسے.....

مذہب و سیاست | دنیاوی معاملات سے کیا واسطہ؟ مذہب کا دائرہ۔ پوجا پاٹ۔ نماز روزہ۔ نیک عمل اور خدا پرستی۔ تاک محدود ہے، اس سے آگے دنیاوی معاملات ہیں۔ ان معاملات

میں مذہب کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خیال نیا نہیں۔ خدا کا سچا مذہب جس کے لئے صحیح لفظ دین، یعنی نظام اطاعت خداوندی ہے، جہاں اور جہاں بھی پیش کیا گیا خود ساختہ قوانین پر چلنے والے انسانوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ”مذہب کو ان معاملات کے ساتھ کیا تعلق؟“ خدا کی عبادت (بمعنی پوجا پاٹ) سے دنیا میں کوئی نہیں روکتا۔ اس سے دوسرے کا بگڑتا کیا ہے۔ آپ صبح سے شام تک اس شکل کی عبادت کرتے رہیئے آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ہر جگہ آزادی ہے۔ لیکن جب آپ عبادت بمعنی عبودیت (یعنی انسانوں کے بجائے قوانین خداوندی کی محکومیت) کو مذہب (یعنی دین) کی حیثیت سے اختیار کریں گے تو مستبد قوتیں کبھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔ اسلئے کہ دنیا کا نظام استبداد، انسانوں کو حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ لیکن اللہ کا نظام (یعنی دین) انسانوں سے یہ حق چھین کر اس ذات کے سپرد کر دیتا ہے جو حکومت کی فی الواقعہ سرادار ہے۔ لہذا دوسروں پر اپنی مرضی چلانے کا خوگو انسان اسے کس طرح گوارا کر سکتا ہے؟ یہ ہے وہ جذبہ محرکہ جس کے تحت مستبد قوتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مذہب پوجا پاٹ کی حد تک رہے تو بالکل درست۔ لیکن اگر ان کے معاملات میں دخل دینے لگ جائے تو سخن دین است۔ یہی ہے وہ اعتراض جو قوم مدین نے کیا۔ انہوں نے حضرت شعیب سے کہا کہ آپ نمازیں پڑھتے رہیئے۔ ہم کب روکتے ہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ کی یہ نماز کیسی ہے جو کہتی ہے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں بلکہ اسے کسی اور قانون کے تابع رکھیں۔ ”اموال“ کے لفظ کو خاص طور پر سامنے رکھیئے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظام صلوٰۃ صرف مساجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات کو بھی اپنے اندر لے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین خداوندی ان نامہوار یوں کو جو

کرنے کے لئے آتا ہے، جو تقسیم رزق کے بارے میں انسانوں نے اپنے خود ساختہ آئین و قوانین کی رو سے پیدا کر رکھی ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہینچیکہ غیر خدا فی نظام، نظام خداوندی کے مقابلہ میں آتا ہے اور اس سے بڑی شدت سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنی صلوٰۃ کا دائرہ اپنی مساجد تک رکھو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض تو ایک طرف میں تمہاری مساجد کی تعمیر، مرمت، روشنی، پانی، جھاڑ فافوس، فرش، قالین تک کے لئے مدد و دنگا لیکن اگر تم یہ کہو کہ خدا کا قانون ہماری معاشی زندگی کو بھی محیط ہے تو اس کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

یہ تو تھا آیت کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق۔ اب پہلے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اہل مدین بت پرست تھے۔ بت پرستوں سے پوچھئے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم پرستش تو درحقیقت خدا ہی کی کرتے ہیں لیکن انہوں کو خدا کی صفات کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔

مقصود سب کا ایک ہے بابا

لہذا تمہاری نماز اور تمہاری بھگتی ایک ہی منزل تک پہنچنے کے دورستے ہیں۔ اور بت پرستوں تک ہی کیا موقوف ہے! دنیا میں کسی "خدا کے بھگت" سے پوچھئے۔ وہ یہی کہے گا کہ راستے مختلف ہیں لیکن قبلہ مقصود سب کا ایک ہے۔ کسی نے خدا کا کہہ دیا کسی نے رام رام۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ تعلیم بظاہر بڑی خوش آئند ہے اور دلآویز۔ اسی لئے مذہب کو خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق تک محدود رکھنے کے مدعی اور ساعی ہمیشہ اس قسم کے بزرگوں کے اقوال پیش کرتے رہتے ہیں جن سے یہ پایا جائے کہ راستے جدا جدا ہیں مطلوب سب کا ایک ہے۔ (جہنا ایک، گھاٹ بہتیرے۔ کہت کبیر سمجھ کے پھیرے) اور اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں کہ جب عالمگیر سچائیاں سب جگہ یکساں طور پر موجود ہیں تو پھر اختلاف طریق پر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ دو مردوں کو اپنے طریق کی دعوت دے۔ جس طریق پر کوئی چلا کر یا ہے ٹھیک ہے۔ غور کیجئے۔ قوم مدین نے حضرت شعیب سے کیا یہی نہیں کہا؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے جس طریق پر چلے جا رہے ہیں اور جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تم جس انداز سے اپنے رب کی عبادت کرتے ہو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ لوگوں سے یہ کہو کہ وہ اپنے طریقہ کو چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کر لیں؟

مذکر و مصدر تصریحات کو سامنے رکھ کر آیت نظر پر پھر غور کیجئے کہ حقائق و عبرت کا کتنا بڑا بحر ذخار ہے جو چند الفاظ کے سواحل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔ دین الہی خدا اور بندے کے درمیان محض پرستش (پوجا پاٹ) کا تعلق نہیں۔ دین

دین کا صحیح مفہوم | حکومت خداوندی کا ضابطہ قوانین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی معاملہ دین کی حدود سے باہر نہیں۔ اور دین خداوندی (اسلام) میں عبادت سے مفہوم پرستش (پوجا پاٹ) نہیں بلکہ اس ضابطہ قوانین کی عملی اطاعت ہے جس کا نفاذ قوت و حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ عبادت کی مختلف شکلیں (نماز، روزہ وغیرہ) اسی اطاعت کا محسوس مظہر ہیں اور اس نظام کے قیام و بقا کا ذریعہ۔ (تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے)

﴿

قوم نے یہ کہا اور اس کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

قَالَ يَقَوْمِ اَرَاۤءَ يُتِمُّ اِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَرَزَقْنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَا اُرِيدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا اَنْهَكُمُ عَنْهُ اِنْ اُرِيدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِيۤ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيبُ ۝ (۸۸)

شعیبؑ نے کہا کہ اے میری قوم! اور اس پر غور کرو کہ میرے پروردگار نے عقل و بصیرت کے نمایاں راستے میرے سامنے کشادہ کر دیئے ہوں۔ اور لوٹ کھسوٹ، بددیانتی اور بے ایمانی سے حاصل کردہ روزی کی بجائے مجھے نہایت عمدہ، خوشگوار اور حلال و طیب روزی عطا کی ہو۔ (تو میں اس کے بعد بھی تمہیں صحیح راستے کی طرف آنے کی دعوت نہ دوں گا)۔ نہ ہی میں ایسا کر سکتا ہوں کہ جن باتوں سے میں تمہیں روکتا ہوں، انہیں خود اختیار کروں۔ میں جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں خود اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، میں تو اس کا نتیجہ کہ چکا ہوں کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا، میں تمہارے غلط نظام معاشرہ کی اصلاح کروں گا۔ (میں جانتا ہوں کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے، وہ میری دستِ مجھے میسر نہیں۔ لیکن) مجھے وہ تمام اسباب، قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہو جائیں گے۔ اُس کے قانون کی محکمیت پر مجھے پورا پورا بھروسہ ہے۔ اور سفرِ حیات میں میرا ہر قدم، اُسی رضیہٗ خیر و خوبی کی طرف اُٹھتا ہے۔

اس بصیرت افروز جواب کے مختلف ٹکڑوں پر غور فرمائیے۔ قوم نے یہ کہا تھا کہ ہم اُس روش پر چلے جا رہے ہیں جو ہمارے آباء و اجداد سے ہم تک متواتر پہنچی ہے۔ تم اس کے خلاف کیوں کہتے ہو؟ آپ نے اس کے جواب میں وہی کہا جو اس سے پیشتر ہر رسولؑ نے اس اعتراض کے جواب میں کہا تھا۔ یعنی جب میرے پاس

اسلاف پرستی

اللہ کی طرف سے ایک کھلی ہوئی روشنی موجود ہے جس سے میں غلط اور صحیح کی پرکھ کر سکتا ہوں تو پھر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کئے کسی روشنی کہیں پر چلے جانا کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ یہ واضح دلیل اور کھلی ہوئی روشنی، حضرت شعیبؑ کی تعلیم تھی جو بذریعہ وحی آپ کو دی گئی تھی۔ اس کے بعد فرمایا کہ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ میں تمہاری نخویف و ترسب سے ڈر جاؤں۔ لیکن ڈرے وہ جو تمہارا محتاج ہو اچھے اللہ پر ایمان ہو وہ انسانوں کا محتاج کیسے ہو سکتا ہے۔ تم میرے رازق نہیں ہو۔ مجھے رزق اس مبداء فیض سے ملتا ہے جو حیۃ المّٰزٰقین ہے جس کا عطا کردہ رزق، درحقیقت رزق حسنہ (بہترین روزی) ہے تم غیر اللہ کو رازق سمجھتے ہو اور ان کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو۔ اس لئے تمہاری حالت یہ ہے کہ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے تمہیں دس مرتبہ مقام انسانیت سے گنا پڑتا ہے۔ لیکن میرا خدا وہ ہے کہ رزق بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ دنیا جہان کی سرفرازیاں بھی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ۵

اے خدا تانے دہ، جانے برد آں خدا تانے دہ، جانے دہ

پھر فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ میں بھی تمہاری روش اختیار کر لوں، لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ جس بات کو میں علی وجہ البصیرت صحیح سمجھتا ہوں اور اس پر چلنے کے لئے تمہیں دعوت دیتا ہوں، تو کیا میں خود اس کے خلاف چلنے لگ جاؤں؟ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں وہی کچھ خود بھی کرتا ہوں۔ باقی رہا یہ کہ میری صلوٰۃ یہ کیوں حکم دیتی ہے کہ میں تمہارے ”دنیاوی معاملات“ میں بھی دخل انداز ہوں اور تم سے تمہارے آباء اجداد کی روش کہیں چھڑا کر ایک اور راہ پر لے چلوں۔ سو یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی استطاعت بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور اصلاح کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ کرو کہ چونکہ تم نے پہلے ہی سے دل میں فیصلہ کر لیا ہے کہ میری مخالفت ضرور کرنی ہے اس لئے میں جو کچھ کہوں اس کا الٹ کرتے جاؤ۔ یہ روش مرتزقا یا حماقت ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہلاکت و بربادی۔

وَلْيَقُومُوا لَيْبِئِكُمْ شَتَاقِي ۚ اَنْ يَّصِيبَكُمْ مِّثْلُ مَا اَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ اَوْ قَوْمِ
هُودٍ اَوْ قَوْمِ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمٌ لَّوْطٍ مِّنْكُمْ بَعِيْدٌ ۝ (۱۱۰)

اے میری قوم! دیکھنا! میری مخالفت میں تم کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس سے تمہارا بھی وہی حشر ہو جائے جو نوحؑ، ہودؑ یا صالحؑ کی قوم کا ہوا تھا۔ یا قوم لوطؑ کا ساحال، جس سے تم اچھی طرح باخبر ہو کیونکہ وہ کچھ زیادہ عرصہ کی بات نہیں۔ نہ ہی ان کی تباہ شدہ بتیاں تم سے کچھ زیادہ دور واقع ہوئی ہیں۔

محض ضد غور کیجئے! کیا دنیا میں حق و صداقت کی مخالفت عام طور پر اسی لئے نہیں ہوتی کہ محض ضد اور تعصب کی بنا پر فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ اس کی مخالفت کرنی ہے اور پھر اس کے بعد کبھی سوچا ہی نہیں جاتا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر غور تو کر لیا جائے؟ یہی وہ راہ ہے جو سیدھی تباہی اور بربادی کے جہنم تک لے جاتی ہے۔ اس روش سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تَوْبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ۝ (۹۰)

تم اپنی موجودہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے اس طرح بچ سکتے ہو کہ تم اُس راستے کو چھوڑ کر، خدا کے راستے کی طرف آجاؤ۔ اور سلب و نہیب کے موجودہ نظام کی جگہ خدا کا نظام ربوبیت قائم کر کے، اُس سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کرو۔ وہ نظام خداوندی نہایت شفقت آمیز انداز سے سامانِ حمت عطا کرتا ہے۔

قوم کے پاس ان محکم دلائل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن کیا انہوں نے لا جواب ہو کر اعترافِ حقیقت کر لیا؟ تو بہ! تو بہ! نخوت و تکبر کے شیا طین بھلا کب اس کی اجازت دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا:

قَالُوا يَشْعِيبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۚ وَلَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ۝ (۹۱)

انہوں نے کہا کہ اے شعیب! پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو اس میں سے بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں! اس لئے انہیں ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ تم کوئی ایسے صاحبِ قوت و اقتدار بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم تمہاری باتوں کو مجبوراً مان لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں محض تمہاری برادری کا لحاظ ہے۔ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور تم ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکتے۔

اس جواب پر صبح تبصرہ خود حضرت شعیبؑ کے ارشاد میں موجود ہے جو اس سے اگلی آیت میں ہے۔ آپ نے فرمایا۔

قَالَ يَوْمَئِذٍ أَهْطَىٰ أَعِزُّ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ ۖ وَاتَّخَذُ تَمُوهًا وَرَأَىٰ كُمْ ظَاهِرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝ (۹۲)

شعیبؑ نے کہا کہ اچھا! تمہیں خدا کے قانونِ مکافات کا کوئی ڈر نہیں۔ ڈر ہے تو میری برادری کا ہے جس میں اب سمجھا کہ تم جو خدا کا نام لیتے رہتے ہو، وہ محض برائے وزنِ بیت ہے۔ تم نے اُسے بطور (EXTRA) اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے، کہ جب اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اس سے کام لے لیا جائے، ورنہ مرد اور سہارا

کے لئے تمہاری نگاہیں اور یہی طرف اٹھتی ہیں۔ حالانکہ اگر تم آنکھیں رکھتے تو تمہیں نظر آ جاتا کہ خدا کا قانون مکافات تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں انسان، دوسرے انسانوں کا پاس خاطر تو کرتا ہے لیکن خدا کا خیال کبھی نہیں کرتا! آپ نے کیسی حقیقت کشا اور دلاویز بات کہی ہے کہ کم بختو! تمہارے نزدیک میری برادری کی طاقت تو ایسی ہے جس کا تم پاس کرو لیکن خدا کا قانون مکافات تمہارے نزدیک (معاذ اللہ) کچھ شے ہی نہیں کہ اس کا بھی کچھ خیال رکھا جائے! غور کیجئے!

خدا کا قانون مکافات

کیا دنیا میں تمام بڑی بڑی خرابیوں کی علت یہی نہیں کہ لوگ انسانوں کا پاس خاطر تو کرتے ہیں لیکن قانون خداوندی کو پس پشت ڈالے رکھتے ہیں۔ اگر اس کا دھیان پیش نظر رہے تو خلش و اضطراب اور فتنہ و فساد کا یہ جہنم، سکون و طمانیت کی جنت بن جائے۔

مندرجہ صدر آیت (۱۱۳) میں ظُہْرِیًّا کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ عربوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب وہ سفر میں جاتے تو جتنے اونٹوں کی فی الواقع ضرورت ہوتی ان سے ایک آدھ زاید ساتھ لے لیتے کہ اگر راستے میں متعینہ اونٹوں میں سے کسی کو کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا حادثہ پیش آ گیا تو یہ فالتوا ونٹ (EXTRA) کام آ جائے گا۔ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ تم خدا کا نام ضرور لیتے ہو اور اس کے ماننے کے مدعی بھی ہو۔ لیکن عملی زندگی میں تم نے اس کی حیثیت، ایک ظُہْرِیٰ جیسی رکھ چھوڑی ہے کہ جب اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو تو اسے بطور آخری حربہ استعمال کر لیا جائے۔ یہ ہے تمہارا خدا کو ماننا۔

غور کیجئے! کیا آج ہماری بھی یہی حالت نہیں؟

جب حضرت شعیبؑ نے دیکھا کہ قوم اپنی ضد پر بڑی طرح سے جمی ہوئی ہے تو فرمایا کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ تم اگر تباہ ہونے پر تلے بیٹھے ہو تو تمہیں تمہاری غلط روش کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے؟

وَيَقُومُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۖ لَمَّا يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُعَذِّبُهُ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ۝ (۱۱۳)

بہر حال، میں نے سمجھ لیا ہے کہ وعظ و نصیحت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج بہت جلد بتا دیں گے کہ وہ کون ہے جس پر سوا کُن تباہی کا عذاب آتا ہے۔ اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

یعنی وہی استنتاجی طریق استدلال (PRAGMATIC TEST) کہ میرے پروگرام کو تکمیل تک پہنچ لینے دو، اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ میرا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔

✽

سورۃ شعراء میں ہے کہ قوم نے کہا کہ تمہاری ان باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ (۲۶)

انہوں نے کہا ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، (قوم کے مصلح بننے کی کوشش کرتے ہیں)۔

اس لئے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ تم پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ لیکن تم تو ہمارے جیسے انسان ہو۔ تم پر وحی کیسے ہو سکتی ہے؟ یعنی اسی

ساز کہیں کی صدا ہے باز گشت جو ہم اس سے پیشتر ہم سابقہ کے احوال و کوائف میں سنتے چلے آئے ہیں۔

وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ (۲۶)

تو ہماری طرح کا انسان ہے (اس لئے تو خدا کا رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟) ہم تمہیں تمہارے دعویٰ میں سراسر جھوٹا سمجھتے ہیں۔

اگر تم واقعی سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو!

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (۲۶)

اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ ہماری اس روش کے نتیجے میں ہم پر تباہی آنے والی ہے، تو تم آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو (اور اس طرح اس ناگہانی آفت کو ہم پر بے آؤ)۔

اس کے جواب میں آپ نے فقط اتنا کہا کہ

قَالَ رَبِّيَّ اعْلَمُ إِنَّمَا أَعْمَلُ مَا كُنْتُ أَعْمَلُ ۝ (۲۶)

شفیع نے کہا کہ (میں تم پر آسمانی آفت کیا گراؤں گا)، میرا نشوونما دینے والا خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو، (اور تمہارے یہ اعمال، تم پر کس قسم کی تباہی لائیں گے)۔

وہ تمہارے اعمال سے واقف ہے اور اعمال کے ظہور نتائج کا وقت بھی اُس کو معلوم ہے۔ اس لئے میں تم پر عذاب کیا لاؤں گا؟ عذاب لائیں گے خود تمہارے اعمال!

﴿

ظہور نتائج کا وقت | قوم مدین اپنی بدعنوانیوں اور سرکشیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق جہالت کا زمانہ ختم ہو گیا اور ظہورِ عذاب شروع ہو گیا۔ تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ مدیانیوں کا فتنہ و فساد حد سے بڑھ چکا ہے اس لئے اب ان سے انتقام لو۔

پھر خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کر کے فرمایا کہ مدیانیوں کو تنگ کر دو اور انہیں مارو۔ (گنتی ۲۵-۱۶)
پھر خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہلِ مدیان سے بنی اسرائیل کا انتقام لے۔ اور تو بعد اُس کے اپنے لوگوں سے مل جائے گا۔ (گنتی ۲۱)

چنانچہ ایک قیامت خیز جنگ ہوئی جس میں مدیانی بُری طرح سے تباہ ہوئے۔ قرآنِ کریم میں جنگ کا ذکر نہیں بلکہ اس کے بعد کا ذکر ہے جو زلزلہ اور آتش فشاں کی صورت میں اُن پر مسلط ہوا اور جس سے اُن کی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد انہیں مزید مہلت دی گئی کہ وہ اپنی حالت میں اصلاح کر لیں۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی سرکشیوں اور بدعنوانیوں سے باز نہ آئے تو پھر اُن کی برادری کا وقت آپہنچا۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَثِيمِينَ ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانَ لَمْ يَعْنُوا فِيْهَا ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَانُوا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝

۷
۹۱-۹۲

(۹۲-۹۱)

اس کش مکش کے بعد ہوا یہ کہ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا تھا، انہیں لرزاوینے والے عذاب سے آگھیرا اور وہ اپنے گھروں میں، مٹی کے تودروں کی طرح بے حس و حرکت پڑے کسے پڑے رہ گئے۔

وہ اس طرح نیست و نابود ہو گئے گویا وہ ان بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ (وہ شعیبؑ کے متبعین سے کہا کرتے تھے کہ تم اپنی روش سے باز آ جاؤ، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے لیکن ہوا یہ کہ نقصان انہی کا ہوا جو شعیبؑ کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

یہی الفاظ سورہ عنکبوت میں ہیں۔

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَمِينَ ۝ (۲۹)

انہوں نے شعیبؑ کی تکذیب کی تو (آخر الامر) انہیں زلزلہ کی تباہی نے اس طرح آپکڑا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرے ہوئے پائے گئے۔

حضرت شعیبؑ اس سے پہلے ہی ان سے الگ ہو چکے تھے۔

فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَاقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ آسَىٰ عَلَىٰ قَوْمٍ كَافِرِينَ ۝ (۹۲)

شعیبؑ اس تباہی سے پہلے ہی ان سے الگ ہو گیا تھا۔ اُس نے جاتے وقت ان سے کہا تھا کہ اے میری قوم! میں نے تمہیں، اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات پہنچا دیئے۔ میں نے بہتیرا یا کہ تمہارا بھلا ہو جائے لیکن تم ایک نہ سنی۔ (اور اپنی غلط روش پر برابر آگے بڑھتے چلے گئے)۔ اب اُس کے نتیجے میں جو تباہی تم پر آ رہی ہے، میں اس پر کیا افسوس کروں!

آیت کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔ ان میں بظاہر قوم کے عبرت انگیز انجام سے بے تعلقی پائی جاتی ہے لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو اس بے تعلقی میں بھی ہمدردی و شفقت کے کس قدر نازک اور شدید جذبات مضمر ہیں! مسلمانوں کو بھی کیسا درد مند دل عطا ہوتا ہے (نیز دیکھئے ۹۵-۹۴ : ۲۴/۱۸۹)

✽

یہ ہے سرگزشت قوم مدین۔ اصحاب الایکہ کا ضمنی ذکر قرآن کریم کے دو اور مقامات میں بھی آیا ہے۔

وَتَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَبُ الْأُيُتِ الْأُولَىٰ ۝ (۳۸ : ۵۰)

نیز قوم تمود۔ قوم لوط اور اصحاب الایکہ (اہل مدین) نے بھی۔ ان کا بڑا لاؤشکر تھا (سب کے سب تباہ کر دیئے گئے)۔ (نیز ۵/۱۳۸)

✽

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا أَخَذْنَا أَهْلَهَا بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَاءِ لَعَلَّهُمْ يَضُرَّعُونَ ۝ (۹۴)

(یہ محض چند واقعات ہیں جنہیں اس مقام پر سامنے لایا گیا ہے، ورنہ تمام اقوام سابقہ کی تاریخی یادداشتیں

اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ہم نے جب بھی کسی ہستی کی طرف کوئی نئی بھیجا، (تو اُس کے ارباب دولت و ثروت نے اس کی مخالفت کی) $\frac{۳۴}{۳۳}$ و $\frac{۳۳}{۳۴}$ ۔ جب تک اُن کی غلط روش، اس درجہ تک نہ پہنچتی کہ وہ ان کی آخری تباہی کا موجب بن جائے، ان پر ہلکی ہلکی مصیبتیں آئیں مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ اپنی غلط روش کا نتیجہ دیکھ کر، قوانین خداوندی سے سرکشی چھوڑ دیں، اور اُن کے سامنے جھک جائیں۔ یہ مصیبتیں اور مشکلیں خود اُن کے غلط نظام کی پیدا کردہ ہوتی تھیں۔

ساتھ آیات میں اقوام گزشتہ کی داستانیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس کے بعد ملخصاً بتایا گیا ہے کہ ان کی تباہی اور بربادی کی وجہ کیا تھی، اور وہ تباہی اُن پر کس انداز سے آئی۔ اگرچہ حقیقت متعدد بار سامنے آچکی ہے، بایں ہمہ اسے چند الفاظ میں، بار دیگر، دہرایا جائے کہ دین کی تاریخ اُس کشمکش کی تاریخ ہے جو نظام ملکیت، سرمایہ داری اور مذہبی غلط کار قوموں کی تباہی | پیشواہیت اور نظام خداوندی میں پیہم اور مسلسل چلی آرہی۔ اس سے دین اور مذہب کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مذہب کو ان باطل نظام ہائے زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ قسم کا تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے، جو پوجا پاٹ، بندگی، پرستش کے ذریعے ہر قسم کے نظام میں حاصل ہو سکتا ہے۔ دین ان باطل نظاموں کو مٹاتا اور ان کی جگہ نظام خداوندی قائم کرتا ہے۔

اب رہا وہ طریق جس کے مطابق غلط کوش اور غلط کار قوموں کی تباہی ہوتی ہے۔ غلط نظام آہستہ آہستہ خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر شروع ہی میں ان کی روک تھام کا انتظام کر لیا جائے تو قوم تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اگر ان خرابیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو وہ بڑھتی چلی جاتی ہیں، تاکہ ان کی آخری تباہی کی نوبت آ جاتی ہے۔ زیرِ نظر آیات میں اسی حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے۔

یہاں ان بلکے بلکے جھٹکوں کا مقصد یہ بتایا گیا: لَعَلَّهُمْ يَضُرُّعُونَ — تَضَرُّع کا مفہوم آیت

(۵۷) کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے۔ غلط نظام میں قوم زندگی بخش سرشتوں سے کٹ جاتی ہے۔ انہیں اس قسم کی وارننگ سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر ان حتمہ ہائے حیات بخش کی طرف پلٹ آئیں۔ وہ چشمے جن کی نشاندہی دوہری آیات آگے آیت (۹۶) میں کی گئی ہے۔

ثُمَّ بَدَلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَّ قَالُوا قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَآخَذْنَاهُمْ بِنُصْرَتِهِمْ وَلَا يَشْعُرُونَ ۝

وہ ان قوانین کے سامنے جھک جاتے، تو ان کی معیبتیں، خوشحالیوں میں بدل جاتیں۔ جب ان پر اس طرح ایک عرصہ گزر جاتا، تو وہ پھر بھول جاتے کہ بد حالی اور خوشگوازی، قانون خداوندی سے وابستہ ہے (نہیں) وہ کہتے کہ اس قسم کی تبدیلیاں، یونہی اتفاقی طور پر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے اسلاف کی بھی یہی حالت رہی کہ ان پر کبھی اچھے دن آ جاتے، کبھی بُرے۔ اس لئے قانون مکافات کوئی چیز نہیں۔ وہ اس طرح، اپنی غلط روش میں اندھا دھند آگے بڑھتے چلے جاتے، تا آنکہ ظہورِ نتائج کا وقت آ جاتا، اور وہ لسطرچ اچانک پکڑے جاتے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا کہ ان پر یوں تباہی آ جائے گی۔

اس میں قوموں کی عمومی ذہنیت سامنے لائی گئی ہے۔ یعنی ان پر جھٹکا آتا ہے تو وہ سنبھل جاتی ہیں۔ لیکن ٹھوڑے ہی عرصہ کے بعد، اسے بھول جاتی ہیں اور پھر اُسی روش کہن پر کامزن ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم نے تاریخ کے ایک عمیق فلسفہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جن لوگوں کی نگاہ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین خداوندی پر نہیں (یعنی سیکولر نظام زندگی کے پیرو ہیں)، وہ اپنے آپ کو اس فریبِ یہ کچھ اتفاقیہ نہیں ہوتا میں مبتلا رکھتے ہیں کہ اس قسم کے حادثات اتفاقیہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا، اور اب بھی ویسے ہی ہوتا ہے

لیکن قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے کہ کارگر کائنات میں کوئی واقعہ اتفاقیہ رونما نہیں ہوتا۔ یہاں ہر واقعہ اور حادثہ قانونِ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔ (انڈکس میں ”تاریخ“ اور قوموں کے عروج و زوال کے قوانین“ کے عنوانات دیکھیے)۔ قرآن کے دعویٰ کی صداقت کا عجیب ثبوت ہے کہ اب میکولڈ مغرب کے دانشور بھی اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ دنیا میں واقعی کوئی حادثہ اتفاقیہ (BY CHANCE) رونما نہیں ہو۔ اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ جب تک وہ سبب ہمارے علم میں نہیں آتا، ہم اسے (CHANCE) کہتے ہیں۔ جب وہ سبب معلوم ہو جاتا ہے تو وہی چالشِ قانون کے احاطہ میں آ جاتا ہے۔

جب کوئی قوم اپنی تباہی کے آثار کو محض اتفاقی (CHANCE) سمجھتی رہے تو وہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اصلاح سے مراد ہوتی ہے اس خرابی کا دور کرنا جو اس تباہی کا سبب ہو۔ اور ایسا وہی قوم کر سکتی ہے جس کی نگاہ قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل قوانین پر ہو۔ جھٹکے کے وقت وہ سوچے گی کہ ہم سے کون سے قانون کی

تقدیر اور سیکولر ازم | خلافتِ درزی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ خرابی ہے۔ اور جب اس علت کی تحقیق کر لے گی تو اسے دور کرنے کی تدبیر کرے گی۔ واضح رہے کہ جسے سیکولر اصطلاح میں چالش

کہا جاتا ہے، اُسے مذہب پرست طبقہ تقدیر کہہ کر پکارتا ہے۔ چانس میں بھی کوئی شخص اس حادثہ کی ذمہ داری اپنے سر پر نہیں لیتا۔ عقیدہ تقدیر میں بھی یہی ہوتا ہے۔ تقدیر پرست قومیں بھی اپنی اصلاح کر ہی نہیں سکتیں۔ جب ان کی تباہی آتی ہے تو وہ شعوری طور پر سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ سیکولر ذہنیت یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتی ہے کہ محض اتفاقی حادثہ ہے، اور تقدیر پرست یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی! ان کے برعکس ان کہتا ہے کہ یہ سب (عروج و زوال) قوانین خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

﴿ ۹۶ ﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

اگر یہ لوگ ہمارے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے، اور اُس کے اتباع سے (زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنے کی فکر کرتے، تو ہم ان پر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے) (۹۶-۹۷)۔ یعنی اُن برکات کے دروازے جن سے اُنہیں اس دنیا کی زندگی کی خوشحالیاں اور سرسبزیاں بھی میسر آجائیں اور آخری زندگی کی شادایاں اور ثمرباریاں بھی۔ لیکن انہوں نے اُسے جھٹلایا تو ان کے اعمال کے نتائج نے اُنہیں اُن پکڑا۔

یہ آیت، اس سے پہلے آیات (۹۴-۹۵) میں آچکی ہے۔ وہاں مفہوم دیکھ لیجئے ”ارض و سماء“ کی برکات کے ارتباط سے قرآن کریم نے دنیاوی زندگی اور وحی میں جس ربط باہمی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے نگہ بصیرت دنیا اور دین کا ارتباط [وحد میں باقی ہے۔ اسلام نہ سیکولرزم ہے جس میں منتہی ارض (محض دنیوی زندگی) ہوتی ہے، اور نہ ہی مذہب یا تصوف جس میں دنیا کو قابل نفرت قرار دے کر مقصد حیات (مرعومہ) ”روحانیت“ قرار دی جاتی ہے۔ اقبالؒ کے یہ بصیرت افروز اشعار معلوم کتنی بار پہلے سامنے آچکے ہیں، اور کتنی بار اور سامنے آئیں گے کہ

غریباں را زیر کی سازِ حیات	شرقیان را عشق را ز کائنات
زیر کی از عشق گروہ حق شناس	کارِ عشق از زیر کی محکم اساس
عشق چوں با زیر کی ہمہ شود	نقشبندِ عالم دگیر شود
خیر و نقشِ عالم دگیر بنہ	عشق را با زیر کی امیر دہ

یہ ”عشق اور زیر کی“ کا امیزہ ہے جسے قرآن نے ”ارض و سماء“ کا ارتباط کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے جو

از کلید دین در دنیا کُشاو

دنیا کے ہر دروازے کو دین کی چابی سے کھولتا ہے۔

ان قوموں کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ارتباط "ارض و سماء" کے اس قانونِ ازل کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔ یہاں اخذُ نہم (ہم نے انہیں پکڑا) کے بعد یہاں کَانُوا یُکْسِبُونَ (اُن کے غلط اعمال کی وجہ سے) کا اضافہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ خدا کی گرفت کیوں ہوتی ہے۔

اس کے بعد استعارہ کے طور پر بتایا ہے کہ ان قوموں کی حالت کیا ہو چکی ہوتی ہے۔

اَفَاَمِنْ اَهْلِ الْقُرَىٰ اَنْ يَّاتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَائِمُونَ ۝
اَوْ اَمِنْ اَهْلِ الْقُرَىٰ اَنْ يَّاتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يُلْعَبُونَ ۝
اَفَاَمِنُوا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُونَ ۝

یہ ہیں وہ حقان جو تاریخی شہادتوں سے ثابت ہیں تو کیا اس کے بعد بھی (یہ تمہارے مخاطب جو مختلف بتیوں میں رہتے ہیں، اس سے نڈر ہو چکے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آئے جب وہ سو رہے ہوں۔ (۹۷) کیا یہ اس سے بالکل نچنت ہو رہے ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر چاشت کے وقت آئے جب وہ بے خبر کھیل گویں مشغول ہوں۔ (۹۸)

کیا یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انہیں خدا کی تدبیروں کی طرف سے امان مل چکی ہے؟ یاد رکھو! اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں وہی قوم رکھ سکتی ہے جس نے تباہ اور برباد ہونا ہو۔ (۹۹)

تباہ ہونے والی قوموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یا تو وہ قوت اور دولت کے نشہ میں اس قدر مدہوش ہوتی ہیں کہ انہیں (سونے والے کی طرح) اس کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ اُن کے گرد و پیش ہو کیا رہا ہے، اور تباہیاں اور بربادیاں کس طرح اُن کے سر پر منڈلا رہی ہیں۔ اور یا یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ جاگ رہے ہوتے ہیں، لیکن (شرطِ نچ کھیلنے

تباہی کب آتی ہے | والوں کی طرح) اپنے جذبات کی دنیا میں اس قدر جذب ہوتے ہیں کہ کہہ سکیں قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا نَوْ لَهَا وَلَا يَنْصَرِفُونَ بِهَا نَوْ لَهَا

اِذَا نَّ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا نَوْ لَهَا (۱۰۰)۔ اُن کی آنکھیں تو ہوتی ہیں، لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ اُن کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن اُن سے سنتے نہیں۔ ان کے دل و دماغ بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ اس مدہوشی کے عالم میں قانونِ مکافات کی طرف سے بالکل نچنت ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا خیال تک

نہیں آتا کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

۴
۱۰۰
أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصْبَنَهُمُ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝

یہ لوگ جو پہلی قوموں کی تباہی کے بعد، اُن کے ملک اور دولت کے وارث ہوئے ہیں، کیا ان پر یہ بات اب بھی واضح نہیں ہوئی کہ ہمارا قانون ان کے جرائم کی بنا پر، انہیں مصیبتوں میں مبتلا کر سکتا ہے؟

لیکن یہ جو، اس قدر واضح دلائل و شہادات کے باوجود، ان باتوں پر کان نہیں دھرتے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلاف کی اندھی تقلید، اور مفاد پرستیوں کے جذبات، نے ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو سلب کر دیا ہے۔ انڈس میں قانون استبدال و استخلاف قومی کا عنوان دیکھیے۔ اس میں قرآن نے کہلے کر جب ایک قوم اپنی صلاحیت کھودیتی ہے تو اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ اس قوم سے کہہ دیا جاتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۴۱)

پھر ہم نے تمہیں سابقہ قوم کا جانشین بنایا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

اگر تم نے بھی اسی قوم کی روش اختیار کی جس کے تم جانشین بنے ہو، تو تمہارا انجام بھی اُنہی جیسا ہو جائے گا۔ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی۔ یہاں تو اصول ہی یہ ہے کہ زندہ وہی قوم رہتی ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور مرنے والی قوم کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے۔

۵
۱۰۱
تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ رَهَبًا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۚ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ۝

بہر حال یہ ہیں وہ چند اقوام سابقہ جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کئے ہیں۔ ان کے رسول، ان کی طرف واضح دلائل و احکام لے کر آئے۔ وہ لوگ بجائے اس کے کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا اس پر غور و فکر کرتے، بلا سوچے سمجھے اُسے جھٹلا دیتے۔ کبھی اس بنا پر کہ اس سے پہلے اُن کے آباؤ اجداد اُسے جھٹلا چکے تھے۔ اور کبھی یوں کہ ایک دفعہ، حوالت پونہی منہ سے نکل گئی، اس پر جم کر بیٹھ گئے۔ حقیقت سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر یوں مہر لگا کرتی ہیں۔ اسلاف کی اندھی تقلید، اور اپنی بات کی پیچ، انسان سے سمجھنے سونے کی صلاحیت سلب کر دیا کرتی ہے۔

خدا اور تعصب تباہ ہونے والی قوم کی ایک ذہنیت یہ بھی ہوتی ہے کہ جس بات سے وہ ایک دفعہ انکار کر دیں، آپ لاکھ سمجھائیے، وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے (اس کی وضاحت آیات

(۱۱۲-۱۱۳) میں کی جا چکی ہے)۔ اس قسم کی ذہنیت، قوت اور استبداد کا نشہ پیدا کر دیتا ہے۔
 وَجَدُوا اِبْهَاءَ اَنْفُسِهِمْ ظُلُمًا وَّ عَلُوًّا ۙ فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
 الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (۲۴-۱۱۳)

ظلم اور تکبر نے اُن کی ذہنیت ایسی کر دی تھی کہ وہ صداقت سے بدستور انکار کرتے چلے گئے، حالانکہ انہیں دل میں یقین تھا کہ بات سچی ہے۔ یہ وہ فسادِ قلب و نگاہ تھا جس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

آپ آیت (۲۴) کی تشریح دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقت اور صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے کس قدر کٹاؤ قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعصب اور تنگ نظری بدترین خصلت ہے۔ اسے دلوں پر مہر لگ جانا کہتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب کبھی یہ خالی الذہن ہو کر سوچتے ہیں تو صداقت کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن پھر تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں تو اپنے سابقہ اقرار پر قائم نہیں رہتے۔

وَمَا وَجَدْنَا لَآكُثْرَهُمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَجَدْنَا اَكْثَرَ لَفٰسِقِيْنَ ۝ (۱۰۲)

ان اقوام سابقہ میں سے اکثر کی یہی حالت رہی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے وفا شعار نہ رہے۔ انہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا، اس پر قائم نہ رہے۔ وہ صبح راستے کو چھوڑ کر، غلط راہوں پر چلنے لگ گئے۔

چوتھا باب

سورۃ الاعراف - آیات ۱۰۴ تا ۱۲۶

صاحبِ ضربِ کلیمؐ

- ۱۔ تجلی کا طور
- ۲۔ عقل کے تجرباتی طریق اور وحی میں فرق۔
- ۳۔ عصا وید بیضا۔
- ۴۔ تسبیح اور ذکر کا انقلابی مفہوم۔
- ۵۔ نبوت سے پیشتر کے مراحل۔
- ۶۔ خدا ہی کو ”اپنے ایک کام“ کے لئے تیار کرتا ہے۔
- ۷۔ خدا کی معیت کا مفہوم۔
- ۸۔ ہرمزان اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ
- ۹۔ دربارِ فرعون میں۔
- ۱۰۔ اسلاف کے متعلق نظریہ۔
- ۱۱۔ ذبح اپنا اور پارٹی بازی۔ حکمتِ فرعون
- ۱۲۔ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مناظرہ۔ ساحرین کا مفہوم
- ۱۳۔ محکوم کی کوئی بات قابلِ اعتنا نہیں ہوتی۔
- ۱۴۔ فرعون کا ادا عا۔ اتار بکھڑا اعلیٰ۔
- ۱۵۔ ساحرین کا ایمان
- ۱۶۔ استبداد کی شعلہ فشاںیاں۔
- ۱۷۔ ایمان کی قوت۔

چوتھا باب

کشمکش فرعون و صاحبِ ضربِ کلم

سابقہ باب میں اقوام (حضرت) نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب (علیہم السلام) کی داستانیں سامنے آ چکی ہیں۔ آئندہ آیات میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش اور بنی اسرائیل کے کوائفِ حیات کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکار، سابقہ جلدوں میں بھی آچکے ہیں۔ آئندہ آیات میں سے جو آیات پہلے آچکی ہیں، ان کا تو صرف حوالہ دیا جائیگا دیگر آیات کی تشریح کی جائے گی۔

حضرت موسیٰؑ کی داستانِ زندگی کے کچھ اشارات، مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۷۰ (زیر آیت ۲) دیئے جا چکے ہیں۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تفصیلی سلسلہ کلام اس مقام سے شروع کیا جائے جہاں انہیں شرفِ نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا اور فرعون کے ساتھ تصادم کا حکم دیا گیا۔ جہاں تک خدا کے ساتھ ہم کلامی کا تعلق ہے اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۰ (زیر آیت ۲۱) ذکر آچکا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے، مدین میں جہاں شادی کی تھی، تو ایک معینہ مدت تک وہیں رہنے کا معاہدہ بھی کیا تھا۔ جب وہ مدت ختم ہو گئی، تو آپ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر وہاں سے چل نکلے۔ چرواہوں کی زندگی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اپنے ریوڑ کو لئے لئے مختلف چراگاہوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ آج اس جنگل میں۔ کل اُس نخلستان میں۔ ایک چھوٹا سا خیمہ۔ چند ضروریات کی چیزیں۔ سر پر اللہ کا آسمان۔ سامنے اس کی کھلی ہوئی زمین۔ صاف ہوا۔ مصفا پانی۔ اسی انداز میں، حضرت موسیٰؑ شبانی سے جہانِ بنانی کے طریقے سیکھ رہے تھے کہ اب ایک اور منزل سامنے آئی۔

اندھیری رات، جاڑے کا موسم جنگل کا سماں۔ اپنی بستی سے دور، کوہ طور کے دامن میں۔ شاید راستہ بھولے ہوئے دور، پہاڑ پر آگ دکھائی دی۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ میں جاتا ہوں۔ وہاں سے آگ کا انگارہ بھی لاتا ہوں اور راستہ کا آتا بھی۔

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ النَّاسُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا عَلَيَّ أَتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝ (۲۸)

سوجب موسیٰ نے زمین میں، اپنی مدت معینہ پوری کر لی اور اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے کر چلا۔ تو طور کی جانب آگ دیکھی۔ اس نے اپنے اہل خانہ سے کہا کہ ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے تمہیں وہاں سے (راستے کی) کوئی خبر لا دوں۔ یا آگ کا انگارہ۔ تاکہ تم تپ سکو۔

تجلی گاہ طور | یہ سورۃ قصص کی آیت ہے۔ لیکن سورۃ طہ میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے مذکور ہے اس لئے پہلے اس سورت کی متعلقہ آیات دیکھئے۔ فرمایا۔

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ۖ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا عَلَيَّ أَتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝ (۲۸)

اس حقیقت کبریٰ کو جاننے کے لئے کہ خدا کے ضابطہ قوانین پر عمل پیرا ہونے سے، کس طرح ابتدائی دشوار گزار مراحل کے بعد، بالآخر کامیابیاں اور کامرئیاں نصیب ہو جاتی ہیں، نہیں موسیٰ کی سرگزشت اپنے سامنے رکھنی چاہیئے۔

اس داستان کا آغاز ہم اس مقام سے کرتے ہیں، جب اُس نے (دور سے) آگ دیکھی تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں۔ ممکن ہے میں وہاں سے تمہارے لئے ایک انگارا لے آؤں، یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ہمیں (اس اندھیری رات میں) راستے کا پتہ نشان بتا سکے۔ (تنہا عقل انسانی، وحی کی مدد کے بغیر، اس طرح، قیاسات نشان راہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے)۔

حضرت موسیٰ، آگ کے نشان پر نگاہ رکھے، اپنے وہ بیان میں چلے جا رہے تھے کہ کسی پکارنے والے نے آپ کا نام

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يٰمُوسَى ۖ (۲۹)

پھر جب وہ وہاں پہنچا، تو اس وقت پکارا گیا۔ اے موسیٰ!

اس سنسان جنگل میں جہاں کوئی واقف معلوم نہیں ہوتا تھا، اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رہ گئے۔ کہ انہیں میں پکارتے والے نے خود ہی اس استعجاب کو رفع کر دیا۔ آواز آئی۔

إِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاحْلَعْ نَعْلَیْکَ ۚ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی ۝ (۲۰)

میں تیرا نشوونما دینے والا ہوں۔ تو اب اُس مقام تک پہنچا۔ ہے جہاں تیرے لئے عقل کے تجرباتی اور قیاسی طریق سے نتائج تک پہنچنے کی طول طویل مسافتیں لپیٹ دی گئی ہیں، اور اس کی جگہ وحی کا مقدس راستہ کھول دیا گیا ہے۔ جہاں حقائق از خود منکشف ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ لہذا تو اب اُس لیے سفر کے ساز و سامان کو الگ رکھ کر، اطمینان سے بیٹھ جا۔ وہ دور ختم ہو گیا۔ (۷۹) ذ (۹۳)۔

قارئین کو معلوم ہو گا کہ دنیا کی ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی، الفاظ کے حقیقی معانی (LITERAL MEANINGS)

بھی ہوتے ہیں اور مجازی معانی بھی۔ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کا اسلوب بیان بھی عربی زبان ہی کا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید کے الفاظ کے حقیقی معانی بھی ہوتے ہیں اور مجازی معانی بھی۔ قرآنی الفاظ کے حقیقی اور مجازی معانی سے متعلق، اپنی لغات القرآن کے پیش لفظ میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ واضح رہے کہ مجازی معانی لینے سے مراد یہ نہیں کہ جو معانی آپ کا جی چاہے لے لیں۔ بالکل نہیں۔ یہ معانی بھی ان الفاظ کے حقیقی معانی کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت لغات القرآن میں پیش کردہ معانی سے اچھی طرح سمجھ بھی آ سکتی ہے۔ قرآن مجید کا مفہوم سمجھنے کا میرا انداز یہ ہے کہ جن الفاظ کے حقیقی معانی، اُس کے عمومی مفہوم میں فٹ نہ بیٹھتے ہوں میں وہاں ان کے مجازی معانی لیتا ہوں۔ ان سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ سابقہ جلدوں میں بیشتر مقامات پر آیات قرآنی کا مجازی مفہوم آپ کے سامنے آچکا ہے۔ بالخصوص جلد چہارم میں معجزات حضرت عیسیٰ کے ضمن میں (مطالب الفرقان۔ جلد چہارم۔ ص ۱۱۰-۱۱۱)۔ داستان حضرت موسیٰ کے سلسلہ میں بھی ہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ آیت (۲۰) کا حقیقی معانی کے اعتبار سے ترجمہ یہ ہو گا۔ ”میں ہوں نیزا پروردگار پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طوئی کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔“

لیکن جب ہم وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو ایک بہت بڑی حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے ظاہر ہے کہ حقائق کائنات کے معلوم کرنے کا ذریعہ عقل ہے۔ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ یعنی وہ کسی ایک معاملہ کویتی ہے۔ اس کے متعلق کچھ فیصلہ کرتی ہے۔ اس فیصلہ پر عمل کرتی ہے اور پھر تجربہ بتاتا ہے کہ وہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط۔ غلط ہونے کی صورت میں وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے اور پھر اس پر تجربہ کر کے دیکھتی ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق بہت لمبا بھی ہوتا ہے اور گونا گوں مشکلات کا حامل بھی۔ اس کے برعکس، وحی، انسان کو پہلے ہی دن

بتا دیتی ہے کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ اس لئے وحی کی راہ نمائی سے سفرِ زندگی کی طولِ طویل راہیں سٹک بہت مختصر ہو جاتی ہیں۔ طویٰ کے یہی معنی ہیں۔ لپٹی ہوئی۔ سٹھائی ہوئی۔ کہا یہ گیا کہ تو اب تجرباتی طریقوں سے نکل کر وحی کی سمٹی ہوئی مقدس راہی میں پہنچ گیا ہے اس لئے اب تو اس لمبے سفر کے ساز و سامان (تعلیٰک) کو الگ کر دے۔ وحی نے تیرے سفر کی منزلوں کو سٹھا دیا ہے۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ۝ (۲۰)

میں نے تجھے، ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ سو جو بات تجھے، اس وحی کے ذریعہ بتائی جاتی ہے، اُسے دل کے کانوں سے سنو۔

وہ اولین وحی کیا تھی؟

اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۝ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِکْرِیْ ۝ (۲۱)

اس وحی کا اولین پیغام یہ ہے کہ اللہ میں ہی ہوں۔ میرے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار و اختیار نہیں۔ اس لئے تم صرف میری محکومیت اختیار کرو، اور میرے قانون اور نظام کو غالب کرنے کے لئے صلوٰۃ کا نظام قائم کرو۔

قیامِ حکومتِ خداوندی کی بنیاد یعنی قیامِ حکومتِ خداوندی کی وہی بنیادی تعلیم جو اس سے پیشتر

تمام حضراتِ انبیائے کرام کی زبانی ہم سنتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا جائز نہیں۔ عبودیت اسی کی اختیار کی جائے گی۔ اور اس عبودیت (یعنی اللہ کی محکومیت) کا نظام، الصلوٰۃ سے قائم ہوگا۔ اس انقلابِ عظیم کی اولیں منزل، سرکش قوتوں کا استہلاک ہوگا کہ جب تک لَا اِلٰهَ دِہٰرَ طَاغُوْتِیْ قُوْتٌ سَے انکار کی تکمیل نہ ہوگی۔ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کی محکومیت) کا ظہور نہیں ہوگا۔ اس لئے:

اِنَّ السَّاعَةَ اَتَتْۢ اٰتِیَةً ۝ کَاۤدُ اُخْفِیْہَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی ۝ (۲۲)

(اس حقیقت کو یاد رکھو کہ تیرے ہاتھوں ایک) انقلابِ عظیم رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب، جو اس وقت ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ تھا، اب نکھر کر سامنے آجائے۔ یہ انقلاب اس لئے سامنے آئے گا تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ مل سکے (اور سلب و نہب کا موجودہ فرعون، قارون اور ہامانی معاشرہ جس میں حالت یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا حاصل کوئی لے لیتا ہے، الٹ کر رکھ دیا جائے۔ یہ انقلاب نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے سے آئے گا)۔

وہ وقت اب قریب آنے والا ہے کہ سرکش قوتوں کے اعمال کے فطری نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں مستبد قوتوں کے نظام میں ہوتا یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا حاصل کوئی لے جاتا ہے
 دانا میں می کار و آل حاصل بُرد

لیکن اس انقلاب کے بعد، جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے ظہور میں آئے گا، ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگا جس میں سلب و نهب کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ کوئی مستبد قوت کسی سے کچھ چھین نہیں سکے گی۔

اس لئے، ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جو آنے والے راستہ میں بڑی خطرناک گھاٹی تھی۔ ایک طرف بنی اسرائیل کے متعلق علم تھا کہ ان کی خوئی غلامی نے ان کے ایمان و عمل کی قوتوں کو مفلوج کر رکھا ہے اس لئے وہ اس جانگسل کشاکش حق و باطل میں قدم قدم پر ہمت ہار بیٹھیں گے۔ اس لئے یہ واضح کر دیا کہ ان کی بزدلی اور دوں ہمتی۔ عدم استقلال و فقدان استقامت صفحہ ایمان اور کمزوری عمل حضرت موسیٰ کے راستہ میں سنگ گراں بن کر حائل نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف، قوم فرعون تھی جو اس انقلاب کی سب سے بڑی مزاحم بننے والی تھی۔ اس لئے کہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زور پڑتی تھی۔ ان کی طرف سے شدید ترین مخالفت کا یقین تھا۔ لہذا یہ بھی بتا دیا کہ انکی اس مخالفت سے یہ خیال کبھی دل میں پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ چلئے ان سے مفاہمت کر کے بین بین کا راستہ اختیار کر لیا جائے حق اور باطل میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کی طرف اس ایک آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں فرمایا۔

فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ۝ (۲۶)

اس کے لئے ایک بات کو اچھی طرح سمجھ رکھو۔ جو لوگ اس آنے والے انقلاب کے واقع ہونے پر یقین نہ رکھیں اور اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہیں (انہیں اپنے ساتھ نہ رکھنا، ورنہ وہ تمہارے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جائیں گے، اور اپنے ساتھ، تیری تباہی کا بھی موجب بن جائیں گے۔) یہ انقلاب انہی لوگوں کے ہاتھوں رونما ہوگا جو اس پر دل سے یقین رکھیں اور اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے خیال سے بالاتر ہو جائیں (

غور کیجئے۔ کتنی اہم حقیقت ہے جسے اشاروں ہی اشاروں میں یوں بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ حق و باطل کی معرکہ آرائی میں وہی قوم کامیاب و کامران ہوگی جو اپنی خواہشات و مقنضیات نفس اور امیال و عواطف قلب کو جذبہ حصول مقصد کے تابع رکھے خواہ اس میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ جو اس انقلاب کے راستہ میں

سنگ گراں بن کر حائل ہو گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اس طرح حضرت موسیٰؑ کو اس آنے والے انقلاب کے متعلق ضروری احکام دیئے گئے۔ قرآن کریم نے اس کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ بڑا غور طلب ہے۔ ہم پہلے ان آیات کا وہ ترجمہ لکھتے ہیں جو عام طور پر کیا جاتا ہے دیتے ترجمہ آپ کو ہر مترجم قرآن کریم میں ملے گا) اس کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اگر ان آیات کے الفاظ کو مجاز پر محمول کیا جائے تو ان سے کون سی حقیقت سامنے آتی ہے۔ پہلے عمومی ترجمہ کیلئے حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا۔

وَمَا تِلْكَ يَمِينُكَ يُوسَىٰ (٢٠)

اور ”اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟“

عرض کیا۔

فَالْبَاقِيَ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مَنفَعَةً لِّهَٰذَا الْبَلِّ ۚ إِنَّ هَٰذَا عِندَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ - وَفِي مِثْلِهِ نَبَأُ الْفَارُوقِ (۱۶)

عرض کیا۔ میری لاکھی ہے۔ چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بریوں کے لئے بڑے جھاڑ دیتا ہوں۔ میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

آواز آئی۔

قَالَ لَقَدْ أَخَذَهَا يَمُوسَى ۝ (٢٠/١٩)

عکرم ہوا " اے موسیٰ اسے ڈال دے "۔

انہوں نے تعمیل ارشاد کی۔

فَالْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى ۝ (٢٠)

جیٹا نچر موسیٰ نے ڈال دیا۔ اور دیکھنا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

صدائے غیبی نے کہا۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ نَفْسُهُ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَى ۝ (٢٠/٣١)

حکم ہوا اب اسے پکڑ لے اور مت ڈر۔ ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔

پھر ارشاد ہوا۔

وَأُضْمِرْ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجَ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَى ۝ (٢٣)

اور (نیز حکم ہوا) کہ اپنا ہاتھ پہلو میں رکھ، اور پھر نکال۔ بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو، چمکتا ہوا نکلے گا یہ (تیرے لئے) دوسری نشانی ہوئی۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ ہماری نشانیاں ہیں۔ انہیں محض بطور عجوبہ کاری نہیں دکھایا گیا بلکہ یہ ہماری بہت بڑی نشانیوں کی تمہید ہیں۔

لِنُرِيكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ ۝ (۲۰۰)

”یہ نشانیاں اس لئے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔“

دوسرا مفہوم | یہ تو ہے ان آیات کا عمومی ترجمہ۔ لیکن اگر ہم ان الفاظ کے مجازی معانی لیں تو بات کچھ اور سامنے آتی ہے۔

اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہو گا کہ جب حضرت موسیٰ کو اس عظیم مہم سے متعلق احکام دیدیئے گئے تو خدا غیب نے پوچھا کہ مَا تِلْكَ بِيْمِينِكَ يَمُوسَىٰ (۲۰۱) اے موسیٰ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نقاط نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے؟ حضرت موسیٰ نے جواب میں کہا کہ بارالہا! یہ احکام کیا ہیں؟ هِيَ عَصَايَ (۲۰۲) یہ تو میرے لئے سفر زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں اَتَوَكَّوْا عَلَیْهَا۔ میں اب انہی کے آسارے سے چلوں گا۔ وَ اَهْشَوْا بِهَا عَلٰی غَنَمِيٍّ۔ انہی کے ذریعے اب میں اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجھڑوں گا اور ان کے جمود و تعطل کو حرکت و حرارت میں بدل دوں گا۔ وَلٰی فِیْهَا مَارَبٌ اٰخَرٰی (۲۰۳)۔ ان کے علاوہ دیگر معاملات زندگی بھی جو میرے سامنے آئیں گے ان میں ان سے بصیرت و راہ نمائی حاصل کروں گا۔ حکم ہوا کہ جاؤ اور انہیں لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ قَالَ اَلْقِهَا يَمُوسٰی (۲۰۴)

اس و نورشوق کے بعد جب اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام و ضوابط کے نتیجہ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس پر غور کیا تو حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں، ایک آزدھا ہے جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے فَالْقِهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰی ۝ (۲۰۵) خدا نے کہا کہ موسیٰ! اس خیال سے مت گھبراؤ۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو (قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ) ان کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی رکھیں ان سے فلاں فلاں کام لوں گا، ہم انہیں ایسا ہی بنا دیں گے۔ (سَنُعِيْدُهَا سَيْرَتَهَا الْاُولٰی) (۲۰۶)۔ اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو۔ تو نہایت سکون و سکوت اور پوری دل جمعی سے اپنی دعوت کو روشن اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تو ان تمام مشکلات سے محفوظ و معصون

لے ان الفاظ کا مجازی مفہوم کس طرح بیا گیا ہے اس کی وضاحت آگے چل کر اس مقام پر کی جائے گی جہاں حضرت موسیٰ کے ساحرین و بار فرعون کے ساتھ مقابلہ کا منظر سامنے آئے گا۔

باہر نکل آئے گا۔ وَأَصْحٰمُ يَدٰٓكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجُ بَيْضًا مِّنْ غَيْرِ سُوْرٍ (۲۲)۔ تیری اس طرح کی کامیابی تیری دعوت کی صداقت کی نشانی ہوگی یعنی دشمنوں کی ہلاکت منفیاً نہ حیثیت سے نشان، اور تمہاری کامیابی مثبت حیثیت سے نشان۔ لِنُزِيْكَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰی (۲۳)۔ یہ احکام ہم تجھے اس لئے دیتے ہیں کہ تجھے دکھادیں کہ انکے ذریعے کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔

یہ ہو گا ان آیات کا مفہوم اگر ان کے الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں۔ ان احکام و ضوابط اور ان کی اس طرح تبیین و تشریح کے بعد حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰی (۲۴)۔

اب تم فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم و استبداد میں بہت ہی زیادہ آگے بڑھ چکا ہے۔ اُس کی سرکشی حدود فراموش ہو گئی ہے۔

طغی کے لفظ پر غور فرمائیے اور قرآنی بلاغت کے اعجاز پر وجد کیجئے۔ سرکشی و معصیت کو شئی کی تمام کفت بروہاں طغیانوں کو کس طرح ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے!

جب حضرت موسیٰؑ نے سنا کہ وہ ہم جس کے سر کرنے کے لئے انہیں مامور کیا جا رہا ہے کس قدر صبر آزما اور استقامت طلب ہے تو اس کی توفیق کے لئے بھی اسی باب عالی کے سامنے جھولی پھیلا دی۔ عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۖ وَيَسِّرْ لِي اَمْرِي ۖ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ۖ لَا يَفْقَهُوْا قَوْلِي ۖ وَجْعَلْ لِّيْ وِزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۖ هَٰرُونَ اَخِي ۖ اَشْدُّ دَبِيْہٖ اَزْدِيْ ۖ وَاَشْرِكْهُ فِیْ اَمْرِيْ ۖ كٰی نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۖ وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۖ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا (۲۵-۲۶)

کہ اے میرے نشوونما دینے والے! (یہ مجھ بڑی سخت ہے، اس کے لئے تو) میرے سینے میں وسعت اور کشادہ عطا کر دے (کہ بڑی سی بڑی مشکل بھی مجھے پریشان نہ کر سکے۔ ۲۶)۔

اور جو شواربیاں میری راہ میں آئیں، انہیں مجھ پر آسان کر دے۔

اور میری زبان میں ایسی طلاقت اور روانی پیدا کر دے (کہ میں تیرے پیغام کو بطریق احسن قرینی مقابل تک

سہ واضح رہے کہ میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ آپ ان آیات کا مجازی مفہوم ہی لیں۔ اگر آپ ان کے عمومی مفہوم سے مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں بہر حال ان کا وہی مفہوم لیتا ہوں جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

پہنچا سکوں۔ اور میری بات اُن کی سمجھ میں آجائے (اور سیدھی اُن کے دل تک اُتر جائے)
(چونکہ یہ ہم بڑی سخت ہے، اس لئے) میرے اہل خاندان میں سے، میرے بھائی، ہارونؑ کو میرے ساتھ کر
دے تاکہ وہ میرا بوجھ بٹائے۔ اُس کی مدد سے میری قوت مستحکم ہو جائے گی۔ وہ اس عظیم مہم میں میرا شریک
رہے گا۔

یوں ہم دونوں مل کر، تیرے تفویض کردہ پروگرام کی تکمیل میں بہت زیادہ سرگرم عمل رہیں گے اور تیرے
تانون اور نظام کو غالب بنانے کے لئے بیش از بیش قدم اٹھا سکیں گے۔
تو ہم دونوں کے حالات سے باخبر رہے (اور جانتا ہے کہ ہم دونوں مل کر کس طرح اس مہم کو سر کرینگے)۔

زبان کی گرہ کشائی | سینہ کی فراخی (شرح صدر) وسعتِ ظرف اور دشواری منزل کی آسانی کے ساتھ،
زبان کی گرہ کشائی کی بھی دعا مانگی گئی ہے۔ اس لئے کہ ایک مدت تک مدین کے بیابانوں
میں بدویت کی زندگی بسر کرنے سے زبان میں غالباً وہ طلاق نہیں رہی ہوگی جو ایسے مواقع پر حسنِ خطابت کے لئے
ضروری ہوتی ہے۔ اس کی تائید سورہ قصص کی چونتیسویں آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ
وَ أَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا (۲۹)

(دوسری بات یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز تک شہری آبادی سے دور رہنے کی وجہ سے، میری زبان بھی ایسی
صاف نہیں رہی کہ میں دربارِ فرعون کے لوگوں سے فصیح و بلیغ گفتگو کر سکوں) میرا بھائی، ہارونؑ، مجھ سے زیادہ
فصیح اللسان ہے۔

مذکورہ بالا آیات (۲۷-۲۹) میں نُسَبِ حَلَكَ (تاکہ ہم تیری تسبیح کریں) اور نَزَلُ كَرَكَ (ہم تیرا ذکر کریں) کے
تسبیح و ذکر کا مفہوم | ٹکڑوں پر بھی غور کیجئے۔ حضرت موسیٰؑ کے ذمہ فریضہ یہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ جائیں،
فرعون اور اس کے طاغوتی لشکر کو شکست دیں۔ اور بنی اسرائیل کو غلامی و محکومی

کی پستیوں سے نکال کر حکومت و سطوت کی بلندیوں پر لے جائیں اور ان کی حکومت کی بنیاد قوانینِ خداوندی پر
رکھیں۔ اس عظیم الشان مہم کے لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے تائید و نصرت کی التجا کی۔ اور اپنے قوتِ بازو، حضرت ہارونؑ
کو بھی اپنی معیت کے لئے مانگا۔ اور یہ اس لئے تاکہ وہ عظیم الشان مہم سر ہو سکے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کے لئے یہ الفاظ
آئے ہیں "تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں" اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی تسبیح اور ذکر سے صحیح
مفہوم کیا ہے؟ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ و استبداد (یعنی فساد) کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی

کا قیام و بقاء۔ یہ ہے تسبیح اور یہ ہے ذکر۔ نہ کہ زاویوں اور خانقاہوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں، سربراہوں، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہرتے رہنا، اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا۔ وہ تسبیح و ذکر تھا مردانِ خود آگاہ و خدا مست کا، اور یہ تسبیح و ذکر ہے ان کا جو کشمکش زندگی سے منہ موڑنے کا نام "معرفت" رکھ لیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

اندازِ بیاں گر چہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات
یادِ سعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات



حضرت موسیٰؑ کی درخواست کے جواب میں اُس درگاہِ عاجز نواز سے ارشاد ہوا کہ

قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَمُوسٰى ۝ (۲۰)

ارشاد ہوا۔ اے موسیٰؑ! تیری درخواست منظور ہوئی۔

اس لئے کہ جو کچھ مانگا گیا ہے وہ تو اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہے جس کے لئے تدبیرِ الہی کی مصلحت کرطیاں اس سے پیشتر سامنے آچکی ہیں۔

وَلَقَدْ مَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى ۝ اِذَا وَحَيْنَا اِلٰى اَمْرِكَ مَا يُوحٰى ۝ اِن اَقْذِفْنٰهُ فِى
التَّابُوْتِ فَاَقْذِفْنٰهُ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۝
وَالْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۝ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ ۝ اِذْ تُتَشٰى اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ
اَدْلُكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۝ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰى اَمْرِكَ كِىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۝ وَقَتَلْتَ
نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُوْنًا ۝ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِىْ اَهْلِ مَدْيَنَ ۝ ثُمَّ جِئْتَ
عَلٰى قَدَرٍ يَمُوسٰى ۝ (۲۰-۲۱)

ایہ سن کر موسیٰؑ کا سر نیاز، اظہارِ تشکر کے لئے جھک گیا، اور اُس نے کہا کہ بارِ الہا! یہ تیرا بہت بڑا احسان ہے

جو مجھ پر کیا گیا ہے۔ اس پر بارگاہِ خداوندی سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! تم پر ہمارا یہ احسان کچھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ اس کا سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہوا تھا۔

جب ہم نے تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی تمہاری ماں کی طرف (اپنے ایک بندے کی معرفت) یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنے بچے کو صندوق میں ڈال دے، اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہا دے۔ دریا کی لہریں اسے کنارے پر لگا دیں گی جہاں سے اسے وہ شخص لے جائے گا جو میرے احکام و قوانین کا بھی دشمن ہے اور خود اس بچے کا بھی دشمن۔

(اس طرح اے موسیٰ! تو فرعون کے محلات میں جا پہنچا، اور ہم نے اپنی عنایت سے تجھے ایسا بنا دیا تھا کہ سب لوگ تجھ سے محبت کریں۔ یہ تمام انتظام اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم چاہتے تھے کہ تمہاری پرورش و تربیت ہمارے زیرِ نگرانی (شاہی محلات میں) ہو، تاکہ تو ان روزِ مملکت و سیاست سے اچھی طرح واقف ہو جائے جس کا تجھے آخر الامر مقابلہ کرنا تھا)۔

(تو جب وہاں پہنچ گیا تو فرعون کے گھر والوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ تمہاری رضا عمت (دودھ پلانے) کا یہاں انتظام کیا جائے (اُس وقت) تمہاری بہن وہاں سے گزری تو اُس نے اُن سے کہا کہ کیا میں تمہیں ایسی عورت کا پتہ بتا دوں جو اس کی پرورش کر سکے گی؟ (یہ عورت خود تمہاری والدہ تھی)۔ اس طرح ہم نے تجھے پھر تمہاری والدہ کی گود میں پہنچا دیا تاکہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ (بیٹے کی جدائی کی وجہ سے) غمگین نہ ہو۔ اس کے بعد تو بڑا ہوا تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ لیکن ہم نے تجھے اس معاملہ کی پریشانی سے نجات دلائی۔ پھر تجھے محلات سے نکال کر، سخت اور درشت زندگی کی، کٹھالیوں میں ڈال دیا تاکہ تو کندن بنتا چلا جائے۔ اس طرح تو کئی برس تک مدین میں چرواہا بن کر رہا۔

اس قدر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد کہیں جا کر، تو ہمارے پیانے پر پورا اُترا۔

سب کچھ اندازے کے مطابق | ”علیٰ قد د“ کے الفاظ پر غور فرمائیے یعنی جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ وہ اتفاقاً نہیں ہو گیا وہ اللہ کے متعین فرمودہ پیمانوں اور نڈالوں

کے مطابق ہو رہا ہے۔ ان منازل سے گزرنے کے بعد۔

وَاصْطَلَعْنَاكَ لِنَفْسِي ۝ (۲۱)

اس طرح ہم نے، اے موسیٰ! تجھے اپنے ایک خاص کام کے لئے تیار کیا ہے۔ (یہ نہیں کہ تو بکریاں چرتے

چراتے، اتفاق سے آگ لینے کے لئے ادھر آ نکلا اور ہم نے تیرے سر پر تاج نبوت رکھ دیا۔
یعنی ”مجھے اپنے لئے تیار کیا ہے“ دیکھئے! کتنے واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ نبی کو مقام نبوت کے لئے
وہی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ جو ہر عظمیٰ اس کے کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ بھی کہ نبوت ہر کس و ناکس
کو یونہی نہیں مل جاتی۔ جس سینہ کو مضبوط وحی بنانا مقصود ہوتا ہے، اسے اس کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ قول
بے خبراں ہے۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ پیمبری ہر ایک کو یونہی نہیں مل جایا کرتی۔ قدرت اسے پہلے
دن سے پیمبری کے لئے تیار کر رہی ہوتی ہے اور جب وہ اس کو مقرر کردہ انداز سے کے مطابق، اس بار عظیم کے اٹھانے
کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصب جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ (ثُمَّ جَعَلْنَا عَلَىٰ قَدْرِئِمُوسٰی)

اس مقام پر ایک وضاحت نہایت ضروری ہے۔ نبی سے متعلق آیات کا ترجمہ فعل حال (PRESENT TENSE) میں اس لئے کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے بھی یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ (مثلاً) ”جب وہ خدا کے مقرر کردہ
انداز سے کے متعلق اس بار عظیم کے اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے اس منصب جلیلہ پر فائز کیا جاتا ہے“
(وغیرہ)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اب بھی ایسا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے قطعاً نہیں۔ نبوت کا سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات
گرامی پر ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو نبوت نہیں مل سکتی۔ لہذا، وحی اور نبوت کے متعلق جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ سب ماضی
سے متعلق ہے۔ یعنی ”ایسا ہوا کرتا تھا“ یہ نہیں کہ اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ وحی اور نبوت کے متعلق جہاں بھی کچھ آئے، اس
نکتہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھئے۔

اس کے بعد پھر انہی آیات کی طرف آجائے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي۔ ”ہم نے
تجھے اپنے ایک مقصد کے حصول کے لئے تیار کیا ہے“ حضرت موسیٰؑ کو جس مقصد کے حصول کے لئے نامور کیا گیا تھا وہ
تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ استبداد و استحصال سے چھڑا کر، انہیں ایسی آزادی کی فضا میں اذن بال کشائی دے
جس میں محکومیت صرف قوانین خداوندی کی ہو۔ اس مقصد کو خدا نے ”اپنا ایک کام“ قرار دیا ہے۔ آپ مطالب الفرقان۔
جلد چہارم۔ کے انڈکس میں ”خدا“ کا عنوان دیکھئے۔ اس کے تابع بتایا گیا ہے کہ خدا کس طرح اپنی ذمہ داریوں کو انسانوں کے
ہاتھوں پوری کرا پا کرتا ہے۔ نیز جلد اول (ص ۱۸۴) جہاں بتایا گیا ہے کہ خدا انسانوں کے کاموں کو بھی کس طرح اپنی طرف
منسوب کرتا ہے۔ زیر نظر آیات میں مقصد مظلوم بنی اسرائیل کی داد دینی ہے اور اسے خدا نے اپنا مقصد قرار دیا ہے اور

حضرت موسیٰؑ کو اس مقصد کے حصول کے لئے مامور کیا ہے۔ ان مقامات سے، انسان اور خدا کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

یہ کہنے کے بعد کہ ہم نے تمہیں اپنے ایک مقصد کے لئے تیار کیا ہے، اس مقصد کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کر دی۔

اِذْ هَبْ اَنْتَ وَاُخُوْكَ بِاٰیٰتِنَا فِیْ ذِکْرِیْ ۝ (۲۲)

سوا ب تم اور تمہارا بھائی دونوں، ہمارے قوانین کو لے کر، فرعون کی طرف جاؤ۔ اور دیکھنا امیر سے پروگرام کے مطابق عمل کرنے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا۔

یعنی اس مقصد کی تکمیل یوں ہوگی۔ یہاں پھر ذکر کا لفظ قابل غور ہے اور اس تشریح کی تائید کر رہا ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔

اِذْ هَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی ۝ فَقُوْلَا لَہٗ قُوْلًا لِّیْنَا کَعْلَہٗ یَتَذٰکُرْہٗ اَوْ یُخْشٰی ۝ (۲۳)

اس کے بعد موسیٰؑ اس مہم کے لئے روانہ ہو گیا، اور جب اس کا بھائی یارونؑ بھی اس کے ساتھ آ ملا، تو انہی ہدایات کا پھرا عادہ ہوا اور ان سے کہا گیا کہ تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم و ستم میں حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کی سرکشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

جب اس کی طرف جاؤ تو اس سے نرمی سے بات کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح نصیحت پکڑ لے، یا اپنی سرکشی کے عواقب سے ڈر جائے۔

دعوت انقلاب کے دو مقام | دعوت حق و صداقت کے سلسلہ کی پہلی کڑی پر غور فرمائیے یعنی فرعون کے پاس پہنچو تو پہلے نرمی سے سمجھانا۔ شاید اس کے دل پر اثر ہو جائے اور وہ

صحیح بات کو سمجھ لے اور اپنے انجام و عواقب سے ڈر جائے۔ ایک داعی حق و صداقت کی پہلی آواز، نرمی اور نصیحت کی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس سے سرکش قوتوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اپنی معصیت نوشی میں اور زیادہ ولیہ ہو گئی ہیں تو پھر ضربِ کلیمی کی باری آتی ہے جس کے لئے عصا کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کا رہے بنیاد

جو زخم، مرہم سے مندمل نہ ہو اس کا علاج، نوک نشتر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے لئے مشکینوں میں کسنا ہی پڑتا ہے۔ جو کچھ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے، وہ قیامت تک جماعتِ مومنین کے لئے شمعِ ہدایت ہے، انہیں بھی ایسے مقامات پر یہی انداز اختیار کرنا چاہیئے۔

مزید ہدایات | اور حضرت موسیٰ کو یہ حکم ملا اور ادھر حضرت ہارون کو مصر میں اشارہ مل گیا کہ وہ جا کر اپنے بھائی سے ملیں۔ چنانچہ وہ ان سے راہ میں آکر مل گئے۔ اب واقعہ کی مزید کڑیاں اُس زمانہ سے متعلق ہیں جب یہ دونوں بھائی اکٹھے ہو گئے تھے۔

قَالَ رَبَّنَا اِنَّا نَخَافُ اَنْ يَّغْرِبَ عَلَيْنَا اَوْ اَنْ يَّطْغِيَ ۝ (۲۵)

ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں ڈر ہے کہ فرعون ہماری مخالفت میں پیش دستی کرے یا سرکشی سے پیش نہ آئے۔

یہ خوف بیجا نہ تھا۔ ادھر قہر مانی قوتوں کا ایک پھرتا ہوا سیلاب، جیوش و عسا کر، تلوار و سنان، تہر و دو فرعونیت کے ساز و سامان کی شکل میں موجزن۔ اور ادھر ریدل سمجھیے کہ دو گڈ ریسے! لیکن جو قوت ان کے ساتھ تھی وہ فرعون اور اس کے جنود و عسا کر کو کہاں میسر تھی؟ فرمایا

قَالَ لَا تَخَافَا اِنَّنِي مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ (۲۶)

خدا نے کہا کہ تم مت گھبراؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میں سب کچھ سنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں۔ (اس لئے وہ تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا)۔

فرعون کے پاس بے دھڑک جاؤ۔

فَاْتِيَهُ فَقُولَا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي اِسْرٰٓئِيْلَ ۝ وَلَا تَعْذِرْهُمْ ط
قَدْ جُنُكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَبِّكَ ط وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ (۲۷)

تم اُس کے پاس بے دھڑک جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم نیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل پر اس قدر سختیاں نہ کرو، بلکہ انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو۔ اگر تم اس راستے پر چلو گے جو خدا کا بتایا ہوا ہے، تو تمہارے لئے سلامتی ہوگی۔ سلامتی ہوتی ہی اُس کے لئے ہے جو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔

جو سیدھی راہ اختیار کرے اس پر اس سلامتی کی بشارت ہے۔ لیکن جو اپنی ضد پر اڑ جائے تو

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ الْيَنَّا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلٰى ۝ (۲۸)

لیکن اگر تم پیغام خداوندی کو جھٹلاؤ گے اور اس سے سزائی اختیار کرو گے، تو پھر تباہی اور بربادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

اب تم خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو کہ تم کو کس راستہ اختیار کرنا چاہئے ہو۔

ان دونوں ٹکڑوں میں اسلام کی پوری خصوصیات سمٹ کر آگئی ہیں۔ جو سیدھی راہ اختیار کرے۔ وہ امن و سلامتی میں ہے اور یہی وہ جنت ارضی ہے جس کے لئے ابن آدم مارا مارا پھر رہا ہے اور اپنی ہرنا کام جستجو کے بعد تھک کر پکاراٹھتا ہے کہ "تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی"

اسلام تو انہیں خداوندی کے سامنے جھکنے والوں کو امن و سلامتی کی جنت عطا کرتا ہے ان کے برعکس جو سرکشی اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کو اپنے بچہ استبداد میں جکڑے رکھنا چاہے، اس کے لئے ہلاکت و بربادی کا رسوا کن عذاب۔

۷۶

آیت (۲۶) میں کہا ہے کہ تم فرعون سے مت ڈرو اسی معکسا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ سوال یہ ہے کہ خدا کی اس معیت کے معنی کیا ہیں۔ یوں تو اس نے تمام انسانوں سے کہا ہے کہ ہو معکم اینما کنتم (۲۷) تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے، لیکن اس معیت میں اور اس میں جہاں حضرت موسیٰ اور ہارون سے کہا گیا ہے کہ انی معکم، بنیادی فرق ہے۔ خدا کی اس معیت کے معنی کیا ہیں اس کے متعلق ہم سے نہیں۔ ایک ایسے مخالف کی زبان سے سنئے جس نے اس معیت خداوندی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ خلافت فاروقی میں، جب جماعت مومنین نے ایران کو فتح کیا ہے تو وہاں کا ایک نامور گورنر، ہرمزان، قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تمہارے متعلق فیصلہ تو بعد میں کیا جائے گا۔ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو جس نے میں ورطہ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اس سے پہلے حالت یہ تھی کہ تم ایرانی، ہم عربوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ ہمیں بڑی نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ دوستی تو ایک طرف، ہم سے جنگ کرنا بھی اپنے لئے باعث عار سمجھا کرتے تھے اور اگر کہیں مٹھ بھڑ ہو جاتی تھی تو تم ایک ہی جھٹکے میں ان کے چھکے چھڑا دیا کرتے تھے۔ اب کیا ہوا ہے کہ وہی عرب ہیں اور وہی ایرانی۔ لیکن صورت یہ ہے کہ عرب تمہیں ذلت آمیز شکست پر شکست دیتے جارہے ہیں اور تم پاب زنجیر یہاں کھڑے ہو۔ یہ حیرت انگیز انقلاب کیسے رونما ہو گیا؟

ہرمزان نے کہا کہ عمر! بات یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں ہم اور تم ایک ایک دوسرے سے ٹپٹتے تھے اس لئے ہم تم پر غالب آجایا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم (ایرانی) تو اکیلے ہوتے ہیں اور تمہارے ساتھ

تمہارا خدا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکیں!

یہی نھی خدا کی وہ معیت جس کا اس نے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو یقین دلایا تھا۔ یعنی خدا کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش میدان میں نکل آنا اور اپنا ہر قدم اُس کے قوانین کی اطاعت میں اٹھانا۔ یہی ہے خدا اور بندے کا وہ تعلق جس کے متعلق فرمایا۔ **إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ** (۷۷)۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ خدا کی معیت اور نصرت مشروط ہے اس سے کہ انسان خدا کے متعین کردہ مقصد کے حصول کے لئے میدان میں نکل آئے۔ جب وہ یہ کرے گا تو اسے خدا کی نصرت میسر آجائے گی! وہ نصرت کیا ہوگی؟ **يُثَبِّتُ أَقْدَامَكُمْ** (۷۷)۔ تمہارے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔



اس کے بعد اس داستان انقلاب کی اگلی کڑی آتی ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کے جن دیگر مقامات میں اتنا حتمہ بیان ہوا ہے انہیں بھی سامنے رکھ لیا جائے تاکہ مفہوم بالکل واضح ہو جائے اور تمام جزئیات سامنے آجائیں۔ سورہ قصص کی آیت ۲۹ پہلے لکھی جا چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کس طرح آگ لینے کے لئے پہاڑ کی طرف بڑھے۔ اس سے آگے ہے۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ
أَنْ يَمْوَسَّىٰ رَافَاً أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۸)

جب وہ وہاں پہنچا تو وادی کے دائیں کنارے، اُسے بائیں زمین کے ایک درخت کی طرف سے آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! یہ آواز تمہارے خدا کی طرف سے آرہی ہے جو تمام اقوام عالم کا نشوونما دینے والا ہے (۲۸)۔ {اس

آواز کو مدحی کہا ہے (۲۸)۔}

سورہ طہ آج اسے **وَادِي الْمُقَدَّسِ طُوًى** (۲۸)۔ کہا گیا تھا۔ یہاں مزید وضاحت فرمادی کہ ندائے جمال وادی کے دائیں جانب، جھاڑی کے پاس سے آئی تھی۔ اس کے بعد ہے۔

وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تُهْتَزُّ كَانَهَا جَانٌّ وَلَّىٰ مُدَبِّرًا لَّمْ يَعْقِبْ طَيْمُوسَىٰ
أَقْبَلُ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ ۝ (۲۸)

پھر موسیٰؑ کو مختلف احکام و ہدایات دے کر کہا کہ ان احکام کو، جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا اور وجہ جامعیت

ہیں، فرعون کے سامنے پیش کرو۔ موسیٰؑ نے جب پیش نظر مہم اور ان احکام و ہدایات پر غور کیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک مہم نہیں، جتنا جاگتا سانپ ہے جسے پکڑنے کا اسے حکم دیا جا رہا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے خیال میں اس مہم سے بٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے خائف ہوا۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ اس مہم کو نہایت اطمینان سے سنبھال لو تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔ (۱۰۸-۱۰۷) ذ (۲۰-۱۷) ذ (۲۶-۳۳) ذ (۲۷-۱۳)

سورۃ طہ میں اسے حیتہ (سانپ) کہا گیا ہے۔ یہاں کا نَہَا جَانٌ کہہ کر وضاحت فرمادی کہ وہ "گویا سانپ" تھا۔ یہ ترجمہ مجازی نہیں۔ لیکن اگر ان الفاظ کو بطور استعارات یا جملے تو مفہوم یہ ہو گا کہ حضرت موسیٰؑ کو مختلف احکام و کیر کیا کہ ان احکام کو جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا ہیں جا کر فرعون کے سامنے پیش کرو۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اس مہم اور اس سے متعلقہ احکام پر غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ فرعون کے خلاف یہ مہم نہیں۔ ایک اثر دہا ہے جسے زندہ پکڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس خیال سے حضرت موسیٰؑ نے دل میں کچھ خوف سا محسوس کیا۔ اس پر آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔

أَسْأَلُكَ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجُ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۚ وَاضْمُرْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ
مِنَ الرَّهْبِ ۚ فَذَلِكَ بُرْهَانِي مِنْ رَبِّكَ ۚ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا
قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ (۲۸-۳۳)

پھر موسیٰؑ کو ایسے احکام دیئے جن میں حُسنِ عمل کے خوشگوار نتائج کی خوش خبریاں تھیں۔ نیز ان تمام احکام کی تائید میں روشن اور تابناک دلائل و براہیں۔ اس سے کہا کہ ان دلائل کو نہایت دلجمعی سے پیش کرنا۔ لوگوں کے لیے یہ بہت خوش آئند ہوں گی۔ ان میں سے کوئی بات بھی ان کے لئے ناگواری کا باعث نہیں ہوگی۔ اگر کہیں خوف کا مقام آئے تو وہاں پھل پھلانا نہیں، بلکہ اپنے بال و پر سمیٹ کر پوری جمعیتِ خاطر سے، مقابلہ کے لئے تیار رہنا اور اپنی جماعت کی تنظیم اچھی طرح سے کرنا (۳۵)۔ یہ دونوں قسم کے احکام (منذرات و مبشرات) تیرے پروردگار کی طرف سے، فرعون اور اس کے اہل و عیال کے لئے، واضح دلائل ہیں۔ (انہیں ان کے سامنے پیش کرو وہ لوگ بڑے ہی غلط راستے پر چل رہے ہیں۔

قرآن کریم نے حضراتِ انبیاء کرام کو مبشرین اور منذرین کہہ کر پکارا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا فریضہ فرقہ تھا

کو تباہ کرنا نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہیں سمجھاتے تھے کہ تم نے (قوانین خداوندی کے خلاف) جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ لیکن اگر تم اپنی اس روش کو چھوڑ کر، قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کر لو تو دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں اور کامرانیاں تمہارے حصے میں آجائیں گی۔ حضرت موسیٰؑ کو جو پروگرام دیا گیا اسے ”بِرُحَانِ“ کہا گیا ہے۔ یعنی دور روشن و لیدیں۔ ایک دلیل ان کی غلط روش کے نتیجہ میں ان کی تباہی۔ یہ تندی تھی۔ دوسری دلیل ان کی صحیح روش کے نتیجہ میں، درخشندہ کامیابیاں۔ یہ تبشیر تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے بدبیا سے مراد یہی تبشیر تھی اور عصا سے مراد تندی۔

جب حضرت موسیٰؑ کو اس غمزدہ کی طرف سے محفویت کا اطمینان دلا دیا، تو انہوں نے عرض کیا۔
 قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۝ وَ أَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسَلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۝ (۲۸-۲۷)
 موسیٰؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! میرے ہاتھوں ان کا ایک آدمی مر گیا تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے گرفتار کر کے قتل کر دیں گے۔

(دوسری بات یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز تک شہری آبادی سے دور رہنے کی وجہ سے، میری زبان بھی ایسی صاف نہیں رہی کہ میں دربار فرعون کے لوگوں سے فصیح و بلیغ گفتگو کر سکوں)۔ میرے بھائی، ہارونؑ، مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے۔ اُسے میری امداد کے لئے میرے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ جو کچھ میں کروں یا کہوں، وہ میری تائید و تصدیق کرتا جائے۔ مجھے ڈر ہے وہ لوگ ضرور میری تکذیب کریں گے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ سَتَشُعُّ عَصَدَكَ بِأَخِيكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِأَيِّ شَيْءٍ أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُونَ ۝ (۲۹-۲۸)

اللہ بے کہا کہ گھبرو نہیں میں تمہارے بھائی کو تمہارے ساتھ بھیج کر، اُسے تمہارا دست و بازو بنا دوں گا اور تم دونوں کو ایب علیہ عطا کروں گا کہ ان لوگوں کا ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ تم ان احکامات کو لے کر ان کی طرف جاؤ تو یہی۔ تم دونوں، اور جو لوگ تمہارا اتباع کریں گے، یقیناً اہل فرعون پر غالب رہیں گے۔

دیکھئے! کس وضاحت اور یقین سے کہا گیا کہ جاؤ! ہماری طرف سے قوت و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ اور تم اور تمہارے

متبعین، اس سرکش و جابر قوم پر غالب آجائیں گے۔



سورہ نمل میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا ۖ سَأَتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ بَشِيرٍ ۖ قَبْسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝ (۲۷)

یہ جو کہا گیا ہے کہ غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے، اس کے لئے فرعون اور موسیٰؑ کی کشمکش کو دیکھو۔ اس داستان کا آغاز اُس واقعہ سے کئے جب، ایک تیرہ ماہ شب میں، موسیٰؑ اور اس کے ساتھی ایک پہاڑ کے دامن میں تھے۔ رات کی تاریکی میں راستے کا پتہ نشان نہیں ملتا تھا، اور سردی بلا کی تھی۔ موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ مجھے (دور پہاڑ پر) آگ دکھائی دی ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں، اور یا تو وہاں کسی سے راستے کے متعلق پتہ نشان لاتا ہوں، اور یا آگ کا انگارہ، کہ تم لوگ اسے تپ سکو (اور اس طرح رات بسر ہو جائے) (۲۸/۲۹)

جب حضرت موسیٰؑ آگ کے نشان کی طرف بڑھے تو آواز آئی۔

فَلَمَّا جَاءَهُ نُورٌ دِيْ اَنْ بُوْرِكَ مِّنْ فِى النَّارِ وَمِنْ حَوْلِهَا ط وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۷)

جب موسیٰؑ آگ کے قریب پہنچا تو اسے آواز سنائی دی کہ یہ مقام جس میں آگ نظر آرہی ہے (یعنی طور کی چوٹی) اور اس کا روگرد (ارض فلسطین) بڑی مبارک سرزمین ہے (جہاں اس قدر انبیاء پیدا ہونے والے ہیں اور جو بنی اسرائیل کے لئے انقلابِ عظیم کی آماجگاہ بننے والی ہے) (۲۷/۲۸)۔

(لیکن تم اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ تمام برکات و سعادت اسی خطۂ زمین تک محدود ہیں، باقی دنیا اس سے محروم ہے۔ نہیں، ایسا نہیں)۔ وہ خدا جو تمام نوبع انسان کو نشو و نما دینے کا ذمہ دار ہے، وہ اس سے بہت بلند ہے (کہ وہ صرف کسی ایک خطۂ زمین کو اپنے صحابِ کرم کے لئے مخصوص کرے اور باقی دنیا اس کی گوہر پاشیوں سے محروم رہے۔ اس کی طرف سے عطا شدہ سامانِ نشو و نما)۔ خواہ اس کا تعلق طبعی ضروریات سے ہو یا انسانی ذات سے۔ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس نے سامانِ رزق بھی ہر قوم کو دیا ہے اور وحی کی رہنمائی بھی،

مقصود یہ بتانا تھا کہ یہ مقام (طور) اور اس کے ارد گرد کا علاقہ (ارض فلسطین) بڑی بابرکت زمین ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی یہاں مختلف انبیاء کرامؑ کی وساطت سے پیغاماتِ خداوندی کا عام چرچا ہوا تھا اور اب بھی یہ علاقہ (کچھ عرصہ بعد) نظامِ خداوندی کی آماجگاہ بننے والا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ برکات و سعادت اسی خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ خدا تو رب العالمین ہے۔ اس لئے اس کی تحسین تمام ارض پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ اس تصور سے بہت بلند ہے کہ اس کی ربوبیت کو کسی خاص علاقہ یا خاص نسل میں محدود کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا:-

يٰمُوسٰى اِنَّهٗ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۲۶)

(موسیٰ! جیڑن تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی اور کس نے دی؟ اس پر) ندائے جمال نے کہا کہ اے موسیٰ! یہ آواز تمہارے خدا کی طرف سے آئی ہے، جو بڑی قوتوں کا مالک اور عمدہ ترین تدابیر کا حامل ہے۔ (اس کی قوت و حکمت کا مظاہرہ اس کشمکش میں ہوگا جو تیرے سامنے آنے والی ہے)۔

”عَزِيزُ الْحَكِيمُ“ کی صفتِ خداوندی پر غور فرمائیے۔ غالب اور حکمت والا جس عظیم الشان مہم کو سر کر رہے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو مامور کیا جارہا تھا اس کے لئے ایسے ہی غالب و حکیم خدا کی تائید و نصرت کی ضرورت تھی۔ غلبہ کے ساتھ حکمت (RATIONALITY) نہ ہو تو وہ دھاندلی ہوتی ہے، اور اگر حکمت کے ساتھ غلبہ نہ ہو تو وہ نرا وعظ۔ اس کے بعد ارشاد ہے:-

وَالَّذِي عَصَاكَ فَلَئِنَّ آهَاتِهِمْ تُرْسًا كَانَتْهَا جَانٌّ وَلِيٌّ مُّذَبَّرًا وَلَمْ يَعْقِبْ طِيْمُوسٰى لَا تَخَفْ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ (۲۷)

(پھر موسیٰؑ کو، اس مہم کے سلسلہ میں، مختلف احکام و سے کر کہا کہ) ان احکام کو، جو تیرے لئے زندگی کا محکم سہارا اور وجہِ جامعیت ہیں (فرعون کے سامنے جا کر) پیش کرو۔ موسیٰؑ نے جب اس مہم، اور اسے سر کرنے کے پروگرام پر غور کیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک جیتا جاگتا اثر دھا ہے جس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ موسیٰؑ نے اپنے خیال میں اس سے پیچھے ہٹنا چاہا اور فرعون کی طرف جانے سے ٹائف ہوا۔

(۱۰۸-۱۰۷ : ۲۰-۲۱ : ۲۲-۲۳ : ۳۳-۳۴)۔

آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! ڈرو نہیں۔ جب ہم اپنے پیغمبروں کے ساتھ ہیں، تو پھر ان کے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی (۲۶)۔ (یہاں لفظ مرسلون نے بات واضح کر دی کہ سانپ سے ڈرنے کی بات نہیں تھی۔ رسالت کی بے پناہ ذمہ داریوں کے احساس کا خوف تھا)۔

الَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۲۷)

نہی اُسے ڈرنے کی ضرورت ہے جس سے کبھی دانت نہ بڑا دتی ہو گئی ہو، لیکن اُس نے اس سے توبہ کر کے زندگی کی حسین اور بہادر راہ اختیار کر لی ہو۔ اس لئے کہ ہمارے قانون مکافات میں اس کی گنجائش ہے کہ ایسے شخص کو، اس کی سابقہ لغزشوں کے نقصان رسان اثرات سے محفوظ رکھا جائے، اور اُس کی نشوونما برابر ہوتی رہے۔ (لہذا، اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہو کہ تم نے غلطی سے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، اور اس طرح تم سے ایک جرم مرزد ہو گیا تھا، اس لئے اب اس عظیم مہم کو کس طرح سرانجام دیا جا سکے گا، تو اس خیال کو بھی دل سے نکال دو۔)

پھر فرمایا۔

وَاَدْخُلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجَ بَيْضًا مِّنْ غَيْرِ سُوءٍ قَفٍ فِي تِسْعِ آيَاتِ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ ۝ (۲۸)

پھر موسیٰ کو، ان احکام کی تائید میں، براہین نیرہ عطا کیں جن میں ارباب عقل و بصیرت کے لئے روشنی اور نانبائی کا سامان تھا۔ وہ اگر ان پر غور و فکر کریں گے تو انہیں نظر آجائے گا کہ احکام خداوندی کے اتباع میں کسی خرابی کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ وہ تو مرتد یا خیر ہوتے ہیں (۲۸)۔ یہ دلائل ان نو (۹) آیات (۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹) سے متعلق تھے جنہیں لے کر موسیٰ، فرعون اور اس کی قوم کی طرف گیا تھا۔ وہ قوم جو زندگی کے صحیح راستہ کو چھوڑ کر، غلط راہوں پر چل نکلی تھی۔

ان تسع آیات (نو نشانیوں یا احکام) کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مذکورہ صدر مقامات میں تفصیل دی گئی ہے لیکن سورۃ نازعات میں ان تفصیل کو اجمال میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

فرمایا۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوسٰى ۝ اِذْ نَادٰهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝
اِذْ هَبُّ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِبْنَهُ طَغٰى ۝ (۲۹-۳۰)

(۱) انقلاب کوئی نیا انقلاب نہیں ہو گا۔ یہ سلسلہ تو شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مستبد قوتیں کمزوروں کو دبا رہی ہیں، اور انبیاء کرام اُن کے رفقاء کی جماعتیں ان کمزوروں اور ناتوانوں کو ابھار کر اُوپر لاتی رہی ہیں۔ (مثلاً) موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کو لو۔ اور اس داستان کا آغاز وہاں سے کرو جب موسیٰ، اس مقام

میں پہنچ چکا تھا جہاں عقل کے تجرباتی طریق کی لمبی مسافتوں کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا، اور اس پر وحی کے ذریعے براہ راست انکشاف حقائق کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ (۲۴)۔ یعنی جب موسیٰ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اُس وقت، اُس کے نشوونما دینے والے نے اُسے پکارا، اور کہا کہ:

تم فرعون کی طرف جاؤ۔ اُس نے وہاں کی مچا رکھی ہے۔ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔ اُس نے کمزوروں کو بُری طرح دبا رکھا ہے۔

سورۃ شعراء میں ہے۔

وَ اِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوسٰی اِنَّ اَنْتَ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۙ اَلَا یَتَّقُوْنَ ۝

(۲۴-۱۱)

اس حقیقت کی شاہد، داستانِ بنی اسرائیل ہے، جسے اس جگہ مختصراً دہرایا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء اس مقام سے کی جاتی ہے۔ جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی اور اُس سے کہا کہ تم اس قوم (فرعون) کی طرف جاؤ جس نے بڑی سرکشی اختیار کی ہے۔

ان کی طرف جاؤ اور اُن سے پوچھو کہ کیا وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن عواقب سے بچنا چاہتے ہیں یا نہیں؟

حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّکَذِّبُوْنِ ۝ وَ یَقِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ
فَاَرْسِلْ اِلَیْ هٰرُوْنَ ۝ (۲۶-۱۳)

موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے ڈر ہے کہ وہ (میری بات نہیں مانیں گے بلکہ اٹا) مجھے جھٹلائیں گے۔

(ہو سکتا ہے کہ ان کی مخالفت اس قدر شدت اختیار کر لے کہ اس کا مقابلہ کرنا تنہا میرے بس کی بات نہ رہے) میرا دم گھٹنے لگ جائے اور میں ان سے کھل کر بات بھی نہ کر سکوں۔ اس لئے تو ایسا کر کہ ہارون کی طرف بھی پیغام بھیج دے (کہ وہ میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہے)

سورۃ طہ کے الفاظ ہیں، حضرت موسیٰؑ نے دعا مانگی تھی کہ رَبِّ اَشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (۲۲) "اے اللہ! میرا سینہ کھول دے" یہاں اس اہم ذمہ داری کے بوجھ کی طرف اشارہ ہے جس کے لئے شرح صدر کی آرزو، دعا بن کر لب پر آگئی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے سورۃ طہ میں عرض کیا تھا کہ "میری زبان کی گرہ کشائی فرما دیجئے تاکہ وہ

میری بات سمجھ لیں“ (۲۰-۲۸)۔ یہاں اپنے عجز بیان کے متعلق کہا کہ لَا يَنْتَلِقُنْ لِسَانِي اِس لئے حضرت ہارونؑ کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا (۲۸)۔ (وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے)

اس کے بعد عرض کیا کہ ایک بات اور بھی ہے۔

وَلَهُمْ عَلَىٰ ذَنْبٍ فَاَخَافُ اَنْ يَقْتُلُوْنِ ۝ (۲۴-۲۷)

(دوسری بات یہ بھی ہے کہ) وہ لوگ میرے خلاف قتل کا الزام دھرتے ہیں، اس لئے مجھے خدشہ ہے کہ

وہ مجھے گرفتار کر کے قتل نہ کر دیں

دیکھئے! حضرت موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں۔ اس لئے کہ آپ قتلِ عمد کے ترکب نہیں تھے۔ بلکہ وہ

حادثہ محض اتفاقی تھا۔ لیکن (جیسا کہ پہلے آچکا ہے) حکومتِ فرعونؑ کے اربابِ بست و کشاد، آپ پر قتلِ عمد کا

الزام دھر کر آپ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ (ملاحظہ ہو آیات (۲۸-۳۱) جو پہلے درج کی جا چکی ہیں)۔ اللہ تعالیٰ

نے فرمایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دونوں بھائی جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَا اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ (۳۲-۳۴)

خدا نے کہا کہ (مت ڈرو) اُن کی مجال نہیں کہ وہ ایسا کریں۔ (لیکن یہ ٹھیک ہے کہ ہم کی سختی کے پیشِ نظر،

ہارونؑ کو بھی تمہارے ساتھ جانا چاہیئے) پھر تم دونوں، ہمارے قوانین کو لے کر اُن کی طرف جاؤ۔ ہم تمہارے

ساتھ ہیں۔ ہم ایک ایک بات کو سُنتے (دیکھتے) رہیں گے۔ (۳۲-۳۴)۔

یہ تھے وہ واقعات جو مبرطور لہرانے والی برقِ بجلی کے دامن میں، آگ کی تلاش میں نکلے ہوئے (حضرت) موسیٰؑ

کو پیش آئے۔



اہلِ خانہ انتظار میں ہونگے کہ آپ آگ لے کر آئیں! انہیں کیا معلوم کہ وہاں سے کون سی زندہ حرارت مل گئی ہے جو افراد کے خون میں ہی نہیں بلکہ قوم کی رگِ جان میں برقِ تپاں بن کر دوڑ

جائے گی۔ حضرت موسیٰؑ اس مقصدِ عظیم کو دل میں لئے، جس کے لئے آپ کو مامور کیا گیا تھا، مصر کی جانب روانہ ہو گئے۔

غور کیجئے! یہاں سے بھاگے تھے تو کس حالت میں۔ اور آبِ لُٹے ہیں تو کس انداز سے! اُس وقت فرعون اور اسکے

اربابِ حکومت کی سازش سے پنج کر نکلے تھے اور اب مراجعت ہوئی ہے تو بایں مَطَّ کہ انقلابات کی ایک دنیا جلو میں ہے

اور سینے میں سوائے ایک اللہ کے کسی کا خوف مضمحل نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی آمد

طور سے واپسی

دربارِ فرعون میں

اور ان کے ارادوں کی اطلاع، بنی اسرائیل اور فرعون کی حکومت کو مل چکی ہوگی۔ بہر حال آپ فرعون کے پاس پہنچے اور اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يُفْرِعُونَ رَاقِي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۱۰۴)

موسیٰ نے فرعون سے کہا کہ (تم نے انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ ایک گروہ کو پامال کرتے ہو، دوسرے کو سر پر چڑھاتے ہو۔ اس سے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں ۱۰۴)۔ میں اُس خدا کی طرف سے پیامبر ہوں جو تمام نوع انسان کا نشوونما دینے والا ہے۔ (اُس کے نزدیک انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں، یہی انداز معاشرہ کا ہونا چاہیے)۔

”میں خدا کا فرستادہ ہوں اس لئے حق کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ مطالبہ میرا فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پر مجبور نہ کر۔ خدا کے فرستادہ کے حوالہ کر دے تاکہ وہ انہیں انسانوں کی انسانیت سوز محکومی سے چھڑا کر، خدا کی محکومیت میں لائے اور اس طرح انہیں انسانیت کی زندگی سے روشناس کرائے“

حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقُّ ۚ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ ۝ (۱۰۵)

مجھ پر لازم ہے کہ میں خدا کے متعلق، حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس نشوونما دینے والے کی طرف سے، کھلے کھلے دلائل اور قوانینِ حیات لایا ہوں۔ ان قوانین کی رو سے، کسی قوم کو اپنی غلامی اور محکومی میں رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں)۔ لہذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ (تاکہ یہ آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں)۔ یہ خدا کے بندے ہیں، تمہارے نہیں، اس لئے انہیں میرے پیر و کردار میں انہیں انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر، قوانینِ خداوندی کے تابع لے آؤں۔ اسی کا نام آزادی ہے۔ (۱۰۵)

اس مقام کے علاوہ حسب ذیل آیات میں بھی اس بات کو دہرایا گیا ہے۔

(۱۰۵) ۱۱۹-۱۱۸ ۱۱۷-۱۱۶ ۱۱۵-۱۱۴ ۱۱۳-۱۱۲ ۱۱۱-۱۱۰ ۱۰۹-۱۰۸ ۱۰۷-۱۰۶ ۱۰۵-۱۰۴ ۱۰۳-۱۰۲ ۱۰۱-۱۰۰ ۹۹-۹۸ ۹۷-۹۶ ۹۵-۹۴ ۹۳-۹۲ ۹۱-۹۰ ۸۹-۸۸ ۸۷-۸۶ ۸۵-۸۴ ۸۳-۸۲ ۸۱-۸۰ ۷۹-۷۸ ۷۷-۷۶ ۷۵-۷۴ ۷۳-۷۲ ۷۱-۷۰ ۶۹-۶۸ ۶۷-۶۶ ۶۵-۶۴ ۶۳-۶۲ ۶۱-۶۰ ۵۹-۵۸ ۵۷-۵۶ ۵۵-۵۴ ۵۳-۵۲ ۵۱-۵۰ ۴۹-۴۸ ۴۷-۴۶ ۴۵-۴۴ ۴۳-۴۲ ۴۱-۴۰ ۳۹-۳۸ ۳۷-۳۶ ۳۵-۳۴ ۳۳-۳۲ ۳۱-۳۰ ۲۹-۲۸ ۲۷-۲۶ ۲۵-۲۴ ۲۳-۲۲ ۲۱-۲۰ ۱۹-۱۸ ۱۷-۱۶ ۱۵-۱۴ ۱۳-۱۲ ۱۱-۱۰ ۹-۸ ۷-۶ ۵-۴ ۳-۲ ۱-۰



حضرت موسیٰ نے سب سے پہلے یہی کہا کہ میں اپنے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مہری بُت پرست تھے اور ان کے بادشاہ شانِ الوہیت کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔ بُت پرستی کا مسلک یہ ہے کہ

مختلف صفات معبودیت کے لئے مختلف دیتا تصور کر لئے جاتے ہیں اور پھر ہر دیتا کا مجسمہ تراش کر، ان سے وہی کچھ مانگا جاتا ہے جس کا اسے دیتا قرار دیا جاتا ہے۔ بارش برسانے والا دیتا۔ ہوا میں چلانے والا دیتا۔ اولاد دینے والا دیتا۔ قس علیٰ ہذا۔ پھر ہر قبیلہ اور ہر قریبہ کا جدا جدا دیتا اور الگ الگ "خدا" ہوتا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میں اپنے رب (یا تمہارے)

رب کی طرف سے پیغامبر ہوں تو فرعون نے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يُمُوسٰی ۝ (۲۰)

"اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اسے موسیٰ؟"

کون سے رب کی طرف سے؟ کون سے خدا کی جانب سے؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے چار لفظ کہے ہیں اور غور کیجئے تو کس طرح بساط کائنات کے چاروں گوشے ان کے اندر سمٹ کر آگئے ہیں وحی کا اندازہ ہی یہ ہوتا ہے۔ فرمایا:-

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي اَعْطٰی كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی ۝ (۲۱)

موسیٰؑ نے کہا کہ ہمارا رب، کسی خاص گروہ یا قوم کا رب نہیں۔ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ انسانوں تک یہ رہنمائی وحی کے ذریعہ آتی ہے، جسے لے کر ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کا جواب

وہ رب جس نے ہر شے کو خلقت عطا فرمائی۔ غور کیجئے۔ ہر شے کا پیدا کرنے والا۔ یہ نہیں کہ صرف بارش برسانے والا۔ اولاد عطا فرمانے والا۔ بلکہ اس وسیع و عریض کائنات میں جس شے کا بھی تصور کر سکو اس کا خالق اور صرف خالق ہی نہیں بلکہ پیدا کرنے کے بعد ہر شے کو جس منفی تک پہنچاتا ہے، وہاں تک کی راہ نمائی کرنے والا۔ سلسلہ ارتقاء کی اولین اور آخری کڑیوں کا مالک کہیئے! ایسے خدا کی موجودگی میں کسی شے کو اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں کسی اور "خدا" کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے؟

حضرت موسیٰؑ نے جو کہا تھا کہ اِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۲۲) اور اس کے جواب میں —

— فرعون نے پوچھا تھا کہ وہ "رب" کونسا ہے تو اس میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے۔ فرعون کا دعویٰ تھا [اور دنیا کے ہر فرعون] کا یہی دعویٰ ہوتا ہے کہ [اَنَا رَبُّكُمْ اَلَا عَلٰی] کو کون کو میں سامان زندگی عطا کرتا ہوں اس لئے میں ہی ان کا رب ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے جو کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں تو اس سے

فرعون کے اس دعوائے ربوبیت کی بھی تردید کر دی۔ اس لئے فرعون نے دُہرا کر پوچھا کہ وہ کون سا رب ہے جس کی طرف سے تم آئے ہو۔ اس سرزمین میں ”رب“ تو میں ہی ہوں۔

بہر حال فرعون نے سوچا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو اس الجھاؤ میں الجھالے گا۔ لیکن جواب ایسا مسکت اور جامع ملا کہ سٹی بھول گیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس راہ سے کتر کر دو سری طرف نکل جائے۔ کہنے لگا اچھا! یہ بتاؤ کہ جو لوگ پہلے ہو گئے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ ان میں سے کون راہِ راست پر تھا اور کون گمراہ۔ خدا کے ہاں اس وقت ان کی کیا حالت ہے؟ کس کی نجات ہوئی اور کون عذاب میں مبتلا ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ۚ (۱۰۵)

جب فرعون نے دیکھا کہ اس سوال کے جواب میں موسیٰؑ پر گرفت کی گنجائش نہیں نکل سکتی تو اس نے بحث کا رُخ بدلا اور خاص ”حکمتِ فرعون“ سے کام لینا چاہا۔ اس کے گرد و پیش، امراء و وزرائے تھے۔ وہ اور اُن کے آباء و اجداد مشرک تھے، اور موسیٰؑ کے معیار کے مطابق، جہنم کے سزاوار۔ اس لئے اُس نے موسیٰؑ سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ جو لوگ پچھلے زمانے میں گورچکے ہیں (یعنی ہمارے اسلاف) اُن کا کیا حشر ہوگا۔ (کیونکہ وہ تو تمہارے خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے)۔

یہ سوال ایسا تھا کہ اس کے جواب سے فرقہ وادی اور گمراہ وہ سازی کی ہزارا فراق انگیز راہیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے فرعون کی سیاست کی وسیعہ کاری کا مقصد یہ بھی تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ اس قوم کے اسلاف میں سے کسی کے متعلق بھی یہ کہیں گے کہ وہ گمراہ تھے تو فرعون اپنے اہل و بار اور عوام سے کہے گا کہ دیکھو! یہ شخص تمہارے واجب الاحترام بزرگوں کی توہین کرتا ہے۔ اس طرح اُن کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں حضرت موسیٰؑ کا مخالف بنا دیا جائے گا۔ اوریوں وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے وہ آئے ہیں ناکام ہوں سے اوجھل کر دیا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ ہم حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے مخالف بادشاہ کے مکالمہ میں دیکھ چکے ہیں (دیکھئے مطالب الفرقان جلد سوم)

ایک اور بصیرت افروز جواب

ص ۵۶) حضرات انبیائے کرامؑ کا مسلک، مجادلانہ نہیں ہوتا، اعلانِ ہوتا ہے، وہ بحث و مناظرہ کے لفظی کورکھ دھند سے بچ کر، اس انداز سے حقیقت کشائی کر دیتے ہیں جس سے پوچھنے والا ساکت بھی ہو جائے اور مطمئن بھی۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب میں فرمایا۔

قَالَ عَلَّمْنَا عِنْدَ رَبِّنَا كِتَابَ جَلِيلٍ لَا يَفْضِلُ رَبِّنَا وَلَا يَنْسَىٰ ۚ (۱۰۶)

اُس نے یہ سوال اس نیت سے کیا تھا کہ جب اس کے جواب میں موسیٰ کہے گا کہ وہ سب جہنم میں جائیں گے تو اس کے اہل دربار مشتعل ہو جائیں گے اور یوں بنی اسرائیل کی آزادی کا مسئلہ مذہبی جذبات کے سیلاب میں بہ جائے گا۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا سابقہ کس سے پڑا ہے (موسیٰ نے کہا کہ اس بات کا مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ لوگ کس حال میں ہیں)۔ اس کا علم میرے پروردگار کے نوشتے میں ہے (اس لئے اُن کے معاملہ کا فیصلہ، خدا کے نوشتے کے مطابق ہو جائے گا)۔ وہ خدا ایسا نہیں کہ کھویا جائے، یا بھول میں پڑ جائے۔ (اس لئے اُن کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک اُن کے اعمال کے مطابق ہو جائے گا۔ تم اپنے پہلے سوال کا جواب سنو، کہ جس رب نے ہمیں تمہاری طرف بھیجا ہے، وہ رب کیسا ہے؟)

جواب کے ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے اور خفائی و معارف کی اس بصیرت افروز دنیا میں جذب ہو جائیے فرمایا کہ اسلاف کا علم، نوشتہ الہی میں ہے اور وہ نوشتہ ایسا ہے جس میں کسی قسم کی غلطی اور سہو کا امکان نہیں ہے۔ اس لئے مجھے (یا تمہیں) اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کا حال اُن کے رب کے علم میں ہے لیکن تمہارے لئے فقط اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ کا قانون مکافات عمل ایسا محکم گیر اور محیط کل ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی اور غلطی کا امکان نہیں۔ اس لئے ہمیں نکر اپنی اپنی کرنی چاہیئے۔ ہماری نجات کے لئے ہم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں بزرگ بڑا ہے یا فلاں۔ اور فلاں کی نجات ہوگی یا نہیں۔ ان کے متعلق ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم عرض کریں کہ۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ (۵۹)

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمارے لئے بھی سامان حفاظت عطا فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کے لئے بھی، جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں۔

ان کے اعمال کے متعلق ہم سے باز پرس نہ ہوگی۔

تِلْكَ أُمَمٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا

۱۰۔ یہ آیہ علیلہ حیات بعد المات کے اہم گوشہ سے متعلق ایک بنیادی اصول بھی بیان کر رہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ نکتہ ایک مبسوط تشریح کا محتاج ہے اس کا بیان اس کے اپنے مقام پر آئے گا۔

يَعْمَلُونَ ۝ (۱۰۴)

بہر حال، اگر اس کے باوجود تم اصرار کرتے ہو کہ تمہارے اسلاف ایسے نہیں تھے، ایسے تھے، تو اس سے اصل بات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ جیسے بھی تھے، اُن کے اعمال اُن کے لئے تھے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کس روش پر چلتے تھے اور کیسے کام کرتے تھے۔ تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ یہ ہے دین کی اصل جس میں کسی جھگڑے کی گنجائش نہیں۔

اُن کے اعمال ان کے ساتھ۔ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ۔ اس لئے اس فکر کی کیا ضرورت ہے کہ ان کا کیا حال ہے؟ فکر یہ کرو کہ ہمارا کیا حال ہو گا؟

آیہ عبرت! حضرت موسیٰؑ کے اس جواب پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس سے فرعون کی چال کس طرح ناکام بنا کر رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ ہم تشدد و افتراق کے جس جہنم میں مبتلا ہیں کیا اس کی ایک بڑی وجہ یہی نہیں کہ بجائے اس کے کہ ہم اسلاف پرستی کے اس سوال کے جواب میں رجوع فرعون نے کیا تھا، وہی طریق اختیار کریں جو زبان وحی سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ عَلِمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ۔ ایک ایک کے متعلق عدالت کی کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور (معاذ اللہ) خدا نے احکم الحاکمین کا منصب بھی خود ہی اختیار کر لیتے ہیں؟ اس سے باہمی تکفیر و تفسیق کے دروازے کھل جاتے ہیں اور یوں، ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب کی ماننے والی اُمت واحدہ، سینکڑوں فرقوں میں بٹ کر عملی شرک کی نظیر بن جاتی ہے۔ اور، قیامت بالائے قیامت، کہ تحریک و تشیع اور فرقہ سازی اور گردہ بندی کی ان تمام مذہموں کو شمشوں کا نام ”خدمت اسلام“ رکھا جاتا ہے یا للعجب!!



بہر حال، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس سوال کا بھی ایسا مسکت جواب دیا کہ اس کے بعد کوئی بات بن نہ پڑی چونکہ اس جواب میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے قانون مکافاتِ عمل کی طرف اشارہ کیا تھا اس لئے اس کی مزید تفصیل میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا بھی اجمالی تذکرہ کر دیا جس سے قانونِ کائنات کی ہمہ گیری سے، قانونِ مکافات پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یعنی ہمداء سے معاد کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی) آپ نے فرمایا:-

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَوَسَّلَكَ لَكُمُ فِيهَا سُبُلًا وَانْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَخَرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْ ثَبَاتٍ شَتَّىٰ ۖ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النَّهْيِ ۚ وَمِنهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۚ (۵۵-۵۷)

وہ رب، وہ ہے جس نے تم سب کے لئے اس وسیع و عریض زمین میں سامان پرورش جمع کر دیا، اور تمہاری نقل و حرکت کے لئے راستے بنا دیئے۔ وہ رب جو بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس کی آب پاشی سے انواع و اقسام کی نباتات پیدا کر دیتا ہے۔

ہاں تم خود بھی کھاد اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ اس تمام نظام فطرت میں، صاحبان عقل و بصیرت کے لئے اس حقیقت کبریٰ کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں، کہ کائنات میں پروردگاری صرف خدا کی ذات کے لئے ہے۔ لہذا، کسی فرعون کا یہ کہنا کہ ”أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَىٰ“ میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔ (۴۹/۲۴)۔ یہ زمین۔ یہ دریا۔ یہ ملک سب میری ملکیت ہیں (۴۳/۵۱)۔ اس لئے تم میرے محتاج اور محکوم ہوئے۔ بے بنیاد دعویٰ اور حماقت پر مبنی تصور ہے۔

اُس پروردگار حقیقی نے تم سب کو اس زمین (بے جان مادہ) سے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ (تمہارے بے جان مادی جسم کو اسی میں ٹوٹا دیتا ہے، لیکن اس کے بعد، تمہیں حیات نو عطا کر کے اس سے اٹھا کھڑا کرے گا جو پہلی کڑیوں سے مختلف ہوگی (آخری موت ہے آخر کی)۔ لہذا، انسانوں میں آقا اور بندہ۔ حاکم اور محکوم کی تفریق کیسی؟ آقا اور حاکم صرف خدا ہے۔ سب انسان آپس میں برابر اور اُس کے محکوم ہیں۔ کیا اب تم سمجھ گئے ہو کہ وہ خدا کون سا ہے جس کا پیغام لے کر ہم تمہاری طرف آئے ہیں؟

❖

سورۃ شعراء میں بھی اس مکالمہ کا ذکر ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۚ (۲۴/۲۴)۔ (فرعون نے پوچھا کہ رب العالمین کون ہے) حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔ قَالَ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ إِنَّكُمْ لَمُوقِنُونَ ۚ (۲۴/۲۴)۔ (موسیٰؑ نے کہا کہ وہ پستیوں اور بلندیوں کا اور ان سب کا جو ان کے درمیان ہیں، رب ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو تو)۔ ظاہر ہے کہ اس الہ حقیقی کا عقیدہ، نہ صرف قوم فرعون کی احسان پرستی ہی کو جڑ سے اکھڑ دیتا تھا بلکہ خود فرعون کے دعوائے ربوبیت کو بھی خاک میں ملا دیتا تھا۔ اس لئے کہ فرعون کا دعویٰ

فرعون کا دعوائے ربوبیت

یہ تھا کہ اَنَا رَبُّكُمْ اَلْعَلٰی (۱۰۹) میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں اور حقیقت یہ کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایک فرعون موسیٰ

ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا میں ہر مستبد قوت، اپنے دبدبہ و اقتدار کو انہی راہوں سے قائم کرتی ہے۔ وہ رزق کے چشمیوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے اور پھر بھوکے انسانوں سے، جو جی میں آئے منوا اور کرالیتی ہے۔ ورنہ انسان اگر اپنی روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو تو کسی کے سامنے جھکے کیوں؟ فرعون کے دعوائے ربوبیت کی بھی یہی بنیاد تھی۔ اس لئے جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ میرا خدا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ہے۔ یعنی کائنات کی ہر شے کا پروردگار۔ اور پھر اس دعویٰ کی دلیل میں تفصیل سے بتا دیا کہ خدا کس طرح مخلوق کے لئے سامانِ رزق مہیا کرتا ہے (۱۰۵-۱۰۶)۔ تو فرعون نے اپنے حواریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ ”سنتے ہو۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ (۱۰۶)۔ فرعون کے اس استفسار میں ایک طرف تضحیک کا پہلو بھی ہے، لیکن دوسری طرف، اپنے اربابِ حکومت کی توجہ اس انقلابی روح کی طرف بھی منعطف کرادی گئی ہے جو حضرت موسیٰؑ کے اس دعوائے ایمان میں جھلک رہی تھی جس شخص کا ایمان یہ ہو کہ کائنات کی تمام اشیاء کا نشوونما دینے والا خدا ہے بزرگ و برتر کے سوا کوئی نہیں، وہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے سامنے بھلا کب جھکنے دے گا؟

اور اس دعوے کا ابطال

فرعون کی نگاہوں نے حضرت موسیٰؑ کے اس سادہ سے جملہ میں انقلاب

آسمانی کی وہ تمام بجلیاں بھانپ لیں جو اس قسم کے ایمان کے سحاب میں بے تاب ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی استہزاء آمیز تنقید کو اسی حقارت سے ٹھکرا دیا جسکی وہ مستحق تھی۔ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر آگے بڑھ گئے۔ اور فرمایا۔ قَالَ رَبُّكُمْ اَبَاكُمْ وَرَبُّ اَبَائِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ (۱۰۶) ”وہ اللہ تمہارا رب اور تمہارے آباء و اجداد کا رب ہے“ اس ٹکڑے میں حقیقت ضمناً فرعون کے اس ”نشر“ کا بھی جواب تھا کہ تم لوگوں کی ربوبیت کے مدعی ہو۔ حالانکہ تم اور تمہارے آباء و اجداد (جنہیں تمہاری طرح یہی دعویٰ تھا) سب اپنی پرورش کے لئے بھی اسی بارگاہِ ممدیت کے محتاج تھے (اور ہیں) سو جب تم خود اپنی پرورش کے لئے کسی اور کے محتاج ہو تو تم دوسروں کی پرورش کیا کر سکتے ہو؟ فرعون نے پھر اہل دربار کی طرف دیکھا اور کہا کہ سنتے ہو! اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں اور میرے آباء و اجداد (یعنی وہ تمام شہنشاہ جن کی عظمت کے سامنے دنیا کا نپتی تھی) اس کے نزدیک سب محتاج ہیں؟ کیا اس قسم کی باتیں کوئی سلیم العقل انسان کر سکتا ہے؟

قَالَ اِنَّ سَؤْلَكُمْ الَّذِي اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۝ (۲۶)

فرعون نے اپنے اہل دربار مخاطب ہو کر کہا کہ تم مجھے خدا نے تمہاری طرف اپنا رسول بھیجا تو ایک پاگل بھیجا!

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی اس جگہ پاش تنقید سے پھر اسی بے رنجی کا بڑا ڈکھا جس کی وہ سزاوار تھی، اور اپنے سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ اللہ صرف تمہاری حکومت کے دائرہ میں بسنے والوں ہی کا پروردگار نہیں۔ بلکہ ساری دنیا میں بسنے والی مخلوق کا رب ہے۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (۲۷)

(موسیٰؑ نے اُس کے ہفوات پر پھر کوئی توجہ نہیں دی، اور اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے) کہا کہ وہ خدا، مشرق و مغرب، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے۔ اگر تم ذرا بھی عقل و خرد سے کام لو تو یہ بات آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

تخویف کا اچھا حربہ | فرعون یہ کچھ سنتا جا رہا تھا اور غم و غصہ سے بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب جو اس نے دیکھا کہ اس کے دعوائے ربوبیت کی یوں پے درپے دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں۔ اور وہ بھی اس کے اراکین سلطنت کے سامنے۔ تو کھسیانہ ہو کر، اس حربہ پر اتر آیا جو مستبد قوتوں کے پاس آخری ”ویل“ ہوتا ہے۔ کہا

قَالَ لَیْسَ اَتَّخَذْتُ الْهٰٓغَیْرِیْ لِاَجْعَلَ لَكَ مِنَ الْمُسْجُوْنِیْنَ ۝ (۲۸)

(اب فرعون سے نہ رہا گیا۔ اس نے طیش میں آ کر موسیٰؑ سے کہا کہ اپنی زبان بند کرو، اور کان کھول کر سن لو کہ) اگر تم نے (میری مملکت میں رہتے ہوئے) میرے سوا کسی کو صاحب اقتدار تسلیم کیا، خواہ وہ تمہارا خدا ہی کیوں نہ ہو، تو یہ کھلی ہوئی بغاوت ہوگی جس کی پاداش میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔ (۲۸)

دیکھئے! سیاست فرعونی اور حکمتِ کلیمی کی تفصیل کس طرح اس مختصر کالم کے اندر جھلمل جھلمل کر رہی ہیں دنیا میں فرعون قوتیں، انسانوں سے اپنی ”معبودیت“ تسلیم کرنا چاہتی ہیں اپنے مزعومہ دعوائے ”ربوبیت“ کی بنا پر اور حکمتِ کلیمی ان کے دعوئے ربوبیت کی حقیقت کو بے نقاب کر کے ان کی ”معبودیت“ کے زعم باطل کو مٹی میں ملا دیتی ہے۔ شروع سے آج تک دنیا میں یہی کشمکش جاری ہے۔ اور جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے اذل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سلسلہ صید و صیاد | یوں تو دنیا میں ہر شکار میں لذت ہوتی ہے لیکن یہ لذت اپنی انتہا تک اس وقت پہنچتی ہے جب ایک انسان کا شکار دوسرا انسان ہو۔ یہ وہ لہو ہے جو منہ سے لگے نہیں

چھوٹا۔ تاریخ نوع انسانی پر غور کیجئے تو یہ اسی سلسلہ صید و صیاد کی خوشچکان داستان نظر آئے گی۔ قوم بنی اسرائیل، مصریوں کے پنجہ آہنی میں بے بس شکار کی طرح تڑپ رہی تھی۔ حضرت موسیٰ کا مطالبہ اس کے سوا کیا تھا کہ اس مظلوم شکار کو چھوڑ دو اور اجازت دو کہ میں انہیں ساتھ لے کر چلا جاؤں جہاں یہ آزادی کی فضا ہے بسط میں اطمینان کا سانس لے سکیں۔ بظہر معقولیت (یعنی بنگاہ انسانیت) دیکھئے تو اس پر اہل فرعون کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے تھا؛ لیکن اگر وہ بنی اسرائیل کو ملک سے نکل جانے کی اجازت دے دیتے تو پھر اپنی ہوس حکمرانی کی تشنگی کس طرح بجھاتے؟ مستبد قوتیں، صرف اپنے معاملات کی درستی کے لئے اپنی حکومت قائم نہیں کرتیں۔ انہیں اپنے جذبہ حکومت کی تسکین کے لئے کسی دوسری قوم کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے خون کی رنگینی ان کے قصر دولت کی آرائش و زیبائش کے کام آسکے۔ اس لئے اس قسم کی مستبد قوتیں کبھی اجازت نہیں دے سکتیں کہ محکوم قوم ان کے نظام حکومت سے نکل جائے۔ اس لئے کہ اس سے وہ محکوم قوم فرعون کی جیلہ کاریاں | برابری کے درجہ پر آجاتی ہے۔ محکوم نہیں رہتی۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مستبد قوم کی حکومت کے لئے، کسی محکوم قوم کا وجود ضروری ہوتا ہے جسے

وہ مختلف جیلوں اور حربوں سے دباؤ رکھے۔ یہی کچھ فرعون نے کر رکھا تھا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلًا شِيْعًا يَسْتَضِعُّ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يَذِخُّوْا
اُبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِيْ نِسَاءَهُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسْرِئِيْنَ ۝ (۲۸)

واقعہ یہ تھا کہ فرعون نے اپنی مملکت میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اور ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔ اس کے لئے اُس کی بالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہر مردانگی نظر آئے، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیتا اور جو ان جوہروں سے عاری ہوتے، انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کر کے، اُن کی قوت کو توڑتا چلا جاتا رہا ۲۸

(۲۸) -

اس آیت جلیلہ کے غوامض پر غور کیجئے۔ مفسدِ ارباب حکومت کی دیسہ کاریوں کی طولانی فہرست چند لفظوں میں

دسیسہ کاریاں اور گروہ سازیاں | سمٹ کر آگئی ہے۔ گروہ سازی اور پارٹی بندی، وہ بنیادی حربہ ہے جس پر ابلیسی نظام کے قیام کا دار و مدار ہوتا ہے۔

رَجَعَلًا أَهْلًا بِشَيْعًا) اور ان میں سے ایک جماعت کو کمزور رکھنے کی ہر ممکن کوشش تاکہ وہ ابھرنے نہ پائے۔ ان میں سے جو لوگ ایسے نظر آئیں جن میں جرأت و حریت کے جوہر ہوں انہیں ذلیل و خوار کیا جائے اور جو لوگ ان صفات سے عاری ہوں انہیں معزوز و مقرب بنا دیا جائے۔ اس طرح اس محکوم قوم پر احسان بھی رکھا جائے کہ اس سے کس قدر فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں دبائے بھی رکھا جائے۔ یہ ہے وہ فسادِ آدمیت جو ہر فرعونی نظامِ حکومت کا خاصہ ہوتا ہے (إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ) اور اسی فساد کو مٹانے کے لئے ضربِ کلیدی اور حربہِ اللہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ غور کیجئے! کہنے کو تو یہ آج سے تین چار ہزار سال پہلے کی ایک قوم کی داستان ہے۔ لیکن درحقیقت یہ وہ ابدی حقائق ہیں جو کبھی پرانے نہیں ہو کر تے۔ یہ حقیقت آج بھی اسی طرح تازہ اور زندہ ہے جس طرح آج سے چار ہزار سال پہلے تھی۔ قرآن، حقائق سے بحث کرتا ہے جو فطرت کے اہل قوانین کی طرح غیر متبدل ہوتے ہیں۔ طاغوتی سیاست کی جن مہرہ بازیوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ کسی خاص قوم، خاص ملک اور خاص زمانہ سے متعلق نہیں۔ ابلیس شروع سے آدم کے ساتھ ہے اور ساتھ ہی رہے گا۔ وَفِيهَا آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔



مطالبات | یہ تھے وہ حالات جن میں، حضرت موسیٰؑ نے یہ مطالبہ پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دیدی جائے۔ یہ مطالبہ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ایسا نہیں تھا باسانی تسلیم کر لیا جاتا۔ اس کی مخالفت میں تو ہر ممکن قوت صرف ہو جانی چاہیے تھی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

پھر حضرت موسیٰؑ کا دوسرا مطالبہ، کہ خدائے واحد کی محکومیت اختیار کرو، فرعون کے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ جس روش پر آباد و اجداد کے وقت سے چلے آ رہے ہیں، اس کا چھوڑ دینا جس حکومت اور شانِ خداوندی کو اسلاف سے ورثہ میں حاصل کیا ہے اسے تیاگ دینا! جس لئے قوت و ثروت میں صدیوں بدست چلے آ رہے ہیں اسے ترک کر دینا!!! کچھ آسان نہ تھا۔ اس کے لئے بڑے محکم ایمان کی ضرورت تھی۔ قوم فرعون مہلّا اسے کس طرح آسانی سے قبول کر لیتی؟ اگر ایسے مطالبات اتنی آسانی سے قبول کو لئے جایا کرتے تو دنیا میں باطل شکن بازوؤں کی ضرورت ہی کیوں پڑتی؟

قوم فرعون سے ان مطالبات کی مخالفت اور سخت مخالفت غیر متوقع نہ تھی۔ لیکن مشیت کو یہ منظور تھا کہ جس

مظلوم قوم کو اس درجہ کمزور و ناتوان بنا دیا گیا ہے اسے دنیا میں سرفرازی عطا کرے۔ (کیونکہ ان میں ہنوز اس سرفرازی کی صلاحیت باقی تھی)۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۚ وَنُكَسِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِي فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝ (۲۸-۲۹)

چنانچہ اس کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیش نظر ہمارے قانون مکانات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا، اسے ہماری نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطہ زمین کا مالک بنا دیا جائے۔

جہاں ان کی اپنی حکومت ہو، اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار رہا مان، اور ان کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھایا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے، اور جس سے بچنے کیلئے وہ اس قدر محکم تدبیر اختیار کیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی تباہی اور بربادی۔

خدا کا احسان کیا ہوتا ہے؟ دوسری آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ اہل فرعون کو یہی خوف تھا کہ بنی اسرائیل کسی دن ابھر کر سامنے نہ آجائیں۔ اسی لئے وہ انہیں

کچلنے کی مختلف تدابیر اختیار کرتے رہتے تھے۔ لیکن مشیت خداوندی نے یہ اعلان کر دیا کہ بالآخر وہی ہو کر رہے گا جس سے وہ یوں لرزاں تھے۔ بنی اسرائیل ابھرے اور فلسطین اور اس کے گرد و نواح کی زمینوں پر درجو اس زمانہ میں حکومت مصر کی باجگذار ریاستیں بنیں) قابض ہو گئے۔ یہ تھا کمزوروں پر اللہ کا احسان۔

لیکن کیا یہ احسان یونہی بیٹھے بیٹھے ہو گیا تھا؟ اس کے جواب کے لئے ابھی چند صفحات کا اور انتظار کیجئے۔ جب وہ ٹکڑا سامنے آئے گا تو اس وقت معلوم ہو گا کہ یہ احسان کن جاں گداز اور صبر آزمایہ مراحل سے گزرنے کے بعد وجہ سرفرازی ہوا تھا۔



دعوت موسوی کا استقبال بہر حال، یہ تھا حضرت موسیٰ کا وہ مطالبہ اور یہ تھی ان کی وہ دعوت۔ اب دیکھئے کہ اس دعوت کا استقبال کس طرح سے ہوا۔ فرعون نے کہا کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم اللہ کی طرف سے رسول ہو اور اس مقصد کے لئے مامور کئے گئے ہو کہ بنی اسرائیل

کو یہاں سے آزاد کر کے لے جاؤ۔ لیکن اس کا ثبوت کیا ہے کہ تم واقعی مامور من اللہ ہو!

قَالَ اِنْ كُنْتَ حَقًّا بِآيَةٍ فَاتِّبِهَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

قرعون نے کہا کہ اگر تم خدا کی طرف سے کوئی واضح دلیل لائے ہو، تو اسے اپنے دعوے کی صداقت میں پیش کرو۔

اس کے جواب میں

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَنَزَعَ يَدَهُ فَاِذَا هِيَ بِيْضَاءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ (۱۰۸-۱۰۶)

اس پر موسیٰ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جن کی بنا پر اس نے وہ دعویٰ کیا تھا اور جنہیں وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ یہ محکم دلائل، اپنی صداقت کے زور و دروں پر، اس طرح آگے بڑھے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوت اور شدت واضح طور پر سامنے آرہی تھی۔ ان کی شدت سے مراد یہ تھی کہ ان کی خلافت و رزی کا نتیجہ کس قدر ہلاکت انگیز ہوگا۔

پھر وہ ان روشن دلیلوں کو سامنے لایا جن کی رو سے بتایا گیا تھا کہ ان قوانین کی اطاعت سے زندگی کا ہر گوشہ کس طرح تباہ ہو جائے گا۔ یہ بصیرت افروز دلائل ہر دیدہ بینا کے لئے چراغ راہ بن سکتے

تھے۔ (۲۰-۱۷، ۲۶-۳۳، ۲۸-۳۲)

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے ان قوانین و دلائل کو پیش کیا جس کے سہارے انہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا اور جسے وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان قوانین سے سرکشی کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ دلائل و براہین اپنے زور و دروں سے اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے تھے کہ ان کی قوت و شدت واضح طور پر سامنے آتی چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ ان براہین کو سامنے لائے جن میں بتایا گیا تھا کہ قوانین خداوندی پر عمل کرنے کا نتیجہ کس قدر خوب شکوہ و تباہی ہوگا

۱۔ یہ ان الفاظ (عصا - ثعبان مبین - بد بیضیا) کے مجازی معنی ہیں جنہیں ہمارے نزدیک، استعارۃ استعمال کیا گیا ہے۔ (اس کی سند لغات القرآن میں اپنے اپنے مقام پر ملے گی)۔ ویسے عصا کے حقیقی معنی لاٹھی - ثعبان مبین کے معنی نمایاں اثر دہا۔ اور بد بیضیا کے معنی سفید چمکیلا ہاتھ ہیں۔

ان دلائل کی دہشت گردی و تابناکی ہر دیدہ بینا کو نظر آتی چلی جا رہی تھی۔

اربابِ حکومت نے جب یہ سب کچھ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا السَّحَرُ عَلِيمٌ ۖ يَبْرِيدُ
 أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَسْرَضِكُمْ ۖ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۚ (۱۱۰-۱۰۹)

اس پڑ فرعون کے سردارانِ قوم نے ایک دوسرے سے کہا، یہ تو بڑا ماہر سحر کار نظر آتا ہے (جو اپنے زورِ بیان سے جھوٹ کو پسِ بکھڑا کر دکھاتا چلا جا رہا ہے)۔

اس کا منشاء یہ نظر آتا ہے کہ (اس طرح لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر) تمہیں اس ملک سے نکال باہر کرے۔ اور یہاں اپنی حکومت قائم کرے۔ سو کہو کہ تمہارا اس باب میں مشورہ کیا ہے؟ (۲۶/۳۵)

اس کے بعد انہوں نے فرعون سے کہا۔

قَالُوا أَسْرَجُهُ وَأَخَاهُ وَأَسْرَسِلُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۖ يَا تُولَكِ
 بِكُلِّ سِحْرٍ عَلِيمٌ ۚ (۱۱۲-۱۱۱)

انہوں نے (باہمی مشورہ کے بعد) فرعون سے کہا کہ تم موسیٰ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو تو مسرودِ التوا میں رکھو، اور اس اثنا میں نقیبوں کو ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بھیج دو کہ وہاں سے سحر کار مذہبی پیشواؤں کو اکٹھا کر کے لائیں (تاکہ وہ ان کا مقابلہ کر کے انہیں شکست دے سکیں)۔

اس مقام پر زرا رکھئے اور مذہبی پیشواؤں کی ذہنیت پر غور کیجئے۔ فرعون نے انہیں بلایا تھا کہ وہ (حضرت موسیٰؑ کے دعادی کے مقابلہ میں اپنے معتقدات اور مسلک کی حقانیت کو ثابت کریں۔ یہ ان کا مذہبی فریضہ بھی تھا اور اپنے آپ کو برسرِ حق ثابت کرنے کے جذبہ کا تقاضا بھی۔ اس لئے انہیں نہایت جوش و خروش سے آگے بڑھنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ فرعون سے اس طرح معاملہ بازی کرتے ہیں گویا وہ اس کا کوئی کام کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے وہ پہلے طے کر لینا چاہتے ہیں کہ اس کام کی انہیں اجرت کیا ملے گی؟ مذہبی پیشوائیت میں ہوتا ہی یہی ہے۔ ان کا ذریعہ معاش مذہب ہوتا ہے اس لئے وہ ہر مذہبی فریضہ کی ادائیگی کا معاوضہ لیتے ہیں۔ اذان دینے کا معاوضہ خطبہ دینے کا معاوضہ نماز پڑھانے کا معاوضہ نکاح پڑھانے کا معاوضہ حج کے مناسک ادا کرانے کا معاوضہ۔

۱۔ سحر کے معنی جھوٹ اور فریب کے بھی ہیں۔

وقس علیٰ انہذا جہاں جہاں مذہبی پیشوائیت ہے، وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے ان (مذہبی پیشواؤں) کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَجْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَعْبُدُوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (۱۱۱) اُن علماء و مشائخ کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مال غلط طریق سے کھا جاتے ہیں۔ یہ خود کچھ کمائی نہیں کرتے اور لوگوں کی محنت کی کمائی پر ملتے ہیں۔ ان سادہ لوحوں سے کہتے ہیں کہ ہم تمہاری راہ نمائی خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف کہتے ہیں، لیکن درحقیقت خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں سب سے بڑی روک یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر قرآن کریم نے مذہبی پیشوائیت (PRISTHOOD) کے اعوارہ ہی کو ختم کر دیا۔ قرآنی نظام میں ان کا تصور تک باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نظام قائم نہ ہونے پائے۔

یہی کچھ آج سے چار پانچ ہزار سال پہلے ہوتا تھا۔ یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔

بات یہاں تک ہوئی تھی کہ فرعون کے اہل دربار نے اس سے کہا کہ (حضرت موسیٰؑ سے پٹنا ہمارا آپ کے بس کی بات نہیں۔ اسے مذہبی پیشواؤں سے بھڑا دیجئے۔ عوام مذہب پرست واقع ہوتے ہیں، یہ (مذہبی پیشوا) انکے جذبات کو بھڑکا دیں گے تو "عوامی تحریک" اسے (حضرت موسیٰؑ کو) سیلاب کی طرح بہا کر لے جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس مقام پر ہم فقط اتنا دیکھیں گے کہ فرعون اور اسکی قوم کی طرف سے اس دعوت کا استقبال کس طرح ہوا۔ قرآن کریم مختلف مقامات پر اس گوشہ کے متنوع پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ سورۃ الاعراف کی متعلقہ آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ سورۃ یونس میں ہے۔

قَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ قَبِیْنٌ ۝ (۱۰۶)

چنانچہ جب ان کے سامنے ہمارا وہ پیغام پیش کیا گیا جو سترتا ستر حق و صداقت پر مبنی تھا، تو انہوں نے یہ

کہہ کر اس سے انکار کر دیا، کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ اور باطل ہے۔

اس کا جواب حضرت موسیٰؑ کی طرف سے کیا ملا؟ فرمایا۔

قَالَ مُوسٰی اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَ کُمْ ۚ اَسِحْرٌ هٰذَا ۙ وَلَا یُفْلِحُ السَّحْرُوْنَ ۝

(۱۰۷)

موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ کیا تم اس حق کے متعلق جو تمہارے سامنے اس طرح پیش کیا جا رہا ہے، یہ کہتے

ہو کہ وہ جھوٹ اور باطل ہے۔ یاد رکھو! جن لوگوں کے دعوے جھوٹ اور باطل پر مبنی ہوتے ہیں، وہ کبھی

کامیابی کا منہ نہیں دیکھا کرتے۔ (اور تم دیکھ لو گے کہ میں اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوتا ہوں۔)

اسلاف پرستی | اس بصیرت افروز دلیل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن وہ، بجائے اس کے کہ حقیقت کو تسلیم کر لیتے، علم و عقل کی راہ چھوڑ کر، فوراً اس روش کی طرف

آگئے جسے ہم اہم سابقہ کے تذکرہ میں دیکھ آئے ہیں۔ یعنی اسلاف پرستی کا اندھا جذبہ!

قَالُوا أَجِئْنَا لَتُلْقِنَا عَمًّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونُ لَكُمُ الْكِبْرِيَاءُ فِي
الْأَرْضِ ط وَمَا نَحْنُ لَكُم بِمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۱۲)

(جو قانونِ خداوندی موسیٰؑ نے پیش کیا تھا، وہ لوگ، علم و براہین کی بنا پر تو اس کی تردید کر نہیں سکتے تھے، اس لئے انہوں نے وہی روش اختیار کی جو باطل پرستوں کے ہاں شروع سے چلی آرہی ہے)۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس مسلک سے برگشتہ کر دو جو ہمارے آباء و اجداد سے متواتر چلا آ رہا ہے؟ اور اس طرح ہمارے اقتدار کو ختم کر کے، مملکت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لو! (ہم تمہاری چالوں کو خوب سمجھتے ہیں، اس لئے) ہم تمہاری کوئی بات ماننے کے نہیں۔ اسلاف پرستی کی عقیدت اور قوت و حکومت کا نشہ، انہیں کس طرح چھوڑا جاسکتا تھا؟

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَمَسَّ لُبَّ ابْنِ إِسْرَءِيلَ إِذْ جَاءَهُمْ فَقَالَ
لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يُمُوسَىٰ مَسْحُورًا ۝ (۱۱۱)

ہم نے موسیٰؑ کو (قوم فرعون کی آخری تباہی سے پہلے) نوکھلی کھلی نشانیاں دی تھیں۔ (اے رسول! تم اپنی قوم مخاطب سے کہو کہ اگر یہ اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو) بنی اسرائیل سے دریافت کر لیں کہ ایسا ہوا تھا یا نہیں۔ (۱۱۲-۱۱۱ ذ ۲۷)۔ ہوا یہ تھا کہ جب موسیٰؑ قوم فرعون کی طرف آیا تو فرعون نے سب کچھ سُنے کے بعد، اس سے کہا کہ تم جو کہتے ہو کہ تم خدا کی طرف سے رسول ہو، تو اس باب میں یا تو تمہیں خود دھوکہ لگ گیا ہے۔ یا تم دوسروں کو دھوکا دیتے ہو۔ (۱۱۱)

(ان نشانیوں کا ذکر آگے چل کر آئے گا) دوسری جگہ ہے۔

فَتَوَلَّىٰ بَرَكْنَهُ وَقَالَ سِحْرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ (۱۱۰)

فرعون نے، اپنی قوت کے زعم میں، ان قوانین سے روگردانی کی، اور موسیٰؑ کے متعلق کہا کہ وہ یا تو بڑا

چالاک اور جھوٹا ہے، اور یا پاگل ہو گیا ہے۔

سچ ہے اوقات کے نشہ میں عقل و ہوش کی باتیں ایسی ہی نظر آیا کرتی ہیں۔ جیسے رنگین چشمہ سے ہر شے رنگ دار نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُ مَا أُنْزِلَ هَؤُلَاءِ إِلَّا رُبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِصَافِرٍ
وَإِنِّي لَا أَظُنُّكَ يُفْرِعُونَ مَثْبُورًا ۝ (۱۱۲)

موسیٰؑ نے اس سے کہا کہ تو (یقیناً) اپنے دل میں اس حقیقت کو پا چکا ہے کہ یہ قوانین و ضوابط جنہیں میں نے تمہارے سامنے پیش کیا ہے، مجھ پر خدائے ارض و سموات کے سوا کسی نے نازل نہیں کئے۔ (تم میرے متعلق کہتے ہو کہ مجھے دھوکا لگ گیا ہے) لیکن میں دیکھتا ہوں کہ دھوکے میں تم خود مبتلا ہو کہ تب اسی تمہارے سر پر منڈ لا رہی ہے، تم اس میں چاروں طرف سے گھر چکے ہو، (اور وہ تمہیں نظر نہیں آتی)۔

کس طرح نگلی لپٹی رکھے بغیر کہدیا کہ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی سے نظر آ رہا ہے کہ تمہاری ہلاکت کے دن قریب آچکے ہیں۔ غور کیجئے! یہ اس مستبد بادشاہ سے کہا جا رہا ہے جس کے نام کی نسبت سے دنیا میں سرکشی و عدوان متعارف ہے۔ یعنی فرعونیت، رعونت اور تکبر کی شدید ترین صورت کا نام بن چکی ہے۔ لیکن جو مرد خدا صرف قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے عواقب سے ڈرتے والا ہو، اس کے سینے میں کسی اور کا ڈر کیسے آ سکتا ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ، خوف تو شرک سے پیدا ہوتا ہے۔

ہر کہ رمز مصطفیٰؐ فہمیدہ است

شرک را در خوف مقہور دیدہ است

سورہ طہ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے تہایت مسکت دلائل سے واضح کر دیا کہ وہ کس خدا کے فرستادہ ہیں تو فرعون نے کہا

قَالَ أَجِئْتَنَا لِلتَّخْرِجِنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسُحْرِكَ لِيُؤْخَذَ ۝ (۲۰)

اُس نے موسیٰؑ سے کہا کہ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ اپنے باطل مذہب اور نگاہ

غریب دلائل کے زور سے، ہمیں ہماری مملکت سے نکال باہر کرے؟

سورۃ مومنین میں، مردارانِ حکومت کی طرف سے ایک ایسا جواب منقول ہوا ہے جو حقائق و معارف کی

ایک دنیا اپنے اندر رکھتا ہے

فَقَالُوا أَأَتُومِنَ الْبَشَرِ مِثْلَ مَا نَحْنُ عِبَادُ ۝ (۲۳)

انہوں نے (بجائے اس کے کہ جو کچھ ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس پر غور کرتے) کہا کہ کیا ہم ان کی بات مان لیں جو انسان ہونے کے اعتبار سے ہمارے ہی جیسے ہیں۔ (فوق البشر نہیں)۔ اور جہاں تک رتبہ اور درجہ کا تعلق ہے، وہ اُس قوم کے افراد ہیں جو ہماری محکوم ہے۔ (محکوم قوم کے پاس عقل و بصیرت کہاں ہو سکتی ہے؟ اور پھر انہیں یہ جبرأت کیسے ہو گئی کہ اپنی حاکم قوم کو آکر سبق پڑھانے لگیں! یہ ہمارے لئے سخت باعثِ ذلت ہو گا اگر ہم ان کی بات مان لیں)۔

پہلے حصہ میں ہے کہ کیا ہم ان پر ایمان لے آئیں جو ہماری ہی رسولوں کی بشریت پر اعتراض طرح کے دواں انسان ہیں! یہ وہ اعتراض ہے جو اس سے پیشتر

بھی ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ یعنی انسانوں کی عجوبہ پسند طبیعت اسے باور کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتی کہ انہی جیسا ایک انسان خدا کا رسول ہو سکتا ہے! یہی وجہ ہے جو تمام اقوام و ملل نے اپنے اپنے ”بانیانِ مذاہب“ کو انسانی کے مقام سے اٹھا کر، الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا اور پھر ان کی طرف ایسے ایسے ”طلسم ہوش رُبا“ کے سے افسانے منسوب کر دیئے جنہیں سُن کر انسان جاو کے جزیروں میں پہنچ جائے۔ یہی اعتراض قوم فرعون نے کیا۔

لیکن اس اعتراض کا دوسرا حصہ اور بھی زیادہ غور طلب ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا ہم محکوم کی بصیرت

ان کی بات مان لیں جو اُس قوم کے فرد ہیں جو خود ہماری محکوم ہے۔ غور کیجئے، حاکم قوم کی نفسیاتی کیفیت کو چند سادہ الفاظ میں کس قدر وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں، حاکم قوم کے نزدیک، محکوم قوم کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ قوم غالب کی ہر ادائیہ ایک شانِ محبوبیت ہوتی ہے جسے مغلوب قوم بلا سوچے سمجھے اختیار کئے جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہی اس قوم کا تمدن اور اس کی تہذیب بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس محکوم قوم کے خیالات، نظریات و مقصدات بھی وہی کچھ ہو جاتے ہیں جو حاکم قوم کے نزدیک قابلِ ستائش ہوں۔ وہ دیکھتی ہے تو ان کی آنکھوں سے، سنتی ہے تو ان کے کانوں سے اور سوچتی ہے تو ان کے دماغ سے لہٰذا قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أُذُنٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا (۱۲۹)۔ ”دل میں لیکن ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھنے

نہیں۔ کان ہیں مگر سنتے نہیں اُولَئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط (۱۰۹) ”یہ (انسان نہیں)۔ حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ“ اس لئے کہ اُولَئِكَ هُمْ الْغٰفِلُوْنَ ط (۱۱۲) ”یہ لوگ (اپنے مقام سے) بے خبر ہیں“

لیکن ان کے برعکس قوم غالب کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ بات ان کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ محکوم قوم کے ہاں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے اور سچ پرچھے تو وہ ایسا سمجھنے میں چنداں مورد الزام بھی نہیں قرار پاسکتے۔ ”درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے“ بھوکا اگر یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس دنیا بھر کے افلاس اور محتاجی کا حتمی علاج موجود ہے تو اسے کون ہوشمند بھیج تسلیم کرے گا؟ اس لئے جو قوم عملاً غلام ہو، اس کی بات پر اعتماد کون کر سکتا ہے۔ بقول حکیم الامتؒ

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی جسے زبیا کہیں آزاد بندے سے وہی زیبا
بھروسہ کو نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر کہ دنیا میں فقط مردانِ حرکی آنکھ سے پینا

آج کا مسلمان آئینہ کے سامنے | آج مسلمان حیران ہے کہ اسلام جب ایک حقیقت ثابت ہے تو اسے دنیا بے غل و غش قبول کیوں نہیں کر لیتی۔ لیکن یہ کہتے دقت وہ کبھی نہیں سوچتا کہ دنیا، اسلام کو اس کے پیش کرنے والوں کی حالت سے جانچتی ہے۔ جن پیش کردہ خیالوں کی حالت یہ ہو (جو ہماری آج ہے) تو ان کی بات سُننا کون پسند کرے گا، وہ جہاں بھی جائیں گے یہی جواب پائینگے کہ اَنْتُمْ مِنْ لِبَشَرٍ مِّثْلِنَا وَقَوْمُهُمْ لَنَا عِندُكُمْ كَمَا هُمْ لَكُمْ اَنْتُمْ مُنْظَرُونَ کیا ان کی بات پر ایمان لے آئیں جو دنیا میں انسان کہلانے کے بھی مستحق نہیں! اگر اس نسخہء کیمیا میں ایسا ہی جات بخش اثر ہے جیسا بتاتے ہیں تو ان کی اپنی حالت ایسی ناگفتہ بہ کیوں ہو رہی ہے؟ یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کا کوئی جواب بن نہیں پڑ سکتا۔ اسلام کو پیش کرنے کا حق اس قوم کو حاصل ہے جس کی اپنی حالت اسلام کے درخشندہ نتائج کی زندہ دلیل ہو۔ نہ کہ ان بھکاریوں کا جو اپنی روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے رحم و کرم کے محتاج ہوں۔ انہیں تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ منسوب کرنے سے بھی شرم آنی چاہیے کہ ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام جیسا مہر عالم تاب، گہن میں آ رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے کہ

”نا نداری از محمد رنگ و بو

از درد و خود میاں لانا م

کس قدر الم انگیز ہے یہ حقیقت جسے زبان و قلم کے بجائے خون کے آنسوؤں ہی سے بیان کیا جاسکتا ہے؟

احسانات کی یاد دہانی

پھر روٹئے اصل قسمہ کی طرف! سورہ شعراء میں اس واقعہ کے ضمن میں ایک اور ایسی بات آگئی ہے جو دنیا میں سیاست فرعونؑ کی اہم حقیقت اپنے آغوش میں لئے ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی جائے تو فرعون نے کہا کہ ”موسیٰ! تو، اور اس قسم کی بغاوت کی باتیں! حالانکہ تجھے یاد ہونا چاہیے کہ ہم نے کس ناز و نعمت سے تیری پرورش کی۔ اور پھر تو یہاں سے کتنا بڑا جرم کر کے بھاگ نکلا لیکن ہم نے اس پر بھی تجھ سے کوئی مواخذہ نہیں کیا۔ تو بڑا ہی احسان فراموش واقع ہوا ہے؟“

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلَيْدًا ۙ وَلَٰكِن تَقِفْنَا مِنْ عَمَلِكَ ۙ وَفَعَلْتَ
فَعَلَتِكَ الَّتِي فَعَلْتَ ۙ اَنْتَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ۝ (۲۶-۱۸)

فرعون نے موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰ! کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے بچپن سے اپنے ہاں تمہاری پرورش کی، اور تم نے اپنی عمر کا ایک حصہ ہمارے ہاں بسر کیا۔ تم رب العالمین کہتے ہو تمہاری پرورش تو خود ہم نے کی تھی۔ لیکن تم نے ان احسانات کا بدلہ یوں دیا کہ خود ہماری ہی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا — تم کیسے ناشکر گزار آدمی ہو؟

فرعون کے طعن کا دوسرا حصہ چونکہ حضرت موسیٰؑ کی ایک جرم کو منسوب کر رہا تھا اس لئے آپ نے پہلے اسی کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ

قَالَ فَعَلْتُهَا اِذَا وَاَنَا مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبْتَ
لِيَ رَبِّيْ حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (۲۶-۲۱)

موسیٰؑ نے کہا کہ — میں نے دانستہ اُسے قتل نہیں کیا تھا۔ میں نے تو اسے محض ایک مکار مارا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ ٹیکے سے مر ہی جائے گا (۲۸-۲۱) — (۲۶-۲۱)

اس کے بعد، میں یہاں سے اس لئے بھاگ گیا تھا کہ (مفتول تمہاری قوم کا آدمی تھا، اس لئے) میں ڈرتا تھا کہ (تم انصاف سے نہیں، بلکہ قومی عصبیت سے کام لو گے، اور میرے خلاف قتلِ عمد کا جرم عائد کر دو گے)۔

اس کے بعد، خدا نے مجھے نبوت سے سرفراز فرمایا۔ مجھے معاملات میں صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ اور میرا شمار، خدا کے رسولوں کے زمرہ میں کر دیا۔ اور اب میں اسی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔

”ہاں میں بھاگ گیا تھا! اس لئے نہیں کہ میں واقعی قتلِ عمد کا مرتکب تھا اور اپنے آپ کو اس جرم کا مجرم سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ تیرے ظلم و ستم اور تیرے اربابِ حکومت کی سازش سے ڈرتا تھا کہ ان کے اثر کی وجہ سے فیصلہ حق و انصاف کی رو سے نہیں بلکہ دیگر رجحانات و منفضیات کے مطابق ہونا تھا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ مجھے اللہ کی طرف سے عطا ہوا اس سے وہ تمام خوف دور ہو گیا۔ باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم لوگوں نے میری پرورش کی تو اس کے جواب میں، میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ

وَبَلَّغْتُ نِعْمَةً تَمَنَّيْتُهَا عَلَىٰ أَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَآءِ ۖ يٰٓأَيُّهَا

(باقی رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم نے بچپن میں میری پرورش کی اور محلات میں ناز و نعمت سے پالا۔ تو) تم اپنے ان احسانات کا بدلہ یہ چاہتے ہو کہ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھو! (تم نے ایک فرد پر جو احسانات کئے ہیں، انہیں تو جتانے ہو، لیکن اُس کی پوری قوم پر جو مظالم کو رہے، ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟)

غور فرمائیے: حضرت موسیٰ نے کیسی حقیقت کشاںات کہی ہے؟ مستبد حکومت کا سب سے بڑا حربہ یہ ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے چند ایک ممتاز افراد کو نوازی دہتی ہے تاکہ وہ اس کے خلاف لب کشائی نہ کر سکیں اور پھر ان کی ساری قوم کو محکومی کے شکنجے میں کسے رکھتی ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جس احسان کی طرف تم اشارہ کو رہے ہو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ تم نے قوم بنی اسرائیل کے ایک فرد کی پرورش کی اور اس کی قیمت اتنی وصول کو رہے ہو کہ ساری کی ساری قوم کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے؟ کیا اسی کا نام احسان ہے؟

✽

فرعون نے جب تمام باتیں سنیں تو بھانپ گیا کہ حضرت موسیٰ انقلابات کی کتنی دنیائیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سن لیا اور کھو۔

قَالَ لَئِنْ أَخَذْتُ إِلَهًا غَيْرِي لَا جَعَلَنكَ مِنَ الْمُسْجُونِينَ ۖ

لے اس سے لفظ اللہ کے معانی کس قدر واضح ہیں۔ یعنی صاحبِ اقتدار۔ حاکم۔ نہ کہ وہ جس کی پرستش کی جائے۔ (اسکی وضاحت سابقہ جلدوں میں کی جا چکی ہے۔)

(اب فرعون سے نہ رہا گیا۔ اُس نے طیش میں آکر موسیٰؑ سے کہا کہ اپنی زبان گرو اور کان کھول کر
 سن لو کہ اگر تم نے (میری مملکت میں رہتے ہوئے) میرے سوا کسی اور کو صاحبِ اقتدار تسلیم کیا
 (خواہ وہ تمہارا خدا ہی کیوں نہ ہو، تو یہ کھلی ہوئی بغاوت ہوگی، جس کی پاداش میں) تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔
 حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس، میرے دعوے کے ثبوت میں واضح دلائل موجود ہوں تو کیا تو پھر
 بھی اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہے گا؟

قَالَ اَوْ لَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ ﴿۲۶﴾

موسیٰؑ نے کہا کہ اگر میں اپنے دعوے کی تائید میں کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آؤں (تو کیا تم پھر بھی
 مجھے قید کر دو گے؟ کیا تم معاملہ کو دلائل و براہین کی روش سے، طے کرنے کے بجائے، دھاندلی سے
 کام لینا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے ہاں استبدادِ فرعون کی کے علاوہ اور کوئی قانون نہیں؟)
 فرعون نے کہا

قَالَ فَاتِّبِعْ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

(اس جواب سے فرعون کچھ جھینپا، اور موسیٰؑ سے) کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو لاؤ میں بھی
 دیکھوں، وہ کون سی نئی بات ہے جسے تم پیش کرنا چاہتے ہو؟



عصا اور یدِ بقیعہ کے الفاظ پہلے بھی آچکے ہیں جہاں کہا گیا تھا کہ ان الفاظ کے مجازی معانی کی تشریح اس مقام پر
 کی جائے گی جہاں حضرت موسیٰؑ کے 'ساحرین' و بارِ فرعون کے ساتھ مقابلہ کا منظر سامنے آئے گا۔ وہ مقام اب آ رہا
 ہے اس لئے، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان الفاظ کی تشریح کر دی جائے۔

عصا کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۲۴۵) میں بیان کیا جا چکا ہے جہاں بتایا گیا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی
 معانی جمعیت اور اختلاف کے ہیں۔ یعنی قوت اور محکمیت کے ذرائع اور اسباب۔ اسی جہت سے یہ لفظ جماعت
 کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور لاکھمی کو بھی اسی لئے عصا کہا جاتا ہے کہ وہ تقویت اور سہارے کا ذریعہ ہوتی
 ہے۔ طبعی طور پر تو لاکھمی سہارے کا موجب بنتی ہے لیکن جب یہ لفظ معنوی اعتبار سے مستعمل ہوگا تو اس سے مراد محکم
 دلائل ہوں گے جو مدعی کے لئے سہارے کا موجب ہوں گے۔

البتہ (ہاتھ) کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، جس طرح ہمارے بیان "ہاتھ" لفظ "یا فارسی میں دست

اور انگریزی میں (HAND)۔ طبعی طور پر اس کا مطلب پانچ انگلیوں والا پنجہ (ہاتھ) ہوتے ہیں، لیکن مجازی طور پر اس سے مراد ہر قسم کی قوت اور گرفت ہوتی ہے۔

البیاض (بیضاء) کے بنیادی معنی سفیدی کے ہیں لیکن چونکہ عربوں کے ہاں بَيَاضُ (سفید) افضل ترین رنگ تھا اس لئے وہ جملہ خصال حمیدہ اور صفات کریمہ کو بیاض سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ جو شخص کسی عیب کے ساتھ آلودہ نہ ہوا اسے ابیض الوجد کہتے تھے۔ اسی لئے اس کے معنی بے داغ کردار اور روشن سیرت لئے جاتے تھے۔ جب یہ لفظ دلائل اور براہین کے لئے آئے گا تو اس سے مراد نہایت محکم، روشن اور درخشاں دلائل ہوں گے جن میں کوئی سقم نہ ہو۔ عربوں کے ہاں اَلْيَدُ الْبَيْضَاءُ روشن اور واضح دلیل کو کہتے تھے (دیکھئے لغات القرآن۔ عنوان (ب۔ ی۔ ض)۔ یہی اس کے مجازی معانی ہونگے۔

سحر (ساحرین) کے متعلق، مطالب الفرقان جلد دوم میں تفصیلی بحث آچکی ہے۔ اس کے عام معانی توجادو کے ہیں لیکن اس کا استعمال ہر باطل عقیدہ یا فریب کارانہ مسلک کے لئے ہوتا ہے۔ قدیم مذاہب میں مذہبی پیشوا اپنے تقدس اور مقام الوہیت کو ساحرانہ شعبہ کاریوں کے بل بوتے پر قائم رکھتے تھے اس لئے ساحرین کا لفظ مذہبی پیشواؤں کے لئے بھی بولا جاتا تھا۔ پھر ان مذہبی پیشواؤں کا، نظم و نسق حکومت میں بھی بڑا عمل ہوتا تھا اس لئے بلند تہذیب مذہب اور ایمان حکومت بھی ساحرین کہلاتے تھے۔ فرعون کے ہامان کو دیکھئے۔ وہ صرف مذہبی پیشوا ہی نہیں۔ ان کے جنود (لشکر) بھی ہیں۔ نیز وہ شعبہ عمارت مملکت کا بھی مقتدر اعلیٰ تھا۔ لہذا جب فرعون نے فیصلہ کیا کہ (حضرت) موسیٰؑ کا مقابلہ ساحرین سے کوایا جائے تو اس سے مراد جادو گروں کے ساتھ مقابلہ نہیں تھا۔ ان بلند پایہ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مقابلہ مقصود تھا جو حیطہ حکومت میں بھی اعلیٰ مناصب رکھتے تھے۔ اسی سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ حضرات انبیاء کرامؑ (معاذ اللہ) جادو گر نہیں ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے جادو اور جادو گروں کی شدید مذمت کی ہے۔ اسی لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ حضرت موسیٰؑ اور ساحرین دربار فرعون کے مابین مقابلہ جادو گری کا تھا۔ حضرات انبیاء کرامؑ پیغام حق کے داعی ہوتے تھے اور باطل پرستوں سے ان کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس مقابلہ کی بنیاد دلائل و براہین (بینات اور آیات خداوندی) پر ہوتی تھی، اور انہی کی رو سے وہ باطل پرستوں پر غالب آتے تھے۔ یہ حضرات اپنے مخالفین کو چیلنج ہی یہ دیتے تھے ہاؤ
بَرِّهَا نَكْمَرِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۷) اگر تم اپنے دعوے میں پے ہو تو اس کی تائید میں دلائل پیش کرو۔
بنابرین حضرت موسیٰؑ اور فرعونؑ مذہبی پیشواؤں میں مقابلہ حق و باطل کے دعاوی کا تھا جس کی تائید اور تردید

دلائل کی رو سے ہونی تھی۔ قرآن کریم نے اس کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں انہیں ان کے مجازی مفہوم میں لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو ایک پیغمبر کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ اپنی دعوتِ حق کو جادو کے زور سے منوائے جو کہ تو بلکہ جادو، اور اسی نوعیت کی دیگر توہم پرستیوں کو مٹانے کے لئے آتا تھا۔ دین کی عمارتِ علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے، نہ کہ طلسمانہ جہالت اور شعبدہ کارانہ فریب کاریوں پر، اس سلسلہ میں، مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں (انڈکس کے حوالوں کی رو سے) معجزات کا عنوان دیکھئے۔ ————— ہاں خصوص جلد چہارم میں حضرت عیسیٰ کے مبینہ معجزات کا عنوان۔

ان حقائق کی روشنی میں، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہم نے ان الفاظ کے مجازی معانی کیوں لئے ہیں یہاں ہمہ جو حضرات ان الفاظ کے حقیقی معانی سے مطمئن ہیں، وہ بخوشی وہی معانی اختیار کریں۔ میری ان سے کوئی بحث نہیں۔



سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم اپنے دعوے کی تائید میں کوئی دلائل رکھتے ہو تو انہیں پیش کرو۔

فَأْتِنِي عَصَاةً فَإِذَا هِيَ تَعْبَانُ مُبِينٌ ۖ وَلَا تَزَعِ يَدَہُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّظِيرِينَ ۝

(۲۶-۳۳)

اس پر موسیٰؑ نے وہ قوانین و ضوابط پیش کئے جو اسے خدا سے ملے تھے اور جنہیں وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ یہ قوانین و ضوابط کیا تھے، گویا ایک اڑدھاتھا جو باطل معقذات کو نکلے جا رہا تھا۔ (ان کی رو سے

بتایا گیا تھا کہ اہل فرعون کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا۔ ۱۰۸-۱۰۹ / ۲۶-۲۷ / ۳۱-۳۲)

اس کے بعد موسیٰؑ ان بلائیںِ نیرہ کو سامنے لایا جن کی رو سے واضح کیا گیا تھا کہ تو انہیں اللہ کی اطاعت سے ان کا مستقبل کس قدر روشن ہو جائے گا۔ ان دلائل کی دلخندگی اور تباہی کی ہر دیدہ بینا کو صاف نظر آ رہی تھی۔

اس پر فرعون نے اراکینِ سلطنت سے کہا

قَالَ لِمَلَا حَوْلَهُ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلِيمٌ ۖ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ قَاطِعًا تَأْمُرُونَ ۝

(۲۶-۳۵)

اس پر فرعون نے اپنے اہل دربار (مردانِ قوم) سے کہا، کہ یہ شخص یقیناً ایک ماہر سحر کار ہے جو

جھوٹ کو سچ بنا کر دکھاتا چلا جا رہا ہے۔

اس کا ارادہ یہ نظر آتا ہے کہ یہ اپنی فریب کاریوں سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر، یہاں اپنی حکومت قائم کرے اور تمہیں اس ملک نکال باہر کرے۔ سو بتاؤ کہ تمہارا اس باب میں کیا مشورہ ہے؟
(۱۱۲)

یہ تمہارا دین بدل دے گا (یعنی نظام حکومت)۔ (۱۱۲) (۱۱۳)
میں ان کے ابناء کو قتل کر دوں گا — (۱۱۲) (۱۱۳)
انہوں نے کہا۔

قَالُوا أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَأُبْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ لِحَشِرِينَ ۖ يَا تَوَكُّلْ بِكُلِّ سَحَابٍ
عَلَيْهِمْ ۝ (۱۱۲-۱۱۳)

انہوں نے کہا کہ (ہمارا خیال یہ ہے کہ) ہر دست موسیٰ اور اس کے بھائی کے معاملہ کو معرض التوا میں رکھو، اور مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں ہر کار سے بھیج دو کہ وہ مختلف میدانوں سے، باہرین سحر کار پر ہتوں کو تمہارے پاس بلا لائیں۔

اس سلسلہ میں سورۃ الاعراف کی جو آیات پہلے گزر چکی ہیں ان میں کہا گیا تھا کہ اگر باب حکومت نے باہمی مشورہ کیا اور پھر فرعون سے کہا کہ پیشواؤں کو جمع کراؤ۔ یہاں فرمایا ہے کہ اراکین سلطنت سے پوچھا تو انہوں نے ایسا مشورہ دیا۔ بات ایک ہی ہے۔ فرعون نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے باہمی مشورہ کیا۔ اور فرعون کے سامنے اپنی تجویز پیش کر دی۔ سورۃ نمل میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ قوم فرعون کے لوگ حضرت موسیٰ کی صداقت و حقانیت کے دل سے قائل — ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی ضد اور قوت و حکومت کے نشہ کی بدستی کی بنا پر انکار کئے جا رہے تھے۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ أَيْتَانَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۖ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا
أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۱۱۲-۱۱۳)

لیکن جب اس قوم کے پاس ہمارے اس قدر بصیرت افروز احکام آئے، تو بجائے اس کے کہ وہ لوگ ان پر ایمان لے آتے، اُلٹا کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ موسیٰ کو خدا نے یہ احکام دے کر ہماری طرف بھیجا ہے، اور اگر ہم نے انہیں نہ مانا تو ہم پر تباہی آجائے گی۔

حالانکہ انہیں دل میں یقین ہو چکا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں، لیکن انہوں نے محض اپنی سرکشی اور تکبر کی بنا پر ان سے انکار کر دیا۔ سو تم دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے انسانی معاشرہ میں اس طرح فساد برپا کر رکھا تھا (انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنا، عدالت خداوندی میں سب سے بڑا جرم ہے)۔

غور کیجئے۔ قرآن کتنی بڑی حقیقت، دو لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ باطل اور فریب کی بنیادوں پر بڑا بننے کا جذبہ انسان میں ایسی ذہنیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ان حقائق سے جس کی صداقت کا وہ دل سے قائل ہوتا ہے اس لئے انکار کئے جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کی بیٹی ہوگی اور اس سے دوسروں کی نظروں میں خفیف ہونا پڑے گا۔ ظلم و استبداد کی رو سے حاصل کردہ عزت و شوکت کی حقیقت ملمع کی سی ہوتی ہے جس کا رنگ ایک تاؤ دینے سے فنی ہو جاتا ہے۔ عزت و عظمت وہی پایدار ہوتی ہے جو حق پر مبنی معتقدات اور حسن کردار اور پاکیزگیِ ضمیر کی بنا پر حاصل ہو۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس لئے ان کا شیوہ یہ ہونا ہے کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں مردانہ و اداس کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک بات کو دل سے مانیں لیکن مصلحت یعنی کی بنا پر اسے زبان پر نہ لائیں یا زبان سے وہ کچھ کہیں جو ان کے دل میں نہ ہو۔ دل اور زبان کی ہم آہنگی ان کے کردار کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔

آئیں جواں مرواں، حق گوئی و بیباکی اللہ کے بندوں کو آتی نہیں رو باہی

قوم فرعون کی لپٹی کر دار دیکھئے۔ طبعی طور پر بدبہ اور طوطہ کا یہ عالم کہ ایک قوم کی قوم کو اپنے منہ کی گھٹ میں لے رکھا ہے۔ اور کیر کیڑ کی کردری کی یہ کیفیت کہ ایک بات کو صحیح مانتے ہیں لیکن مصلحت یعنی کی بنا پر اسے زبان پر لانگی ہمت نہیں پاتے۔ اس قسم کی روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

افسوس صد ہزار سخن ہائے گفتنی خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ان لوگوں کی دوں فطرتی اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ جب ان سے فریقِ مقابل کے دلائل کا جواب نہیں ہی پڑتا تو یہ استخفاف اور استہزاء پر اتر آتے ہیں۔ (جیسا کہ مطالب الفرقان جلد اول ص ۲۴ پر لکھا جا چکا ہے) یہ دنائت اور کینگی کی انتہا ہوتی ہے۔ چنانچہ جب فرعون اور اس کے ایمانِ سلطنت کے پاس حضرت موسیٰؑ کے دلائلِ باہر کا کوئی جواب نہ رہا تو وہ اس حربہ پر اتر آئے۔ فرمایا

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ۝ (۲۳-۲۴)

(مثلاً) ہم نے موسیٰؑ کو، اپنے قوانین خداوندی دے کر، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔

اُس نے اُس سے کہا کہ مجھے خدائے رب العالمین نے تمہاری طرف بھیجا ہے ۔

جب اُس نے اُن کے سامنے قوانین خداوندی کو پیش کیا تو وہ اُن کا مذاق اڑانے لگے ۔

سورۃ قصص میں ہے ۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرٍ وَمَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ﴿٢٨﴾

چنانچہ جب موسیٰؑ ہمارے قوانین کو لے کر اُن کے پاس گیا تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ یہ سب جھوٹ پر مبنی من گھڑت باتیں ہیں ۔ ہم نے ایسی باتیں اپنے آباء و اجداد سے کبھی نہیں سُنیں ۔ (اس لئے ہم انہیں ماننے کے لئے تیار نہیں)۔

اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا :-

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنۡ جَاءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنۡدِهٖ وَمَنۡ تَكُوْنُ لَهُۥ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يَفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ ﴿٢٩﴾

موسیٰؑ نے کہا کہ (یہ بھلا کون سی دلیل ہے کہ چونکہ یہ باتیں تم نے اپنے آباء و اجداد سے نہیں سُنیں ، اس لئے یہ سب جھوٹ ہیں ۔ باقی رہا تمہارا یہ اعتراض کہ میں نے یہ باتیں اپنی طرف سے خود وضع کی ہیں اور انہیں منسوب کر رہا ہوں خدا کی طرف ۔ تو تم ان باتوں کو پرکھ کر دیکھو کہ یہ کیسی ہیں ۔ جہاں تک اُن کی منجانب اللہ ہونے کا تعلق ہے) میرا نشو و نما دینے والا خوب جانتا ہے کہ کون فی الواقعہ اس کی طرف سے قوانین لے کر آتا ہے ۔ (اور کون اس کی طرف غلط باتیں منسوب کرتا ہے ۔ نیز وہ یہ بھی جانتا ہے کہ) انجام کار کامیابی کس کی ہوگی ۔ اس لئے کہ اُس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اُس کے قوانین سے سرکشی برتیں ، (یا اُس کی طرف غلط باتیں منسوب کریں) وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

اس کے جواب میں فرعون نے اراکین سلطنت سے کہا ۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمۡ مِنۡ اِلٰهٍ غَيْرِیْؕ قَا وَقَدْ لِيۤ اِلٰهَ مَنۡ عَلٰی الطَّيۡنِ فَاجْعَلۡ لِّيۤ صُرْحًا عَلَیِّ اَظْلَمۡ اِلَیۤ اِلٰهٍ مُّوسٰیؕ وَاِنِّیۡ لَآظُنُّهُۥ مِنَ الْكٰذِبِیۡنَ ﴿٣٠﴾ (نیز ۳۱-۳۴)

فرعون نے اپنے اہل دربار سے کہا کہ (موسےؑ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض "مذہبی" گفتگو نہیں ۔ یہ تو گہری

سیاست ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اقدار و اختیار، سروری اور ماکیت سب خدا کے لئے ہے۔ کسی اور کے لئے نہیں۔ لیکن، میں اپنی مملکت میں، تم لوگوں کے لئے، اپنے اقدار و اختیار کے سوا کسی کا اقتدار نہیں جانتا۔ اس کے بعد اُس نے ہاتھ سے استہزاء کہا کہ یوں کہو کہ پڑا وہ میں انیٹیں پکاؤ۔ پھر ان انیٹوں سے میرے لئے ایک بہت بلند محل تعمیر کراؤ تاکہ میں اُس پر چڑھ کر، موسیٰؑ کے خدا تک پہنچوں اور دیکھوں کہ وہ کیسا ہے!

بہر حال، میں اسے، اس کے دعویٰ میں جھوٹا سمجھتا ہوں، اس لئے اس کی کوئی بات ماننے کے لئے

تیار نہیں ہوں۔ (۲۸/۳۸) نیز (۳۰/۳۷) اور (۳۱/۳۶)۔

بہر حال، فرعون نے سب کچھ دیکھنے سمجھنے کے باوجود، حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کی۔ استہزاء پر اتر آیا اور ان اصولوں سے سرکشی برقی جن کی طرف آپ دعوت دے رہے تھے۔ سورۃ نازعات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے ارشاد فرمایا تھا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور

فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلَّا أَنْ تَزُكَّىٰ ۖ وَأَهْدِيكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ ۖ (۴۹/۱۸-۱۹)

اُس سے کہو کہ (تم نے دولت اور قوت بہت جمع کر رکھی ہے، لیکن اپنے مقام انسانیت کے متعلق تم نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں)۔ کیا تو چاہتا ہے کہ تیرے شرف انسانیت کی بھی نشوونما ہو جائے؟ اور میں تجھے وہ راستہ بتاؤں جو تمہیں خدا کی ربوبیت عامہ کی طرف لے جائے۔ اس سے یہ کچھ کہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے اُس کا احساس شرف انسانیت بیدار ہو جائے، اور وہ اپنی موجودہ روش سے، جو اسے تباہیوں کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے، رُک جائے۔ (اس سے کم از کم اتمام حجت ہی ہو جائے گا)۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ اس کی طرف گئے اور فارسیہ الْكُذْبَىٰ ۖ (۴۹/۲۰) ”زندگی کا بلند و بالا اصول اس کے سامنے پیش کیا۔ لیکن فرعون نے اس کی تکذیب کی اور حضرت موسیٰؑ کی دعوت انقلاب سے سرکشی برقی۔ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ (۴۹/۲۱) اور منہ پھیر کر چل دیا۔ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَىٰ ۖ (۴۹/۲۲)۔ اور اپنی رعایا کو جمع کیا اور منادی کرادی۔ فَخَشَرَ فَنَادَىٰ ۖ (۴۹/۲۳)۔ کیا منادی کرانی؟ یہ کہ یاد رکھو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ۖ (۴۹/۲۴)۔ میں تمہارا ”اُن وَا“ ہوں۔ سو یاد رکھو، میرے سوا کسی کی بات نہ ماننا۔ سورۃ زخرف میں اس ”منادی“ کی مزید تفصیل دے دی گئی ہے۔

وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يُقَوْمُ أَلَيْسَ لِي مُلْكٌ مِّصْرَ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ

تَجْرِي مِنْ تَحْتِيْ ۖ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَّا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۗ وَلَا يَكَاذِبِيْنَ ۝ فَلَوْلَا اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنَيْنِ ۚ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُۥ فَاَطَاعُوْهُ ۚ اِنَّهُمْ كَاٰلُ قَوْمٍ فَاسِقِيْنَ ۝ (۲۳-۵۱)

(فرعون، اس انقلابی تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اس قدر خائف تھا کہ وہ ملک میں اس قسم کے اعلانات کرتا رہتا تھا کہ اے میری قوم! کیا میں ملکیت مصر کا مالک نہیں ہوں؟ کیا یہ نہریں، جو میرے انتظام کے تحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں ہیں؟ کیا تم ان باتوں پر غور نہیں کرتے؟)

(۲۳-۵۱) کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں اس شخص کے مقابلہ میں کس قدر بہتر اور برتر ہوں، جو ہماری محکوم قوم کا ایک فرد ہے، اس لئے نہایت پست اور کمزور۔ پھر یہ ایسا دہقان اور گنوار ہے کہ اسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ (۲۳-۵۱)

اگر اس کے خدا نے اسے اتنے بڑے اقتدار کا مالک بنانا تھا تو اسے، سرداری کے امتیازی نشان کے طور پر، سونے کے لنگن کیوں نہ دیئے گئے۔ یا اس کے جلو میں صفت و وصف فرشتے کیوں نہ بھیجے گئے۔ چنانچہ وہ اس قسم کے پراپیگنڈہ سے اپنی قوم کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا رہا تا کہ وہ سمجھ سوج سے کام نہ لے سکیں بلکہ اندھا دھند اس کی اطاعت کرتے رہیں۔ لیکن حق بات تو یہ ہے کہ وہ قوم خود ہی غلط راستوں پر چلنا چاہتی تھی۔ (ورنہ اگر قوم صحیح راستے پر چلنا چاہے تو مستبد قوتوں کی طرف سے اس قسم کا پراپیگنڈہ اسے متاثر نہیں کر سکتا)۔

ان آیات پر غور کیجئے اور پھر تصور میں لائیے ان ہدایت کو جن سے متاثر ہو کر اس نے یہ اعلان کیا ہوگا۔ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكٌ مُّضَرٌّ ۙ کیا یہ مملکت مصر (اور اس کی حکومت) میری نہیں؟ کیا اس کے دریا اور نہریں میرے قبضہ میں نہیں؟ کیا تم یہ کچھ نہیں دیکھ رہے؟ قوت و شوکت کے سب سامان ایک طرف اور دوسری طرف (نقل کفر، کفر نباشد) یہ ذیل و کمزور سا انسان، جو اچھی طرح (مہذب انسانوں کی طرح) بات بھی نہیں کر سکتا جس کے پاس ایک پیسہ تک نہیں۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر یہ سچا ہے تو اس کے جلو میں آسمان کے فرشتوں کے پرے کیوں نہیں؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی اس کی بات نہ سنے اقوام کی کیا مجال تھی جو اس فرعونی حکم سے سرتابی برتنی (حالانکہ جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے۔ وہ دل سے حضرت موسیٰ کی صداقت کے معترف تھے) اس قوم نے اپنے بادشاہ

ہی کی اطاعت کی۔ اس لئے کہ قوم بھی تو ویسی ہی تھی جیسا خود فرعون۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ ۝

پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کس قدر گہرا خطرہ پیدا کر دیا تھا جس کے پیشِ نظر فرعون کو ایسے اعلانات کی ضرورت پڑی۔ خود فرمایا آپ نے کہ ایک داعی انقلاب، رسولِ برحق، کی آواز میں کس قدر زلزلہ انگیز کڑک ہوتی ہے کہ وہ دلوں کی بستیوں کو ہلا دیتی ہے۔ دنیا میں علمبردارانِ حق و صداقت کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ غیر خدائی نظامِ ہائے زندگی میں ایسا زلزلہ پیدا کر دیں کہ ہر طاغوتی قوت بلبلا اٹھے!

پھر اس نکتہ کی طرف بھی آپ نے توجہ کی کہ فرعون نے کہا کہ اگر یہ شخص صاحبِ حشمت و دولت ہوتا تو بھی اس کی بات سن لی جاتی! لیکن یہ ”غیر مہذب“، ”مافلس و نادار انسان“ اور ”عوئی“ اس قدر بلند آہنگ! یعنی اسی ساز کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم قومِ نوح کے زمانہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں!

جیسا کہ ہم شروع سے بناتے چلے آ رہے ہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا مطیع و محکوم بنانے کا طریقہ یہ ہے انہیں ”روٹی“ کا محتاج کر دیا جائے۔ مستبد قوتوں کی عمرانی کارِ راہی اسی میں ہوتا ہے کہ وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں اور پھر بھوکے لوگوں سے جو چاہے منوائی اور کراتی ہیں۔ فرعون نے اپنے اعلان میں یہی دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو تم پر رزق کے سب دروازے بند کر دیئے جائیں گے، اور یہ شخص (حضرت موسیٰؑ) تمہیں ایک وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکے گا کیونکہ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں! سرکس کے شیر کو بھوکا مار بیٹے اور پھر اس سے جو چاہے کر ایٹھے!



قوتِ کلیمی

فرعون نے اپنی بوکھلاہٹ میں یہ سب کچھ کہا لیکن، بایں ہمہ، اسے خطرہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دلنشِ تعلیم اور اس کی تائید میں ایسے واضح دلائل کہیں عوام کو متاثر نہ کر دیں۔ اس لئے اس نے اس کا علاج بھی سوچا کہ اپنی قوم کے پیشوا یا مذہب کے ساتھ اس کا مناظرہ کرایا جائے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ باوجود اپنی (بظاہر) بے سرو سامانی کے حضرت موسیٰؑ اپنے اندر کتنی بڑی قوت رکھتے تھے کہ فرعون کو یہ جرأت نہیں پڑی کہ انہیں پکڑا کر قتل کر دے یا قید کر دے۔ سیرتِ بلند کی قوت بے پناہ ہوتی ہے۔ محکوم قوم ہی کیوں نہ ہو، اسے ایک کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر سرکشی و استبداد کی سب قوتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وہ کلیم جس کے متعلق کہا ہے کہ

مردِ حُسرِ محکم نہ زورِ لا تحف
پادشاہاں در قباہائے حُسر
ما بیدار سرِ مجیب اور سرِ یکف
زورِ روانہ سب ہم آں عریاں فقیر (اقبال)

بہر حال، فرعون نے حکم دیا کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں کو اکٹھا کیا جائے۔ اب حق و باطل کی کشمکش کا ایک نیا میدان سامنے آیا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔

وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجَلٌ إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ۝

۱۱۳

چنانچہ ان کے مذہبی پیشوا (ہامان اور اس کے ساتھی پروہت) فرعون کے پاس جمع ہو گئے۔ انہوں نے اُسے کہا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آ گئے تو ہمیں اُمید ہے کہ ہمیں اس کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ (مذہبی پیشواؤں کے پیش نظر ”اہمیت“ ہوتی ہے، حق کا بول بالا کرنا نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ مذہب پرستی اُن کا پیشہ ہوتا ہے، لہذا ذریعہ معاش)۔ (۲۴/۱۱۳)

فرعون نے کہا۔

قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝

۱۱۴

فرعون نے کہا ”ضرور ملے گا، اور تم سب میرے مقربوں کی صف میں داخل ہو جاؤ گے۔“
اس سے بڑا انعام اور کیا حاصل ہو سکتا تھا کہ بادشاہ کا تقرب حاصل ہو جائے۔

قبل اس کے کہ ہم اس رزمگاہِ حق و باطل کا منظر سامنے لائیں، ایک اہم وضاحت ضروری ہے۔ آیت (۲۸/۱۱۳) میں لکھا جا چکا ہے کہ فرعون نے ہامان سے کہا کہ ایک پختہ محل بناؤ تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو آسمان پر جھانکوں۔ اس کے علاوہ ہامان کا ذکر ان آیات میں بھی آیا ہے (۲۸: ۶، ۲۹: ۲۹، ۳۴: ۳۴، ۴۰: ۲۱) جو کہ متعلق ہیں اپنی کتاب ”برقِ طور“ میں بھی لکھا ہے لیکن اس کا یہاں دھڑنا ضروری ہے۔

تعدادات (عبدعتیق) کی کتاب آستر میں ایک ہامان کا ذکر آیا ہے جو ایران کے شاہنشاہ، انیسویں صدی کے دربار میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ وہ یہودیوں کی نسل کشی کے ورپے تھا لیکن شہنشاہ کی محبوبہ آستر نے بادشاہ کو اس طرح اپنے دامِ فریب میں پھنسا دیا کہ اس نے خود ہامان کو حوالہ در در سن کر دیا۔ یورپ کے بعض متعصب مسیحیوں نے یہ یہودہ اعتراض کیا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے (معاذ اللہ) ایران کے ہامان کا قہقہہ سن کر اسے فرعون مصر کی داستان کے ساتھ چکا دیا ہے لیکن حق کی قوت ملاحظہ ہو کہ وہیں کے تاریخ کے محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ (۱) تورات میں شامل کتاب آستر اور اس میں مذکور ہامان کی کہانی سب جعلی ہے۔ اور (۲) جس ہامان کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس تحقیق کا ملخص یہ ہے کہ آسن (سورج کا دیوتا) مصر میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا، اور اس کے مندر کا اعلیٰ پجاری شان و شوکت کے بلند ترین مقام پر فائز تھا۔ یہی آسن رع قرآن کا ہامان ہے۔ جیسے تورات کا آرون

لے لفظی معنی جادوگر ہیں۔

(AORON) تفسیر لفظی سے قرآن کریم میں بادون ہو گیا۔ ڈاکٹر سٹینڈورف (STEINDORFF) اپنی کتاب (THE RELIGION OF THE ANCIENT EGYPTIANS) میں ہامان کے متعلق لکھتا ہے۔

آمن دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اول (یعنی سب سے بلند مرتبہ کاہن) کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی تھا۔ مندر کی عالی شان عمارت اور ان کی زیبائش و آرائش کا نظم و نسق اسی کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج، یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خوازا کی نگرانی اور انتظام کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اسکے پجاری اس کے دائرہ اقتدار میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور مغربی مصر کے تمام منادر کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی ہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے آمن کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم سویں آبادی پر اس کی حکومت تھی۔

اسی محقق نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جرمنی میں مصر کا ایک قدیم مجسمہ ہے جس پر نقش ہے کہ وہ آمن کے سردار کاہن یکن خونس کا ہے جو فرعون، رع تیس ثانی کے زمانے میں تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں (تحت لفظ مصر) مذکور ہے کہ فرعون مصر کے اٹھارہویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اہمیت اختیار کر لی تھی اس خاندان کے زمانے میں آمن رع (واقعہ تھیبس) کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ہو چکے تھے جن کی وجہ سے وہ بے حساب دولت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر (BREASTED) نے بھی اپنی کتاب (A HISTORY OF EGYPT) میں لکھا ہے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ہوتا تھا۔ (حوالوں کے لئے دیکھیے برق طور۔ عنوان ہامان)۔ ان خفائی کی روشنی میں ان قرآنی آیات کا مفہوم آسانی سمجھ میں آ جاتا ہے جن میں ہامان کا ذکر ہے۔ (واضح رہے کہ حیرت منگ مندر کے شہنشاہوں کا نام نہیں بلکہ لقب فرعون تھا اسی طرح آمن رع کے سب سے بڑے پجاری کا لقب ہامان تھا)۔



ان تصریحات کے بعد، ہامان (آمن رع) کے جنود (یعنی پجاریوں کی فوج کے دستے) اور صاحب ضرب کلیم کے مقابلہ کی طرف آئیے۔

سورہ ظہر میں ہے کہ اس معرکہ کے لئے جشن کا دن مقرر کیا گیا تھا اور ذرا دن چڑھے کا وقت نہ تاکہ لوگ ضرورت سے فارغ ہوں اور جمع زیادہ رہے۔ اہل فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا۔

فَلَنَأْتِيَنَّكَ سِجْرٌ مِّثْلِهِ فَأَجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا
أَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمَ الزَّيْنَةِ وَأَنْ يُخَشِّرَ النَّاسَ حُشًى ۝

(۲۰/۵۸-۵۹)

اگر یہی بات ہے تو ہم تیری سحر طرازیوں کا جواب، سحر طرازیوں سے دیں گے (اس کا جواب ہمارے مذہبی پیشوا
دیں گے)۔ سو تو، ہمارے اور اپنے درمیان مقابلہ کے لئے ایک دن مقرر کر لے۔ اس کی خلافت و زری نہ ہم کریں،
نہ تم کرو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان یہ مقابلہ برابر کی سطح پر ہوگا۔

موسیٰؑ نے کہا کہ بہت اچھا۔ تمہارے مقابلہ کے لئے جس کا دن مقرر ہوا۔ دن چڑھے لوگوں کو اکٹھے ہونا

چاہیے۔

چنانچہ معاملہ طے کر کے، فرعون ان سے الگ ہوا اور اب اپنی تدابیر کی تکمیل کی فکر کرنے لگا۔

فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ شَعْرًا ۝ (۲۱/۲۰)

اس فیصلہ کے بعد فرعون نے اُن کی طرف سے توجہ ہٹائی۔ اپنی تمام تدابیر کو یک جا جمع کیا، اور مقررہ وقت
پر مقابلہ کے لئے آگیا۔

جب مقابلہ کا دن آیا تو حضرت موسیٰؑ نے مجمع کو (یا ان کے مذہبی پیشواؤں کو) مخاطب کر کے کہا۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ وَيُذَكِّرُ أَهْلَ اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْجَنُكُمْ بَعْدَ آيَةٍ وَقَدْ خَابَ
مَنْ اخْتَلَا ۝ (۲۱/۲۱)

(جو مذہبی پیشوا، موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے بلائے گئے تھے) موسیٰؑ نے انہیں مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! تم
تباہ ہو جاؤ گے۔ تم خدا کے خلاف افترا پردازی مت کرو۔ اپنی طرف سے مذہب تراش کر، اسے اُس کی طرف
منسوب مت کرو۔ یاد رکھو! خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، وہ خامرہ نامراد رہتے ہیں۔ وہ انہیں
چڑ بنیاد سے اکھڑو یا کرتا ہے۔

اس خطاب کا بیڑا ہوا کہ وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

فَتَنَزَّلُ عَنَّا أَمْرُهُمْ بَيْنَهُمْ وَآسَرُ وَاللَّجُؤَى ۝ (۲۱/۲۲)

اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ ان مذہبی پیشواؤں نے آپس میں رد و کد شروع کر دئی اور باہم سرگوشیاں
کرنے لگے۔ (عوام پر بھی اس کا برا اثر پڑا)۔

ارباب حل و عقد نے جب دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ تو مقابلہ سے پہلے ہی میدان مارے جا رہے ہیں تو مجمع (یا مذہبی پیشواؤں) سے کہا کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ یہ دونوں بھائی کیا منصوبے باندھ رہے ہیں؟ گوش ہوش سے سنو۔

قَالُوا إِنْ هَٰذِهِنَّ لَسِحْرَانِ بُرِيدَانِ أَنْ يُفْجِرَ بِكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ ۚ فَأَجْبِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ اتُّوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنْ اسْتَعْلَىٰ ۝ (۱۱۳-۱۱۴)

(فرعون کے درباریوں نے جب مجمع کی یہ حالت دیکھی تو انہیں خطرہ لاحق ہو گیا) انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ دونوں بھائی (موسیٰؑ اور یارونؑ) کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ باطل مذہب کے پیشوا ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اپنی فریب کاریوں سے اپنا تسلط جمالیں اور تمہیں تمہاری مملکت سے نکال باہر کریں اور تمہارے مذہب و مسلک کو، جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا ہے تباہ کر کے رکھ دیں۔ اور اس طرح تمہارے ارباب حکومت اور پیشوایان طریقت کا تمام شرف و اقتدار چھین کر لے جائیں۔

(پھر انہوں نے اپنے مذہبی مناظروں کو خصوصیت سے مخاطب ہو کر کہا کہ اپنے باہمی اختلافات کو چھوڑ کر، اس مشترکہ دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے، اپنی تمام ہنرمندیوں اور تدابیر کو یکجا کر لو اور پھر پرا باندھ کر ان کے مقابلے کے لئے ڈٹ جاؤ۔ یاد رکھو! یہ معرکہ بڑا فیصلہ کن ہے۔ جو آج بازی لے جائے گا، وہی کامیاب ہوگا۔) (۱۱۳-۱۱۴) ۝ (۱۱۵-۱۱۶)

دیکھئے! کس طرح ان کے جذبات کو مشتعل کیا جا رہا ہے تاکہ حضرت موسیٰؑ کی معذرت اور تنذیر نے جو اثر کیا تھا اسے نازل کر دیا جائے اور یہ انہیں اپنے ملک اور تہذیب و تمدن کا دشمن خیال کرنے لگ جائیں کہ یہ نہ صرف تمہارا ملک ہی چھیننے کی فکر میں ہیں بلکہ اس بلند و بالا تہذیب و تمدن کے مٹا ڈالنے کی بھی تدبیریں سوچ رہے ہیں جس کے تم وار ہو۔ آنکھیں کھولو! کس سوچ میں ہو! دیکھو کہ یہ دونوں بھائی کس انقلاب کی ٹھکانے بیٹھے ہیں!!!

✽

سورۃ شعراء میں ہے۔

لہذا یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جو فارغین حقیقی معانی کو ترجیح دینا چاہیں وہ ان الفاظ کے معانی کسی بات ترجمہ قرآن کریم کے نسخے سے دیکھ لیں۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۝ (۱۲۶)

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور ملک کے بڑے بڑے سحرکار پر دہشت، تابناک اور وقت مقررہ پر، موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے جمع ہو گئے۔

مذہبی پیشواؤں کے علاوہ عوام کو بھی دعوتِ شمولیت دی گئی تھی۔

وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنْتُمْ مُجْتَبِعُونَ ۝ لَعَلَّآ نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِنْ كَانُوا هُمْ الْغَالِبِينَ ۝

(۱۲۷-۱۲۸)

علاوہ ازیں، عام لوگوں سے بھی کہا گیا کہ وہ بھی جمع ہو جائیں۔

تاکہ جب یہ پروہت کامیاب ہوں تو ان کا شاندار جلسہ نکالا جائے۔

اس کے بعد ان کے مذہبی پیشواؤں کی سلسلہ جوئی اور معاوضہ طلبی کی درخواست کا ذکر ہے جسے سورۃ اعراف کی آیات (۱۲۹-۱۳۱) میں بیان کیا جا چکا ہے (دیکھئے ۱۲۹-۱۳۱)۔ اس کے بعد مقابلہ شروع ہوا۔ اور سوال یہ پیدا ہوا کہ پہل کون کرے۔

مقابلہ ۱۱۶ | قَالَ الْقَوَاهُ فَلَمَّا أَلْقَوْا سَعَرُوا أَعْيَنَ النَّاسِ وَاسْتَزْهَبُوا هُمْ وَ جَاءُوا بِسِحْرِ عَظِيمٍ ۝

موسیٰؑ نے کہا کہ تم پہل کرو۔ سو جب انہوں نے اپنے مسلک کو پیش کیا، تو ان کی سحر بیانی کی چمک نے لوگوں کی نگاہوں میں نیرگی پیدا کر دی، اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں کو اس سے بھی ڈرایا کہ تم نے فرعون کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اور اس طرح انہوں نے بہت بڑے مکر و فریب کا جال بچھا کر رکھ دیا۔

اس کے بعد۔

۱۱۷ | وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ۚ

اور ہم نے، موسیٰؑ سے، وحی کے ذریعہ کہہ دیا کہ تم اپنی تیزیرات کو پوری قوت اور شدت کے ساتھ پیش کر دو۔ جب اُس نے انہیں بیان کیا تو مخالفین کا فریب باطل بلامیٹ ہو کر رہ گیا۔

لے یہاں پر لفظ عصا ”آیا ہے۔“

”عصائے موسیٰ“ باطل کی نظر فریب ”رسیوں“ کو نگل گیا۔ اور اس طرح۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ فَغَلَبُوا فَهْلَكَ ۝ وَانْقَلَبُوا صَغِيرِينَ ۝

۱۱۸-۱۱۹

سورس طرح حق ثابت ہو گیا۔ اور ان کا کیا کرایا سب اکارت گیا۔ (۸۲-۷۶) (۲۰-۶۵)

یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی رُوسے ہوا تھا۔ (۸۲)

اور فرعون اور اس کی قوم کو، وہیں دیکھتے دیکھتے، مغلوب اور ذلیل ہو کر پسا ہونا پڑا۔

﴿﴾

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں بھی اس مناظرہ کا ذکر (قریب قریب) انہی الفاظ میں آیا ہے (دیکھئے ۸۲-۷۶)۔

۴۹-۷۵ : ۲۴-۷۳ آیت (۲۴) میں ہے کہ فرعون کے مذہبی پیشواؤں کا انداز بیان اس قدر سحر آفریں تھا کہ حضرت موسیٰؑ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کے دلائل و محض لفاظی کے زور پر (اثر انداز نہ ہو جائیں اور اس طرح وہ کامیاب ہو جائیں۔ لیکن خدا نے انہیں اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے دلائل ان اثرات کو زائل کر دیں گے۔

﴿﴾

ساحرین کا کیر کیر ہم پہلے دیکھ چکے ہیں (جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ فرعون اور اس کے اہل و بار، دل میں تو حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت کے مائل ہو چکے تھے لیکن ان کی امانیت اس اعتراض اور حقیقت کے برعکس اظہار کے راستے میں حائل ہو رہی تھی اس لئے وہ اس کی مخالفت کئے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس سامنے آتا ہے۔ قوم فرعون کے ان مذہبی پیشواؤں کا جو مقام تھا اس کی بابت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ان کا منصب اور ان کے مقام کی عظمت اور باب اقتدار سے بھی کہیں بڑھ کر تھی۔ پھر اس مقابلہ کی اہمیت اور نزاکت بھی ان پر واضح تھی۔ اس میں کامیابی کا جو صلہ انہوں نے طلب کیا، اور فرعون نے جس کا اقرار کیا تھا، اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر انہوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا تو فرعون کی طرف سے اس کا کیا رد عمل ہوگا!

ان تمام تر غیبات اور تربیات کے علی الرغم ان کی بچنگی سیرت اور بلند می کردار کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ کے دلائل کی رو سے ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ الٰہ حقیقی فرعون (یا آمن) نہیں بلکہ خدائے ارض و سموات ہے، تو انہوں نے تمام عواقب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اس کا کھلے بندوں اعلان کر دیا۔ اور خدائے حقیقی

کے حضور والہانہ انداز سے سجدہ ریز ہو گئے۔ **وَالْقَى السَّجَرَةَ سَاجِدِينَ** (۱۲۳)
یہ وہ سجدہ تھا جس سے زمین و آسمان رقص میں آجائے جس سے باطل کے ہر خدا کی اسیلیت بے نقاب ہو جائے۔ اس سجدے کی عظمت کے متعلق مطالب الفرقان - جلد دوم - ص ۳۱ ملاحظہ فرمائیے۔
سجدے سے اٹھتے اور کہا:

قَالُوا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ رَبِّ مُوسٰى وَهَارُونَ ۝ (۱۲۳-۱۲۴)
(۲۰/۲۸-۲۹)

انہوں نے کہا کہ ہم اس خدا پر ایمان لاتے ہیں جو جملہ کائنات کا پروردگار ہے۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔
کیسا درخشاں تھا طالع ان بیدار بخت مذہبی پیشواؤں کا جس پر ساری کائنات کی عظمتیں اور ثروتیں چھا کر دی جائیں
وہ سجدہ نصیب ہوا جس سے ان کی خاک آلود پیشانیوں میں رفعتوں کے ہزار عرش جگمگا اٹھے۔ یہی وہ سجدہ تھا جس نے
انہیں وہ جرأت عطا کر دی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ سے سرفرازانہ آگے بڑھ جائیں۔ ہم غلامانہ ذہنیت
کے خوگر اس سجدہ کی لذت کو کیا جائیں گے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھا ہے
ہزار سجدے سے دنیا بے آدمی کو بچا



فرعون کی شعلہ بازی ہم ساحرین کے تیر انگیز بذبہ ایمان کے کیفیت بار و نشاط اور منظر میں کچھ اس طرح جذب
ہو گئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ فرعون کی قلبی کیفیت کا بھی جائزہ لے لیں کہ اس پر اس
غیر متوقع انقلاب سے کیا گزری؟ اس میدان مبارزت میں ساحرین کی ناکامی ہی کچھ کم الم انگیز نہ تھی۔ اس پر جب
دیکھا کہ وہ ”موسیٰ“ کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں (یعنی بزعم فرعون، دشمن سے جا ملے ہیں) تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ
اس کے دل و دماغ کی حالت کیا ہو گئی! ذلت اور ایسی کھلی ہوئی ذلت! شکست اور ایسی رسوا کن شکست!!
وہ ایک سپھرے ہوئے شیر کی طرح گر جا اور کھٹ برد باں سیلاب کی طرح اٹھا۔ کہ ہیں! میری آنکھوں کے سامنے
ایسی کھلی ہوئی بغاوت!

قَالَ فِرْعَوْنُ اَمْتُمْنِيْهِ قَبْلَ اَنْ اُذِنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا الْمَكْرُ مَكْرٌ مُّؤَمَّوۃٌ
فِي الْمَدِيْنَةِ لِنَخْرُجُوْا مِنْهَا اَهْلَهَا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲۳)

(اس پر فرعون کے غصے کی آگ بھڑک اُٹھی)۔ اُس نے کہا کہ کیا تم میری اجازت کے بغیر ہی موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آئے ہو؟ میں اب سمجھا کہ یہ تم سب کی ملی بھگت ہے۔ یہ تو ایک گہری سیاسی سازش معلوم ہوتی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ تم میرے دار الخلافہ سے ارباب اقتدار کو نکال باہر کرو اور خود مملکت پر قبضہ کر لو۔ تم سب اندر سے ملے ہوئے نظر آتے ہو۔ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا کہ اس سازش کا نتیجہ کیا ہے۔

کسی مسلک کو صحیح جان کر اس پر ایمان لے آنا انسان کے اپنے دل کے فیصلہ پر موقوف ہونا چاہیے۔ لیکن استبداد اس کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ کی عقل و بصیرت اور قلب و دماغ کا فیصلہ کچھ ہو۔ کہنا وہ ہو گا جس کا حکم دیا جائے۔ اسی لئے فرعون نے کہا کہ ”میری اجازت کے بغیر ایمان لے آئے؟“ پھر جیسا کہ مستبد حکومتوں کا دستور ہے۔ فرعون نے ساحرین کے اس فیصلہ کو ایک سازش قرار دیدیا تاکہ انہیں بقاء کے الزام میں مآخوذ کر لیا جائے۔ ساحرین کا ایمان علی وجہ البصیرت تھا۔ لیکن چونکہ اس سے قصر حکومت میں تزلزل واقع ہوتا تھا اس لئے اسے سازش قرار دے دیا گیا جس کی مراد فرعون کی ”عدالت“ میں اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ:

لَا قُطِعَ عَنْ أَيْدِيكُمْ وَأُسرُجُلُكُمْ مِّنْ خَلَاةٍ ثُمَّ لَا صَلَّيْتُكُمْ أَجْمَعِينَ ۝

۱۲۴

میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے کٹواؤں گا (یا ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈلوؤں گا) اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔

سورۃ طہ میں فرعون کے قول کا ایک اور ٹکڑہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ ساحرین کے اس اعتراض سے عوام پر بے حد بُرا اثر پڑا ہے تو معاملہ کو مثبت بنانے کے لئے مشہور کر دیا کہ یہ مذہبی پیشوا (درپردہ) حضرت موسیٰ کے شاگرد ہیں اور ان کی آپس میں ملی بھگت ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

قَالَ ۲۱۱ مَن تُمْلِكُ لَهُ قَبْلُ أَنْ أَدْنِ لَكَمُ رِيشَهُ لَكِبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَيْكُمُ السَّحَرَةُ
فَلَا قُطِعَ عَنْ أَيْدِيكُمْ وَأُسرُجُلُكُمْ مِّنْ خَلَاةٍ وَلَا وَصَلَيْتُكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ
وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَى ۝ (۲۱۱) (نیز ۲۱۲)

(اس پر فرعون، مارے غصے کے لال پلا ہو گیا اور اُن سے گرج کر کہا کہ میں!) — تم میرے حکم کے بغیر رب موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لائے ہو؟ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ موسیٰؑ) تمہارا پیر و مرشد ہے جس سے تم نے یہ سب فریب انگیزیاں سیکھی تھیں (اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا، سب تمہاری ملی بھگت تھی۔ تم دیکھو میں تمہیں کیسی عبرت انگیز سزا دیتا ہوں) میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا (یا تمہیں اُلٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈلوؤں گا)۔

اور تمہیں کھجوروں کے تنوں کے ساتھ ٹکا کر سولی دی جائے گی۔ اور اس طرح تم دیکھ لو گے کہ ہم دونوں (فرعون اور موسیٰ) میں سے کون زیادہ سخت اور دیر پا عذاب دے سکتا ہے۔

ساحرین کا ایمان | جو رو استبداد کی ان قہر مافی بجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا! اب ساحرین کے کوہ مثال عزم و ایمان کی تجلیات کا تابناک منظر بھی دیکھئے۔ اب ساحرین بھی وہ نہیں تھے جن کا اندازہ فرعون نے کیا تھا۔ وہ اب خدائے حقیقیوم پر علی وجہ البصیرت ایمان لاچکے تھے اور یہ وہ ایمان ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا

تو کریتا ہے یہ بال و پر روح الایں پیدا

دنیا میں حقیقی قوتوں کا راز، ایمان میں مضمر ہے۔ جس قدر آپ کا یقین محکم ہے، اسی قدر ناقابل تسخیر قوتوں کے آپ مالک ہیں شکست و کامرانی کا بنیادی مدار قاطبہ ساز و سامان پر نہیں، یقین و عدم یقین پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے مقاصد کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہوگا وہی دنیا میں کامیاب و شاد کام ہوں گے۔ یہی شکست و فتح کا اٹل پیمانہ ہے۔ اسی سے قوموں کا مستقبل ماپا جاتا ہے۔ جب یقین، ایمان کے درجہ تک پہنچ جائے۔ اور ایمان ہو، اللہ و اٰحٰد القہار پر۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مقام سے نہیں ہٹا سکتی۔ لہذا، فرعون کی دھمکی، ایمان و ایقان کے ان آہنی پکڑوں پر کیا اثر کر سکتی تھی۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے

جسے حق نے کیا ہو نیستیاں کے واسطے پیدا

فرعون نے اپنے انتہائی غضب و جلال میں کہا کہ میں تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا۔ تمہاری تنکا بوٹی کر دوں گا۔ ڈرو میرے غضب سے! خوف کھاؤ میرے انتقام سے! لیکن ان سے ان استقلال و انتقامت کے مجسموں پر کیا اثر ہوا؟ انہوں نے ایک خفیف سی ہنسی سے فرعون کی طرٹ نگہ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ جن حقائق کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کیا تمہارے ڈر سے ان کی تکذیب کہہ دیں؟

قَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ بِشِرْكِكَ عَلٰی مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا (۲۶)

انہوں نے اس گرج کو نہایت اطمینان کے ساتھ سنا اور دل کو پورے سکون سے کہا کہ جو حقیقت و دلائل و براہین کی رُو سے ہم پر منکشف ہو چکی ہے، نہ ہم اس پر اپنی باطل پرستی کو ترجیح دے سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اس خدا

سے منہ موڑ کر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تمہارا حکم مان سکتے ہیں۔

”فرعون“! تو کیا جانے کہ ہماری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ خدا پر ایمان کی لذت کیسی ہوتی ہے؟ یہ تیری دھمکیاں اور تجوہیت و ترہیب کی شعلہ باریاں، ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ فَاَقْضِ مَا آتَتْ حَاضِرُ (۱۲۶) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے، کر ڈال۔ جو تیرے جی میں آئے کر گزر۔ تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ ہماری طبعی زندگی بیک گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ اِنَّمَا تَقْفِي هَذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۱۲۶)۔ تو صرف اسی دنیا کی زندگی تک ہی، حکم دے سکتا ہے۔ ہم اپنے اللہ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اس ایمان سے ہمیں کوئی نہیں پھر سکتا۔

اِنَّا اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَا اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهِ خَيْرٌ
وَّاَبْقٰی ۝ (۱۲۶)

ہم اپنے نشوونما دینے والے پر ایمان لا چکے۔ اُس سے ہماری وعایہ ہے کہ وہ ہماری سابقہ غلطیوں کے مہلک اثرات سے ہماری حفاظت کر دے۔ یہ ————— بالخصوص باطل پرستی کی اس خطا کا زائد روش۔ کئے اثرات سے جس پر چلنے کے لئے تم نے ہمیں مجبور کر رکھا تھا۔ (ہم اب دیکھ چکے ہیں کہ) خدا کا قانون ہی بہترین اور باقی رہنے والے نتائج کا حامل ہے۔

ساحرین، فرعون کو یہ جواب دے رہے تھے اور آسمان کے فرشتے مجتہز، بارگاہِ بزدی میں عرض کر رہے تھے کہ
اِلَّا الْعٰلَمِیْنَ اَنْزِلَ اِرْشَادُ بَیِّنٍ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اسی آدم کی ذریت میں، جسے ابلیس نے بہکانے اور پھسلا نے کایوں دعویٰ کیا تھا، ایمان اور ایتقان کے ایسے فولادی پیکر بھی ہوں گے، جن کی کیفیت یہ ہوگی کہ
یَوْمَ رُکَّ اَبَدًا تَلْسَمُ بَرْلَبِ اَوْسَت

سورۃ اعراف کی آیات (۱۲۵-۱۲۶) اور سورۃ شعراء کی آیات (۵۱-۵۲)۔ میں بھی اسی

۱۲۵-۱۲۶

واقف کو داہرایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں نے فرعون کی دھمکیوں کا جواب کس قدر

حقارت آمیز ہنسی سے دیا۔

ایک ایمان یہ تھا اور ایک ایمان اس انداز کا ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْبِدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَمَّا بَہُ خَیْرٍ اَطٰمَانَ یٰہُ ۚ وَاِنْ اَمَّا
بِتَہُ فِتْنَةٍ ۚ الْقَلْبُ عَلٰی وَجْہِہٖ تَفْخِیْسٌ ۚ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ ط ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرٰۤی
الْمُبِیْنُ ۝ (۲۲)

ایک طبقہ تو ان لوگوں کا جو قانونِ خداوندی سے اس طرح روگردانی کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان کا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں، لیکن اس طرح گویا وہ کنارے پر کھڑے ہیں۔ اگر دیکھتے ہیں کہ اس قانون کی اطاعت میں فائدہ ہے، تو اس پر مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن اگر اس سے انہیں کسی قسم کا نقصان ہوتا ہو۔ تو وہ اس سے بلا تامل منہ پھیر لیتے ہیں (۱۶۷)۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی حال کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے اور مستقبل کی بھی۔ دُنیا میں بھی خسارہ اور آخرت میں بھی۔ اور یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے (جس کے لئے کسی دلیل و بُرہان کی ضرورت نہیں۔ علی وجہ البصیرت ایمان اور پیدائشی مسلمان کے ایمان میں یہی فرق ہوتا ہے۔

ما بیدال سرنجیب۔ اور سر بکفت

دار و اندر سینہ تکبیر اُمم	در بین اوست تقدیر اُمم
قبلاً ما کہ کلیسا، گاہ دیر	او نخواہد رُزق خویش از دست غیر
صبح و شام ما بفکر ساز و برگ	آخر ما چیست؟ تلخ ہائے مرگ
در جہان بے ثبات اور اثبات	مرگ اور از مقامات حیات
اہل دل از صحبت ما مضحل	گلِ ز فیض صحبتش دارائے دل
کار ما وابستہ تخمین و ظن	ادب ہمہ کردارہ کہ گوید سخن
ما گدایاں کو چہ گرد و فاقہ مست	فقر اور از لا الہ تیغے بدست
ما پر کا ہے اسیر گرد و باد	ضریش از کوہِ گراں جوئے کشاد

محرم اوشو، زما بے گمانہ نشو،

خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

(اس ضمن میں مطالب الفرقان - جلد دوم - صفحہ ۲۵ بھی ملاحظہ فرمائیے)۔

بیان تک داستان حضرت موسیٰ کا وہ حصہ سامنے آیا ہے جس کا تعلق فرعون کے ساتھ ٹکراؤ سے ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کا ذکر نہیں آیا۔ اس کے بعد (آیت ۲۵) اور اس سے آگے فرعون اور بنی اسرائیل دونوں کا تذکرہ آیا گا۔ بنی اسرائیل کی رقم ویش پوری داستان مطالب الفرقان جلد دوم میں، اور بعض کوائف جلد چہارم میں آچکے ہیں لہذا اب ہم ایسا انداز اختیار کریں گے کہ سورۃ الاعراف کی جن آیات میں بنی اسرائیل کے ان واقعات کا ذکر آئے گا جو سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکے ہیں، وہاں صرف سابقہ جلدوں کا حوالہ دیدیا جائے گا اور جو واقعہ ایسا ہوگا جو پہلے نہیں آچکا، اس کی عند الضرورت تفسیر کر دی جائے گی۔

پانچواں باب

سورة الاعراف - آیات ۱۲۷ تا ۱۵۸

کواثف بنی اسرائیل

- ۱۔ وراثتِ ارض کا ابدی قانون۔
- ۲۔ فرعونی نظام کے ابتدائی تباہ کن نتائج
- ۳۔ قوم فرعون کی غرقابی۔
- ۴۔ بنی اسرائیل کا عبورِ دریا۔
- ۵۔ نفسیاتِ غلامی کے مظاہرے۔
- ۶۔ گوسالہ پرستی۔
- ۷۔ تفرقہ، شرک سے بھی بدتر۔
- ۸۔ حضرت موسیٰؑ کی دیدارِ خداوندی کی استعداد۔
- ۹۔ اس کا جواب۔
- ۱۰۔ قوم کی طرف سے خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ۔
- ۱۱۔ دونوں میں فرق۔
- ۱۲۔ الواحِ حضرت موسیٰؑ۔
- ۱۳۔ حضرت موسیٰؑ کی درخواست کہ ان کی قوم کو دنیا اور آخرت کی حسانت سے نوازا جائے۔
- ۱۴۔ اس کا جواب کہ ایسا اتباعِ محمدیؐ سے ہوگا۔
- ۱۵۔ بعثتِ نبی اکرمؐ کا مقصود و منتہی۔
- ۱۶۔ نوعِ انسانی کی آزادی۔
- ۱۷۔ خدا کا آخری رسولؐ۔

پانچواں باب

کوائفِ بنی اسرائیل

سابقہ باب میں (آیت ۱۲۷-۱۲۸) حضرت موسیٰؑ کے کوائفِ حیات بیان ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد کی آیات میں (منجملہ دیگر امور) داستانِ بنی اسرائیل کے متعدد گوشے سامنے لائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ داستانِ بنی اسرائیل کے ضمن میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر بھی آئے گا۔ لیکن یہ ذکر ضمنی ہوگا۔ لہذا داستانِ بنی اسرائیل ہی کی بیان ہوگی۔ یہ داستان مطالب الفرقان جلد دوم میں شرح و بسط سے بیان ہو چکی ہے۔ اُن واقعات میں سے، سورۃ الاعراف کی آئندہ آیت میں جن کا ذکر آئے گا، اُن کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اُن کے متعلق صرف مطالب الفرقان جلد دوم کا حوالہ دیا جائے گا۔ البتہ جن آیات میں کسی سابقہ واقعہ میں کوئی اضافہ ہوگا، ان کی تشریح کر دی جائے گی۔ اس التزام کے مطابق، آئندہ آیات ملاحظہ فرمائیے۔ آیت (۱۲۷) میں ہے

وَقَالَ الْمَلَأَمِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَى وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَالْهَتَكَ ط قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّا لَوَقَّهِمُ النَّارَ ۝

فرعون کے درباریوں نے اُس سے کہا کہ (تم نے ان مذہبی پیشواؤں کے خلاف تو اپنا فیصلہ دے دیا لیکن) کیا تیرا ارادہ یہ ہے کہ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ ملک میں فتنہ و فساد برپا کرتے پھریں اور ایسا پراپیگنڈا کریں جس سے خود تیری قوم، تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے۔

فرعون نے کہا کہ (نہیں! میں ان کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ لیکن ان کے لئے میرے ذہن میں دوسری تدبیر ہے۔ یہ ہماری محکوم قوم ہے، اسے ہم سیاسی حربوں سے کچل دیں گے)۔ ہم اس قوم کے معزز افراد کو

جن میں جو ہر دانگی کی جھلک دکھائی دیتی ہو اور جن سے خطرہ کا امکان ہو، ذلیل و خوار کر کے غیر مؤثر بنا دیں گے، اور جو طبقہ ان جوہروں سے عاری ہوگا، اسے معزز اور مقرب بنا کر آگے بڑھاتے جائیں گے۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے یہ قوم نباہ ہو جائے گی (۲/۲۹ و ۳/۲۵)۔

فرعون کی طرف سے تشدد | اس کا ذکر آیت (۱۲۸) میں بھی آیا ہے۔ مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۷، پر آچکا ہے۔ فرعون کی حکومت، اپنی محکوم قوم (بنی اسرائیل) کو جس جس طریق سے اذیتیں دیتی تھی، اس کا ذکر (مطالب جلد دوم میں) آچکا ہے۔ حضرت موسیٰ کی آمد سے پہلے یہ اذیتیں اور انداز کی تھیں۔ صاحب ضربِ کلیم نے جو انقلابی آواز بلند کی تو اس سے بنی اسرائیل کی حیثیت ایک باغی قوم کی ہو گئی۔ لہذا قوم فرعون کی طرف سے اذیتیں بھی شدت اختیار کر گئیں۔ بنی اسرائیل نے ان تکالیف سے گھبرا کر حضرت موسیٰ سے شکایت کی، تو آپ نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ تکالیف کا یہ دور جلد ہی گزر جائیگا اور اس کے بعد تم محکوم قوم سے حاکم قوم بن جاؤ گے۔ اگلی دو آیات میں اسی انقلاب کا ذکر ہے:

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ تَقْدِرُ يَوْمَئِذٍهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ قَالُوْٓا اَوْ ذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیْنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّهْلِكَ عَدُوُّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَمَنْظُرٌ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ فرعون کی ان دھمکیوں سے مت ڈرو۔ تم قانون خداوندی کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے جاؤ اور خدا سے اس کی توفیق مانگو (۱۲۸) اور اپنے پروگرام پر ثابت قدم رہو۔ (حکومت و مملکت ان کے باپ کی جاگیر نہیں کہ وہ ابدی طور پر ان ہی کے پاس رہے خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ کرتے رہیں) یہ تو خدا کے قانون کے مطابق ملتی اور اس کے مطابق چھنتی ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ یہ ملتی اُس قوم کو بے جس میں اس کی حاکمیت ہو (۱۲۹)۔ جو قوم، اُس کے قانون کی نگہداشت کرے گی، یہ آخراً اُس کے پاس جائے گی۔

اس پر موسیٰ کی قوم نے اُس سے کہا کہ جب تم یہاں نہیں تھے تو اُس وقت بھی ہمیں مصیبتوں کا سامنا ہوا۔ تمہارے آنے سے یہ اُمید بند نہ گئی تھی کہ اب ہمارا باپ کٹ جائے گا، اور آرام سے زندگی بسر ہوگی، لیکن فرعون

لڑائی مول لے کر تم نے ہمیں پھر مصیبت میں ڈال دیا۔

استقامت کی تلقین | موسیٰؑ نے کہا کہ گھبرانے کیوں ہو۔ (پہلے تمہاری مصیبتیں، محکومی اور غلامی کی وجہ سے تھیں، لیکن اب جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا، وہ حصول آزادی

کے لئے ہوں گی۔ اگر تم نے ثبات و استقامت سے کام لیا تو تم دیکھو گے کہ تمہارا لشو و نمادینے والا کس طرح تمہارے دشمن کو تباہ کر دیتا ہے، اور اُس کی مملکت تمہارے حصے میں آجاتی ہے۔

اس کے بعد وہ خدا یہ دیکھے گا کہ مملکت حاصل ہونے کے بعد تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟ اس کا ذکر آیت

(۱۳۰) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَعَارِبَهَا
الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا ط وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ
بِمَا صَبَرُوا ط وَدَمَرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ

اور جس قوم کو وہ اس قدر کمزور و ناتواں (اور ذلیل و خقیق) سمجھا کرتے تھے، اُسے (مختلف ممالک سے نوازا) اُس ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا وارث بنا دیا جو ہمارے قدرتی خزانے اور پیداوار سے مالا مال تھا۔ یوں تیرے لشو و نمادینے والے کا پروگرام، بنی اسرائیل کے حق میں، اس حسن و خوبی سے تکمیل تک پہنچا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اس تمام جدوجہد میں بڑی استقامت کا ثبوت دیا تھا۔ ان کے برعکس، قوم فرعون کے ساختہ پرواختہ کو برباد، اور ان کی عایشان عمارات کو تہس نہس کر دیا۔

(لیکن یہ اس داستان کا آخری حصہ ہے جسے ہم نے اس مقام پر بیان کیا ہے)۔

اس تکس فی الارض کی تفسیر مطالب الفرفان جلد دوم صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸ پر آچکی ہے۔

﴿﴾

قوموں پر اُن کے غلط نظام کے نتیجے میں، تباہیاں کس طرح آتی ہیں، ان کی تفصیلات سا بقہ جلدوں میں آچکی ہیں۔

(ملاحظہ ہواؤ گس)۔ اس کا اصولی تذکرہ آیت (۱۳۱) میں بھی سامنے لایا گیا ہے۔ اس اصول کے مطابق، قوم فرعون پر بھی

تباہیاں آئیں، جن کا ذکر آیات (۱۳۱) و (۱۳۲) میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصِ الْمَخْرُجَاتِ

لَعَلَّهُمْ يَذْكُرُونَ ۝

قوم فرعون پر تباہیاں | (اُس اصول کے مطابق جس کا ذکر (۱۳۱) میں کیا جا چکا ہے) قوم فرعون کے غلط نظام کے نتائج رفتہ رفتہ سامنے آنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ وہاں خشک سالی کی وجہ سے، فصلوں میں کمی ہو گئی، تو سارے ملک میں قحط پھیل گیا۔ اُنہیں اس سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ غلط نظام معاشرہ میں قدرتی حادثات کے مقابلہ کی سکت نہیں ہوتی۔ اس قسم کے حوادث کے مفرات اثرات کی روک تھام کا انتظام نظام ربوبیت ہی کی رو سے ہو سکتا ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالْدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۚ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۴

اُن پر سیلاب آئے۔ ٹڈی دل نے نباہی مچائی۔ فصلوں کو برباد کرنے والے کیڑے پیدا ہوئے۔ میندگوں کی کثرت ہو گئی۔ فساد و خون کی بیماریاں رونما ہو گئیں۔ یہ سب کھلی کھلی علامات تھیں (اس بات کی کہ جب ملک کا نظام صحیح خطوط پر متشکل نہ ہو، تو وہاں اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اربابِ نظم و نسق اپنی عیش پرستیوں میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ انہیں اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی)۔ قوم پر اس قسم کی مصیبتوں کے باوجود، اس کا حکمران طبقہ اپنی سرکشی سے باز نہ آیا۔ وہ درحقیقت گناہی مجرموں کا گروہ! (جو کچھ ملک میں ہو رہا تھا، وہ انہی کے جرائم کا نتیجہ تھا)۔

لیکن، بجائے اس کے کہ وہ ان جھٹکوں سے عبرت پکڑتے اور سبق حاصل کر کے اپنے نظام کی اصلاح کرتے، وہ حضرت موسیٰ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے۔ فرمایا:

فَاِذَا جِآءَتْهُمْ الْحُسْنَةُ قَالُوْا النَّاهِیْہُ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَبۜئَةٌ یَّطَّرُوْا بِمُوسٰی وَّمَنْ مَّعَہٗ ۚ اِلَّا اِنَّمَا ظَنُّرْہُمْ عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَہُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۵ وَقَالُوْا اَمَہُمَا تَاۡتٰیۡہُمۡ مِنْ اٰیۡةٍ لِّتَسْحَرَ نَاۡیَہَا ۚ فَمَا تَخُنۡ لَّکَ بِمُؤْمِنِیۡنَ ۝۶

لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب اُن پر خوش حالی کا زمانہ آنا تو کہتے کہ یہ ہمارے حسن انتظام کا نتیجہ ہے۔ اور جب سختی آتی تو کہتے کہ یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے ہے۔

اُن کی اس مسیبت کا سبب، موسیٰ اور اُس کی جماعت کی نحوست نہ تھی (نحوست کسی میں بھی نہیں ہوتی) یہ اُن کی اپنی غلط روش کا نتیجہ تھا جو قانونِ خداوندی کے مطابق مرتب ہو رہا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ

اس حقیقت کو نہیں جانتے (اور اپنے اعمال کا جائزہ لینے کے بجائے دوسروں کو ان کا ذمہ دار قرار دے کر، اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔) $(\frac{۲}{۱۲})$ ذ $(\frac{۲}{۱۲})$ ذ $(\frac{۲}{۱۲})$ ذ $(\frac{۲}{۱۲})$ ذ $(\frac{۲}{۱۲})$ ذ
 قوم ذریعہ موسیٰ سے کہتی کہ تو ہم سے اپنا باطل مذہب منوانے کے لئے جتنا جی چاہے زور لگائے، اور جس قسم کی مصیبت ہم پر لاسکتا ہے، لے آ۔ ہم تجھ پر کبھی ایمان نہیں لانے کے۔
 اس کے بعد ہے:

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا لِمُوسَىٰ اذْعُ لَنَا رَبِّكَ بِمَا عَهِدَ
 عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ
 بَنِي إِسْرَءِيلَ ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُمْ بِلِغْوِهِ إِذَا
 هُمْ يَنْكُثُونَ ۝

جب ان پر تباہی آتی تو وہ کہتے کہ اے موسیٰ! تو اپنے رب سے دعا کر۔ اگر وہ ہم سے اس عذاب کو طائل دے، تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے، چونکہ (تو کہتا ہے کہ) خدا نے تجھ سے عہد کر رکھا ہے، اس لئے وہ تیری دعا ضرور قبول کرے گا۔
 سو جب ہم کچھ وقت کے لئے، ان سے اس سختی کو دور کر دیتے، جس تک انہوں نے بالآخر اپنی غلط روش کی وجہ سے پہنچ کر رہنا تھا، تو وہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے۔

اس کے بعد ان کی آخری تباہی کا ذکر ہے، جس میں وہ غرق و رہا ہو گئے تھے!
 فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا
 عَنْهَا غَافِلِينَ ۝

جب وہ اس طرح (مسلل اور سہم) ہمارے قانون کو جھٹلاتے رہے اور اس کے نتیجہ خیز ہونے کی طرف سے لاپرواہ رہے، تو ہمارے قانون مکافات نے انہیں پکڑ لیا۔ صورت یوں ہوئی کہ وہ اپنی قوت کے نشے میں بہست، موسیٰ اور اس کی قوم کا ناقب کرتے ہوئے، سمندر (یا دریا) میں کود پڑے، اور غرق ہو گئے۔ یوں ہم نے

۱۔ قرآن کریم نے اس جگہ کتنی بلند حقیقت کو بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ مصیبت انسان کی طرف نہیں آتی۔ انسان خود مصیبت کی طرف جاتا ہے۔

انہیں تباہ کر دیا۔

غرق ہوتے وقت فرعون کے ایمان لانے کا واقع اور اُس کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا ذکر مطالب الفرقان جلد دوم صفحات ۲۴۹ و ۲۵۲ پر آچکا ہے۔

بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے کا ضمنی سا اشارہ آیت (۱۳۸) میں آیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۵۵ میں ملے گی۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ صحرائے سینا پہنچنے کے بعد بنی اسرائیل نے کس طرح بُت سازی کی فرمائش کی۔

وَجُوزْنَا بِبَنِي إِسْرَءِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَى أَصْنَامٍ لَهُمْ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَلْ لَنَا آلِهًا كَالَّذِينَ هُمْ يُعْبُدُونَ ۖ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ۚ إِنَّ هَؤُلَاءِ مُتَبَرِّئُونَ مَا هُمْ فِيهِ وَبَطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۚ قَالَ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِيكُمْ آلِهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

قوم فرعون دُوب آئی اور بنی اسرائیل کے لئے ہم نے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ سمندر (یا دریا - ۲) کے پار اتر گئے۔ اُس کے بعد اُن کا گزر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جو اپنے بتوں کی پرستش پر جمی بیچھی تھی (اور یہی چیز ان میں وجہ بجا مبعیت تھی)۔ موسیٰ کی قوم نے موسیٰ سے کہا کہ جس قسم کے ان کے دیوتا ہیں، ہمیں بھی اس قسم کا دیوتا بنا دو!

موسیٰ نے کہا کہ (میں، اس کے سوا تم سے کیا کہوں کہ) تم بڑے ہی جاہل ہو۔ (۱۳۸)

جس مسلک پر یہ (بُت پرست) چل رہے ہیں، وہ مسلک تباہ ہو کر رہنے والا ہے، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، وہ یکسر باطل ہے۔ اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں۔ (۱۳۹)

اُس نے کہا کہ کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور الہ تجویز کر دوں، حالانکہ وہ خدا ایسا ہے جس نے

تمہیں اپنی ہم عصر اقوام پر فضیلت عطا کی ہے۔ (۱۴۰)

اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۵۳ میں آچکی ہے۔

ان آیات میں صرف بُت سازی کی فرمائش کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ان کی گوسالہ پرستی کا ذکر اس طرح

آیا ہے۔

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ خَلْقِهِمْ عَجَلًا جَدًّا ۚ إِنَّهُمْ يَبْرُونَ ۚ إِنَّهُمْ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۚ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ۝

گو سالہ پرستی

بہر حال، موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں اُس کی قوم نے اپنے زیورات وغیرہ گلا کر بچھڑے کا ایک دھڑا سا بنایا۔ (یعنی اس قسم کی طلائی مورقی بنالی جس کی پرستش اہل مصر کیا کرتے تھے۔ سامری نے اُس میں ایسی کاریگری رکھ دی (پتھر) کہ اس میں سے ہوا سے گائے جیسی آواز نکلتی تھی۔ تو ہم پرست، جاہل قوم کے لئے، یہی چیز، اس جسدِ بے جان کو معبود تسلیم کرنے کے لئے کافی تھی حالانکہ اگر وہ ذرا بھی عقل و خرد سے کام لیتے تو یہ حقیقت اُن پر واضح ہو جاتی کہ وہ ”معبود“ اُن سے بابتی نہیں کرتا (اُس میں سے صرف ایک بے معنی سی آواز نکلتی ہے۔ اور وہ آواز ہمیشہ ایک ہی جیسی ہوتی ہے) نہ ہی وہ کسی معاملہ میں اُن کی راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن، اس کے باوجود، انہوں نے، اس بچھڑے کو اپنا دیوتا بنالیا۔ وہ کس قدر راہِ حق سے ہٹی ہوئی قوم تھی۔

(ایک مدت کی غلامی نے، اُن سے غور و فکر کی صلاحیتیں اس حد تک چھین لی تھیں، اور اُن میں اس قدر احساسِ کمتری پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے حیوان کے بت کو، اپنے سے افضل سمجھتے تھے اور اُس کے سامنے جھکتے تھے۔ شرک اسی لئے جرمِ عظیم ہے کہ وہ انسان کو اُس کے مندرجہ ذیل سے بہت نیچے گرا دیتا ہے۔)

یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔ وہ جب واپس آئے تو:

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا ۚ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي ۚ مِنْ بَعْدِي ۚ أَعَجَلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۖ وَ أَلْقَى الْأُلُوحَ ۚ وَ أَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجْحَدُ ۚ قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضَعُّفُونِي ۚ وَ كَادُوا يَقْتُلُونَنِي ۚ فَلَا تُشْمِتُ بِيَ الْأَعْدَاءَ ۚ وَ لَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي ۚ وَ لِأَخِي ۚ وَ ادْخُلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَ أَنْتَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ۝

جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف واپس آیا تو اُسے ان کی حماقت پر، غصہ بھی آیا، اور افسوس بھی ہوا۔ اُس نے اُن سے کہا کہ تم نے میری عدم موجودگی میں جو کچھ کیا ہے، بہت بُرا کیا ہے۔ مجھے یہاں سے

گئے ہوئے کچھ ایسا لمبا عرصہ تو نہیں ہو گیا تھا کہ تم بایوس ہو گئے اور خدا کے غضب کو آدازیں دے دیکر بکلیا۔ (۱۴۹)۔

پھر اُس نے الواحِ تورات کو ایک طرف رکھ دیا، اور (غصے میں) اپنے بھائی کے بال پکڑ کر کھینچے (۱۵۰)۔ بھائی نے کہا کہ (مجھ پر اس طرح ناراض نہ ہو۔ میری بات سن لو۔ میں نے انہیں اس بات سے اس لئے زبردستی نہیں روکا کہ تو اُکڑ کہے گا کہ تم نے قوم میں تفرقہ پیدا کر دیا، اور میری واپسی کا انتظار تک نہ کیا (۱۵۱)۔ میں نے انہیں، سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے میری نرمی کو) میری کمزوری پر محمول کر لیا۔ قریب تھا کہ یہ مجھے قتل ہی کر ڈالتے۔ سو تم اب یہ تو نہ کرو کہ مجھے بھی ان سرکش مجرموں کے زمرے میں شامل کر لو، اور میرے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کرو جس سے ہمارے دشمن ہم پر ہنسیں (۱۵۰)۔

(جب موسیٰ اس طرح حقیقتِ حال سے باخبر ہوا تو اُس نے) کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھ سے اور میرے بھائی سے جو خطا ہو گئی ہو، اُس سے ہماری حفاظت کا سامان ہم پہنچا۔ اور اپنی نظرِ غیبت کو بدستور، ہمارے شامل حال رکھ۔ اس لئے کہ تجھ سے بڑھ کر سامانِ رحمت و عاطفت ہم پہنچانے والا اور کون ہے؟ (۱۵۱)

ان آیات کے درمیان بنی اسرائیل کی توبہ کا ذکر ہے:

وَلَمَّا سَقَطَ فِيْ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنْهُمْ قَدْ ضَلُّوْۤا قَالُوْۤا لَیْسَ لَہُمْۙ ۴
۱۴۹ یَرْحَمُنَا رَبُّنَا وَیَغْفِرْ لَنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

جب (موسیٰ) کے سمجھانے سے انہوں نے اپنے کئے پر غور کیا تو) اُس پر سخت نادم ہوئے اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ سخت غلطی کر بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ اگر ہمارے نشوونما دینے والے نے ہم پر مہربانی نہ کی، اور ہماری اس حماقت کے تباہ کن نتائج سے ہمیں محفوظ نہ رکھا، تو ہم یقیناً سخت نقصان میں رہیں گے۔

مطالب الفرقان جلد دوم میں یہ واقعات صفحات ۲۵۶ تا ۲۵۹ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کے

بعد ہے:

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسٰی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاُلُوْحَ ۖ وَفِیْ نُسْخٰتِہَا هُدًی وَّرَحْمَۃٌ ۴
۱۵۲

لَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ۝

اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو اُس نے تختیوں کو اٹھایا جس پر وحی منقوش تھی۔ جو کچھ اُن پر لکھا تھا، اس میں، اُن لوگوں کے لئے جو قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف ہوں صحیح راستے کی طرف راہنمائی اور سامانِ رحمت تھا۔

آیات (۱۵۳-۱۵۴) میں ان کی سزا کا ذکر ہے :

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ۝ وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا أَنَّ رَبَّكَ مِّنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

اس پر خدا نے کہا کہ تم دونوں سے ہم نے درگزر کیا۔ لیکن جن لوگوں نے بھڑے کی پرستش کی تھی، انہیں، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق سزا ملے گی۔ انہوں نے اپنے آپ کو بے جان حیوان سے بھی زیادہ حقیر سمجھا، اس لئے وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہوں گے (۱۵۳)۔ ہم افترا پردازوں کو اُن کی بد عملی کی اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں (۱۵۴)۔

لیکن جن لوگوں سے (سہواً) کوئی لغزش ہو جائے، اور اس کے بعد، وہ پھر اپنے مقام کی طرف لوٹ آئیں (اپنے کئے پر نادم ہوں اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لیں)۔ اور خدا کے ضابطہٴ حیات کو اپنا نصب العین بنالیں۔ تو تیرے نشو و نما دینے والے کے قانونِ ربوبیت میں، اُن کی حفاظت اور رحمت کی گنجائش ہے۔

اس سزا کی تفصیل واقعہٴ سبت کے ضمن میں سامنے آئے گی جس کا ذکر چند آیات بعد کیا گیا ہے۔

﴿﴾

سورۃ بقرہ (آیت ۲۵) میں ہے کہ ان لوگوں نے حضرت موسیٰ سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا کو بے نقاب دکھانا چاہتے ہیں۔ اس پر کیا ہوا، اس کی تفصیل مطالبِ الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۷۷ پر گزر چکی ہے۔ اسی واقعہ کو آیہ

درج ذیل میں دہرایا گیا ہے۔ فرمایا:

وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ سَرَجًا لِّإِيْقَاتِنَا فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

﴿ ۷ ۱۵۵ ﴾

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُمْ مِنْ قَبْلِ وَآيَايَ أَتَهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ۝

خدا کو یہ نقاب دیکھنے کا مطالبہ | اور موسیٰؑ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقرر کردہ وقت کے لئے چنے (۲/۵۶) جب انہیں سخت زلزلہ نے آپڑا تو

موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! اگر تو چاہتا تو مجھے اور ان لوگوں کو اس سے پیشتر ہی (جب ان لوگوں نے یہ سوال کیا تھا۔ ۲/۵۶) ہلاک کر دیتا۔ (لیکن جب تو نے ایسا نہ کیا تو اس سے ظاہر ہے کہ تیری مشیت یہی تھی کہ ہم اس طرح ہلاک نہ ہوں۔ تو اب) کیا تو اس بات کی وجہ سے جو ہم میں سے کچھ بیوقوف لوگ کر بیٹھے ہیں، ہمیں ہلاک کر دے گا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ انگیزی، ہماری ہلاکت کے لئے نہیں، بلکہ یہ دیکھنے کے لئے ہے کہ ہم میں حوادث برداشت کرنے کی کس قدر صلاحیت آچکی ہے۔ (ناکہ ہم اپنے متعلق کسی غلط انداز سے میں نہ رہیں)۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے مقامات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ایسے نازک کہ غفل و فکر سے کام نہ لینے والے لوگ، انہی سے غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کا قدم صحیح راستے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔

بہر حال، تو ہمارا کارساز اور سرپرست ہے جو غلطی ہو گئی ہے اس کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت اور رحمت کا سامان کر دے۔ اس لئے کہ سب سے بہتر سامان حفاظت عطا کرنے والا تیرا ہی قانون ربوبیت ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی اس درخواست کا باقی حصہ اگلی آیت میں ہے، اور اس کے ساتھ، خدا کی طرف سے جواب جو آیت (۲/۱۵۶) تک چلا گیا ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے گزارش کیا کہ:

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هَذَا نَا إِلَيْكَ قَال عَذَابِي أَصِيبُ بِهِ مِنْ أَشْيَاءٍ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَا كُتِبَ لِلَّذِينَ يُتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝

حضرت موسیٰؑ کی درخواست | اور ہمارے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشگواریاں پیدا کر دے اور مستقبل کی زندگی میں بھی۔ اس لئے کہ ہم تیری طرف رجوع کر رہے ہیں۔

اس پر خدا نے کہا کہ میری طرف سے تباہی میرے قانونِ مشیت کے مطابق صرف اُس پر آتی ہے (جو میرے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ ورنہ) میرا عام پروگرام یہی ہے کہ کائنات کی ہر شے، نشوونما حاصل کر کے، اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ (تم دیکھتے ہو کہ خارجی کائنات میں میرا یہ نظام ربوبیت و رحمت کس طرح کارفرما ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں) یہ ربوبیت انہیں مل سکتی رہے جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہیں اور دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں، یعنی وہ لوگ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھیں۔

یہ تھا جو ہم نے موسیٰؑ سے کہا۔

اس میں چار اہم نکات سامنے آتے ہیں:

- ۱۔ دنیا اور آخرت کی حسنت (خوش گواریاں)
- ۲۔ رحمتِ خداوندی کی وسعت اور عالمگیریت۔
- ۳۔ انسان اپنے اوپر مصائب آپ لاتا ہے۔
- ۴۔ رحمتِ خداوندی کے مستحق کون لوگ ہیں۔

دنیا اور آخرت میں حسنت کے موضوع پر، مطالب الفرقان جلد اول (صفحات ۱۵۰-۱۴۹) اور جلد سوم صفحہ ۲۵ دیکھئے۔ دین (نظامِ خداوندی) کا حاصل ہی یہ ہے۔ دنیاوی خوش گواریوں سے وہ رہبانیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اور اُخروی خوش گواریوں سے سیکولرازم کی۔

رحمتِ خداوندی کے قرآنی مفہوم کے لئے مطالب الفرقان جلد اول (صفحہ ۲۰) دیکھئے۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ یہ رحمت کس طرح پوری کائنات کو محیط ہے۔

انسان اپنے آپ کو اس رحمت سے محروم کر کے، کس طرح مصائب کا شکار اور تباہیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے لئے سابقہ جلدوں میں تقدیر اور مکافاتِ عمل کے عنوانات دیکھئے۔ بالخصوص مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۲۲۰) جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مصیبتیں انسان کی اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔

چوتھے نکتہ کے متعلق مختصر سا اشارہ زیر نظر آیت میں دیا گیا ہے۔ لیکن تفصیل اگلی آیت میں آئی ہوئی ہے ہم دونوں آیات کا مفہوم یکجا بیان کریں گے۔ واضح رہے کہ آیت نمبر (۱۵۶) میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے مخاطب حضرت موسیٰؑ معلوم نہیں ہوتے کیونکہ اس میں توراۃ کے ساتھ انجیل کا بھی ذکر ہے۔ اس کے مخاطب

نبی اکرمؐ کی مخاطب قوم، یا اقوام ہیں جن میں بنی اسرائیل (یہودی) بھی شامل ہیں۔ اس کی تائید آیت (۱۵۸) سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ اس رحمت کے سزاوار وہ لوگ ہوتے ہیں:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُ وَنَدًا مَكْتُوبًا عِنْدَ هُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَا مَرْهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

اتباع رسول اکرمؐ (ہمارا یہ قانون، سابقہ انبیاءؑ کی وساطت سے بھی ملتا رہا، اور اب یہی قانون اس رسولؐ کی معرفت آیا ہے۔ اس لئے اب ہماری ربوبیت اور رحمت ان لوگوں کے حصے ہیں

آئے گی، جو نظام ربوبیت قائم کرنے کے لئے اس رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلیں گے جو (قرآن سے پہلے) اُمّی تھا (۲۹) جس کی علامات (یہود و نصاریٰ)، اپنے ہاں، تورات اور انجیل میں لکھی پاتے ہیں۔ وہ اُن باتوں کا حکم دیتا ہے جسے وحی خداوندی صحیح تسلیم کرتی ہے، اور اُن امور سے روکتا ہے جو اس وحی کی رو سے ناپسندیدہ ہیں۔ اسی وحی کی رو سے وہ زندگی کی تمام پاکیزہ، خوشگوار چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے، اور اُن جنائث کو حرام ٹھہراتا ہے۔ (جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے ۴)۔ اور (مذہبی پیشواؤں کے جن خود ساختہ اُئین و شرائع اور مستبد حکام کے جو دستم کے) جس بوجھ کے پیچھے انسانیت دبی چلی آرہی تھی، اُس بوجھ کو اُس کے سر سے اتارتا ہے۔ اور (تقلید و اوبام کی جن زنجیروں میں، انسانی قلب و باغ جکڑا ہوا تھا) ان زنجیروں کو توڑتا ہے (۵)۔ اور اس طرح

نوع انسان کو آزادی عطا کرنا ہوا تھا، ان زنجیروں کو توڑتا ہے (۵)۔ اور اس طرح

انسان کو صحیح آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ (حدود اللہ کا پاس رکھتے ہوئے) اپنی سعی و کاوش سے جن بند یوں تک جانا چاہے، چلا جائے۔ اس کے راستے میں کوئی روک نہ ہو۔ قرآن کا نظام، ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ یہ کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ (۶)۔ وہ

ہو سکتا ہے کہ یہ امور حضرت موسیٰؑ ہی سے بطور پیشگوئی کہے گئے ہوں جیسا طرح اُن سے حضورؐ کی آمد اور بعثت کا ذکر بطور پیشگوئی کیا گیا تھا۔ مخاطب کوئی بھی ہو، ان امور کا اطلاق عام ہے۔

قوت کے بل بوتے پر کمزور انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرانا۔ ملوکیت خواہ سابقہ زمانوں کی شہنشاہیت ہو، خواہ عہد حاضر کی ڈکٹیٹر شپ اور خواہ مغربی جمہوریت، سب انسانوں کی حاکمیت کی مختلف شکلیں ہیں اسلام ان سب کے خلاف نعرۃ انقلاب ہے۔ ۲۔ نظام سرمایہ داری۔ یعنی انسانوں کو روٹی کا محتاج بنا کر، اُن سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرانا۔ قرآن اس نظام کی جرّ کاٹنے کے لئے آیا تھا۔ اور ۳۔ مذہبی پیشوائیت۔ یعنی انسانوں کی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اُن سے خدا کے نقاب میں اپنی اطاعت کرانا۔

قرآن کریم غلامی کی ہر نوع کے لئے موت کا پیغام تھا۔ وہ ہر قسم کے اغلال و اہم کو توڑنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے نظام میں، انسان خدا کے احکام کے سوا کسی کا محکوم نہیں رہتا۔ یہی بعثت محمدیہ کا مقصود و مطلوب تھا۔ ۴۔ زکوٰۃ کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے۔ نیز ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کے لئے۔ ۵۔ حلال و حرام کی پوری تفصیل سابقہ جلدوں میں ملے گی (انڈکس دیکھئے)

۶۔ رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لانے والوں کا فریضہ السّٰدین (نظام خداوندی) کا قیام اور استحکام قرار پاتا ہے۔ یعنی ایمان اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کا اتباع ضروری ہے۔ ۷۔ کہا گیا ہے کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) رسول اللہ کی بعثت کی پیشین گوئیاں اپنی کتابوں (تورات اور انجیل) میں موجود پاتے ہیں۔ ان کتابوں میں، زمانہ نزول قرآن تک میں بھی تحریف و تنسیخ ہو چکی تھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ”مذہب عالم کی آسمانی کتابیں“ یا مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں دیکھئے)۔ لیکن اس کے باوجود ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے بچے کچھے آثار میں بھی یہ پیش گوئیاں کسی نہ کسی رنگ میں موجود تھیں۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ کا تذکرہ اپنی کتابوں میں مذکور

کتاب سابقہ میں پیش گوئیاں

پاتے ہیں۔ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) بالخصوص یہودی) اس تلاش میں رہتے تھے کہ قرآن کے خلاف اعتراض کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے۔ اگر وہ اپنی کتابوں میں حضور کی آمد کا تذکرہ موجود نہ پاتے، تو وہ حضور کے دعویٰ نبوت کے خلاف طوفان برپا کر دیتے۔ لیکن انہوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ اس زمانے میں ان کتابوں میں یہ تذکرہ موجود تھا۔ اس چودہ سو سال میں، ان کتابوں میں جس قدر تحریف ہوئی ہے اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں بھی اشارات اور تلمیحات کے انداز میں بعض نشانات ملتے ہیں، (مثلاً) تورات کی کتاب استثنائیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کہا: میں اُن کے لئے (یعنی بنی اسرائیل کے لئے) ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا،

اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔ (باب ۷۱ آیت ۹۷)
بنی اسرائیل کے بھائی، بنی اسمعیل تھے۔ اور بنی اسمعیل میں سوائے نبی اکرمؐ کے کوئی نبی نہیں آیا اس لئے اُس میں اشارہ حضورؐ ہی کی طرف ہے۔ اس کتاب میں ذرا آگے چل کر ہے:-

خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیب سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ ان پر جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ (باب ۷۳ آیت ۲)

فاران مکہ کی پہاڑی کا نام ہے۔ اور دس ہزار قدسی وہی ہیں جن کی معیت میں حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ انجیل۔ کتاب متی (باب ۲۱۔ آیات ۴۳-۴۲) میں ہے:-

جس پیچھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پیچھر ہو گیا..... اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے گی، دیدی جائے گی۔ اور جو اس پیچھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰؑ کے بعد خدا کی بادشاہت کا دعویٰ نبی اکرمؐ کے سوا کسی نے نہیں کیا تھا (نیز مرقس ۱۱-۱۲)۔ یوحنا کی انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں سے کہا:

میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بھیجے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔

(۱۴-۱۳)۔ نیز (۱۴-۱۳)

اسل لفظ فار قلیط تھا جس کا ترجمہ انجیلوں کے مختلف نسخوں میں، مختلف کیا گیا۔ میرے پیش نظر بائبل کا وہ اردو ترجمہ ہے جسے برٹش انڈیا بائبل سوسائٹی (لاہور) نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں اس کا ترجمہ ”مددگار“ کیا گیا ہے اور حاشیہ میں ”وکیل یا شفیع“ لکھا ہے۔ اور اسی باب کی آیت ۲۶ میں ”مددگار یعنی روح القدس“ لکھا ہے۔ اس کے سوا بھی باب میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں سے کہا:

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار

تمہارے پاس نہیں آئے گا (یہاں بھی حاشیہ میں وکیل یا شفیع لکھا ہے)

عیسائیوں کی چار مروجہ انجیلوں کے علاوہ ایک اور انجیل بھی ہے جسے ”انجیل برنباس“ کہتے ہیں۔ (برنباس

بھی حضرت عیسیٰؑ کے ایک معزز حواری تھے)۔ یہ انجیل قدرے غیر معروف معلوم ہوتی ہے (اس لئے عیسائی اسے مستند تسلیم نہیں کرتے بطالب الفرقان

انجیل برنباس کی شہادت

(قرآن مجید) کے اتباع سے۔ اگلی آیت میں اسے نکھار کر بیان کر دیا کہ رسالت محمدیہ، تمام نوع انسان کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس لئے اب انسانیت کے منزل مقصود تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ فرمایا :

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ مَا فَاِمْتُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ
النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

۱۵۸

خدا کے آخری رسولؐ

اسے رسولؐ (تم تمام نوع انسان سے پکار کر کہہ دو کہ میں (قبائل و اقوام کی قوموں، اور نسلی، وطنی اور مذہبی گروہ بندیوں کی حدود سے بلند ہو کر) پوری کی پوری انسانیت کی طرف خدا کا پیغام بر بن کر آیا ہوں)۔ اُس خدا کا پیغام جس کی حکومت کا تختِ اجلال تمام کائنات میں بچھا ہوا ہے، جس کا قانون ہر جگہ کا رہا ہے۔ اُس کے سوا کائنات میں کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ افراد اور اقوام کی زندگی اور موت کے فیصلے اُسی کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں۔ لہذا تم (اپنے اپنے غلط عقائد و تصورات کو چھوڑ کر) اُس خدا پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے رسولؐ پر جو { (قرآن سننے سے پہلے ۲۹) } اُمی تھا۔ وہ خود بھی سب سے پہلے، خلیفہ اور اُس کی طرف سے نازل کردہ قوانین پر ایمان لایا ہے۔ تم، ان قوانین کو عملاً مشکل کرنے کے لئے اس رسولؐ کے پیچھے پیچھے چلو۔ بس یہی ایک راستہ ہے جو تمہیں کامیابی کی منزل تک لے جائے گا۔

ہم اسے ہاں، مسئلہ ختم نبوت پر بھی لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ (اللہ الحمد کہ — مرزا غلام احمد کے متبعین کو قانوناً دائرۃ اسلام سے خارج قرار دینے کے بعد بحثوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا)۔ میں سمجھتا ہوں کہ (دیگر آیات کے علاوہ) صرف یہ ایک آیت اس موضوع پر قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے جس رسولؐ کی رسالت ”جمع نوع انسان“ کے لئے ہو، اس کے بعد انسانوں کی طرف کسی اور رسولؐ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

❦

آیت (۱۵۸-۱۵۹) تک حضرت موسیٰؑ کا تذکارِ جلیلہ، اور اسی ضمن میں داستانِ بنی اسرائیل مسلسل آ رہی تھی۔ درمیان میں تین آیات (۱۵۸-۱۵۹) میں نبی اکرمؐ کا ذکرِ مبارک آ گیا جسے اُوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم نے درمیان میں سے آیات (۱۵۸-۱۵۹) کو چھوڑ دیا تھا کہ ان میں ایک الگ حقیقت بیان ہوئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ان آیات پر بھی غور کر لیا جائے۔ اور اسکے بعد

اُگے بڑھا جائے۔ پہلے آیات ۴۳، ۴۴ کو یکجا لیجئے، کیونکہ ان میں ایک ہی مضمون آیا ہے۔

وَوَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً ۖ وَأَتَمَمْنَاهَا بِعَشْرِ فِتْنَةٍ مُّبَيِّنَاتٍ
رَبِّهِ ۖ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۖ وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي
قَوْمِي ۖ وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِبِيعَاتِنَا
وَكَلِمَةُ رَبِّهِ ۖ قَالَ رَبِّ ارْنِي ۖ أَنْظُرْ إِلَيْكَ ۖ قَالَ لَنْ تَرَ بَنِي ۖ وَلَكِنْ أَنْظُرْ
إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَ بَنِي ۖ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ
جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۖ فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَنَكَ تُبَّتْ إِلَيْكَ
وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ۝

حضرت موسیٰ کی دیدار خداوندی کی آرزو | پھر ایسا ہوا کہ موسیٰ، ہمارے حکم کے مطابق، ایک
دس دن کے لئے اپنی قوم سے الگ ہوا۔ (۲/۵۱)

اُس نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میری عدم موجودگی میں، میری جانشینی کرنا اور قوم کی اصلاح کی کوشش
کرتے رہنا۔ اور دیکھنا! ان میں ایسا شرارتی عنصر بھی ہے جو انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُن کی راہ نہ چلنا۔ اُن سے
مقاط رہنا۔ (۱۴۲)

اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کردہ وقت پر پہنچا، اور اُس کے رب نے اُس سے باتیں کیں، تو وہ (شدتِ شوق
سے بے اختیار پرکار اٹھا کہ) اے میرے پروردگار! تو میرے سامنے بے حجابانہ آجا، تاکہ تیرے دیدار سے میری نگاہ کا میاں
ہو۔ اس نے کہا۔ اے موسیٰ! تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن تو اُس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکرا رہا تو تو مجھے دیکھ
سکے گا۔ سو جب جلالِ خداوندی نے اس پہاڑ پر اپنی نمود کی۔ تو اُس نے اُسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ (۵۹)۔ اور موسیٰ
بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب وہ ہوش میں آیا تو کہا کہ بار الہا! تو واقعی اس سے بہت بلند ہے کہ انسان تجھے دیکھ سکے
میں تیری طرف (ایسے) ہی متوجہ رہوں گا (جیسے تو نے کہا ہے)۔ میں اس حقیقت پر سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں کہ
انسان کے لئے خدا کا دیکھنا محال ہے)

۱۔ یزوت کے مقامات ہیں جن کی حقیقت و ماہیت سے غیر از نبی آشنا نہیں ہو سکتا۔ ان حقائق کو بیان تو ہمارے ہی الفاظ میں کیا
جاتا ہے لیکن ان کی اصل و غایت کچھ اور ہوتی ہے۔ جس طرح ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جبریل، نبی، روحی کس طرح لاتا تھا، اسی طرح ہم
یہ بھی نہیں جان سکتے کہ نبی اور خدا کا تعلق کیا ہوتا تھا۔ ہم نبی کی طرف نازل شدہ وحی کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کے ہم مکلف نہیں۔

حضرت موسیٰؑ سے متعلق ایک خصوصیت خدا سے ہم کلامی کی بتائی گئی ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث مطالب الفرقان جلد سوم - صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۸ پر گزر چکی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ الفاظ کوئی بھی ہوں، مقصد اُن سے وحی خداوندی ہوتا ہے۔ اور چونکہ یہ خاصہ ثبوت سے، اس لئے کوئی خیر از نبی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کی کُنہ حقیقت کیا ہوتی ہے۔ وحی کس طرح نبی پر نازل ہوتی تھی۔ اُس وقت نبی کی قلبی کیفیت کیا ہوتی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہمارا تعلق وحی کے متن سے ہے جسے رسول، دوسرے انسانوں تک، بعینہ انہی الفاظ میں پہنچا دیتا تھا۔ اور غور و فکر سے اسے سمجھا جاسکتا تھا۔ اور سمجھا جاسکتا ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا کو بے حجاب دیکھنے کی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ خدا کیا ہے؟ اس کے متعلق ہم بسیط سے بسیط لفظ بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ وہ ذات برتر از خیال و قیاس و گمان و دہم ہے۔ اس لئے اس کے لئے الفاظ کون سے استعمال کئے جاسکتے ہیں، اس کی جو صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں، ہم انہی کی نسبت سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا ہے، اور ایسا ہے۔ لیکن اُس وہ، کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ چہ جائیکہ اسے آنکھوں سے دیکھا جاسکے۔ اس کے خلاف اُس نے خود کہہ دیا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ..... (پہ)۔ اس کے یہی معنی نہیں کہ اُسے آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ یہاں لفظ ادراک آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بصارت اور بصیرت ہر دو اعتبار سے جیلہ ادراک میں نہیں آسکتا۔ اس لئے اُسے آنکھ سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ————— ہیں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟ یہ سوال بڑا نازک ہے، اس لئے گہرے غور و تدبر کا محتاج ہے۔

زندگی اپنے ابتدائی مراحل طے کرتی، حیوانی سطح تک آئی تو وہ (یوں کہئے کہ خالص) طبیعیاتی (PHYSICAL) یا مادیاتی (MATERIAL) تھی، اس لئے اس کی دنیا محسوسات تک محدود تھی۔ اس کے تقاضے بھی اسی حد تک محدود تھے، اور اس کی خواہشات بھی وہیں تک محصور۔ لیکن جب یہ پیکر انسانی میں پہنچی تو اس میں ایک بنیادی تبدیلی آئی۔ اس کا جسم اور اس کے تقاضے تو طبیعیاتی سطح پر تھے۔ لیکن اسے ایک اور شے بھی عطا ہوئی تھی، جسے اس کی ذات، نفس یا خودی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ غیر مادی ہے، اس لئے محسوسات کے دائرے میں آ نہیں سکتی اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ چھو سکتے ہیں۔ یعنی اس کا

وجود ہے، لیکن محسوسات سے ماوراء۔ اس حد تک دیکھئے تو یہ صفت خداوندی کی حامل ہے۔ اس کا بھی وجود ہے، لیکن محسوسات سے ماوراء۔

مادیت سے اس قدر ماوراء ہونے کے باوجود، نفس انسان کا فرد متعلقہ کے مادی جسم سے تعلق لایفک ہے۔ وہ اپنے تمام فیعلوں کو انسانی جسم کی وساطت سے بروئے کار لاتا ہے۔ جسم انسانی کے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہونے کے باوجود نفس انسانی، انسانی جسم کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ لیکن انسان کو کچھ اور صلاحیتیں بھی دی گئی ہیں۔ (مثلاً) قیاس۔ تخیل۔ تصور وغیرہ۔ فوق الطبیعیاتی حقائق (REALITIES) کو تشبیہات اور تشبیلات کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے تو انسان، اپنے تخیل اور تصور کی رو سے انہیں محسوس قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اُس کی تسکین نہیں ہوتی وہ غیر محسوس حقیقت کو، لباس مجاز میں دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔ اور شدت سے آرزو۔ انسان کی اس شدت آرزو کا نتیجہ تھا کہ اُس نے خدا کو اوزاروں کی شکل میں ڈھال دیا۔ اور ان کے بعد ان کے محسوس کی پرستش شروع کر دی۔ یوں بت پرستی کی طرح پڑ گئی۔ دنیا کا قریب قریب ہر مذہب (خواہ وہ عام طور پر متعارف ہو یا غیر معروف) اسی توہم پرستی کا شکار ہے۔ وہ خدا کو کسی نہ کسی محسوس شکل میں دیکھتا ہے۔ اسی سے اس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔

خدا اور انسان

قرآن کریم نے اس توہم پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اُس نے خدا کا ایسا فوق الطبیعیاتی مندرجہ تصور پیش کیا، جو کسی محسوس قالب میں ڈھال ہی نہیں سکتا۔ اُس نے منسوب بھی ایک محسوس شے اپنی طرف کی۔ یعنی بیت اللہ (کعبہ)، لیکن وہ ایسا ہے جو بت کی شکل اختیار ہی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک کسی انسان کے خدا بنا دینے کا تعلق ہے، اس کے لئے حضور نبی اکرمؐ کی طرف بھی نگہ عقیدت اٹھ سکتی تھی۔ قرآن کریم نے حضورؐ کی شہرت کو اس وضاحت و صراحت اور اصرار و تکرار کے ساتھ پیش کیا کہ آپؐ کے (خدا ہونے کا تو ایک طرف) فوق البشر ہونے کا تصور بھی ختم کر دیا۔ (مسلمانوں نے بعد میں کیا کیا، وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کے لئے میری کتاب ”تصوف کی حقیقت“ دیکھئے، یا سابقہ جلدوں میں ”غلو“ کا عنوان۔ میں یہاں کتاب اللہ کی بات کر رہا ہوں نہ کہ مسلمانوں کے عام عقائد کی)۔

فوق الفطرت حقیقت کو لباس مجاز میں دیکھنے کی یہی شدت آرزو تھی جو اس استدعا کی شکل میں حضرت موسیٰؑ کی زبان پر بخاشہ آگئی کہ رَبِّ اَسْرِ بِنِيْ اَنْظُرُ اَيْلَاكَ (۱۴۱)۔ ادھر سے یہ استدعا زبان پر آئی اور ادھر سے کسی توقف اور تاثر کے بغیر یہ جواب کہ لَنْ تَرٰ سِنِيْ (۱۴۲) ”تو مجھے نہیں دیکھ سکتا“ ملے۔

لے خدائے تو اپنے متعلق یہ کیا کہ کوئی انسانی آنکھ اُسے دیکھ نہیں سکتی۔ ہم نے اس باب میں کس قدر غلو کیا، اسکے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۲۷۸ دیکھئے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ کے ساتھ کیا گزری اور پہاڑ پر کیا بیٹی، یہ معاملات ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اس قسم کے واقعات کا تعلق نہ احکام سے ہوتا ہے نہ راہنمائی سے۔ اس لئے اگر یہ ہماری سمجھ میں نہ بھی آئیں تو اس سے قرآنی راہنمائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ (جہاں تک پہاڑ کے متزلزل ہونے کا تعلق ہے، اس کا ذکر سورہ حشر کی آیت ۲۷ (۵۹/۲۱) میں بھی آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ ”اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ اس پر کس طرح لرزہ طاری ہو جاتا“ لیکن وہیں کہہ دیا گیا ہے کہ وہ محض تشبیلی بیان ہے)۔

نبی کی بشری حیثیت | ہمارے لئے اس واقعہ میں ایک ہی نکتہ موجب موعظت ہے۔ اور وہ ہے نبی کی نبوی اور بشری حیثیت میں فرق۔ نبی کو حقائق کا علم وحی کے ذریعے ہوتا تھا۔ جو حقائق اسے بذریعہ وحی نہیں بتائے جاتے تھے، یا جب تک بتائے نہیں جاتے تھے، اُن کا اسے علم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن عام معمولات میں وہ اپنے معاشرہ ہی کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اور اس سے اُسے صرف وحی منفرد کرتی تھی۔ حضرت موسیٰ کے دل میں اگر خدا کو بے نقاب دیکھنے کی آرزو ابھری تو یہ بہ تقاضائے بشریت تھی۔ وحی نے فوراً بتا دیا کہ خدا محسوسات کا پیکر اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اس سے بلند و بالا اور منزہ ہے۔ اس کے بعد ایسی آرزو کبھی اُن کے لب پر نہیں آئی۔

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ خدا کو بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ قوم موسیٰ نے بھی کیا تھا اور اس کی استدعا حضرت موسیٰ نے بھی کی لیکن دونوں میں بنیادی فرق تھا۔ قوم بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ اِنَّا نُرِىٰكَ حَتّٰی نَرٰی اللّٰهَ جَهْرَةً (۲/۵۵)۔ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بے نقاب نہیں دیکھ لیں گے۔ اور یہ ایسی شرط تھی جو کبھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا یہ مطالبہ یا استدعا نہیں تھی۔ جاہلانہ ضد تھی۔ اس کے برعکس جب حضرت نے اس کی استدعا کی اور وہ پوری نہ ہوئی تو انہوں نے فوراً کہا کہ اِنَّا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۴۴/۱)۔ میں سب سے پہلے اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ خدا کی ذات ایسی ہے جسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ یہ ہوتا ہے فرق ضد پر مبنی مطالبات اور حسن نیت پر مبنی درخواستوں میں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ کو اُن کے مقام بلند سے آگاہ کیا اور ضروری احکامات وحی فرمائے:

قَالَ يٰمُوسٰى اِنِّىْ اصْطَفَيْتُكَ عَلٰى النَّاسِ بِرِسَالَتِىْ وَ بِلَا مِىْ ۙ فَخُذْ مَا اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝

اللہ نے کہا کہ اے موسیٰ! میں نے تجھے دوسرے لوگوں سے ممتاز کیا ہے، دو باتوں میں —
ایک یہ کہ تجھ سے میں نے باتیں کی ہیں (یہ نبوت ہے)، اور دوسرے یہ کہ تجھے اس پر مامور کیا ہے کہ جو کچھ تم
کہا گیا اُسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ (یہ رسالت ہے) لہذا جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے — یعنی احکام
خداوندی — اُسے مضبوطی سے تھامے رہو اور (ان پر عمل پیرا ہو کر) ان برگزیدہ لوگوں میں سے ہو جاؤ جنکی
محنتیں بھرپور نتائج پیدا کیا کرتی ہیں۔

الواح حضرت موسیٰ | اُس زمانے کے معمول کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے ان احکام کو تختیوں پر لکھ
لیا تھا محققین آثارِ قدیمہ کو اُس زمانے کے کھنڈرات سے ایسی مٹی کی (بریاں)
تختیاں ملی ہیں جن پر تحریریں منقوش ہیں۔ واضح رہے کہ یہ نہیں تھا کہ خدا آسمان سے لکھی لکھائی تختیاں نازل کیا
کرتا تھا یا کرتا ہیں۔

حضراتِ انبیاء کرام خدا کی وحی کو اس طرح محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ فرمایا:

وَكُتِبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَابِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً وَ تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۖ
فَخَذَهَا بِقُوَّةٍ وَأَمَرَ قَوْمَكِ يَا خُذُوا بِأَحْسَنِهَا سَأُوْرِيكُمْ
دَاسِرَ الْفَاسِقِينَ ۝

۷
۱۳۵

اور ہم نے ان تختیوں پر (جن پر موسیٰؑ نے وحی لکھی تھی) دین کے ہر گوشے سے متعلق احکام اور اخلاقی قدریں
صاف صاف بیان کر دی تھیں۔ (یعنی ہم نے ان امور کو موسیٰؑ پر وحی کیا اور موسیٰؑ نے انہیں، اس زمانے کے قاعدہ
کے مطابق، تختیوں پر نقش کر لیا) ہم نے موسیٰؑ سے کہہ دیا کہ (وہ بھی انہیں ہر وقت پیش نظر رکھے) جو معاملہ
سامنے آئے، یہ دیکھے کہ ان احکام میں سے کونسا حکم اُس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اُس کا اتباع
کوے (۲۹)۔ (اگر تمہاری قوم نے ایسا کیا تو) وہ بہت جلد دیکھ لے گی کہ ان کے مطابق عمل کرنے سے
کیسے خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں اور، ان کے خلاف چلنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

انہی کے متعلق کہا:

سَأُصْرِفُ عَنْ إِلَٰهِي الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا
كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا
وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّبِعُوهُ سَبِيلًا ۖ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا

۸
۱۳۶-۱۳۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

انڈکس

مطالب الفرقان جلد پنجم

مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدوں کا انڈکس جلد سوم کے آخر میں شائع کیا گیا تھا اور جلد چہارم کا انڈکس اُسی جلد کے آخر میں۔ پانچویں جلد کا انڈکس درج ذیل ہے۔ حوالہ میں جہاں صرف لفظ "انڈکس" لکھا جائے گا اس سے مراد پہلی تین جلدوں کا مشترکہ انڈکس ہوگا۔ باقی جلدوں کے انڈکس کے ساتھ متعلقہ جلد کی تصریح کر دی جائے گی۔ آپ کو جس موضوع کی بھی تلاش ہو بہتر ہوگا کہ آپ اسے تینوں انڈکسوں میں دیکھ لیں۔ جب یہ تفسیر مکمل ہو جائے گی تو اس کے تمام انڈکس جامع طور پر یک جا کر دیئے جائیں گے۔ وہ تمام قرآن کریم کا جامع انڈکس ہوگا۔

انڈکس میں بائیں جانب سورۃ کا نمبر ہے اور دائیں جانب آیت کا نمبر۔ مثلاً (۳۸: ۴) سے مراد ہے چوتھی سورۃ کی اڑتیسویں آیت۔ دس علیٰ ہذا۔

۲۔ انڈکس کے حوالوں میں کہیں غلطی نظر آئے تو اس سے ہمیں مطلع فرمائیں۔

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۱۴۹	۴: ۱۰۲	رکت (ابراہیمی کا اتباع)			الف آرٹ اور اسلام۔ آل۔ درود میں آل کا اضافہ۔ ابراہیمؑ (حضرت) کی دشمنانِ جہات۔ والد کو تنبیہ۔ خلائق کا ثناء کا مشاہدہ ہتیارہ پرستی کے خلاف مفسرین کی غلط فہمی
۶۲	۴: ۸۵-۸۹	ذریت (ابراہیمی اور انبیاء ماسبق)	۱۸۳	۷: ۳۲	
۱۵۷	۷: ۱۰۲	اتباع اور اطاعت میں فرق۔	۶۵	۶: ۹۱	
		اجر رسالت	۵۳	۶: ۷۵	
۶۵	۶: ۹۱	رسولِ اجر رسالت نہیں مانگتے تھے { مؤدۃ فی القربی کا مفہوم	۶: ۷۹	۶: ۷۹	

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۱۰۳	۱۱۸-۱۱۷:۶	اکثریت کی تائیدِ حق کا معیار نہیں ہو سکتی	۱۵۱	۱۶۶:۶	اختیارات سے ذمہ داریوں کی پرکھ ہوتی ہے
۱۲۳	۱۳۲-۱۲۹:۶	إلا ما شاء اللہ کا مفہوم -	۲۰	۳۹:۶	آخری زندگی اور قرآن پر ایمان
		انبیاء		۳۴:۶	لازم و ملزوم ہیں -
۶۴	۹۰:۶	تمام انبیاء اُمت واحدہ کے افراد تھے -	۲۱۴	۵۸:۷	اذن کے معنی قانونِ خداوندی -
۹۹	۱۱۳-۱۱۲:۶	انبیاء کی دعوت کے دشمن -			ارتقاء
۱۰	۱۲:۶	انسان کے اور خدا کے صاحب {	۲۵	۳۸:۶	نظریۂ ارتقاء کا بنیادی اصول -
		اختیار ہونے میں فرق {	۵۴	۹۹:۶	مستقر و مستودع -
۲۲	۳۵:۶	انسانی اختیار سلب کر کے ایمان لانے پر مجبور کرنا مشیتِ خداوندی نہیں ہے {	۴۵	۶:۶	اربابِ اقتدار کے بگڑنے سے {
		اولیاء اللہ			ساری قوم بگڑ جاتی ہے {
		یہ عقیدہ کہ اولیاء اللہ خدا کی عقل ہیں {	۵	۳:۶	ارض و سماء میں اللہ -
۹۰	۱۰۳-۱۰۲:۶	شریک ہوتے ہیں - باطل ہے {	۱۳۸	۱۰۱:۶	استہزاء کا انجام -
		ایقو کے متعلق ضمنی اشارہ -	۱۴۱	۴۸-۷۰:۶	اسلاف کے مسلک کا اتباع -
۷۹	۹۴:۶	ایمان	۱۲۲	۱۲۶-۱۲۸:۶	اسلام کے لئے شرحِ صدر کی ضرورت
		ایمان عقل و فکر کی رُو سے لایا جاتا ہے	۱۵۰	۱۶۳:۶	اسلام کسے کہتے ہیں -
۲۴	۳۶:۶	ایمان بلا عمل -	۲۰۲	۱۶۴:۷	اعراف کا مفہوم -
۱۴۵	۱۵۹:۶	انسان کو ایمان لانے پر مجبور کرنا {	۴۲	۶۱-۶۲:۶	اعمال نامہ کی تفصیل -
۲۳	۳۵:۶	خلافتِ مشیتِ خداوندی ہے {	۴۲۰	۱۴۷:۷	اقتدار بغیرِ حق جرم ہے -
	۱۰۸:۶	دل مانتا ہے، لیکن جھوٹی عزت کا	۴	۲:۶	اقوام (اور افراد) کی موت و حیات
۳۳	۱۰۱:۷	خیالِ اعتراف نہیں کرتا {	۱۲۶	۴-۴:۶	اقوام سابقہ کا انجام -
			۱۶۲	۲۵-۲۴:۶	(نیز دیکھئے قوم)
			۱۶۲	۵:۷	اقوام سابقہ کی تباہی -
			۱۶۴	۶:۷	رتبہ ہی سے پہلے دو شرائط کا پورا ہونا)

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۸۹	۶:۱۰۱	توہم پرستیاں۔	۷۸	۶:۹۳	برکت کے معنی۔
۱۲۸	۶:۱۳۴ تا ۱۴۱	توحید سے خوف مٹ جاتا ہے۔	۲۰۸	۷:۱۵۷	بنی اسرائیل کے لئے نبی اکرم پر ایمان لانا ضروری ہے۔
۷۹	۶:۸۱ تا ۸۲	تھیا کر لسی سنگین ترین جرم۔	۱۹۰	۷:۳۴	بہائیوں کی گمراہی۔
۷۹	۶:۹۴		۱۳۸	۶:۱۵۲	بے حیائی کے خلاف۔
		ج			ت
۱۳۸	۶:۱۵۲	جان	۲۸	۶:۶۸ تا ۷۰	تباہی کی دو شرائط: ہدایت پہنچ چکی ہو اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو
۲۸	۶:۴۴	برائسانی جان کیسا واجب الاخرام ہے	۸۶	۶:۱۲۹ تا ۱۳۲	تخلیق انسانی نفس واحدہ سے تسبیح کا مفہوم۔
۱۴۸	۶:۱۶۱	جائز ذرائع سے فراوانی عرزق۔	۳۴۱	۶:۹۹	تصریف آیات سے قرآن فہمی۔
۱۴۸	۶:۱۶۱	جرم کی سزا، جرم کے مطابق۔	۹۲	۶:۱۰۶	تفرقہ شرک سے بھی بدتر ہے۔
۱۴۸	۶:۱۶۱	(رفقہ کا ناقابل بیان فیصلہ)	۲۰۹	۷:۱۵۱	تقدیر
		جمہوریت — (مغربی)	۱۲۳	۶:۱۲۹ تا ۱۳۲	الا ماشاء اللہ کا مفہوم۔
۱۰۳	۶:۱۱۷-۱۱۸	خلافت قرآن ہے۔	۱۳۴	۶:۱۴۹ تا ۱۵۱	اگر خدا کو منظور ہوگا تو۔
۱۰۳	۶:۱۱۷-۱۱۸	جمہوریت کی تاریخ۔	۱۴۸	۷:۲۸	تقدیر اور تقلید دونوں خلاف قرآن۔
۱۰۳	۶:۱۱۷-۱۱۸	جمہوریت مغرب میں بھی غیر مقبول ہو رہی ہے۔	۱۴۵	۶:۱۵۹	توبہ
۹۹	۶:۱۱۳-۱۱۴ اور ۱۲۲-۱۲۳	جن و انس کا اجتماع۔	۳۵	۶:۵۴	تباہی سامنے آجانے کے بعد توبہ بے معنی ہے۔
۱۹۷	۷:۴۴-۴۳	جنت — اہل جنت کے دلوں سے غل کا دور ہو جانا			جہالت سے غلط اقدام اور توبہ
۱۹۹	۷:۴۴	جنت — اہل جنت و جہنم کا مکالمہ			
۱۳۸	۷:۱۵۲	جنسی خواہش پر ضبط۔			
۱۹۲	۷:۳۷	جہنم میں قوموں کا مکالمہ۔			

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۱۰	۴:۱۲	خدا۔ اور انسان کے اختیار میں فرق۔	۱۵۱	۴:۱۴۵	حاکم اور رب کا باہمی تعلق۔
۹۵	۴:۱۰۸	۱۔ خدا وسعت سے زیادہ	۱۴۸	۴:۷-۹	حبط اعمال۔
۱۵۱	۴:۱۵۳	۲۔ مکلف نہیں ٹھہرتا	۱۳۵	۴:۱۲۶	حرام اشیاء۔
۱۰	۴:۱۲	۳۔ نے اپنے آپ پر پابندیاں	۸۷	۴:۳۲	حرام و حلال کی فقہی فہرستیں۔
۱۰	۴:۱۲	۴۔ عائد کر رکھی ہیں	۱۳۱	۴:۱۲۲-۱۲۵	حقوق اللہ و حقوق العباد۔
۸۹	۴:۱۰۲	۵۔ کی اولاد کا عقیدہ۔	۹۲	۴:۹۰	حکم۔ کتاب۔ نبوت۔
۹۰	۴:۱۰۳-۱۰۴	۶۔ اس کی بیوی ہی نہیں پھر	۳۹۸	۴:۱۲۸-۱۲۹	حکومت (وراثت ارض) کا قانون۔
۱۰	۴:۱۲	۷۔ اولاد کیسے ہو سکتی ہے	۵۹	۴:۸۱-۸۲	حکومت صرف اللہ کی ہے
۲۶	۴:۴۱-۴۳	۸۔ کا اور اک کوئی آنکھ نہیں کر سکتی۔	۱۰۱	۴:۱۱۵	حلال و حرام کی فقہ کی مرتب کردہ
۵۰	۴:۷۱-۷۲	۹۔ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔	۱۳۵	۴:۱۲۴-۱۲۸	فہرستیں۔
۲۶	۴:۴۱-۴۳	۱۰۔ کی ہمسرتوں ہیں۔	۱۱۵	۴:۱۲۰	حلال میں سے طیب کھاؤ۔
۵۰	۴:۷۱-۷۲	۱۱۔ کی دعوت کے سوا ہر	۱۱۵	۴:۱۱۹	حلال جس پر اللہ کا نام نہ لیا
۷۴	۴:۹۲	۱۲۔ دعوت گم رہی ہے۔	۱۲۲	۴:۱۲۲	جائے وہ حلال نہیں۔
۷۴	۴:۹۲	۱۳۔ کا صحیح تصور وہی ہے	۱۳۴	۴:۱۴۲	حنیف کا مفہوم۔
۷۴	۴:۹۲	۱۴۔ جسے خود خدا دے۔	۷۹	۴:۹۴	ختم نبوت کے بعد کشف و البام کے مدعی
۴۴	۴:۴۳-۴۹	۱۵۔ خدا مصیبت کے وقت	۳	۴:۱	خدا۔ ”ایسا کرتا ہے“ کا مفہوم۔
۱۵۲	۴:۱۴۴	۱۶۔ یاد آتا ہے۔	۹۵	۴:۱۰۸	انسان کو مجبوراً صحیح راہ پر نہیں چلانا
۱۵۲	۴:۱۴۴	۱۷۔ خلافت فی الارض۔			
		د			خ
۱۲۵	۴:۱۳۳	درجات مطابق اعمال۔			
۴۵	۴:۹۱	دروہ میں آل کا اضافہ۔			

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۳۰	۴:۴۶	{ رزق - حصولِ رزق کی صلاحیتیں خدا کی عطا کردہ ہیں -	۹۳	۴:۱۰۶	درس کے معنی
۱۳	۴:۱۵-۱۸	{ رسولؐ بھی اگر معصیت کا مرتکب ہو تو مواخذہ سے بچ نہیں سکتا	۱۲۶	۴:۱۳۶	{ دعاوی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا ثبوت - محسوس نتائج -
۷	۴:۷-۹	{ رسولؐ کا وحی کے مطابق نظام قائم کرتا تھا -	۲۰	۴:۲۹-۳۴	{ دنیاوی زندگی ہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں -
۳۲	۴:۵۰	{ رسولؐ کا اعلان کہ میرے پاس خزانے نہیں، غیب کا علم نہیں جانتا، فرشتہ نہیں ہوں - میں صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں -	۲۰۴	۷:۵۲	{ دنیاوی واپسی - مرنے کے بعد دنیاوی واپسی نہیں ہوگی -
۴۶	۴:۴۶	{ رسولؐ کا فریضہ راستہ دکھانا ہے، ذیرستی راستے پر چلانا نہیں -	۱۹	۴:۲۵-۲۸	{ دو قومی نظریہ -
۴۸	۴:۴۸-۷۰	{ لوگوں پر قرآن پہنچاتے رہنا -	۱۸۰	۷:۳۰	{ دین شروع سے ایک ہی رہا ہے (شریعت بدلتی ہے)
۵۳	۴:۷۵-۷۶	{ رسولؐ کی بشریت -	۲۳۲	۷:۵۹	{ دین اور دنیا کا ارتباط -
۱۹	۴:۲۵-۲۸	{ رسولؐ کی مجلس میں منافقانہ شرکت -	۴۵	۴:۹۱	{
۲۰	۴:۲۸-۳۴	{ رسولؐ کو جھوٹا نہیں کہتے، وحی کی تکذیب کرتے ہیں -	۳۲۸	۷:۹۶	{
۵۴	۴:۱۰۷	{ رسولؐ کو اتباعِ قرآن کا حکم -	۱۱۵	۴:۱۱۹-۱۲۲	{ ذبح کے وقت خدا کا نام لینا ضروری ہے -
۲۰	۴:۲۹-۳۴	{ رسولوں کی (آخر الامر) کامیابی -	۳۴۱		{ خکر کا مفہوم -
۳۳	۴:۵۱	{ رسولوں کی دعوت پر سب سے پہلے غریب لوگ لبیک کہتے تھے -	۱۵۱	۴:۱۶۵	{ رب صرف خدا ہے -
			//	//	{
			۴:۱۲	۱۰	{ رحمت - خدا نے اپنے اوپر رحمت فرض فراروی -
			۴:۵۴	۳۵	{

آیت	صفحہ	مضمون	آیت	صفحہ	مضمون
۷:۱-۲	۱۵۴	شرح صدر کے معنی۔	۷:۵۲	۳۴	انہیں دھنکارو نہیں۔
۷:۱۵۲	۱۳۸	شُرک مت کرو۔	۷:۲۵	۲۳	رسولؐ نہ ماننے والوں کے غم میں گھلے جاتے تھے۔
۷:۸۳	۷۱	شُرک ظالمِ عظیم ہے۔	۷:۷۹	۲۸	رسولؐ کوئی اجر رسالت نہیں مانگتا تھا۔
۷:۸۱-۸۲	۵۹	شُرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔			رسولؐ کی بعثت کا مقصد۔
۷:۸۳	۷۱	شُرک۔ مومن کہلاتے ہوئے بھی شُرک۔	۷:۱۵۷	۴۸	نورِ انسانی کی غلامی کی زنجیریں توڑنا۔
۷:۸۸	۳۰۹	شیعہ (حضرت)۔	۷:۱۵۸	۴۱۳	حضورؐ تمام نورِ انسانی کی طرف
۷:۱۵-۱۸	۱۴	شفاعت کے غلط مفہوم	۷:۱۲۶-۱۲۸	۱۲۲	رسولؐ ہیں۔
۷:۵۲	۲۰۵				رجس۔
۷:۱۱۳-۱۱۴	۹۸	شیطینِ الانس و الجن۔			
					س
			۷:۲۵	۱۷۶	زمین میں مرنے جینے کا مفہوم۔
۷:۷۴	۲۶۵	صالح (حضرت)۔	۷:۲۶-۲۷	۱۷۶	زیب و زینت کی چیزیں حرام نہیں۔
۷:۷۳	۲۷۵	ناؤ: حضرت صالحؑ۔	۷:۳۱-۳۲	۱۸۱-۸۲	
۷:۷۹	۲۸۸	اسے آیت اللہ کہا گیا۔			س
۷:۵۲	۳۴	صحابہؓ۔ بارگاہِ نبویؐ میں صحابہ کا مقام		۸۶	سائنس (دیکھئے علوم سائنس)
۷:۵۴	۳۵	صلوٰۃ۔ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم		۲۶۳	سعد و نحس کا مفہوم۔
۷:۷۱-۷۲	۵۰	کتاب اللہ کی اطاعت ہے	۷:۷۲	۵	سما۔ ارض و سماء میں اللہ
۷:۹۰	۳۱۷	صلوٰۃ کا مفہوم حضرت شعیبؑ کی زبانی۔	۷:۱۲	۱۰	سنت اللہ اور کلمت اللہ۔
۷:۳۷-۴۰	۵۲	صور کا اجمالی مفہوم۔	۷:۲۸-۳۴	۲۰	سنت اللہ اور کلمت اللہ۔ غیر متبدل۔
					ش

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۳۲	۴:۵۰	غیب - رسول غیب نہیں جانتے تھے۔	۹۷	۴:۱۱۰ ۱۱۲	ضد - ایک دفعہ نہ کرو، پھر اس پر اڑے رہے۔
۳۸	۴:۵۸-۵۹	غیب کے امور			ظ
		ف	۱۲۶	۴:۱۳۶	ظالمین کی جڑ کٹ جاتی ہے۔
۸۱	۴:۹۵	فرادی کا مفہوم۔	۲۹	۴:۴۵	ظاہر و باطن ممنوع سے اجتناب۔
۱۴۷	۴:۱۴۰	فرقہ بندوں کا رسول سے کچھ واسطہ نہیں۔	۱۱۷	۴:۱۲۱	ظاہر احکام شریعت کی اطاعت ضروری ہے۔
۴۷	۴:۹۰	تمام انبیاء اُمت واحدہ کے افرو تھے			ع
۳۰۰		فرعون کی بیوی۔	۲۴۷	۷:۵۹	عاد (قوم)۔
۱۳۷	۴:۱۵۱	فقہاء سند نہیں ہو سکتے۔	۲۵۷	۷:۷۰	وہ مستبصرین تھے۔
۵۴	۴:۷۷-۷۹	قنا اور بقا کا مفہوم۔	۱۴۱	۴:۱۵۳	عدل کی تاکید۔
۱۸۸	۷:۳۳	فواجش کا مفہوم۔	۴۵	۴:۷۵	عذاب کی شکلیں۔
		ق	۷۹	۴:۹۴	علم و بصیرت سے مدارج بلند ہو جاتے ہیں۔
۱۳۸	۴:۱۵۲	قل نفس۔	۸۴	۴:۹۷ ۹۸	علوم سائنس کی اہمیت۔
۲۰	۴:۲۹-۳۴	قرآن (کتاب اللہ و قانون) قرآن اور اخروی زندگی پر ایمان لازم و ملزوم ہیں۔	۵۴	۴:۷۷ ۷۹	
۷۹	۴:۹۴	قرآن کی مثل - مثلاً ومعہ کا عقیدہ	۱۳۸	۴:۱۵۲	عورت کی دیت مرد سے نصف
۹۲	۴:۱۰۶	قرآن کی وضاحت خود خدا نے کر دی ہے۔	۱۴۱	۴:۱۵۳	عہد کا ایفا۔
					غ

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۴ : ۲	۴	اقوام اور افراد کی موت و حیات	۱۴۳	۴ : ۱۵۴	قرآن ہی صراطِ مستقیم ہے ۔
۴ : ۴۸-۴۹	۳۱	(ہلاکت)	۱۴۳	۴ : ۱۵۴	قرآن کا اتباع ہی اتباعِ سنت ہے ۔
۴ : ۱۳۴-۱۳۵	۱۲۶	قانونِ استبدالِ قومی ۔	۱۰۳	۴ : ۱۱۷	قرآن کی طرف دنیا آ رہی ہے ۔
		قہر ۔ قہار ۔	۱۱۸		قانونِ غیر مبہم ہونا چاہیئے ۔
۴ : ۱۵-۱۸	۱۴	خدا کے قہر اور انسانوں کے قہر میں فرق ۔	۳۶	۴ : ۵۵	قانون کا مدعی دوسروں کے جذبات کا اتباع نہیں کرتا ۔
			۹۱	۴ : ۱۰۵	بصائر کا مجموعہ ۔
			۹۲	۴ : ۱۰۶	تصریفِ آیات سے قرآن فہمی ۔
			۱۰۱	۴ : ۱۱۵	نکھار کر بات کرنے والی کتاب مکمل اور غیر متبدل ۔
۴ : ۷۳-۷۴	۵۲	خدا کی محکمہ اسکیموں کے مطابق	۱۰۲	۴ : ۱۶	سند صرف خدا کی کتاب ہے ۔
۴ : ۷۵-۷۶	۵۳	حقائقِ کائنات کا مشاہدہ (ابراہیمؑ)	۱۰۱	۴ : ۱۱۵	کتابِ موسیٰ کے بعد آخری کتاب
۴ : ۷۷-۷۹	۵۴	ہر شے تغیر پذیر ۔	۷۸	۴ : ۹۳	کتاب اللہ مبارک ہے ۔
۴ : ۹۶-۹۸	۸۴	مظاہرِ کائنات ۔	۱۴۴	۴ : ۱۵۷	اہل عرب کی طرف کتابِ تباکہ
۴ : ۱۰۰	۸۸	آیاتِ ملموئیں ۔	۱۴۴	۱۵۸	اتمامِ حجت ہو جائے ۔
۴ : ۹۰	۶۴	کتاب و حکم و نبوت ۔	۱۴۴	۴ : ۱۵۷	ہم قرآن کی عملی تکذیب کرتے ہیں ۔
۷ : ۷-۹	۱۶۸	کفار اپنے اچھے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں لے لیتے ہیں	۱۵	۴ : ۱۹	قیامت تک ضابطہٴ حیات ۔
۲۹-۳۴	۲۰	کلمات اللہ ۔	۱۲۰	۴ : ۱۲۳	یہ انہی کے لئے مفید ہو گا جو زندہ ہوں
۴ : ۱۲	۹				قوم ۔ (نیز اقوام)
			۶	۴ : ۴-۶	اقوام سابقہ کے مال کی مثال ۔
			۲۷	۴ : ۴۰	قوموں کی تباہی کے اسباب ۔
			۳۳		
۷ : ۸۰	۲۹۰	لوط (حضرت لوط و قوم لوط)			

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۱۲۵-۱۲۴: ۶	۱۲۰	اکابر مجرمین کی طرف سے مخالفت	۳۰۴	۷: ۸	تورات کی افسانہ طرازیوں -
۴: ۴۰-۴۳	۲۷	مفسسی اور افراط زر دونوں {	۳۰۰	۷: ۸	ایک طرف حضرت لوطؑ اور
۶: ۱۵۳	۱۴۱	بتاہی کا موجب			حضرت نوحؑ کی بیویاں،
۶: ۴۴	۲۸	ماپ تول پورا رکھو۔			دوسری طرف فرعون کی بیوی
۶: ۴۶	۳۰	جائز اور ناجائز ذرائع رزق -			
		حصول رزق کی صلاحیتیں -			
۴: ۴۵	۲۹	نظام سرمایہ داری کی تردید {			
		(قانون)			
۶: ۱۰۰	۸۸	سامان نشوونما -	۲۰۸	۷: ۵۴	مارس بکائی* (MAURICE BUCCAELLE)
۶: ۱۰۹	۹۵	مجبورانِ باطل کو گالی مت دو۔	۳۰۹	۷: ۸۵	(فرانس کا سائنس دان)
۷: ۱-۲	۱۵۶	معجزاتِ طلبی اور انکار -	۱۷۸	۷: ۲۹	اُس کی تحقیق -
۶: ۱۱۱-۱۱۲	۹۷				
۶: ۳۷	۲۴				
۶: ۷-۹	۷				
		معجزات دکھانے پر بھی یہ {	۱۶۹	۷: ۱۰	زمین تمام انسانوں کے لئے {
۶: ۳۵	۲۳	ایمان نہیں لائیں گے۔	۱۷۰	۷: ۱۱-۲۴	ذریعہ رزق ہے۔
۶: ۱۶۵	۱۵۰	مکافاتِ عمل - (قانونِ مکارا)	۲۷۵	۷: ۷۳	متاع کا مفہوم -
		تذریعہ وہی لوگ فائدہ اٹھام	۳۰۹		ناقصہ حضرت صالحؑ -
۶: ۵۱	۳۳	سکتے ہیں جو قانونِ مکافات	۳۰۴	۶: ۵۲	حضرت شعیبؑ کا معاشی نظام -
		پر یقین رکھیں۔			انبیاء کی دعوت پر غریب بیکت تھے
۶: ۵۷	۳۷	قانونِ مہلت -	۱۳	۶: ۶۳-۶۴	یہ نظام تمام افراد کی ضروریات {
۶: ۶۷	۴۷	ظہورِ تائید کے بعد تأسف {			پوری کریگا۔ خود کچھ نہیں ہوگا {
۶: ۲۸-۳۴	۲۰	دندانست بے کار ہے۔	۳۰۴	۶: ۵۲	معاشی تحقیقات قرآن کے خلاف نہیں
			۳۰۴	۶: ۳۳	بڑے لوگوں کی فرعونیت -

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۳۷۷	۷:۱۰۹-۱۱۲	ساحرین کا مفہوم -	۹۱	۶:۱۰۵	ہر عمل اپنے لئے -
۳۹۱	۷:۱۲۱-۱۲۲	ساحرین کا ایمان -	۳۳	۶:۵۱	مکافاتِ عمل پر یقین -
۳۳۵		طلوی کا مفہوم -	۸۴	۶:۹۹	مستقر و مستودع -
۳۳۸		عصا اور یدِ بیضا -	۳۶	۶:۵۵	مجرم الگ ہو جائیں گے -
۳۷۷	۷:۱۰۹-۱۱۲		۷۹	۶:۹۴	مذہبی پیشوائیت -
۳۷۷					
۳۶۴	۷:۱۰۴-۱۰۵	ذبحِ ابناء اور پارٹی بازی -	۱۴۸	۶:۱۶۱	جس عمل کی جزا دس گنا ،
۳۴۷		فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ			جرم کی سزا اتنی ہی -
۳۷۱	۷:۱۰۹-۱۱۲	فرعون کی دھمکی -			(اور فرقہ کا افسوسناک فیصلہ)
۳۵۶	۷:۱۰۴-۱۰۵	موسیٰؑ و ربار فرعون میں -	۱۹	۶:۲۵	مناقصہ شرکت مجلسِ نبویؐ میں -
		قوم کی طرف سے خدا کو	۴۰	۶:۴۰	موت اور نیند میں فرق -
۴۰۵	۷:۱۵۵	بے نقاب دیکھنے کا مطالبہ	۴۲	۶:۶۱-۶۲	موت سے صرف جسم مرنا ہے -
۴۰۱	۷:۱۲۴-۱۲۶	قوم فرعون کی غرقابی -	۱۱۶	۶:۱۲۳	موت اور حیات کا قرآنی تصور -
۳۷۲	۷:۱۰۹-۱۱۲	محکوم کی کوئی بات قابلِ	۲۰۴	۷:۵۲	موت کے بعد دنیا میں واپس
		اعتنا نہیں سمجھی جاتی -			نہیں ہو سکے گی -
۳۳۳		مدین کی زندگی -			موسیٰؑ
۳۴۲		وہ منازل جن سے حضرت	۴۰۳	۷:۱۴۸	بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی -
		موسیٰؑ گزرے تھے -	۳۴۱		تبیح و ذکر کا مفہوم -
۳۹۸	۳:۱۲۷	وراثتِ ارض کا قانون -	۴۰۳	۷:۱۴۸	تفرقہ شرک سے بھی بدتر ہے -
۳۸۵	۷:۱۱۳-۱۱۴	ایمان کی حقیقت -	۳۳۴	۱۵۱	تجلی کا طور -
۶۵	۶:۹۱	مؤدت فی القربیٰ -	۳۴۷		خدا کے ساتھ ہونے کا مفہوم -
			۴۱۴	۷:۱۴۲	حضرت موسیٰؑ کی طرف سے دیدارِ
			۴۱۴	۷:۱۴۳	خداوندی کی استدعا
			۴۱۴		اور آپس کا جواب

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۸۰	۶:۹۴	ایغو۔	۲۷۵	۷:۷۳	ناقہ حضرت صالحؑ:
۷۹	۶:۹۴	فراوی کا مفہوم۔	۲۸۷	۶:۹۰	نبوت۔ کتاب و حکم و نبوت۔
۳	۶:۱	نور و ظلمت خدا کی تخلیق۔	۷۳		نذر و نیاز۔ عرس۔
		نوحؑ	۱۵۴	۷:۱-۲	”نزل“۔ لفظ کی اہمیت۔
			۶۵	۶:۹۱	نسل پرستی کے خلاف۔
۲۲۰	۷:۵۹	داستان حضرت نوحؑ۔			نظامِ اسلامی:
۲۲۲	۷:۵۹	طبقاتی تقسیم کے خلاف			رسولؐ کا فریضہ اسلامی {
۲۲۹	۷:۵۹	کشتی کی تیاری۔	۷	۷:۷-۹	نظام قائم کرنا تھا۔
۲۳۲	۷:۵۹	دو قومی نظریہ۔	۱۳	۷:۱۳	نظامِ اسلامی کی خصوصیت۔
۲۳۷	۷:۵۹	عمر حضرت نوحؑ۔	۱۴	۷:۱۴	
۲۴۳	۷:۵۹	کشتی کے متعلق {			
		افسانہ طرازیوں۔	۳۶	۷:۵۵	مجرم الگ ہو جائیں۔
۴۰	۷:۹۰	نہند اور موت میں فرق۔	۷۰	۷:۹۳	غیر متبدل اصول اور {
					بدلنے والے احکام {
			۴۰	۷:۹۰	نفسِ انسانی بہ حالتِ نیتند {
					اور موت۔
۱۳۹	۷:۱۵۲	والدین کے ساتھ {	۴۲	۷:۹۱	نفس کو موت نہیں آتی۔
		حسن سلوک۔			
۲۹۹	۷:۱۳۷	وراثتِ ارض کا قانون۔			
۱۶۴	۷:۷-۹	وزن و اعمال کا ایک {	۵۴	۷:۷۷	نفسِ انسانی تغیرات {
		اہم معیار۔			سے ماوراء ہو جاتا ہے۔
۱۵۴	۷:۱-۲	وحی کی خصوصیت۔	۷۸	۷:۹۳	نفس کی محکمیت بھی اور {
۲۷۵		وحی کے طریق اور عقل کے طریق {			نشو و نما بھی۔
		میں فرق۔			

صفحہ	آیت	مضمون	صفحہ	آیت	مضمون
۱۴۱	۶:۱۵۳	یٰ قِیْمُوں كے مال كی حفاظت	۱۲۰	۶:۱۱۲-۱۲۵	وحی۔ مطالبہ یہ کہ ان کی طرف وحی { براہ راست کیوں نہیں آئی }
۱۵	۶:۱۵-۱۸	یہود و نصاریٰ کی طرف سے مخالفت	۵۰	۶:۷۱-۷۲	ہدایت صرف خدا کی ہدایت ہے۔
۱۳۵	۶:۱۴۷-۱۴۸	یہودیوں پر، ان کے جرائم کی بنا پر بعض چیزیں حرام قرار دے دی گئی تھیں۔	۲۴۷	۷:۵۹	ہودؑ (حضرت)۔

فانش گویم آنچه وردل مضمراست
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت حباں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

(اقبالؒ - جاوید نامہ ص ۹)